روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سُورۃ النّبا

تا

سُورۃ النّاس

(جلد : ۲۰)

افادات

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب سواتی

خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

چودھواں ایڈیشن

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

نام کتاب .... معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ النباء تا سورۃ الناس) جلد ۲۰

افادات .... حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

مرتب .... الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت .... پانچ سو (۵۰۰)

سرورق .... سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ

کتابت .... محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ

ناشر .... مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت .... ۱۶۵/- ایک سو پینسٹھ روپے

تاریخ چودھواں ایڈیشن صفر المظفر ۱۴۲۸ھ بمطابق فروری ۲۰۰۸ء

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ دروس القرآن، محلّہ فاروق گنج گوجرانوالہ

(۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور

(۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور

(۴) مکتبہ سید احمد شہیدؒ، اردو بازار، لاہور

(۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

(۶) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۷) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی

(۸) اسلامیہ کتب خانہ اڈا گامی، ایبٹ آباد

(۹) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ

(۱۰) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

فہرست مضامین دروس القرآن جلد ۳۰

مضامین	صفحہ
پیش لفظ (از حاجی لعل دین)	۱۹
کہنے کی چند باتیں (از مولوی محمد اشرف)	۲۳
سورۃ النبا	۲۷
درس اوّل (آیت ۱ تا ۱۷)	۲۸
وجہ تسمیہ اور کوائف	۲۹
موضوع	"
قیامت ۔ ایک بڑی خبر	۳۰
وقوع قیامت کے متعلق اختلاف	۳۱
خود تخلیق انسانی قیامت پر دلیل ہے	"
زمین گہوارہ ہے	۳۲
پہاڑ کیل ہیں	"
تخلیق ازواج	"
لیل ونہار کے فوائد	"
کائنات کے مختلف عالم	۳۴
مادہ اور توانائی	"
پانی ایک عظیم نعمت ہے	۳۵
فیصلے کا دن	"
درس دوم (آیت ۱۸ تا ۳۰)	۳۷
گذشتہ سے پیوستہ	۳۷
نفخ صور	"
فوج در فوج	۳۸
آسمان کا پردہ اٹھ جائے گا	۳۹

مضامین	صفحہ
پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے	۳۹
دوزخ تاک میں ہے	۴۰
مومنین کا تزکیہ	۴۱
دوزخیوں کی سزائیں	"
سزا کی وجوہات	۴۲
ہر چیز کا ریکارڈ موجود ہے	۴۳
دائمی اور عارضی عذاب	"
درس سوم (آیت ۳۱ تا ۴۰)	۴۴
گذشتہ سے پیوستہ	"
متقین کے لیے انعامات	۴۵
تقویٰ کا مفہوم	۴۶
باغ اور ہم عمر عورتیں	۴۷
شراب طہور	۴۸
وہاں لغویات نہیں ہوں گی	۴۸
جنتیوں کے مدارج	۴۹
رب ، رحمٰن ، رحیم	"
لفظ روح کی تشریح	۵۰
روح اعظم	"
اللہ کے ہاں سفارش کا معیار	۵۱
سفارش کا مشرکانہ عقیدہ	۵۲

کفار کی آخری حسرت ۵۴

سورۃ النزعت ۵۵

درس اول (آیت ۱ تا ۱۴) ۵۶

کوائف اور موضوع ۵۷

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط "

قانون جذب و کشش "

قیامت کیوں ضروری ہے ۵۸

کفار کی جان کنی ۔ مؤمنین کی جان کنی ۵۹

تخلیق کائنات اللہ کی چار صفات پر مبنی ہے ۶۱

صور اول و ثانی ۶۲

قیامت کے روز حالت زار "

درس دوم (آیت ۱۵ تا ۲۶) ۶۴

گذشتہ سے پیوستہ "

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ۶۵

حجاب ناری ۶۶

جوتے اتارنے کی حکمت ۶۷

عطائے نبوت "

وعظ کا حکم ۶۸

تزکیہ "

صراط مستقیم کی طرف راہنمائی ۷۰

خوف خدا "

موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ۷۱

فرعون کی طرف سے تکذیب ۷۱

دعوائے خدائی "

منصور کا نعرہ انا الحق ۷۲

فرعون کا انجام "

درس سوم (آیت ۲۷ تا ۳۶) ۷۴

بعث بعد الموت "

آسمان کی تخلیق ۷۵

رات اور دن کی آمد "

زمین کی تخلیق ۷۶

پانی کی فراہمی "

انسان مضبوط ترین مخلوق ہے ۷۷

جانور انسانوں کی خدمت پہ مامور ہیں "

قیامت سب سے بڑا ہنگامہ ۷۸

درس چہارم (آیت ۳۷ تا ۴۶) ۸۰

گذشتہ سے پیوستہ "

انسان کی عقلی حیثیت ۸۱

عقل اور خواہشات ۸۲

سرکش گروہ ۸۲

خوف خدا والا گروہ ۸۴

خواہش نفسانی "

جذبہ اور عقل ۸۵

وقوع قیامت کا علم صرف اللہ کو ہے "

دنیوی زندگی بالکل مختصر ہے ۸۶

سورۃ عبس	۸۹
درس اول (آیت ۱ تا ۱۶)	۹۰
نام اور کوائف	۹۱
موضوع	″
پس منظر	۹۲
انسانی کی ظاہری اور باطنی کیفیت	۹۳
حضور علیہ السلام سے محبوبانہ خطاب	″
آغاز کلام	۹۴
حضور علیہ السلام کا کام پیغام پہنچا دینا ہے	۹۵
تبلیغ کے لیے تقدیم و تاخیر کا اصول	″
تبلیغ دین کا فریضہ	۹۷
قرآن پاک نصیحت ہے	″
درس دوم (آیت ۱۷ تا ۳۲)	۹۹
گذشتہ سے پیوستہ	″
عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ	۱۰۰
غرباء اور مساکین اولین متبعین ہیں	۱۰۱
انسان کی طرف سے ناشکر گذاری	″
تخلیق انسانی	۱۰۲
راہ ہدایت	۱۰۳
موت اور تدفین	″
بعث بعد الموت	۱۰۵
خوراک کی بہم رسانی	″
درس سوم (آیت ۳۳ تا ۴۲)	۱۰۷
گذشتہ سے پیوستہ	″

قیامت کی آمد	۱۰۸
اقرباء سے فرار	″
روشن چہرے	۱۱۱
سیاہ چہرے	″
سورۃ تکویر	۱۱۳
درس اول (آیت ۱ تا ۱۴)	۱۱۴
نام اور کوائف	۱۱۵
موضوع اور گذشتہ سورۃ سے ربط	″
نظام شمسی	۱۱۶
سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا	۱۱۷
زندہ درگور کرنے والوں سے باز پرس ہوگی	۱۱۹
ہر چیز واضح نظر آئے گی	۱۲۰
درس دوم (آیت ۱۵ تا ۲۹)	۱۲۱
گذشتہ سے پیوستہ	″
خمسہ متحیرہ	۱۲۲
رات اور دن کا تغیر و تبدل	۱۲۳
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں	″
حظیرۃ القدس	۱۲۴
جبرائیل علیہ السلام کی طاقت	″
جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں	۱۲۵
حضور علیہ السلام اور قرآن پاک	۱۲۶
دعوت فکر	″
قیامت اور قرآن کا باہمی ربط	۱۲۷

قرآن پاک حقیقی ترقی کا ذریعہ ہے	۱۲۷
خلاصہ سورۃ	۱۲۸
سورۃ الانفطار	۱۲۹
درس اوّل (آیت ۱ تا ۸)	۱۳۰
نام اور کوائف	"
موضوع اور ربط	"
قیامت سب سے بڑا حادثہ ہوگا	۱۳۱
قرآن کریم کے ساتھ ربط	"
آسمان پھٹ جائے گا	۱۳۲
ستارے بکھر جائیں گے	"
قبریں اکھاڑ دی جائیں گی	۱۳۳
روح اور جسم کا دوبارہ ملاپ	"
خالق اور مخلوق کا تعلق	۱۳۴
درس دوم (آیت ۹ تا ۱۹)	۱۳۷
گذشتہ سے پیوستہ	"
انصاف کا دن	"
تمام اعمال حاضر کیے جائیں گے	۱۳۸
کراماً کاتبین	"
ابرار اور فجار کا انجام	۱۴۰
یوم الدین کی وجہ تسمیہ	۱۴۲
حقیقی مالک ذات خداوندی ہے	"
سورۃ المطففین	۱۴۵
درس اوّل (آیت ۱ تا ۶)	۱۴۶

نام اور کوائف	۱۴۶
پہلی سورۃ سے ربط	"
موضوع	۱۴۷
ڈنڈی مارنے والوں کی مذمت	"
نماز میں کمی کرنا باعث نقصان ہے	۱۴۹
ماپ تول میں کمی کرنا باعث نقصان ہے	"
تجارت میں جھوٹ اور شیطان کا دخل	۱۵۰
سچے تاجروں کے لیے اجر	"
قیامت کے روز محاسبہ	۱۵۱
درس دوم (آیت ۷ تا ۱۷)	۱۵۳
گذشتہ سے پیوستہ	"
فجار کا انجام	۱۵۴
مکذبین قیامت	۱۵۵
منکرین قرآن	"
ان کے دل زنگ آلود ہیں	۱۵۶
دیدار الٰہی سے محرومی	۱۵۷
درس سوم (آیت ۱۸ تا ۲۸)	۱۵۹
گذشتہ سے پیوستہ	"
جزائے عمل یقینی ہے	۱۶۰
ابرار کے نامہ ہائے اعمال علیین میں ہیں	"
فرشتے نیک روح کے ہمرکاب ہوتے ہیں	۱۶۱
روح کا تعلق علیین اور برزخ کے ساتھ	۱۶۲
جنت میں داخلہ ایمان پر موقوف ہے	۱۶۳
ابرار کے لیے انعامات	۱۶۴
نیکی کی طرف رغبت	۱۶۵
درس چہارم (آیت ۲۹ تا ۳۶)	۱۶۷
گذشتہ سے پیوستہ	"

ایمانداروں کے ساتھ استہزاء	۱۶۷
مجرمین کون ہیں	۱۶۸
ضعفاء پر طعن	"
کسی کو حقیر نہیں جاننا چاہیئے	۱۶۹
مجرمین بمقابلہ مومنین	۱۷۰
قیامت کے روز ایماندار کافروں پر ہنسیں گے	۱۷۱
سورۃ الانشقاق	
درس اول (آیت ۱ تا ۱۵)	۱۷۳
نام اور کوائف	۱۷۴
موضوع	۱۷۵
آسمان پھٹ جائے گا	"
سب سے پہلے حضور علیہ السلام کی قبر مبارک شق ہوگی	۱۷۶
زمین بدل دی جائے گی	"
رب کے سامنے حاضری ہوگی	۱۷۷
آسان حساب	"
پس پشت اعمال نامے والا گروہ	۱۷۸
درس دوم (آیت ۱۶ تا ۲۵)	۱۷۹
گذشتہ سے پیوستہ	۱۸۱
شفق کیا ہے	"
غروب شفق اور نماز مغرب	۱۸۲
موت کے بعد تین حالتیں پہلی حالت شفق	"
دوسری حالت رات	۱۸۳
تیسری حالت بدر	"
زندگی کے مختلف ادوار	۱۸۴
انسان کی آخری منزل	"
انسان سے شکوہ	۱۸۵
سجدہ تلاوت واجب ہے	"
سجدہ اور شیطان	۱۸۶
سجدہ تلاوت فی الفور ضروری نہیں	"
کفار کے لیے عذاب الیم	۱۸۷
اہل ایمان کے لیے اجر عظیم	"
سورۃ البروج	۱۸۸
درس اوّل (آیت ۱ تا ۱۱)	۱۸۹
	۱۹۰

نام اور کوائف	۱۹۱
سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط	"
اصحاب الاخدود کا واقعہ	"
ستاروں کی گواہی	۱۹۴
شاہد اور مشہود	۱۹۵
اصحاب الاخدود کی ہلاکت	"
ان کے لیے جہنم کی سزا	۱۹۶
ایمانداروں کے لیے اجر	۱۹۷
درس دوم (آیت ۱۲ تا ۲۲)	۱۹۸
گذشتہ سے پیوستہ	"
ظلم کی سزا اس دنیا میں	۱۹۹
قبر میں لڑکے کی حالت	"
سخت پکڑ کا مفہوم	۲۰۰
اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ	۲۰۱
سابقہ متکبرین کا انجام	۲۰۲
کفار مکہ کے لیے وعید	۲۰۳
حفاظت قرآن	"
سورۃ الطارق	۲۰۵
درس (مکمل سورۃ)	۲۰۶
نام اور کوائف	۲۰۷
موضوع	"
طارق کیا ہے؟	"
دیگر معانی	"

مَا اَدْرٰىكَ اور مایدریک میں فرق	۲۰۸
اعمال محفوظ رہتے ہیں	״
تخلیقِ انسانی قیامت پر دلیل ہے	۲۱۰
اعمال تبدیل نہیں کیے جا سکیں گے	۲۱۱
ہدایت کے لیے انسانی استعداد	۲۱۲
قرآن قولِ فیصل ہے	״
سورۃ الاعلیٰ	۲۱۵
درس اوّل (آیت ۱ تا ۱۳)	۲۱۶
نام اور کوائف	۲۱۷
فضیلت	״
پہلی سورۃ کے ساتھ ربط	״
تسبیح کا مفہوم	۲۱۸
اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک	״
انسان کو اللہ کے نام پر بلایا گیا ہے	۲۱۹
اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ	۲۲۰
انسان کے حواس ظاہرہ اور باطنہ	۲۲۱
جانور انسانوں کی خدمت پر مامور ہیں	״
ہدایت کے خارجی ذرائع	۲۲۲
قرآن پاک کی تعلیم اللہ کے ذمے ہے	״
اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے	۲۲۳
ہدایت کا طالب ہدایت پا لیتا ہے	״
تبلیغ میں سراسر نفع ہے	״
خوفِ خدا کامیابی کا ذریعہ ہے	۲۲۴
شقی کا انجام	״
درس دوم (آیت ۱۴ تا ۱۹)	۲۲۶
گذشتہ سے پیوستہ	״
فلاح کے تین اصول	״
شریعت کے چار بنیادی اصول	۲۲۷
باطن کی پاکیزگی	״
ظاہر کی پاکیزگی	۲۲۸
مال کی پاکیزگی	۲۲۹
نماز کی شرائط	۲۳۰
نماز تمام عبادات کی جڑ ہے	״
دنیا اور آخرت کی زندگی میں تقابل	۲۳۱
آسمانی صحیفے	״
سورۃ الغاشیہ	۲۳۳
درس اوّل (آیت ۱ تا ۱۶)	۲۳۴
نام اور کوائف	۲۳۵
موضوع	״
فضائل سورۃ	״
قیامت ایک عظیم انقلاب ہوگا	۲۳۶
قیامت ہر چیز پر چھا جائے گی	״
ذلیل چہرے	״
بعض عبادت گذار بھی جہنم میں جائیں گے	۲۳۷
ان کا مشروب کھولتا ہوا پانی ہوگا	۲۳۸
بدترین کھانا	״
تروتازہ چہرے	۲۳۹

ان کے لیے جنت کے اعلیٰ مقام ہوں گے	۲۴۰	شداد	۲۶۱
درس دوم (آیت ۱۷ تا ۲۶)	۲۴۳	سزا کا کوڑا	۲۶۳
گذشتہ سے پیوستہ	"	درس دوم (آیات ۱۵ تا ۲۰)	۲۶۵
دلائل قدرت	"	گذشتہ سے پیوستہ	"
اونٹ اور اس کی خصوصیات	۲۴۴	انسانوں کی چار قسمیں	"
آسمان، پہاڑ اور زمین	۲۴۶	زر پرست طبقہ	۲۶۶
سبق آموز دلائل	۲۴۷	خدا سے شکوہ	۲۶۷
افکار کی پاکیزگی	۲۴۹	یتیم اور مسکین پروری	۲۶۸
عقیدے کی پاکیزگی	"	وراثت میں حق تلفی	۲۶۹
ڈیوٹی کی پابندی	۲۵۰	مال کی محبت	۲۷۰
حضور علیہ السلام مذکر (نصیحت کرنے والے ہیں)	"	درس سوم (آیت ۲۱ تا ۳۰)	۲۷۲
سورۃ الفجر	۲۵۳	گذشتہ سے پیوستہ	"
درس اول (آیت ۱ تا ۱۴)	۲۵۴	محاسبہ لازمی ہے	۲۷۳
		زمین کوٹ دی جائے گی	"
نام اور کوائف	"	فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے	۲۷۴
موضوع	۲۵۵	جہنم قریب کر دی جائے گی	"
فجر اور دس راتیں	"	اس دن کی نصیحت بے سود ہوگی	۲۷۵
جفت اور طاق	۲۵۶	خدا کی سزا بڑی سخت ہوگی	"
شب رواں	۲۵۷	نفس مطمئنہ کے لیے انعامات	۲۷۶
عقلمندوں کے لیے لمحہ فکریہ	۲۵۸	عباد اللہ میں شمولیت	"
قوم عاد و ثمود	"	راضی بر رضا	۲۷۷
فضول خرچی	۲۵۹	سورۃ البلد	۲۷۹
فرعون	۲۶۰	درس اول (آیت ۱ تا ۱۰)	۲۸۰

نام اور کوائف	۲۸۰	نام، کوائف اور فضیلت	۲۹۸
پچھلی سورۃ کے ساتھ ربط	۲۸۱	موضوع اور پہلی سورۃ کے ساتھ ربط	۲۹۹
موضوع	″	چند قسمیں	″
شہر مکہ	″	ارادہ انسانیت کا خلاصہ ہے	۳۰۰
عاشقانِ الٰہی کی بستی	۲۸۲	آسمان اور شریعت میں مناسبت	۳۰۲
انسان کسی وقت مشقت سے خالی نہیں	″	انسان کی انفرادی استعداد	″
انسان مکلف ہے	۲۸۳	انسان کی پیدائش فطرت سلیمہ پر ہوتی ہے	۳۰۳
انسان کی خام خیالی	۲۸۴	تزکیہ نفس	″
آنکھیں بڑی نعمت ہیں	۲۸۵	درس دوم (آیت ۱۱ تا ۱۵)	۳۰۵
دو راستے	۲۸۶	گذشتہ سے پیوستہ	″
درس دوم (آیت ۱۱ تا ۲۰)	۲۸۸	قوم ثمود کا تعارف	۳۰۶
گذشتہ سے پیوستہ	″	قوم عاد اور ثمود میں مماثلت	۳۰۷
حصولِ سکون کے ذرائع	۲۸۹	قوم ثمود کی تکذیب	۳۰۸
اونچی گھاٹی، بلند ذہنیت	۲۹۰	ناقۃ اللہ کا مفہوم	″
غلامی سے آزادی دلانا	″	صالح علیہ السلام اور قوم میں مناظرہ	″
فَكُّ رَقَبَةٍ وسیع تر معنوں میں	۲۹۲	اونٹنی کی پیدائش	۳۰۹
یتیم اور مسکین کی مدد یا سوشل ورک	۲۹۳	پانی پینے کی باری	۳۱۰
ایمان شرطِ اول ہے	۲۹۴	اونٹنی کے قتل کی سازش	″
صبر اور رحم کی تلقین	″	عذاب الٰہی کی آمد	۳۱۱
کفار کے لیے وعید	۲۹۵	حضرت علیؓ کی شہادت پر پیش گوئی	۳۱۲
سورۃ الشمس	۲۹۷	قوم ثمود کی تباہی	″
درس اول (آیت ۱ تا ۱۰)	۲۹۸	صالح علیہ السلام کی ہجرت	″

شانِ عبرت ۳۱۳

سورۃ اللیل ۳۱۵

درسِ اوّل (آیت ۱ تا ۱۱) ۳۱۶

نام اور کوائف ″

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط ۳۱۷

ماحول کا اثر ۳۱۸

رات اور دن میں اختلاف ″

مرد و زن میں اختلاف ۳۱۹

انسانی کوشش میں اختلاف ۳۲۰

انفاق فی سبیل اللہ ۳۲۱

حضرت بلالؓ اور عامرؓ پر مظالم ″

توحید پرست لونڈی ۳۲۲

کلمہ گو جنت میں جائے گا ۳۲۳

بخیل کی مثال ۳۲۴

درسِ دوم (آیت ۱۲ تا ۲۱) ۳۲۶

گذشتہ سے پیوستہ ″

ہدایت دینا اللہ کی ذمہ داری ہے ۳۲۷

ہدایت کے ذرائع ″

مکذبین کے لیے وعید ۳۲۹

شقی کی تعریف ″

شقاوت کی اقسام ۳۳۰

شقی اور اتقیٰ میں تقابل ″

متقی کے اوصاف ۳۳۱

صدیق اکبرؓ کے اوصافِ حمیدہ ″

رضائے الٰہی ۳۳۲

سورۃ الضحیٰ ۳۳۵

درسِ اوّل (آیت ۱ تا ۷) ۳۳۶

نام اور کوائف ″

شانِ نزول ″

مضمون سورۃ ۳۳۷

ضحیٰ اور اشراق ″

نمازِ ضحیٰ یا اوابین ″

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط ۳۳۸

ضحیٰ اور لیل وسیع تر معنوں میں ۳۳۹

بہتر مستقبل کی بشارت ۳۴۰

خوش کن انعامات ۳۴۱

حضور علیہ السلام کے بچپن کا زمانہ ۳۴۲

یتیموں کی پرورش ۳۴۳

لفظ ضال کا مفہوم ″

درسِ دوم (آیت ۸ تا ۱۱) ۳۴۵

گذشتہ سے پیوستہ ″

حضور علیہ السلام کا استغناء ۳۴۶

غنائے قلب ۳۴۷

قناعت کی فضیلت ″

یتیم کے ساتھ شفقت ۳۴۸

سائل کے ساتھ حسنِ سلوک ۳۴۹

انعاماتِ الٰہی کا تذکرہ ۳۵۰

غلامی صرف اللہ تعالیٰ کی ″

دین کی تعلیم ۳۵۱
نعمت کا اظہار ۳۵۲
سورۃ الم نشرح ۳۵۵
درس (مکمل سورۃ) ۳۵۶
نام اور کوائف "
پہلی سورۃ کے ساتھ ربط "
شرح صدر ۳۵۷
ظاہری شرح صدر کے چار واقعات "
باطنی شرح صدر ۳۵۹
بوجھ سے مراد اور اس بوجھ میں تخفیف ۳۶۰
جماعت بندی کا حکم "
حضور علیہ السلام کے ذکر کی بلندی ۳۶۲
مشکل کے ساتھ آسانی ۳۶۳
محنت اور ریاضت ۳۶۴
حضور علیہ السلام کے مکاتیب "
سورۃ التین ۳۶۷
درس مکمل (مکمل سورۃ) ۳۶۸
نام اور کوائف "
موضوع ۳۶۹
چار چیزوں کی قسم "
انجیر کے خواص "
زیتون کے خواص ۳۷۰
کوہ طور اور بلد امین "
انسانی جسم کے ساتھ مطابقت ۳۷۱
انسان بہترین ہستی ہے ۳۷۲
دو بنیادی عقائد ۳۷۳
بدترین مخلوق ۳۷۴
ایمانداروں کے لیے انعامات "
اعلیٰ ترین عدالت ۳۷۵
سورۃ العلق ۳۷۷
درس اوّل (آیت ۱ تا ۵) ۳۷۸
گذشتہ سورۃ کا خلاصہ "
تفصیل اور تخصیص ۳۷۹
سب سے پہلی سورۃ "
نام اور کوائف "
وحی کی ابتداء "
زمانہ کا حکم ۳۸۱
وحی کے اثرات "
ان پانچ ابتدائی آیات کے بعد نازل ہونے والی دوسری سورتیں ۳۸۲
توحید اور شرک میں حد فاصل ۳۸۳
ابتدائی اور ثانوی تعلیم ۳۸۴
قلم کا فیضان ۳۸۵
علم کی برکات ۳۸۶
درس دوم (آیت ۶ تا ۱۹) ۳۸۸
گذشتہ سے پیوستہ "
مومن یا طاغی ۳۸۹

سرکش انسان	۳۹۰
استغنا کی وجوہات	″
اللہ کے حضور پیشی	۳۹۱
نماز سے روکنے والا	″
نماز سے روکنے کی وجہ	۳۹۲
نماز کی برکات	۳۹۳
مکذبین کو دھمکی	۳۹۴
مشرکین سے مقابلہ	۳۹۵
مصالحت سے انکار	۳۹۶
سجدہ کمال اطاعت کی نشانی ہے	″
سجدہ تلاوت	۳۹۷
سورۃ القدر	۳۹۹
درس (مکمل سورۃ)	۴۰۰
نام اور کوائف	″
پہلی سورۃ کا خلاصہ	″
موضوع	۴۰۱
شان نزول	۴۰۲
لیلۃ القدر کی فضیلت	۴۰۳
قدر کا مفہوم	
اعمال اور ان کا اجر	۴۰۴
استغفار کا نادر موقع	″
نزول ملائکہ	۴۰۵
خیر و برکت کا نزول	″
کتب آسمانی اور ماہ رمضان	۴۰۶

ساری رات بابرکت ہے	۴۰۶
سورۃ البینہ	۴۰۹
درس اول (آیت ۱ تا ۴)	۴۱۰
نام اور کوائف	۴۱۰
فضائل سورۃ	۴۱۱
بعض صحابہؓ کی خصوصیات	۴۱۲
گذشتہ سورتوں کے ساتھ ربط	۴۱۳
اسوۂ حسنہ کی ضرورت	۴۱۳
ٹیگور کا اعتراف حقیقت	۴۱۴
ہر نبی اپنے دور کا بینہ ہوتا ہے	″
حضور علیہ السلام کے زمانے میں مذاہب عالم	۴۱۵
اتمام حجت اور اہل کتاب	۴۱۶
اہل کتاب کی ضد اور عناد	″
بینہ سے مراد رسول آخر الزمان ہیں	۴۱۷
اہل کتاب کی فرقہ بندی	۴۱۸
درس دوم (آیت ۵ تا ۸)	۴۱۹
گذشتہ سے پیوستہ	″
اہل کتاب کی بلاوجہ مخالفت	۴۲۰
اخلاص فی العبادت	″
حنیف کا معنیٰ	۴۲۱
نماز اور زکوٰۃ	″
عقیدے کی پاکیزگی	۴۲۲
اہل کتاب بدترین مخلوق ہیں	″

مومنین بہترین مخلوق ہیں	۴۲۳
رضائے الٰہی	۴۲۴
بندوں کی رضا	"
خیر البریّہ کون ہیں	۴۲۵
شرُّ البریّہ کون ہیں	"
خشیت الٰہی	۴۲۶
سُورۃ الزِلزال	۴۲۷
درس (مکمل سورۃ)	۴۲۸
نام اور کوائف	"
موضوع	"
فضیلت	۴۲۹
سابقہ سورتوں کے ساتھ ربط	۴۳۰
الٰہی نظام کی برکات	"
جزائے عمل کب واقع ہو گی	۴۳۲
جب زمین ہلا دی جائے گی	"
زمین ہر چیز اُگل دے گی	۴۳۳
راز فاش ہو جائیں گے	۴۳۴
لوگ گروہ گروہ ہو جائیں گے	۴۳۵
اعمال ان کے سامنے رکھ دیے جائیں گے	"
ایمان کے بغیر کوئی نیکی قابل قبول نہیں	۴۳۶
خلاصۂ کلام	"
سُورۃ العٰدِیٰت	۴۳۷
درس (مکمل سورۃ)	۴۳۸
نام اور کوائف	۴۳۸
گذشتہ سورۃ کے ساتھ ربط	۴۳۹
شانِ نزول	"
عادیات کا مفہوم	۴۴۰
پانچ قسمیں	"
گھوڑے کی خصوصیات	۴۴۱
انسان ناشکر گزار ہے	۴۴۲
شکر گذاری کی تلقین	"
مال کی محبت	۴۴۳
تمام راز کھل جائیں گے	۴۴۵
سُورۃ القارِعۃ	۴۴۷
درس (مکمل سورۃ)	۴۴۸
نام اور کوائف	"
موضوع	"
قیامت کے مختلف نام	۴۴۹
قیامت کا نقشہ	"
لوگ انتشار کا شکار ہو جائیں گے	۴۵۰
انسان کا حقیقی وزن	۴۵۱
پہاڑوں کے ذرات بکھر جائیں گے	"
پسندیدہ جزائے عمل	۴۵۲
جہنم کا گڑھا	۴۵۳
اعمال تولے جائیں گے	"
ایمان، اخلاق اور اتباعِ سنت	۴۵۴

آگ کا گڑھا	۴۵۵
حاصل کلام	〃
سورۃ التکاثر	۴۵۷
درس (مکمل سورۃ)	۴۵۸
نام اور کوائف	〃
پہلی سورۃ کے ساتھ ربط	〃
مال کی محبت	۴۵۹
میت کے تین ساتھی	۴۶۰
علم الیقین	〃
انعاماتِ الٰہی کے متعلق باز پرس	۴۶۱
صحت اور فراغت	۴۶۲
کوئی نعمت حقیر نہیں	〃
قرآن اور حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ	〃
کھجور اور پانی	۴۶۳
فضیلت سورۃ	۴۶۴
سورۃ العصر	۴۶۵
درس (مکمل سورۃ)	۴۶۶
نام اور کوائف	〃
عصر کا مفہوم	〃
نمازِ عصر، صلوٰۃ وسطیٰ	۴۶۷
انسانی عمر قیمتی سرمایہ ہے	〃
قسم صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی ہونی چاہیئے	۴۶۸
قسم بطور گواہی	۴۶۹
ایمان اور عمل صالح	۴۶۹
ایمان مفصل	۴۷۰
نظریات کی درستگی	〃
جماعت کی اہمیت	۴۷۱
حق کی وصیت	〃
صبر کی تلقین	۴۷۲
فلاح کے چار اصول	〃
سورۃ الھمزۃ	۴۷۵
درس (مکمل سورۃ)	۴۷۶
نام اور کوائف	〃
سابقہ اور آئندہ سورتوں کا خلاصہ	〃
ہمزہ اور لمزہ	۴۷۷
ارتکازِ دولت	۴۷۸
زر پرست کی خام خیالی	۴۷۹
سرمایہ دار کا حشر	۴۷۹
دوزخ کی آگ	۴۸۰
آگ کا اثر دل پر	〃
دوزخ کی تلخی	۴۸۱
سورۃ الفیل	۴۸۳
درس (مکمل سورۃ)	۴۸۴
نام اور کوائف	۴۸۴
موضوع	〃
تاریخی پس منظر	۴۸۵
حضور علیہ السلام کی ولادت عام الفیل میں ہوئی	۴۹۰

اصحاب فیل کی ناکامی	۴۹۱	قومیت پرستی کی مذمت	۵۰۷
ابابیل کا کارنامہ	۴۹۲	عزت کا مدار تقوٰی پر ہے	۵۰۸
واقعہ اصحاب فیل تمہید نبوت تھی	"	یوم الدین کا انکار	"
اللہ تعالیٰ کی کمال حکمت	۴۹۳	یتیم سے بدسلوکی	۵۰۹
اصحاب فیل کی تباہی	۴۹۴	مسکین کو کھانا کھلانا	۵۱۰
حاصل کلام	"	نماز سے غفلت	"
سورۃ قریش	۴۹۵	ریاکاری شرک کے مترادف ہے	۵۱۱
درس (مکمل سورۃ)	۴۹۶	مذہبی جماعتوں کی کوتاہیاں	۵۱۲
نام اور کوائف	"	انسانی ہمدردی	"
پچھلی سورۃ کے ساتھ ربط	"	بخل کی بیماری	۵۱۳
قریش کے لیے الفت	۴۹۷	**سورۃ الکوثر**	۵۱۵
قریش کا شجرہ نسب	"	**درس** (مکمل سورۃ)	۵۱۶
قریش کا پیشہ تجارت	۴۹۸	نام اور کوائف	"
قریش کا احترام	۴۹۹	شان نزول	۵۱۷
قریش کی قومیت پرستی	"	موضوع	"
قریش کو عبادت کی تلقین	۵۰۰	کوثر۔ خیر کثیر	۵۱۸
پیٹ کا مسئلہ	"	قرآن کریم بھی خیر کثیر ہے	"
قریش کی تکریم	۵۰۱	نعمت کی قدردانی	۵۱۹
امن وامان کے فوائد	۵۰۲	اشاعت قرآن کے مختلف طریقے	"
حاصل کلام	۵۰۳	فلاح کے دو اصول	۵۲۰
سورۃ الماعون	۵۰۵	نماز تعلق باللہ کا ذریعہ ہے	"
درس (مکمل سورۃ)	۵۰۶	قربانی تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے	۵۲۱
نام اور کوائف	"	قربانی صرف پالتو جانور کی روا ہے۔	۵۲۲

دشمن کی ناکامی	۵۲۳
حضور علیہ السلام کے لیے مقام محمود	۵۲۴
کامیابی کا اتمام	〃
سورۃ الکفرون	۵۲۷
درس (مکمل سورۃ)	۵۲۸
نام اور کوائف	〃
گذشتہ سورۃ کا خلاصہ	〃
موضوع	۵۲۹
قرآن کی برکات	〃
رجعت پسند کون ہیں؟	۵۳۰
معبود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے	〃
معبودانِ باطلہ کی کبھی پرستش نہیں ہوگی	۵۳۱
فضائل سورۃ	۵۳۳
سورۃ النصر	۵۳۵
درس (مکمل سورۃ)	۵۳۶
نام اور کوائف	〃
الوداعی سورۃ	۵۳۶
زمانۂ نزول	۵۳۷
تکمیل مشن	۵۳۸
مخالفتِ دین	۵۳۹
فتح اسلام	۵۴۰
ترکوں کا قبول اسلام	۵۴۱
جانشین جماعت	۵۴۱
نبی علیہ السلام کا استغفار	۵۴۲
پہلی سورۃ کے ساتھ ربط	〃
رجوع الی اللہ کی ترغیب	۵۴۳
سورۃ اللھب	۵۴۵
درس (مکمل سورۃ)	۵۴۶
نام اور کوائف	〃
اقربا سے خطاب	〃
شانِ نزول	۵۴۷
موضوع	۵۴۸
حضور علیہ السلام کے چچا	〃
ابولہب اور اس کے بیٹے	〃
ابولہب کی بیوی	۵۴۹
حضرت حاجی امداد اللہؒ کی کرامت	۵۵۰
ابولہب کی ہلاکت	〃
ام جمیلہ کی حضور علیہ السلام سے عداوت	۵۵۳
اسلام کا فکری غلبہ	۵۵۴
سومنات کا مندر	۵۵۵
سورۃ الاخلاص	۵۵۷
درس (مکمل سورۃ)	۵۵۸
نام اور کوائف	〃
خلاصۂ قرآن	〃
اسلام کا مرکزی نظریہ حیات	۵۶۰
نظریہ دہریت	〃
صفاتِ الٰہی کے منکرین فلاسفر	۵۶۱
کفار و مشرکین	〃
ثنویت پرستی	〃

عقیدہ تشبیہ	۵۶۲
شرک کی مختلف اقسام	"
خالق اور مخلوق	۵۶۳
مسئلہ الوہیت	۵۶۴
شرک کے اجزاء	۵۶۵
اللہ تعالیٰ کی چار صفات	۵۶۷
توحید مرکزی عقیدہ ہے	۵۶۷
فضائل سورۃ	۵۶۸
سورۃ الفلق	۵۷۱
درس (مکمل سورۃ)	۵۷۲
نام اور کوائف	"
فضیلت معوذتین	"
روشنی اور تاریکی	۵۷۳
دینی اور دنیوی فتنے	"
مخلوق کے شر سے پناہ	۵۷۴
ظاہری اور باطنی شر	۵۷۵
شر سے بچنا ضروری ہے	"
اندھیرے کا شر	۵۷۶
جادو کا شر	۵۷۷
باطل پراپیگنڈے کا شر	"
نیکوکاروں کی مجلس سے محرومی	"
ادیان باطلہ کا پراپیگنڈا	۵۷۹

حسد اولین کبیرہ گناہ ہے	۵۷۹
خلاصہ کلام	۵۸۰
سورۃ الناس	۵۸۱
درس (مکمل سورۃ)	۵۸۲
نام اور کوائف	"
موضوع	"
فضیلت	۵۸۳
سورۃ فاتحہ اور سورۃ الناس میں ربط	"
صفت ربوبیت کا اطلاق	۵۸۴
صفتِ مالکیت کا اطلاق	"
صفت الوہیت کا اطلاق	"
اللہ تعالیٰ محبوب ترین ہستی ہے	۵۸۵
مخلاتِ دین اور ان کا علاج	۵۸۶
معرفتِ الٰہی	"
وسوسہ شیطانی سے پناہ	۵۸۷
قرآن پاک منتہائے مقصود ہے	۵۸۸
قرآن پاک کی درس و تدریس	"
علومِ قرآن کی امانت	۵۸۹
دعاء ختم القرآن	۵۹۰

پیش لفظ

(از: محترم الحاج لعل دین۔ ایم اے علوم اسلامیہ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔ امابعد

قرآن پاک ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے جس کے فیوض و برکات کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ اس سمندر میں جس کسی نے بھی غوطہ لگایا، اس نے علم و عرفان کا نیا موتی حاصل کیا۔ گذشتہ چودہ صدیوں میں قرآن پاک کے بے شمار تراجم اور تفاسیر مختلف زمانوں اور مختلف زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں اور انشاء اللہ تاقیام قیامت ہوتی رہیں گی۔ اس طرح مختلف زمان و مکان کے لوگ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق قرآن پاک سے ہدایت حاصل کرتے رہیں گے۔ زندہ انسانوں کو وحی الٰہی کی ضرورت کا اعلان خود قرآن پاک نے ان الفاظ میں کیا ہے اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ۝ لِّیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا (سورۃ یٰس) یعنی یہ ایک نصیحت اور صاف پڑھی جانے والی کتاب ہے تاکہ وہ ہر اس شخص کو خبردار کرے جو زندہ ہو۔ مقصد یہ کہ قرآن پاک ایک ایسا نسخہ کیمیا ہے جس سے اعراض وہی شخص برت سکتا ہے جو پڑھنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو اور اس کی حیثیت ایک جامد پتھر سے زیادہ نہ ہو۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ غور و تدبر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ آخری پیغام ہے۔

آں کتاب زندہ قرآن حکیم ۔۔۔ نوع انساں را پیام آخریں

حکمت او لایزال است و قدیم ۔۔۔ حامل او رحمۃ للعالمین

قرآن پاک کو سمجھنے اور اس کے علوم سے بہرہ ور ہونے کے لیے اس کی طرف کس قسم کی توجہ اور کس قسم کے تعلق کی ضرورت ہے، وہ خود قرآن بیان کرتا ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ (سورۃ قٓ) یعنی اس کے خزانے سے وہی شخص

مستفید ہو سکتا ہے جو اہل دل ہو اور ظاہر و باطن کی پوری توجہ کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرے۔ قرآن پاک کے تمام تراجم و تفاسیر اور درس و تدریس کے تمام سلسلے ایسے ہی لوگوں کے لیے پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ دروس القرآن کا یہ سلسلہ بھی اسی قسم کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔

اشاعت معالم العرفان کا یہ سلسلہ جن حالات میں اور جن محرکات کی بنا پر شروع ہوا، اس کا تذکرہ پہلی جلدوں کے تعارف میں پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص کرم نوازی تھی کہ ایسے وسائل میسر آ گئے جن کی وجہ سے اس کارِ خیر کی ابتدا ہوئی۔ اتنے بڑے کام کی منصوبہ بندی اور وسائل مہیا کرنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اس کے بعد مسودہ کی تیاری اور کتابت و طباعت جیسے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ اس

نے بعض اہل دل حضرات کے قلوب میں وہ جذبہ خدمت اور قرآن پاک سے والہانہ محبت ڈال دی جس کے وہ اہل تھے۔ اور اس طرح معالم العرفان کی اشاعت کا ایک موہوم خواب بالکل قلیل عرصہ میں حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

گذشتہ اشاعتوں میں قارئین سے التماس کی گئی تھی کہ ہماری اس کاوش میں ہماری خامیوں سے ہمیں مطلع کریں تاکہ انہیں دور کیا جا سکے۔ الحمد للہ! بعض احباب نے ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا، جس کے لیے ادارہ ان کا تہ دل سے شکر گزار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے کوشش کی ہے۔ کہ ایک کے بعد دوسری جلد بہتر صورت میں پیش ہو۔ کتابت کی اغلاط کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں زیادہ محنت بھی کی گئی ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ اس سلسلہ میں اگرچہ مکمل طور پر کامیابی نہیں ہوئی تاہم اچھی خاصی پیش رفت ہوئی ہے۔

ایک اہم مسئلہ تکرار کا ہے، جس پر قابو پانے کے لیے ہم مسلسل جد و جہد کر رہے ہیں جو حضرات درس قرآن میں بنفس نفیس شرکت کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نصف گھنٹہ کے اس درس میں ایک ایک بات کو مختلف انداز سے دہرایا جاتا ہے۔ تاکہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ بعض احباب کو اگر کوئی چیز پہلی بار سمجھ میں نہیں آتی تو دوسری دفعہ آ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے اگر تحریر میں کوئی چیز دوبارہ بیان ہو تو ذہن کو کھٹکتی ہے۔ حسب ضرورت ایک ہی جملے کو بار بار تو پڑھا جا سکتا ہے۔ مگر ایک ہی

چیز کا تحریر میں مکرر آنا قدرے گراں گذرتا ہے۔ ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے۔ کہ تحریر میں تکرار کی مقدار کم سے کم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نصف گھنٹہ پر محیط کوئی بھی درس کتاب سے دیکھ کر دس پندرہ منٹ میں بخوبی پڑھا جاسکتا ہے اور بات کو سمجھنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

ہمیں پورا پورا احساس ہے۔ کہ قارئین موضوع کے تکرار کی جھلک اس جلد میں بھی محسوس کریں گے جس کی دو صورتیں ہیں۔ اول ایک ہی درس میں کسی مفہوم کا دوبارہ بیان ہونا۔ اور دوم مختلف دروس میں ایک ہی مسئلہ کا مکرر آنا۔ جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے۔ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ اسے کم سے کم کر دیا جائے تاکہ یہ قارئین کے ذہن میں نہ کھٹکے۔ دوسری صورت کے متعلق گذارش یہ ہے کہ قرآن پاک سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں۔ کہ تیسویں پارے کی ۳۷ میں سے ۳۵ سورتیں مکی ہیں اس دور کے مسائل کفر و شرک کی تردید، قرآن پاک کی حقانیت اور معاد سے آگاہی تھے تیسویں پارہ کی چھوٹی چھوٹی سورتوں میں یہی مسائل بتکرار بیان ہوئے ہیں، خاص طور پر قیامت کی ہولناکیوں سے ڈرانا ان سورتوں کا خاص موضوع ہے، جسے مختلف مثالوں اور مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

لہٰذا دروس القرآن کی اس جلد میں ان مسائل کا بار بار بیان دراصل تکرار نہیں بلکہ تیرہ سالہ مکی زندگی پر محیط مختلف مواقع پر ایک ہی مسئلہ کا مختلف انداز بیان ہے۔ اگر قارئین اس پس منظر میں کتاب کا مطالعہ کریں گے، تو وہ محسوس کریں گے کہ یہ تکرار نہیں بلکہ کفار و مشرکین کے مختلف اوقات میں مکالمات اور ان کے سوالات کے جوابات ہیں۔ ——— تمام احباب سے التماس ہے کہ وہ جملہ کارکنان کے لیے استقامت کی دعا کریں۔ خاص طور پر حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب کی صحت و درازی عمر کی دعا کریں جن کے ارشادات کو اس پورے سلسلہ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

احقر العباد

لعل دین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند کہنے کی باتیں

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم خاتم الانبیاء والمرسلین وعلی الہ واصحابہ وازواجہ واتباعہ اجمعین

اما بعد۔ قرآن پاک خدا تعالیٰ کی نازل کی ہوئی آخری اور سچی کتاب ہے۔ زمانہ نزول سے لے کر تاقیام قیامت تمام انسانوں کے لیے جہالت ظلم و فساد کے اندھیروں میں امن و روشنی کا پیغام ہے ہر دور میں اجتماعی و انفرادی زندگی میں انسانیت کے تمام مسائل کا حل صرف اور صرف قرآن پاک میں منحصر ہے۔ کیونکہ اساسی قانون صرف قرآن پاک ہے۔ صحیح احادیث اس کی شرح اور تبیین ہے۔ قرآن پاک کا موضوع انسان ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ عبودیت کا مظہر کامل بنے۔ زمانہ نزول سے لے کر آج تک کی تفسیروں پر نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ تبدیلی حالات کے ساتھ پیش آمدہ مسائل کو قرآن پاک کے ذریعے ہی بطریق احسن حل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ قرآن پاک کے مفہوم و مدلول کو سمجھا ہو۔ اور زمانہ میں موجود خرابیوں اور ماضی کی تاریخ پہ گہری نظر ہو۔ قوموں کے عروج و زوال کے صحیح اسباب بھی پیش نظر ہوں۔

جدید دور میں مرور ایام اور حادثات کے وقوع پذیر ہونے سے معاشی سیاسی۔ اقتصادی طور پر بے شمار مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔ بحمد اللہ تعالیٰ "معالم العرفان فی دروس القرآن" ان حالات میں بہترین راہنما ہوسکتا ہے۔ اس وقت دنیا کے مسائل میں معاشی اور اقتصادی مسائل سب سے زیادہ اہم ہیں۔ آپ دروس القرآن کے مطالعہ کے بعد محسوس کریں گے۔ ان مسائل کا اتنے اچھے اور مناسب انداز میں حل پیش کیا گیا ہے۔ کہ کسی دوسری تفسیر میں ایسے انداز میں شاید نہ ملے۔ دروس القرآن کے مطالعہ کے بعد ایک آدمی باطل نظامات سرمایہ داری، سوشلزم، کمیونزم، اشتراکیت کی بنیادی

خامیوں کو واضح طور پر محسوس کرتا ہے۔ اور اس کے دل کی گہرائیوں میں قرآن پاک کی حقانیت و صداقت اترتی چلی جائے گی۔ صحیح بات وہی ہوتی ہے، جو سلف کی تفسیروں میں موجود ہے۔ یا جن کا اشارہ قرآن و سنت سے ملتا ہے لیکن دنیا میں رائج الوقت باطل نظامات زندگی کے ساتھ تقابل موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے عام فہم زبان میں کیا گیا ہے اور تبدیلی زمانہ کے ساتھ اسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

نصیحت و نیک خواہی مسلمانان در ہر زمان و در ہر مکان رنگے دیگر دارد و اقتضاء دیگر نماید۔

مسلمانوں کی نصیحت و خیر خواہی ہر دور اور ہر جگہ جدا انداز اور جدا تقاضا رکھتی ہے۔

(مقدمہ فتح الرحمٰن ص۱)

اس کا تمام تر مواد بفضلہ تعالےٰ اہل حق کی جماعت کے فہم و مزاج کے مطابق ہے جس کی ابتداء امام الانبیاء علیہ وعلیہم السلام سے ہوتی ہے۔ بڑی بڑی ضخیم تفاسیر مثلاً روح المعانی، تفسیر کبیر۔ در منثور معالم التنزیل، مظہری، ابن کثیر۔ خازن، طبری، بیضاوی، بحر محیط، کشاف۔ مجمع البیان وغیرہ کی متعدد جلدوں کے کئی کئی صفحات پر پھیلے ہوئے تفسیری نکات اور مضامین کو انتہائی مختصر اور عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ انداز بیان میں نہ تصنع ہے اور نہ لفاظی اور نہ زیادہ الفاظ کی بھرتی، بلکہ سیدھے سادھے اور آسان ترین الفاظ میں قرآن پاک کے صحیح پروگرام کو پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ جہاں پڑھے لکھے حضرات ان انمول جواہرات سے مستفید ہوں وہاں معمولی استعداد کے حضرات بھی اس سے محروم نہ رہیں اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اراکین "انجمن محبان اشاعت قرآن مدرسہ نصرۃ العلوم" کو جنہوں نے دروس کے ان کیسٹوں کو (جن سے نقل ہو کر یہ دروس القرآن کتابی شکل میں آپ کے سامنے ہیں) ناخواندہ حضرات کے استفادہ کیلئے اور ان کیلئے جو دروس القرآن کو صاحب درس کی اصلی آواز میں سننا چاہتے ہوں۔ بالکل اصلی لاگت پر بغیر منافع کے مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ جو انجمن کے پتہ پر خط لکھنے سے مل سکتے ہیں۔

موجودہ دور اس اعتبار سے بڑا نازک دور ہے کہ جدت پسند حضرات ارکان اسلام میں بھی تشکیک پیدا کرتے ہیں۔ قرآن پاک کے کلام الٰہی ہونے کا انکار۔ جنت، دوزخ۔ فرشتے ان کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ جن کی زبان و قلم تو اپنا ہے لیکن ذہن و دماغ یورپ کا ہے۔ جنہیں

قرآن وسنت کی تعلیم سے کماحقہ واقفیت نہیں۔ ارکانِ اسلام کی خبر نہیں مسلمانوں کی اجتماعیت سے ان کو سروکار نہیں۔ انہیں اس سے بھی کوئی سروکار نہیں کہ جیسے دنیا کے ہر علم وفن کے لیے کچھ اصول وضوابط مقرر ہیں اسی طرح قرآن پاک پر تحقیق کے لیے بھی کچھ اصول وضوابط ہیں۔ تمام طاغوتی طاقتیں اپنا پورا زور اس بات پر صرف کر رہی ہیں کہ مسلمان اگر یہودی، عیسائی، کمیونسٹ وغیرہ نہیں بنتے تو وہ مسلمان بھی نہ رہیں ایسے حالات میں ہر مخلص دردِ دل رکھنے والا مسلمان "دروس القرآن" کی ضرورت شدت سے محسوس کرے گا۔ کیونکہ ان دروس میں جدت اور تحقیق کے نام سے تحریف کرنے والوں کی پوری تردید کی گئی ہے، شرک وبدعات۔ باطل رسومات کی بھی بڑے عمدہ انداز میں تردید کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عظمتِ صحابہؓ پر ہونے والے رکیک حملوں کا بھی بجا طور پہ دفاع کیا گیا ہے۔ ان دروس کا مطالعہ دوسرے تمام لوگوں کے ساتھ خاص طور پہ اس نوجوان گروہ کے لیے ان شاء اللہ بیحد مفید ثابت ہوگا۔ جو اپنی سادہ لوحی اور قرآن پاک کی صحیح تعلیم سے بے بہرہ ہونے اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام کو نہ سمجھنے کی بنا پر محض الفاظ کے ہیرپھیر اور محض سکول وکالج میں حاصل کردہ تعلیم کے مطابق قرآن پاک کی تعبیر دیکھ کر غلط مش والے لوگوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حضرت امام شاہ ولی اللہؒ نے قرآن وسنت سے جو فلسفہ سمجھا ہے وہ ان کی اپنی کتابوں سے سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ کیونکہ شاہ صاحبؒ اکثر مقامات پہ معمولی اشاروں میں بات کر دیتے ہیں ویسے بھی ان کی کتابیں بہت مشکل ہیں تھوڑی استعداد والا شخص ان کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہ خدمت بھی اللہ تعالیٰ نے صاحب درس حضرت صوفی صاحب دام مجدہم سے لی۔ جو درس میں فلسفہ ولی اللہی کو آسان ترین الفاظ میں پوری تفصیل وبسط سے بیان کر دیتے ہیں۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہرحال خطباء اور علماء ہوں یا طلباء، ملازمت پیشہ ہوں یا تاجر اور کاروباری حضرات اسلام کے صحیح عقائد وتعلیمات سے آگاہ ہونے کے لیے "دروس القرآن" کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ نیز اس جلد میں اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ کہ زیرِ درس آیت کے اوپر خط کھینچ دیا گیا ہے اور بقایا آیات کو قوسین " " میں رکھا گیا ہے۔ تاکہ زیرِ درس آیت

کا دوسری آیات سے اور قرآن پاک کا احادیث سے امتیاز عام آدمی کی سمجھ میں بھی آجائے۔
آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس اور اس کی اشاعت میں حصہ لینے والے جملہ حضرات کی بخشش کا ذریعہ بنائے۔ اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فیضیاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط
محمد اشرف
(فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم)
گوجرانوالہ
۲۴ر ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ - ۴ر ستمبر ۱۹۸۲ء

سورة النبا

عَمَّ ۳۰ — النبا ۷۸

درس اول — (آیت ۱ تا ۱۷)

سُوْرَةُ النَّبَاِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۂ نبا مکی ہے اور یہ چالیس ۴۰ آیتیں ہیں اور اس میں دو ۲ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۚ ① عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۙ ② الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ
مُخْتَلِفُوْنَ ۭ ③ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۙ ④ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ⑤ اَلَمْ
نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ ⑥ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ ⑦ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ ⑧
وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ ⑨ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ ⑩ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ
مَعَاشًا ۠ ⑪ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ ⑫ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۙ ⑬
وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ ⑭ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ ⑮ وَّ
جَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۭ ⑯ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۙ ⑰

ترجمہ: یہ لوگ کس چیز کے متعلق سوال کرتے ہیں ① کیا یہ بڑی خبر کے متعلق دریافت کرتے ہیں ② وہ خبر جس کے متعلق وہ اختلاف کر رہے ہیں ③ خبردار عنقریب یہ لوگ جان لیں گے ④ پھر خبردار عنقریب یہ لوگ جان لیں گے ⑤ کیا ہم نے زمین کو گہوارے کی طرح نہیں بنایا ⑥ اور کیا پہاڑوں کو زمین پر کیل کی طرح نہیں گاڑ دیا ⑦ اور ہم نے تمہیں جوڑے جوڑے پیدا کیا ہے ⑧ اور ہم نے تمہارے لیے نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا ⑨ اور ہم نے رات کو بمنزلہ لباس کے بنایا ⑩ اور ہم نے دن کو ذریعہ معاش بنایا ⑪ اور تمہارے اوپر سات سخت (مضبوط) آسمان بنائے ⑫ اور ہم نے (ان آسمانوں میں) ایک چمکتا چراغ رکھا ہے ⑬ اور ہم نے آسمان کی طرف سے نچڑنے والے بادلوں سے زور سے بہنے والا پانی اتارا ⑭ تاکہ اس سے دانے اور سبزہ اگائیں ⑮

اور گھنے باغ پیدا کریں ⑯ بے شک انسان کے لیے فیصلہ کا ایک دن مقرر ہے ⑰

وجہ تسمیہ اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ النبا ہے۔ مفسرین کرام نے اس سورۃ کے اور بھی کئی نام لکھے ہیں۔ جن میں عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ اور سورۃ تسائل آتے ہیں۔ نبا کے معنی خبر کے ہیں۔ اور نبا العظیم سے مراد بڑی خبر یعنی قیامت ہے۔ سورۃ کا نام عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ اس سورۃ کی ابتدا میں مذکور ہے۔ اور تسائل کا لفظ بھی یَتَسَآءَلُوْنَ سے ماخوذ ہے

یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی چالیس۴۰ آیتیں اور دو۲ رکوع ہیں۔ یہ سورۃ ایک سو تینتیس۱۳۳ الفاظ اور چھ سو نوے۶۹۰ حروف پر مشتمل ہے۔

موضوع

گذشتہ سورۃ کی طرح اس سورۃ میں بھی اللہ تعالٰی نے قیامت کا ذکر ایک خاص انداز سے کیا ہے قیامت کا عقیدہ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ لہذا اللہ تعالٰی نے قیامت کو پیش آنے والے محاسبہ اور جزائے عمل کو ان سورتوں میں مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ اور اس کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔

سورۃ قیامت میں، قیامت کا ذکر نفس انسانی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا گیا تھا۔ یعنی جب قیامت برپا ہوگی، تو تمام نفوس لوامہ بن جائیں گے اور اپنے آپ کو ملامت کریں گے۔

سورۃ دہر میں قیامت کا ذکر ابرار اور اشرار کے انجام کے اعتبار سے کیا گیا ہے ۔

سورۃ مرسلت میں فرمایا "اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ" اس دن رسولوں کے لیے وقت مقرر کیا جائیگا۔ نیز یہ بھی ارشاد ہوا" لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ ○ لِیَوْمِ الْفَصْلِ ○ یہ کس دن کے لیے تاخیر ہو رہی ہے۔ فیصلے کے دن کے لیے جب رسولوں کے لیے وقت مقرر ہوگا۔ امتیں حاضر ہوں گی۔ گواہ آئیں گے، اعمال نامے پیش ہوں گے۔ نیکی اور بدی واضح ہو جائے گی۔ تو گویا اس لحاظ سے قیامت کا ذکر تھا۔

اس سورۃ میں اللہ تعالٰی نے قیامت کا ذکر ایک کسان یا کاشتکار کے نقطہ نگاہ سے کیا ہے۔ کاشتکار زمین میں ہل چلاتا ہے۔ بیج بوتا ہے۔ اور اس کے بار آور ہونے کا منتظر رہتا ہے کہ ایک دن اُس کو فصل کاٹنی ہے۔ انسان کی مثال بھی یہی ہے، اللہ تعالٰی نے اپنی قدرت تامہ کے ساتھ انسان کو زمین میں بویا ہے اور قائم کیا ہے۔ نسل انسانی میں نیک و بد ہر طرح کے لوگ

ملے جلے ہیں۔ ایک وقت آئے گا۔ کہ جب انسان کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہو گا۔ انسان کی فصل کاٹی جائے گی۔ نیک و بد کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اصل فصل گھانس پھونس یا بھوسہ کو الگ کر لیا جاتا ہے فصل بونے کا اصل مقصد تو اناج یا پھل حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ بعض غیر ضروری اشیاء بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ جنہیں الگ کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح فصل انسانی سے نیک، مومن، اور مخلص کو اصل مقصود کے پیش نظر الگ کر لیا جائے گا۔ اور منافق، کافر، اور مشرک کو الگ کر دیا جائیگا یہی فیصلے کا دن ہو گا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے۔ "هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ○ اس دن اگلے پچھلے تمام لوگوں کو جمع کر دیا جائے گا۔ اور پھر ان کی چھانٹی ہو گی۔ "اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا" فیصلے کے دن کے لیے وقت مقرر ہے۔ نیکی اور بدی کا امتیاز ایک دن ہو کر رہے گا۔ یہ قطعی امر ہے۔ اس طرح گویا کسانوں کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر قیامت پر دلیل قائم کی گئی ہے۔

قیامت ایک بڑی خبر

جب قرآن پاک نازل ہونا شروع ہوا۔ تو حضور علیہ السلام نے مشرکین مکہ کو دعوت الی التوحید والایمان دی اس دعوت ایمانی میں قیامت کا بھی ذکر تھا۔ تو کفار نے طرح طرح کی بیہودہ باتیں کرنی شروع کر دیں۔ اور وقوع قیامت کے عقیدہ پر اعتراضات کئے۔ کوئی کہتا تھا "مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ" یعنی یہ وعدہ کب پورا ہو گا۔ قیامت کب آئے گی۔ دوسرا کہتا "مَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً" میرا گمان نہیں ہے کہ قیامت آئے گی۔ کوئی کہتا "هٰذَآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ" یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔ کوئی قیامت نہیں ہے۔ اور پھر اس پر دلیل قائم کرتے۔ "ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِى الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ" یعنی جب ہم زمین میں رل مل جائیں گے۔ تو دوبارہ کیسے اٹھائے جائیں گے۔ یہ تو عقل و شعور کے خلاف ہے "هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ" یہ عقل سے بعید ہے کہ انسان مر کر دوبارہ زندہ ہو۔

ارشاد ہوتا ہے عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ یہ لوگ کس چیز کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ کیا بڑی خبر کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ نبا کے معنی خبر کے ہیں۔ نبی کا مادہ بھی نبا سے ہی ہے کہ نبی اللہ کی جانب سے خبر دیتا ہے۔ یہاں پر بڑی خبر قیامت کو کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ وَّاَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ "وہ بہت بڑی خبر ہے۔ مگر تم اس سے اعراض کرنے والے ہو۔ اس کا انکار کرتے ہو۔ بڑی خبر اس لیے کہ وہ اپنے وقوع، حالات اور نوعیت کے اعتبار سے بڑی خبر ہے۔ قیامت کا واقع ہونا ہر لحاظ سے ایک بڑی خبر ہے۔ چنانچہ اگلی سورۃ میں اسے "طَآمَّةُ الْكُبْرٰى" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

گویا کائنات میں یہ سب سے بڑا ہنگامہ ہو گا، جو اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور ہر چیز کو درہم برہم کر دے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1] شَیَّبَتْنِیْ هُوْدُ۔ وَّالْوَاقِعَةُ، وَالْمُرْسَلٰتُ، وَعَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ وَاِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ یعنی مجھے سورۃ ہود، واقعہ، نبا، اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ اور مرسلت نے بوڑھا کر دیا ہے۔ ان سورتوں میں قیامت کی ہولناکیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جو میری صحت پہ اثر انداز ہوئی ہیں۔ الغرض وقوع قیامت اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک بڑی خبر ہے۔ اسی لیے اسے نَبَاِ الْعَظِیْمِ کہا گیا ہے۔

وقوع قیامت کے متعلق اختلاف

فرمایا یہ لوگ اس بڑی خبر کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہ جس کے متعلق وہ خود اختلاف کر رہے ہیں۔ اَلَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ۔ اختلاف کی صورت یہ ہے۔ کہ کوئی تو قیامت کو مانتا ہے۔ ———— اور کوئی اُسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مؤمنین، انبیاء علیہم السلام کے ارشاد کے مطابق وقوع قیامت پہ یقین رکھتے ہیں جب کہ کفار اس سے انکاری ہیں۔ اور طرح طرح کی بیہودہ باتیں کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کسی کو مر کر جی اُٹھتے نہیں دیکھا۔ کوئی کہتا ہے کہ عذاب و ثواب کوئی چیز نہیں۔ جسم کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ کیونکہ نئی زندگی روح کے لیے ہے۔ جسم کے لیے نہیں ہے۔

ان تمام شبہات و اختلافات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا كَلَّا یعنی ہرگز نہیں یہ حرف ردع و زجر کے لیے آتا ہے۔ یعنی جو کچھ تم سمجھ رہے ہو، ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ سَيَعْلَمُوْنَ یہ لوگ عنقریب جان لیں گے۔ تاکیداً پھر فرمایا ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ خبردار عنقریب ان لوگوں کو پتہ چل جائے گا۔ کہ قیامت ایک حقیقت ہے۔ اور قطعی طور پہ آنے والی ہے اس سے انکار کرنا باطل ہے۔ اور حماقت کی نشانی ہے۔

خود تخلیق انسانی قیامت پہ دلیل ہے

پہلی سورۃ میں فرمایا تھا اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ "کیا ہم نے تمہیں حقیر قطرۂ آب سے پیدا نہیں کیا؟ اس جگہ قدرتِ خداوندی کا ذکر کر کے وقوعِ قیامت پہ دلیل قائم کی جا رہی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق اور علیمِ کل ہے وہ یقیناً قیامت برپا کر سکتا ہے۔ جس نے انسان کو حقیر

---

[1] ترمذی ص ۲/۱۶۳ مستدرک حاکم ص ۲/۳۴۳۔

قطرۂ آب سے پلٹیاں دے دے کر سمیع و بصیر پیدا کیا، وہ دوبارہ زندہ کر کے محاسبہ کیوں نہیں کر سکتا۔

زمین گہوارہ ہے

پہلی سورۃ میں فرمایا تھا کہ ہم نے زمین کو سمیٹنے والی بنایا ہے۔ زندوں کو بھی سمیٹتی ہے۔ اور مُردوں کو بھی یہی اپنے اندر پناہ دیتی ہے۔ اس جگہ فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا کیا ہم نے زمین کو گہوارے کی طرح نہیں بنایا۔ انسان زمین پر بالکل اسی طرح آرام کرتے ہیں۔ جس طرح بچہ گہوارے میں چین و سکون کے ساتھ وقت گذارتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کے لیے زمین کو مستقر بنایا ہے۔ تاکہ وہ اپنے تمام کاروبار آسانی کے ساتھ زمین پر انجام دے سکے۔ زمین میں حیاتِ انسانی کے تمام لوازمات پیدا کیے اور اس کی ضروریات کی ساری چیزیں مہیا کیں تو گویا زمین انسان کے لیے بمنزلہ گہوارہ کے ہے۔

پہاڑ کیل ہیں

فرمایا صرف زمین کو گہوارہ ہی نہیں بنایا بلکہ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا پہاڑوں کو زمین پر کیل بنا دیا ہے۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ زمین میں اضطراب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر جگہ جگہ وزنی پہاڑ رکھ دیے تاکہ زمین کا توازن درست رہے اور یہ ڈولنے نہ پائے۔ پہاڑوں کی تخلیق کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ میدانی زمین میں چونکہ تمام لوازمات زندگی مہیا نہیں ہوتے، لہذا پہاڑ پیدا کر دیے۔ ان پر درخت کثرت سے ہوتے ہیں۔ پہاڑوں سے چشمے ابلتے ہیں۔ معدنیات حاصل ہوتی ہیں۔ جڑی بوٹیاں ملتی ہیں اور پتھر وغیرہ ملتے ہیں۔ یہ سب چیزیں انسانی ضروریات کی ہیں مگر عام طور پر میدان میں نہیں ملتیں، لہذا اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا فرما دیا۔ ان سے ایک طرف ضروریاتِ زندگی میسر آئیں اور دوسری طرف انہوں نے زمین پر کیلوں کا کام دیا۔ تاکہ زمین کا توازن درست رہے۔

تخلیق ازواج

اس کے بعد فرمایا وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا اور ہم نے تمہیں جوڑے جوڑے پیدا کیا۔ جوڑے سے مراد، مرد و زن کا جوڑا بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی دو صنف پیدا کیے۔ اور اس سے مومن، کافر، نیکی، اور بدی کا جوڑا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے ارشاد ہوتا ہے "خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ"۔ یعنی حکمت خداوندی ہے کوئی ایمان لاتا ہے اور کوئی کفر کرتا ہے۔ کوئی نیکی کرتا ہے اور کوئی بدی میں مبتلا ہے۔

لیل و نہار کے فوائد

فرمایا وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ہم نے تمہارے لیے نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا۔ سبات گہرے سکون اور آرام کو کہتے ہیں۔ سکون انسان کو نیند کے ذریعے میسر آتا ہے تاکہ اس کی تھکاوٹ دور ہو جائے

---

[1] ترمذی ص ۴۸۶

انسان فطری طور پر کمزور ہے۔ جیسا فرمایا خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا یعنی انسان مسلسل لامحدود وقت تک کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ وقفہ وقفہ سے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے نیند کو پیدا کیا تاکہ جب انسان کام کاج کر کے تھک جائے۔ تو کچھ دیر کے لیے سو جائے، آرام کرے۔ اور پھر تازہ دم ہو کر دوبارہ کام میں لگ جائے۔

فرمایا وَجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا اور ہم نے رات کو انسان کے لیے بمنزلہ لباس کے بنایا جس طرح لباس انسان کو گرمی سردی وغیرہ سے بچاتا ہے۔ اسی طرح جب رات چھا جاتی ہے۔ تو سب چیزوں کو اپنے اندر ڈھانپ لیتی ہے۔ اور ہر چیز پر سکون ہو جاتی ہے۔ پرندے، درندے اور خاص طور پر انسان رات کو آرام کرتے ہیں لہٰذا رات بطور لباس پیدا کی گئی ہے۔

اطباء کہتے ہیں کہ نیند ستہ ضروریہ[1] میں سے ہے۔ اگر انسان کو نیند میسر نہ آئے تو طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے۔ انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ جنون طاری ہو جاتا ہے۔ لہٰذا نیند نہایت ضروری ہے۔ اور یہ عام طور پر رات کو ہی میسّر آتی ہے۔ لہٰذا انسانی زندگی کے لیے دن کی طرح رات بھی ضروری ہے۔

فرمایا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا اور دن کو ذریعہ معاش بنایا۔ جس طرح آرام کے لیے رات ضروری ہے۔ اسی طرح کاروبار یا روزگار کے لیے دن کا ہونا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دن کو پیدا فرمایا تاکہ لوگ کام کاج کر کے اپنے معاش کا بندوبست کر سکیں۔

عاصم ابن ابی النجود[2] فرماتے ہیں کہ مومن کے لیے دو قسم کی فکریں بڑی ضروری ہیں ہَمَّانِ لَا بُدَّ لِلْمُؤْمِنِ مِنْهُمَا، هَمُّ الْمَعَاشِ وَهَمُّ الْمَعَادِ یعنی مومن قیامت کی فکر اور معاش کی فکر سے کبھی سبکدوش نہیں ہوتا۔ اسے ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی ہے کہ قیامت کے لیے کیا تیاری کی ہے۔ اپنے اور اہل و عیال کی پیٹ پروری کے لیے کیا کرنا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ کہ جس طرح ہم نے رات کو لباس بنایا اسی طرح دن کو ذریعہ معاش بنایا۔

---

[1] ستہ ضروریہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کے بدن کے حالات کو بدلنے والی اور حفاظت کرنے والی ہیں اور وہ یہ ہیں۔ (۱) ہوا (۲) کھانے پینے کی چیزیں (۳) نیند اور بیداری (۴) حرکت و سکون (۵) احتباس اور استفراغ (۶) احداث نفسانیہ یعنی وہ امور جو نفس کو لاحق ہو کر اس میں تغیرات کا باعث بنتے ہیں۔

[2] حلیۃ الاولیاء ص ۶۰ ج ۱۰

کائنات کے مختلف عالم

اور دیکھو! ہم نے وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا تمہارے اوپر سات سخت آسمان بنائے۔ کہیں آتا ہے "سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا" یعنی اوپر نیچے طبقات بنائے۔ یہاں پر آسمانوں کو شداد کہا گیا ہے۔ حالانکہ آسمان تو شفاف نظر آتے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1] کہ آسمانی کرّوں کے عناصر (ELEMENTS) بھی زمین کی طرح ہی ہیں مگر وہ لطیف ہیں۔ زمین میں کثافت اور ظلمت پائی جاتی ہے۔ مگر آسمان لطیف ہیں۔ اور یہ مسلمہ اصول ہے۔ کہ کسی چیز میں جس قدر مادیت اور ظلمت ہو گی وہ کمزور ہو گی۔ اور دوسری چیز جس قدر لطیف ہو گی، اسی قدر طاقتور ہو گی۔ دنیا مادی جہاں ہے یعنی (PHYSICAL WORLD) ہے یہ اینٹ اور پتھر والا جہاں کمزور ہے اس سے زیادہ لطیف جہان عالم مثال ہے۔ زمین میں جو چیز بھی نظر آتی ہے۔ پہلے عالم مثال میں آکر قائم ہوتی ہے۔ پھر یہاں آتی ہے۔ عالم مثال، اس مادی اور ناسوتی جہاں سے بہت قوی ہے۔ اس سے زیادہ طاقتور جہان عالم ملکوت ہے۔ جو ملائکہ اور ارواح کا جہاں ہے۔ اس سے زیادہ طاقتور عالم جبروت ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات سے ہے۔ اور آخر میں عالم لاہوت ہے۔ اس عالم تک کسی کی رسائی ممکن نہیں۔

مادہ اور توانائی

الغرض حکمائے الٰہی اس طریق پر سوچتے ہیں۔ وہ بلندی سے نیچے کی طرف آتے ہیں۔ سب سے بلند تر ایک ذات ہے۔ جو وجود کی مالک ہے۔ وجود سب چیزوں پر حاوی ہے۔ اس کے بعد اس کے اسماء اور صفات کا درجہ ہے۔ ان میں بڑی قوت ہے۔ پھر ملکوت کا درجہ ہے۔ اس میں بھی بڑی طاقت ہے۔ پھر عالم مثال کا جہان ہے۔ یہ بھی بڑا طاقتور ہے۔ اس کے بعد یہ مادیت کا جہان ہے۔ یہاں پر وہ اور سائنسدان یعنی مادی حکماء آکر مل جاتے ہیں۔ سائنس دان مادیت سے شروع کرتے ہیں۔ مادیت کو تلاش کرتے ہیں، عناصر وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر مختلف قسم کے انکشافات کرتے ہیں ———— انہیں آہستہ آہستہ معلوم ہوتا ہے کہ مادے سے طاقتور کوئی چیز بھی موجود ہے۔ اس طرح سائنس دان مختلف تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مادہ کوئی چیز نہیں، اصل چیز توانائی ہے۔ یہ اٹیم بم توانائی پر ہی مبنی ہے۔ یہ کوئی بہت بڑا بم نہیں۔

---

[1] تفہیمات الٰہیہ ص ۲۱۶ تا ص ۲۱۹

اس کے پھٹنے سے اس قدر توانائی خارج ہوتی ہے۔ کہ دس بارہ میل تک کے علاقہ میں اس کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ سب کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ یہ صرف مادی توانائی کا ذکر ہے سائنسدان تو عالمِ مثال تک بھی نہیں پہنچ سکے۔ حالانکہ حکمائے رَبّٰنِیّٖن اوپر کے تمام جہانوں کے بارے میں مطالعہ رکھتے ہیں۔

بہرحال آسمانوں کو شِدَادًا اس لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت طاقتور ہیں۔ زمین کی نسبت وہ لطیف ہیں۔ اور زیادہ طاقتور ہیں۔ جتنا کوئی جہان لطیف ہوگا، اتنا ہی طاقتور ہوگا۔ جبرائیل امین علیہ السلام ایک لطیف مخلوق ہے۔ اس کی توانائی کا اندازہ مادی مخلوق نہیں کر سکتی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اتنی قوت رکھی ہے۔ کہ چاہے تو ایک پر کے ساتھ ساری دنیا کو ملیا میٹ کر دے۔ یہ لطیف چیز ہے۔ اس طرح آسمان بھی لطیف ہیں۔ اس لیے انہیں شِدَاد یعنی طاقتور کہا گیا ہے
وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا اور ہم نے ایک چمکتا ہوا چراغ رکھا ہے۔ اس سے مراد سورج ہے۔ جو ان آسمانوں میں رکھا ہوا ہے۔ نہ اس میں پٹرول ڈالا جاتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی اور ایندھن۔ مگر جب تک اس کو قائم رکھنا منظورِ خداوندی ہے، یہ اسی طرح چمکتا دمکتا رہے گا۔ اور حرارت اور توانائی بہم پہنچاتا رہے گا۔ جب اللہ تعالیٰ اس نظام کو تبدیل فرمائیں گے۔ تو یہ سب چیزیں ختم ہو جائیں گی۔ اس قسم کے اشارات اگلی سورتوں میں بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۔ جب سورج کی روشنی لپیٹ دی جائیگی اور یہ سارا نظام درہم برہم کر دیا جائے گا۔

پانی ایک عظیم نعمت ہے

فرمایا وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا اور ہم نے آسمان کی طرف سے (نچڑنے والے بادلوں سے) زور سے بہنے والا پانی اتارا، جو ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتا ہے۔ بادل پانی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو نچڑتے ہیں۔ اور جتنا پانی بہانا مقصود ہوتا ہے بہ جاتا ہے۔ اور پانی بہانے سے مقصود یہ ہے لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا۔ تاکہ اس سے دانے اور سبزہ اگائیں۔ وَجَنّٰتٍ اَلْفَافًا اور گھنے باغ پیدا کریں۔ جو کہ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لیے ہیں۔

فیصلے کا دن

اے انسان! اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین میں اسی طرح قائم کیا ہے جس طرح کسان زمین میں دانہ بوتا ہے اور پھر فصل پکنے کا انتظار کرتا ہے۔ تاکہ ایک دن فصل کی کٹائی کرے۔ جس طرح

فصل کی کٹائی کا وقت مقرر ہے۔ اُسی طرح اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا انسان کے لیے فیصلہ کا ایک دن مقرر ہے۔ نیکی اور بدی، مومن اور کافر جدا جدا ہو جائیں گے حالانکہ آج ملے جُلے ہیں اس دن ہر چیز اپنے مرکز تک پہنچے گی۔ یہ فیصلے کا دن ہو گا۔ اس کے بعد اس دِن کی کیفیات بیان کی گئی ہیں۔ جو اگلے درس میں آئیں گی۔

النبا ۷۸ عمّ ۳۰

درس دوم (آیت ۱۸ تا ۳۰)

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾
وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾
لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا
بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾ اِنَّهُمْ
كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ
اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾ ع ۱

ترجمہ:- جس دن صور میں پھونکا جائے گا تو تم چلے آؤ گے فوج در فوج ﴿۱۸﴾ اور آسمان کھول دیے جائیں گے پس وہ دروازے دروازے نظر آئیں گے ﴿۱۹﴾ اور پہاڑوں کو چلایا جائے گا تو وہ چمکتی ہوئی ریت کی طرح ہو جائیں گے ﴿۲۰﴾ بیشک دوزخ تاک میں ہے ﴿۲۱﴾ (وہ دوزخ) سرکش لوگوں کا ٹھکانا ہے ﴿۲۲﴾ ٹھہریں گے اس دوزخ میں قرنہا قرن ﴿۲۳﴾ اُن کو جہنم میں نہ تو ٹھنڈک نصیب ہوگی اور نہ ہی (پینے کے لیے) کوئی مشروب (مہیا کیا جائے گا) ﴿۲۴﴾ سوائے اس کے کہ ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا اور (زخموں سے بہنے والی) پیپ ہوگی ﴿۲۵﴾ (یہ سزائیں ان کے اعمال باطلہ کا) پورا پورا بدلہ ہوگا ﴿۲۶﴾ بے شک وہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے حساب کی توقع ہی نہیں رکھتے تھے ﴿۲۷﴾ اور یہ لوگ ہماری آیتوں کو بہت زیادہ جھٹلاتے تھے ﴿۲۸﴾ اور ہم نے ہر چیز کو کتاب میں شمار کر رکھا ہے ﴿۲۹﴾ اب (اس عذاب کا مزہ) چکھو۔ پس ہم نہیں زیادہ کریں گے تمہارے لیے مگر عذاب ﴿۳۰﴾

گذشتہ سے پیوستہ سابقہ درس میں انسان کی پیدائش اور اس کی ضروریات کا ذکر تھا اور پھر یہ کہ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا فیصلے کا ایک دن مقرر ہے۔ ہر نیک و بد کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا ملے گی اس درس میں اس دن کی بعض تفصیلات ہیں۔

نفخ صور فرمایا فیصلے کا مقررہ دن وہ ہوگا جس دن يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ صور میں پھونکا جائے گا۔ حدیث

شریف[۱] میں صُور کی تشریح موجود ہے۔ صحابہ کرامؓ نے حضور علیہ السّلام سے دریافت کیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ صور کو ایک سینگ کی مانند سمجھو۔ جس کا ایک کنارہ باریک اور دوسرا پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اسرافیل علیہ السلام فرشتہ صُور کے باریک کنارے میں پھونک مارے گا۔ جو کھُلے دہانے سے پھیلے گی۔ قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ صُور دو دفعہ پھونکا جائے گا۔ پہلی پھونک پر تمام جانداروں پر موت طاری ہو جائے گی۔ یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ فنا کا صور ہو گا۔ جب دوسری دفعہ صُور پھونکا جائے گا۔ تو تمام مردُے زندہ ہو جائیں گے۔ اور پھر ان کا محاسبہ ہو گا۔ اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

حدیث شریف[۲] میں آتا ہے کہ حضور علیہ السّلام نے فرمایا کہ پہلے اور دوسرے صُور کے درمیان چالیس[۴] کی مسافت ہے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ چالیس[۴] سال؟ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا میں نہیں کہہ سکتا۔ صحابہؓ نے پھر پوچھا کہ! چالیس دن؟ انہوں نے کہا میں نہیں کہہ سکتا۔ بہر حال دو صور کے درمیان چالیس[۴] دن یا چالیس سال کی مسافت ہوگی۔ پہلی بار صور پر تمام نظام ملیا میٹ ہو جائے گا۔ اور دوسری بار صُور پر پھر زندہ ہو جائینگے۔

ایک دوسری حدیث[۳] میں حضور علیہ السّلام کے یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "کَیْفَ اَنْعَمُ وَقَدِ الْتَقَمَ صَاحِبُ الْقَرْنِ الْقَرْنَ وَحَنٰی جَبْهَتَهٗ وَاَصْغٰی سَمْعَهٗ یَنْتَظِرُ اَنْ یُّؤْمَرَ اَنْ یَّنْفُخَ فَیَنْفُخَ" میں کس طرح خوش رہ سکتا ہوں جب کہ صور پھونکنے والے فرشتے نے صور منہ میں پکڑا ہوا ہے پیشانی جھکائی ہوئی ہے۔ اور کان لگائے ہوئے منتظر ہے کہ کب حکم ہو اور وہ پھونک مارے۔

امام ابن عربیؒ صاحب کشف بزرگوں میں سے گذرے ہیں ان کا بیان[۴] ہے۔ کہ وہ صُور اتنا بڑا ہے۔ کہ ساتوں زمین اور ساتوں آسمان صُور کے دہانے میں پڑے ہوئے ہیں جب اس میں پھونک ماری جائے گی۔ تو ارض و سما کی تمام چیزیں درہم برہم ہو جائیں گی۔ یہ امام صاحبؒ کی کشفی بات ہے۔ کسی روایت سے ثابت نہیں۔

تو فرمایا جس دن صُور پھونکا جائے گا فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا تو تم چلے آؤ گے فوج در فوج، غول کے غول یا جھُنڈ کے جھنڈ۔ دوسری آیت میں وضاحت ہے۔ کہ جس طرف سے آواز آرہی ہوگی۔ لوگ اُس طرف ایسے دوڑیں گے، جیسے تیر نشانے کی طرف جاتا ہے۔ فوج در فوج

---

۱ ترمذی ص ۴۶۷   ۲ مسلم ص ۴۰۶ ج ۲ و بخاری ص ۷۳۵ ج ۲   ۳ ترمذی ص ۴۶۶

۴ عرف شذی ص ۴۶۹ طبع مکتبہ رحیمیہ دیوبند

صُور پھونکنے پہ مختلف ارواح اپنے اپنے اجسام کے ساتھ بالکل اسی طرح منسلک ہو جائیں گی جس طرح وہ دنیا میں ہوا کرتے تھے جو بھی نیکی یا بدی انہوں نے دنیا کی زندگی میں کی تھی، وہ ان کے ساتھ ہوگی دوسری جگہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ کہ جب انسان دوبارہ زندہ کئے جائیں گے "هُمْ يُوزَعُونَ" انہیں الگ الگ کر دیا جائے گا۔ یعنی کافر الگ ہوں گے، مومن الگ ہونگے، اطاعت والے علیحدہ ہونگے اور معصیت میں ملوث علیحدہ۔ زانی، قاتل، چور وغیرہ ہر قسم کے لوگ اپنے اپنے گروہ میں شامل ہوں گے۔ اس طرح خوش عقیدہ گروہ الگ ہوگا اور بداعتقاد لوگ اپنے ٹولہ میں ہوں گے۔ صابر و شاکر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اٹھیں گے اور ناشکرگذار اپنے جیسوں کے ہمراہ ہوں گے۔ اس طرح گویا تمام اقسام کے لوگ گروہ در گروہ آگے جائیں گے۔ بعض ضعیف روایاتؔ میں آتا ہے۔ کہ اس وقت بعض لوگوں کی شکلیں بندروں کی ہوں گی اور بعض کی خنزیروں جیسی۔ بعض کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوں گے اور بعض کی زبانیں لٹک رہی ہوں گی۔ گویا مختلف جرائم میں ملوث لوگ اپنی بدعقیدگی، بداعمالی اور بداخلاقی کی بنیاد پہ اپنے اپنے گروہ میں اکٹھے ہوں گے۔

آسمان کا پردہ اٹھ جائے گا

فرمایا، اُس دن حالت یہ ہوگی وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ آسمانوں کو کھول دیا جائے گا فَكَانَتْ أَبْوَابًا پس وہ دروازے نظر آئیں گے جس طرح دیوار پھٹ جاتی ہے اور دریچے نظر آتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ساتوں آسمانوں سے اوپر جنت اور عرش الٰہی نظر آنے لگیں گے۔ یعنی آج جو چیزیں آسمان سے پار نظر نہیں آتیں، اُس دن سب دکھائی دیں گی۔

پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے

فرمایا وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا۔ پہاڑوں کو چلایا جائے گا اور وہ چمکتے ہوئے ریت کی طرح ہو جائیں گے۔ بالکل سراب کی طرح جو دور سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت کچھ نہیں ہوگی۔ پانی تو ہوتا نہیں۔ محض سراب ہوتا ہے۔

الغرض مضبوطی سے جمے ہوئے یہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ جیسے دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ "يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا" اور ایک جگہ فرمایا ان پہاڑوں کی حالت "كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ" رنگین دھنی ہوئی اون کی مانند ہوگی۔ پہاڑوں کے ذرات بکھر جائیں گے۔ بعض پہاڑ سرخ ہیں، بعض سیاہ ہیں۔ تو جب یہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھریں گے تو رنگین دھنی ہوئی اون کی مانند نظر آئیں گے۔ اس طرح گویا یہ بے حقیقت سی چیز بن کر رہ جائیں گے۔ ایک اور جگہ انہیں "وَاهِيَةٌ" یعنی کمزور کہا گیا ہے۔ اس

ؔ تفسیر درمنثور ص ۳۰۷، تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۲ پ ۳۰، روح المعانی ص ۱۲ پ ۳۰

وقت خوف و دہشت طاری ہوگی۔" وَالْمَلَكُ عَلَىٰٓ اَرْجَآئِهَا "فرشتے کناروں پر ہوں گے۔ حاملین عرش کی تعداد دگنی ہو جائے گی جیسا کہ فرمایا "وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ" اس دن عرش الٰہی کو تھامنے والے فرشتوں کی تعداد چار سے بڑھ کر آٹھ ہو جائے گی۔ عرش الٰہی پر قہری تجلی نازل ہوگی۔ جس سے ثقل بڑھ جائے گا۔ ہر چیز پر خوف طاری ہوگا۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ پہاڑ جو آج اس قدر مضبوط نظر آتے ہیں۔ اس دن سراب نظر آئیں گے۔

دوزخ تاک میں ہے۔

اس کے بعد فرمایا اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا "بے شک دوزخ تاک میں ہے۔ یعنی گنہگاروں، نافرمانوں اور خدا کی توحید اور قیامت کے منکرین کے انتظار میں ہے۔ کہ وہ کب اس کا شکار بنتے ہیں لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا" وہی سرکش لوگ جنہوں نے اطاعت کی بجائے معصیت کا راستہ اختیار کیا۔ ظلم اور زیادتی کرتے رہے۔ ان کا ٹھکانا یقیناً جہنم ہے۔ جہنم اور اس کے فرشتے ایسے لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔

فرمایا اس قسم کے بدکردار لوگ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ٹھہریں گے اس دوزخ میں اَحْقَابًا قرن ہا قرن تک۔ احقاب، حقب کی جمع ہے۔ بعض مفسرین کرام[1] فرماتے ہیں کہ ایک حقب اسی[1] سال کے برابر ہے۔ حضرت علیؓ سے حقب کے متعلق دریافت کیا گیا۔ تو انہوں نے فرمایا[2] کہ حقب اسی سال کا ہوتا ہے۔ ایک سال بارہ مہینہ کا اور ایک مہینہ تیس دن کا۔ اور ایک دن موجودہ دنیا کے حساب سے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے قیامت کا ایک حقب اس دنیا کے دو کروڑ چھیاسی لاکھ سال کے برابر ہوگا۔ اور منکرین کو قرنہا قرن تک وہاں رہنا ہوگا۔ بعض مفسرین[3] فرماتے ہیں کہ احقاب سے مراد دائمی رہنا ہے۔ یعنی کفار و مشرکین ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔

عرب اپنے محاورے میں حقب کا لفظ غیر محدود زمانے کے لیے بولتے ہیں۔ "کتاب الحماسۃ" میں کچھ اشعار ہیں جن میں صاحب خانہ اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

٥ يَا رَبَّةَ الْبَيْتِ قُوْمِيْ غَيْرَ صَاغِرَةٍ

اے گھر کی مالکہ اٹھ کھڑی ہو اس حال میں کہ تو عزت والی ہے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۴۶۳ ج ۴، مستدرک حاکم ص ۵۱۲ ج ۲ [2] درمنثور ص ۳۰۷ ج ۶، ابن کثیر ص ۴۶۳ ج ۴ [3] تفسیر ابن کثیر ص ۴۶۴ ج ۴، تفسیر مظہری ص ۱۷۵ ا ۱۷۶ ج ۱۰

ضُمِّیْ اِلَیْکِ رِحَالَ الْقَوْمِ وَالْقُرُبَا

ان مہمانوں کے کجاوے اور ہتھیار اپنے پاس رکھ لے

وَ قُلْتُ لَمَّا غَدَوْا اُوْصِیْ قَعِیْدَتَنَا

"اور میں نے کہا جب انہوں نے صبح کی (جانے کا وقت ہوا) اس حال میں کہ میں اپنے گھر والی کو نصیحت کر رہا تھا" پھر جب صبح کو ان کے رخصت کا وقت آتا ہے تو کہتا ہے

غَدِّیْ بَنِیْکِ فَلَمْ تَلْقِیْھِمْ حُقُبًا

ان مہمانوں کو کھانا کھلا جو بمنزلہ تیرے بیٹوں کے ہیں۔ پس تو ان سے نہیں ملے گی مدت دراز تک یعنی یہ ان اونٹوں پر سفر کرنے والے مسافر ہیں۔ کوئی جان پہچان والے تو ہیں نہیں فَلَوْ تَلْقِیْھِمْ حُقُبًا اب ان سے تیری ملاقات احقاب کے بعد یعنی غیر محدود زمانے کے بعد ہی ہو سکتی۔ تو گویا حُقُب کا لفظ غیر محدود زمانے پر بولا جاتا ہے۔ لہٰذا مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ جو لوگ اس دنیا سے ایمان کی دولت سے خالی گئے ہیں۔ وہ ابدی طور پر جہنم میں رہیں گے۔ ان کی رہائی کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

مومنین کا تزکیہ

البتہ ایسے ایماندار جو دنیوی زندگی میں معصیت میں مبتلا ہوئے اور بغیر توبہ کے رخصت ہو گئے۔ ان کو بھی سزا تو ملے گی مگر وہ تزکیہ کے لیے ہوگی۔ ایسے لوگوں کو ان کے گناہوں سے پاک کرنے کے لیے مختلف مدت کی سزائیں دی جائیں گی۔ کوئی ایک گھڑی بھر دوزخ میں رہے گا۔ کوئی ایک دن اور کوئی ہزاروں سال۔ جس نوع کے جرائم انہوں نے کیے ہوں گے۔ ان کے مطابق انہیں سزا ملے گی۔ مگر آخر کار انہیں دوزخ سے رہائی حاصل ہو جائے گی۔ وہ لوگ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہیں رہیں گے امام ترمذیؒ فرماتے ہیں[1] کہ اس بارے میں تمام صحابہؓ، محدثین کرام اور علماء کا اتفاق ہے۔ کہ اہل توحید ابدی طور پر جہنم میں نہیں رہیں گے بلکہ حسب حال سزا کاٹ کر جہنم سے آزاد ہو جائیں گے۔ اس کی پوری تفصیل احادیث میں موجود ہے۔

دوزخیوں کی سزائیں

دائمی طور پر جہنم رسید ہونے والے بے ایمانوں کے متعلق فرمایا لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْھَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا

---

[1] ترمذی ص۳۷۵

ایسے لوگوں کو جہنم میں نہ تو ٹھنڈک نصیب ہوگی اور نہ ہی انہیں پینے کے لیے کوئی مشروب مہیا کیا جائے گا۔ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا سوائے اس کے کہ ان کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔ اور زخموں سے بہنے والی پیپ ہوگی حمیم اس کھولتے ہوئے پانی کو کہتے ہیں جب وہ بھاپ بننے کے قریب ہو جائے، یعنی جس کے بعد حرارت کا مزید درجہ نہ ہو۔ دوزخی اس قسم کے پانی کو پینے کی کوشش کریں گے تو اس کا ایک گھونٹ آنتوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ پھر اپنی جگہ قائم ہوں گی دوبارہ پیئں گے تو پھر وہی حشر ہوگا۔ جیسا کہ انسانی جلد کے متعلق آتا ہے۔ کہ دوزخ کی آگ جلد کو جلا کر رکھ دیگی مگر وہ بالکل کوئلہ ہو کر تو نہیں رہ جائیگی، بلکہ جلی ہوئی کھال کی جگہ نئی جلد لے لے گی۔ اور پھر وہ بھی جل جائے گی۔ یہ عمل مسلسل جاری رہے گا۔

انہیں پینے کے لیے جو پیپ دی جائے گی۔ وہ سخت بدبودار ہوگی۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ دوزخ کی اس پیپ کا ایک ڈول بھر کر دنیا میں پھینک دیا جائے۔ تو اس کی بدبو سے کوئی چیز کھانے پینے کے قابل نہ رہے۔ زمین کی نشوونما کی طاقت ہی ختم ہو جائے۔ اور بدبو ناقابل برداشت ہو جائے۔

دوزخ کی ان سزاؤں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا جَزَآءً وِّفَاقًا یہ سزائیں ظلم و زیادتی کی بات نہیں ہوگی۔ بلکہ کفار و مشرکین اور بدکردار لوگوں کے لیے ان کے اعمال باطلہ کا پورا پورا بدلہ ہوگا۔

سزا کی وجوہات

فرمایا یہ سخت سزائیں اس لیے دی جائیں گی کہ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا دنیا میں رہتے ہوئے وہ آخرت کے حساب کتاب کی توقع ہی نہیں رکھتے تھے۔ رجا کا معنیٰ توقع بھی ہے اور ڈر بھی۔ یہاں مراد دونوں معنی لیے جا سکتے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کو نہ تو محاسبے کی توقع تھی نہ ہی یہ اس سے خوف کھاتے تھے۔ وہ تو وقوع قیامت کے ہی منکر تھے۔ حساب کتاب تو بعد کی بات ہے۔ وہ تو قیامت کے متعلق ہی بیہودہ قسم کے سوالات کرتے تھے۔ اور آپس میں اختلافات رکھتے تھے۔ سزا کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا کہ یہ لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے۔ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی۔ قیامت اور محاسبے کی تکذیب کی۔ کہتے تھے۔ تم

---

[1] مسند احمد صفحہ ۲۸ / ۳

جھوٹ کہتے ہو۔ اللہ نے کوئی شریعت نازل نہیں کی۔ کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ لہذا اس تکذیب کی وجہ سے انہیں دوزخ کی سزائیں دی جائیں گی۔

ہر چیز کا ریکارڈ موجود ہے

فرمایا کفار ہر چیز کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ہم نے ہر چیز کو کتاب میں شمار کر رکھا ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اور لوحِ محفوظ، فرشتوں کے رجسٹروں اور انسانوں کے اعمال ناموں میں محفوظ ہے۔ دوسری جگہ موجود ہے کہ جس دن انسان اپنے سامنے اس رجسٹر کو کھلا پائے گا جس میں اس کا اعمالنامہ درج ہے۔ تو تعجب سے کہے گا "مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا" یہ عجیب نوشتہ ہے۔ جس میں ہر چھوٹی بڑی چیز درج ہے۔ انسان یہ دیکھ کر دنگ رہ جائے گا کہ اس نے اپنی زندگی میں جو بھی نیکی یا بدی کی تھی۔ سب وہاں موجود ہے۔

دائمی اور عارضی عذاب

ایسے لوگوں کے لیے حکم ہوگا۔ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا۔ اب اس عذاب کا مزہ چکھو۔ ہم نہیں زیادہ کریں گے تمہارے لیے مگر عذاب۔ یہ تمہاری ہی کمائی کا نتیجہ ہے۔ "ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ" یہ تمہارے ہاتھوں کا آگے بھیجا ہوا توشہ ہے۔ "وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ" اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے۔ بلکہ "ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ" لہذا اس عذاب کا مزہ دائمی طور پر چکھو۔ تو دنیا میں بڑا غالب اور عزت دار تھا ظاہر ہے۔ کہ یہ حکم کفار و مشرکین کے لیے ہوگا، جو ایمان کی دولت سے محروم رہے۔ کبائر کے مرتکب ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا۔ وگرنہ اہل ایمان جو معصیت میں مبتلا ہوئے اور بغیر توبہ مر گئے۔ وہ اپنے گناہ کی سزا بھگتنے کے بعد دوزخ سے نکل جائیں گے۔ اور ایمان کی بدولت اللہ کی رحمت میں داخل ہو جائیں گے۔

درس سوم

(آیت ۳۱ تا ۴۰)

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾
وَّكَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ
عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾ رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ
لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ
لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمُ
الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ ۖ
يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾ ع ۲

ترجمہ:۔ بے شک متقی لوگوں کے لیے کامیابی ہے ﴿۳۱﴾ (ان کے لیے) باغ اور انگوروں کے گچھے ہونگے ﴿۳۲﴾ اور نوجوان ہم عمر عورتیں ہوں گی ﴿۳۳﴾ اور (جنتیوں کے لیے) پیالے لبریز ہوں گے ﴿۳۴﴾ جنت میں کوئی لغو یا جھوٹی بات نہیں سنیں گے ﴿۳۵﴾ یہ بدلہ ہوگا تیرے رب کی طرف سے حساب سے دیا ہوا ﴿۳۶﴾ جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور ہر اس چیز کا رب ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے نہایت رحم والا (اس کی مخلوق میں سے) کوئی اس کے سامنے بات کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ﴿۳۷﴾ جس دن روح اور فرشتے قطار در قطار کھڑے ہوں گے وہاں کوئی بھی بات نہیں کر سکے گا سوائے اس کے جسے رحمٰن اجازت دے گا اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے گا ﴿۳۸﴾ یہ دن برحق ہے پس جو چاہے اپنے رب کی طرف ٹھکانا پکڑے ﴿۳۹﴾ بے شک ہم نے تمہیں قریب آنے والے عذاب سے ڈرا دیا ہے جس دن دیکھے گا آدمی جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور کافر یوں کہے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا ﴿۴۰﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے۔ اور یہ کہ "اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا" فیصلے کا ایک دن مقرر ہے۔ وہ لازماً آنے والا ہے۔ اُس دن ہر شخص کو اپنے اعمال کے اعتبار سے جدا کیا جائے گا۔ نیک و بد اپنے اپنے گروہوں میں علیحدہ علیحدہ ہوں گے، نیکوکار، اللہ کی توحید کو ماننے والے الگ ہوں گے۔ مکذبین اور قیامت پر یقین نہ رکھنے والے الگ ہوں گے۔ مکذبین

کا جو حشر قیامت کو ہونے والا ہے۔ اُس کا بیان بھی گذشتہ درس میں ہو چکا ہے۔ اب اس درس میں متقین کے حالات بیان ہوں گے۔ الغرض اس سورۃ میں قیامت کا حال کاشتکار کی ذہنیت کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔ جس طرح کسان زمین کاشت کرنے کے بعد فصل کی کٹائی کا منتظر رہتا ہے اس طرح اللہ نے انسان کو زمین میں قائم کیا۔ اب قیامت کے مقررہ دن کو اس کا محاسبہ ہو گا۔

متقین کیلیے انعامات

قرآن پاک کا ایک عام اسلوب بیان ہے۔ کہ جہاں گنہگاروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ نیکوکاروں کا بھی بیان ہے۔ جہاں جہنمیوں کی سزا کو بیان کیا، وہاں جنتیوں کے انعامات کا بھی ذکر کیا۔ گذشتہ سورۃ میں مکذبین کے متعلق فرمایا، "وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ" وہاں متقین کے متعلق فرمایا اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ ظِلٰلٍ یعنی متقین نعمت کے باغوں، چشموں اور سایوں میں ہوں گے۔

اس سورۃ میں بھی مکذبین کا حال بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا بے شک متقی لوگوں کے لیے کامیابی ہے۔ مفاز فوز سے ہے، جس کا معنیٰ مراد کو پہنچنا یعنی کامیابی حاصل کرنا ہے۔ اب کامیابی کیا ہے۔ ہماری دنیوی زندگی کے لحاظ سے لوازمات زندگی کے حصول کا نام کامیابی ہے۔ انسان کے ذہن میں کامیابی کا نقشہ اس قسم کا آسکتا ہے۔ کہ جسمانی طور پہ تندرستی ہو۔ روحانی طور پہ راحت آرام وسکون ہو۔ اہل وعیال، مال و دولت، خوراک، لباس غرض کہ ضروریات کی تمام اشیاء میسر ہوں، یہی کامیابی ہے۔ کسی قسم کا رنج وغم نہ ہوں، نہ کوئی جسمانی تکلیف ہو، اور نہ روحانی کلفت ہو۔

اللہ تعالےٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرما کر جنت میں داخل کیا تو فرمایا "اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى" تمہیں نہ یہاں بھوک کا خطرہ ہو گا نہ پیاس کا۔ لباس نصیب ہو گا، برہنگی یا دھوپ اور گرمی کا احساس نہ ہو گا۔ بہترین محل بھی نصیب ہو گا۔ یہی کامیابی ہے۔ بہشت میں پہنچنے والے ہر انسان کی کامیابی کا جو تصور قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ وہ اس قسم کا ہے جس طرح اس دنیا میں کوئی بادشاہ ہوتا ہے۔ حکومت، مال و دولت، محلات نوکر چاکر یہ تمام چیزیں ایک بادشاہ کو حاصل ہوتی ہیں۔ وہ ایک خود مختار حکمران ہوتا ہے۔ جو نظام حکومت چلاتا ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام نے ایک عام جنتی کے متعلق فرمایا کہ اس کے ایک ہزار خادم ہوں گے، جو اُس کے

ہر حکم کی تعمیل کے لیے کمربستہ ہوں گے۔ بعض روایات[1] میں اسی ہزار خدام کا ذکر بھی آتا ہے۔ عالیشان محل میسّر ہوگا۔ باغات ہوں گے اور پھر پہننے کے لیے "وَلِبَاسُھُمْ فِیْھَا حَرِیْرٌ" ریشم کا لباس میسّر ہو گا۔ باریک، موٹا، سفید، رنگین، جس قسم کا کپڑا چاہے گا، اُسے حاصل ہو گا۔

زیب و زینت کی اشیاء میں سے سونے کے کنگنوں کا ذکر آتا ہے کہ جنتیوں کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ دوسری جگہ "لُؤْلُؤًا" کا ذکر ہے۔ کہ گلے میں پہننے کے لیے بیش قیمت موتیوں کے ہار ہوں گے۔ سورۂ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے ایمان والوں کے لیے دنیا میں بھی زینت کا سامان مباح فرمایا ہے۔ مگر قیامت کو تو "خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ" خالص انہیں کو نصیب ہوگا۔ برخلاف اس کے کفار زینت کے لوازمات سے محروم ہوں گے۔ ان کے لیے دکھوں اور تکالیف کے انبار ہوں گے اور دردناک عذاب ہوگا۔

تقویٰ کا مفہوم

متقی سے مراد وہ شخص ہے۔ جو کفر و شرک سے اجتناب کرتا ہے۔ معاصی سے بچتا ہے۔ اور دنیوی زندگی نہایت احتیاط کے ساتھ بسر کرتا ہے۔ لفظ تقویٰ کے متعلق حضرت عمرؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ کا مکالمہ موجود ہے[2]۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ تقویٰ کس کو کہتے ہیں تو حضرت ابی بن کعبؓ نے جواب میں کہا "اَمَا سَلَکْتَ طَرِیْقًا ذَا شَوْکٍ" کیا آپ کو کبھی ایسے راستے پر چلنے کا اتفاق نہیں ہوا جو خاردار ہو؟ جس پر کانٹے بچھے ہوئے ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا، ہاں! ایسا ہوا ہے میں ایسے راستوں سے گذرا ہوں حضرت ابیؓ نے پھر پوچھا تو ایسے رستے پر آپ نے کیا کیا۔ انہوں نے کہا شَمَّرْتُ وَاجْتَھَدْتُ میں نے اپنے دامن کو سمیٹ لیا۔ اور بڑی احتیاط کے ساتھ وہاں سے گذرا۔ کہ کہیں میرے کپڑے کانٹوں میں نہ اُلجھ جائیں۔ تو ابی بن کعبؓ کہنے لگے فَذٰلِكَ التَّقْوٰی یعنی تقوای اسی کیفیت کا نام ہے۔ اس دنیا میں فسق و فجور اور طرح طرح کی برائیوں کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔ ان برائیوں سے بچ کر نکل جانا ہی تقویٰ ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے[3] "حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَکَارِہِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّھَوَاتِ" یعنی جنت کو مشکلات کی باڑ کے ساتھ گھیر لیا گیا ہے۔ اور دوزخ کو شہوات کی باڑ سے جو شخص ان شہوات سے بچ کر نکل گیا، وہی متقی ہے اور جو ان

---

[1] ترمذی صفحہ ۳۶۸ [2] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۴۰/۱ [3] ترمذی صفحہ ۳۶۷، مسلم صفحہ ۳۷۸/۲، بخاری صفحہ ۹۶۰/۲

شہوات میں اُلجھ گیا وہ پھنس گیا۔

متقی، عقیدے اور عمل دونوں کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ تقویٰ ایک ایسی صفت ہے جو مومن کے لیے لازم ہے اسی لیے قرآنِ پاک میں جگہ جگہ حکم ہے "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ" اے ایمان والو! اپنے اندر تقویٰ کی صفت پیدا کرو۔ دِل میں خوفِ خدا پیدا کرو۔ کہیں فرمایا۔ "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" ایک دوسری جگہ ارشاد ہے "وَاتَّقُوْنِ یٰاُولِی الْاَلْبَابِ" اے عقل والو! تقویٰ اختیار کرو۔ روزہ کے بیان میں فرمایا کہ روزے تم پر اس لیے فرض کیے گئے ہیں۔ "لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ" تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ اور اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ شرعی احکام کو آسانی کے ساتھ انجام دے سکو گے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سفر پر جا رہے تھے۔ عرض کیا حضور! زَوِّدْنِیْ مجھے کچھ توشہ عطا فرمایئے۔ توشہ سے مراد وہ نصیحت ہے جو سفر میں کام آئے حضور علیہ السلام نے جواب میں ارشاد فرمایا[۱] "زَوَّدَکَ اللّٰہُ التَّقْوٰی" اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ کا توشہ عطا فرمائے۔ اور جہاں تو جائے، بہتری کو پائے۔ اُس کے لیے آپ نے یہ دُعا فرمائی۔ الغرض متقین وہ لوگ ہیں جو شرک، کفر اور معاصی سے بچتے ہیں۔ مشرک اور منافق کبھی متقی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کبیرہ گناہ کرنے والا جب تک تائب نہ ہو متقی نہیں ہو سکتا۔ تقویٰ کی برکت سے مومن کے لیے شریعت پر کاربند ہونا آسان ہو جاتا ہے۔

باغ اور ہم عمر عورتیں

متقیوں کے انعامات کے متعلق فرمایا "حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا" ان کے لیے باغ اور انگوروں کے گچھے ہوں گے۔ حَدَآئِقَ حدیقۃ کی جمع ہے۔ اور یہ اُس باغ کو کہتے ہیں جس کے اردگرد چار دیواری ہو یا کوٹھی ہو۔ ویسے عام باغ کو عربی زبان میں ریاض یا بستان کہا جاتا ہے۔

باغ اور انگور تو رہنے سہنے اور کھانے پینے کا سامان ہے۔ مگر ذہنی آرام و سکون کے لیے فرمایا "وَکَوَاعِبَ اَتْرَابًا" نوجوان ہم عمر عورتیں ہوں گی دوسری جگہ فرمایا "زَوَّجْنٰھُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ" ایک مقام پر ارشاد ہے "وَلَھُمْ فِیْھَآ اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَۃٌ" ان کے لیے پاکیزہ عورتیں ہوں

---

[۱] ترمذی ص ۴۹۷

گی جو ظاہر اور باطن ہر لحاظ سے پاکیزہ ہوں گی شکل وصورت میں بھی نہایت اعلیٰ ہوں گی۔ اور یہ اخلاق کے بھی بلند مرتبہ پہ فائز ہوں گی۔ اُن کی خوبصورتی کا یہ حال ہو گا کہ جنتی عورت کا ایک دوپٹہ خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا دنیا اور اس کی ہر چیز سے بہتر ہو گا۔ ترمذی شریف[1] کی روایت میں حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جنت کی عورت کے دوپٹہ کی قیمت ساری دنیا اور مافیہا ادا نہیں کر سکتے۔ سورۃ واقعہ میں عُرُبًا کا لفظ ہے جس کا معنیٰ ہے محبت کرنے والی عورت، ہو سکتا ہے کہ عورت خوبصورت ضرور ہو مگر خاوند سے متنفر ہو۔ فرمایا ایسا نہیں ہو گا بلکہ جنتی مردوں کو محبت کرنے والی عورتیں نصیب ہوں گی اور ہم عمر ہوں گی۔ بعض اوقات عمر کے تفاوت کی وجہ سے بھی طبیعت میں تکدر پیدا ہو جاتا ہے۔ فرمایا ایسی کوئی بات نہیں ہو گی مرد و زن سب ہم عمر ہوں گے۔ نیز حضور علیہ السلام نے فرمایا[2] لَا یَفْنٰی شَبَابُهٗ اُن کی جوانی کبھی ضائع نہیں ہو گی؛ ہمیشہ نوجوان رہیں گے۔ اُن کا لباس بھی کبھی بوسیدہ نہیں ہو گا۔

شرابِ طہور

فرمایا وَكَاْسًا دِهَاقًا جنتیوں کے لیے لبریز پیالے ہوں گے، جن سے وہ سرور حاصل کریں گے۔ انہیں شرابِ طہور سے نوازا جائے گا۔ اس دنیا والی گندی، نشہ آور، قے آور، گالیاں بکنے اور دنگا فساد کرانے والی شراب نہیں ہو گی۔ بلکہ ایسی عمدہ شراب حاصل ہو گی، جس سے سرور حاصل ہو گا۔ ان لوگوں نے دنیا میں سختیاں برداشت کیں، صبر و شکر کا دامن تھاما دنیوی نعمتوں سے محروم رہے، اس کے بدلے میں انہیں شرابِ طہور کے جام نصیب ہوں گے۔ دھاق بھرے ہوئے پیالے کو کہتے ہیں جو انہیں حاصل ہوں گے۔

وہاں لغویات نہیں ہوں گی

فرمایا لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا جنتی جنت میں کوئی لغو یا جھوٹی بات نہیں سنیں گے وہاں کوئی بیہودہ بات چیت نہیں ہو گی بلکہ ہر طرف خیر و برکت کی باتیں ہوں گی جیسا کہ سورۃ واقعہ میں "اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا" جس طرف جائیں گے فرشتے سلام کریں گے، کوئی گالی گلوچ تمسخر واستہزاء یا ذلت و رسوائی والی بات نہیں سنی جائے گی۔ نہ کوئی جھوٹی بات ہو گی۔ جنت ان بری چیزوں سے مکمل طور پہ پاک ہو گی۔ یہ جنت والوں کے انعامات ہوں گے۔

---

[1] بخاری صفحہ ۳۹۲ جلد ۱، ترمذی صفحہ ۲۵۵ [2] مسلم صفحہ ۳۸۰ جلد ۲

جنتیوں کے مدارج

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ یہ بدلہ ہو گا تیرے رب کی طرف سے متقین کے لیے عَطَآءً حِسَابًا حساب سے دیا ہوا۔ یعنی جیسا کسی کا عمل ہو گا اس کے مطابق اُسے بدلہ دیا جائے گا۔ دوسری جگہ فرمایا "وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا"[۱] ہر انسان کا درجہ اس کے عمل کے مطابق ہو گا جس اخلاق و کردار کا کوئی مالک ہو گا۔ اُس کے مطابق اُسے درجات حاصل ہوں گے۔ شہدار کا درجہ اسی لیے بلند ہے۔ کہ انہوں نے بڑا بلند کام انجام دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[۲] جنت میں سو درجے ہیں اور ہر درجے کا دوسرے سے فاصلہ اس قدر ہے، جتنا زمین سے آسمان کا۔ تو گویا جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا جنتیوں کو اپنے رب کی طرف سے انعامات ملیں گے، درجات حاصل ہوں گے۔ جو ان کے اعمال کے مطابق ہوں گے۔

رب، رحمٰن رحیم

فرمایا رب وہ ہے جو رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ وَمَا بَيْنَهُمَا اور ہر اس چیز کا رب ہے۔ جو آسمان و زمین کے درمیان موجود ہے۔ رب اور مربی کوئی مختلف ہستیاں نہیں ہیں۔ بلکہ زمین، آسمان اور فضار میں پائی جانے والی ہر چیز کا خالق بھی وہ ہے اور ہر چیز کو درجہ کمال تک پہنچانے والا یعنی مربی بھی وہی ہے الرَّحْمٰنِ نہایت ہی مہربان ہے۔ یہ اُسکی صفت رحمٰن کی وجہ سے ہی متقین کو اعلیٰ مقام حاصل ہوں گے۔ یہ اُسی کی مہربانی کا کرشمہ ہے۔ اسی لیے اسکی صفات رحمٰن اور رحیم ہیں۔ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" میں اللہ ذاتی نام ہے۔ اور رحمٰن و رحیم صفاتی نام ہیں۔ اِن اسمار کی تفسیر مفسرین کرام[۳] یوں کرتے ہیں۔ کہ رَحْمٰنُ الدُّنْيَا وَرَحِيْمُ الْاٰخِرَةِ لفظ رحمٰن میں عمومیت پائی جاتی ہے۔ یعنی باری تعالیٰ دنیا میں ہر ایک پہ مہربان ہے نیک و بد مومن و کافر ہر ایک کو دنیوی انعامات سے نواز رہا ہے اور رحیم سے مراد آخرت کی مہربانی ہے۔ جو صرف مؤمنین کو حاصل ہو گی۔ کفار اس سے محروم رہیں گے۔ کیونکہ وہ جزائے عمل کا موقع ہو گا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات ہر شئے کی مالک و مختار ہے لہذا لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا اُس کی مخلوق میں سے کوئی اس کے سامنے بات کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ کسی کو یہ ہمت نہیں

---

[۱] ... [۲] بخاری صفحہ ۱۱۰۴ ج ۲، ترمذی صفحہ ۳۶۲ [۳] تفسیر معالم التنزیل صفحہ ۸ ج ۱

ہوگی۔ کہ وہ از خود اپنے پروردگار کے سامنے بات کہہ سکے۔ کسی کی مجال نہیں جو دم مار سکے۔ ہر چھوٹا بڑا اس کے سامنے عاجز بندہ کی حیثیت میں پیش ہوگا۔ ملائکہ۔ مقربین، شہداء، صالحین، مومنین سب کے سب عاجز ہوں گے۔ اس کے سامنے بات کرنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکیگا۔

لفظ رُوح کی تشریح

روز قیامت کی مزید تشریح بیان کی گئی ہے۔ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَةُ صَفًّا جس دن روح اور فرشتے قطار در قطار کھڑے ہوں گے۔ قیامت کا دوسرا بگل بج جائے گا۔ انسان فوج در فوج آئیں گے۔ ملائکہ صف در صف کھڑے ہوں گے اور روح بھی حاضر ہوگی۔

روح کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ قرآن پاک کو بھی لفظ روح سے تعبیر کیا گیا ہے جیساکہ ارشاد ربانی ہے" وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا" اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح کو وحی کیا۔ قیامت والے دن روح یعنی قرآن پاک سفارشی بن کر آئے گا ان لوگوں کے لیے جو دنیا میں اس کو مانتے تھے اور اسکی تلاوت کرتے تھے۔ روح سے مراد جبرائیل امین علیہ السلام بھی ہیں۔ جیساکہ سورۃ قدر میں ہے۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا یعنی اس رات میں فرشتے اور جبرائیل علیہ السلام نازل ہوتے ہیں۔ تو گویا جبرائیل علیہ السلام اُس دن موجود ہوں گے۔ اور سب کے فیصلے کئے جائیں گے۔

روحِ اعظم

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حکمت اور فلسفے میں روح سے مراد روحِ انسانی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ روحِ انسانی بھی حاضر ہوگی۔ اس کو روحِ اعظم بھی کہا جاتا ہے۔ بعض احادیث میں اس روح کے بارے میں آتا ہے۔ کہ اس کی ہزار زبانیں ہیں۔ شاہ صاحبؒ کی حکمت میں بتلایا جاتا ہے کہ یہ روح اعظم عرشِ الٰہی کے نیچے موجود ہے۔ روحِ اعظم اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ انسانوں کی جتنی روحیں ہیں وہ اس روحِ اعظم کا عکس ہیں۔ ہر روحِ انسانی کا تعلق روحِ اعظم کے واسطے سے تجلی اعظم کے ساتھ ہوتا ہے۔ عرش عظیم پر جو تجلی اعظم پڑتی ہے۔ اُس سے سارا عرش رنگین ہو جاتا ہے۔ اس کا اثر کائنات پر پڑتا ہے۔ تو اس طرح ہر انسان کا تعلق تجلی اعظم کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔ یہ انسانیت کا سب سے کمال درجہ ہے۔ جو شخص اس دنیا میں اس روح سے قریب ہوگا فلاح پائے گا۔ اور جتنا اس

لے حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ صفحہ ۳۶ طبع لاہور

سے بعید ہوگا۔ درجہ کمال سے دور ہوتا جائے گا۔ اس روحِ اعظم کی مثال مکمل انسان کی طرح ہے۔ جس طرح ایک عام انسان کے آنکھ، کان ناک یعنی حواس ہوتے ہیں اسی طرح روحِ اعظم کے حواس ہوتے ہیں۔ اس روح کا عکس انسانوں میں پایا جاتا ہے تو یہ روحِ اعظم بھی قیامت کے روز وہاں موجود ہوگی۔ اور اگر روح سے مراد روحِ انسانی یا جبرائیل امین علیہ السلام ہیں تو وہ بھی وہاں موجود ہوں گے۔

اللہ تعالےٰ کے ہاں سفارش کا معیار

مگر حالت یہ ہوگی کہ لَا یَتَکَلَّمُوْنَ وہاں کوئی بات نہیں کر سکیگا اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ سوائے اُس کے کہ جسے رحمٰن نے اجازت دی ہو۔ وَقَالَ صَوَابًا اور اُس نے بات بھی ٹھیک کی ہو۔ درست بات سے مراد یہ ہے کہ کلمہ توحید پر ایمان رکھنے والا ہو۔ جس نے زبان سے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اور اس پر یقین رکھا ہو۔ ایسے شخص کو وہاں بولنے کی اجازت ہوگی اور سفارش کرنے کا اختیار ایسے شخص کو ہی حاصل ہوگا۔

دوسری جگہ فرمایا[1] لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی" ملائکہ، انبیاء مقربین بھی سفارش نہیں کر سکیں گے مگر جن کے بارے میں اللہ راضی ہوگا۔ کہ ہاں اس کے متعلق سفارش کی جائے۔ اور اللہ تعالےٰ راضی اس سے ہوگا جس نے ٹھیک بات کی ہوگی۔ جس کے دل میں ایمان اور توحید موجود ہوگا۔ کسی کافر منافق یا دہریے کے متعلق کوئی سفارش نہیں ہوسکے گی کیونکہ قَالَ صَوَابًا کے تحت اُس نے ٹھیک بات ہی نہیں کی۔ الغرض کوئی بھی سفارش اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکے گی۔ حتیٰ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب ہیں وہ بھی اللہ کی اجازت سے ہی سفارش کریں گے۔ بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے[2] اَخِرُّ سَاجِدًا یعنی میں خدا تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤں گا۔ میرا اللہ تعالےٰ فرمائے گا اے محمد! اپنا سر اٹھاؤ۔ اب سوال کرو، تمہاری سفارش قبول کی جائے گی۔

یہ تو نبی آخر الزمان علیہ السلام کے متعلق ہے کہ وہ بھی بلا اجازتِ الٰہی سفارش نہیں کریں گے دوسرے انبیاء علیہم السلام کے متعلق فرمایا[2] کہ اُس دن ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہر نبی کہے گا۔

---

[1] ترمذی ص ۳۵۱، مسلم ص ۱۰۹ ج ۱، بخاری ص ۱۱۰۲ ج ۲ [2] بخاری ص ۹۷۳ ج ۲، مسلم ص ۱۰۱ ج ۱

رَبِّ سَلِّمْ رَبِّ سَلِّمْ" اے پروردگار آج بچالے۔ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے کہ آپ خلیل اللہ ہیں، ہماری سفارش کریں تو وہ فرمائیں گے "اِذْهَبُوْا اِلٰى غَيْرِىْ کسی دوسرے کے پاس جاؤ۔ میرا یہ مقام نہیں ہے۔ کلیم اللہ کے پاس جاؤ۔ مجھ سے جو لغزش ہوگئی تھی اُس کے متعلق باز پرس ہو جائے گی میں کیا کروں۔ ہر ایک پر خوف طاری ہوگا۔ الغرض اُس دن سفارش اذنِ الٰہی کے بغیر نہیں ہو سکے گی اور اُسی کے بارے میں ہوگی، جس کا اعتقاد درست ہوگا اُس کے بغیر کسی کی سفارش نہیں ہوگی۔

سفارش کا مشرکانہ عقیدہ

مشرکین کا عقیدہ یہ ہے کہ بڑے بڑے ٹھاکر اور معبود جن کی وہ پرستش کرتے ہیں جن کے نام کی نیاز دیتے ہیں وہ ہر حالت میں سفارش کر کے بچالیں گے، ان کے عقیدے کے مطابق خدا تعالیٰ راضی ہو یا ناراض، یہ معبودان ہر حالت میں سفارش کر کے انہیں بچالیں گے۔ اس قسم کے لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات کو دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرتے ہیں۔ کہ جس طرح اس دنیا میں بادشاہ اپنے وزراء وغیرہ کی سفارش ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ اس طرح اللہ تعالیٰ بھی سفارش ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔ حالانکہ بادشاہ کو خطرہ ہوتا ہے کہ اگر اپنے مقربین کی سفارش نہیں مانے گا تو وہ بگڑ جائیں گے ایجی ٹیشن شروع کر دیں گے اور حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق اس قسم کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ مشرکین جبری سفارش کے قائل ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ" "وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ" اس دن نہ فدیہ ہوگا نہ سفارش ہوگی۔ خاص طور پر جبری سفارش تو قطعی طور پر نہیں ہوگی۔ ہاں جس کے حق میں اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے۔ اور اس نے بات بھی ٹھیک کی ہو، اس کے حق میں سفارش ہوگی۔

فرمایا ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ" یہ دن برحق ہے فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا پس جو چاہے اپنے رب کی طرف ٹھکانا پکڑے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے نیک و بد جونسا راستہ چاہو، اختیار کر لو۔ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ہم نے تمہیں قریب آنے والے عذاب سے ڈرایا ہے۔ خبردار کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے حجت پوری کر دی ہے" وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ

---

[1] تفسیر کبیر صـــــ

حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا" ہم رسول بھیجے بغیر کسی کو عذاب میں مبتلا نہیں کریں گے۔ قیامت کا دن وہ دن ہوگا۔ یَوْمَ یَنْظُرُ الْمَرْءُ جس دن دیکھے گا آدمی مَا قَدَّمَتْ یَدٰہُ جو اُس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ دوسری جگہ سورۃ مزمل میں فرمایا "وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ" جو بھی تم نے آگے بھیجا ہے وہ اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے۔ اس کا حساب کتاب ہوگا۔ اور پھر اُس کے مطابق جزا یا سزا ہوگی۔

کفار کی آخری حسرت

اس دن کفار کی حالت یہ ہوگی وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کافر یوں کہے گا، کاش میں مٹی ہوتا۔ تاکہ میرا حساب کتاب نہ ہوتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1] کہ روزِ قیامت اللہ تعالےٰ جانوروں کو بھی انصاف دلائیں گے۔ جس جانور نے دنیا میں کسی دوسرے جانور پر زیادتی کی ہوگی۔ اُسے اس کا بدلہ دلایا جائے گا۔ اور پھر اُن سے کہا جائے گا "کُوْنُوْا تُرٰبًا" مٹی ہو جاؤ۔ پھر اُن کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ان کو فنا کر دیا جائے گا۔ جانوروں کی پیدائش کا مقصد دنیا میں انسانوں کی خدمت گذاری ہے۔ قیامت کے بعد اُن کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

اسی طرح کافر قیامت کے روز جب اپنا اعمالنامہ سامنے پائیں گے تو تمنا کریں گے۔ کہ کاش ہم مٹی ہوتے، تاکہ آج حساب کتاب سے بچ جاتے۔ اُس کا دوسرا معنیٰ[2] یہ بھی ہے۔ کہ کفار کہیں گے، کاش ہم عاجزی کرنے والے ہوتے۔ ہم نے دنیا میں تکبر نہ کیا ہوتا۔ پچھلی سورۃ میں ذکر آچکا ہے۔ کہ اس دنیا میں انسان کا سب سے اہم فریضہ خدا تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنا ہے۔ اللہ کے حضور خشوع کرنا ہے۔ اگر دنیا میں ایسا نہیں کیا۔ تو قیامت کے روز تمنا کرے گا کاش میں نے عاجزی کی ہوتی۔ غرور و تکبر سے بچ گیا ہوتا۔ تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

امام زمخشریؒ کہتے ہیں[3] کہ بعض واعظین نے یہاں پر کافر سے مراد شیطان لیا ہے۔ یعنی شیطان کہے گا، کاش میں نے تکبر نہ کیا ہوتا۔ آدم علیہ السلام کے ساتھ سب سے پہلے شیطان ہی نے کشمکش کی تھی۔ لہذا اُس دن شیطان دیکھے گا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد عاجزی کی بنا پر انعام واکرام سے سرفراز ہو رہے ہیں۔ تو تمنا کرے گا۔ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کاش میں مٹی ہوتا یعنی میں خاکی ہوتا میرے

---

[1] درمنثور صفحہ ۳۱۱ ج ۶، ترمذی ص ۳۴۸ [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۲ پ ۳۰ [3] تفسیر کشاف ص ۶۹۲ ج ۴

اندر بھی اخبات پیدا ہوتا۔ نہ ناری ہوتا اور نہ غرور وتکبر میں مبتلا ہوتا شیطان نے مٹی کو حقیر جانا تھا اور کہا تھا "خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ" اس روز حسرت کرے گا۔ کہ کاش میں ناری کی بجائے خاکی ہوتا۔ مگر اس دن کسی کافر یا مشرک یا شیطن کی حسرت پوری نہیں ہوگی۔ جزائے عمل کا وقت ہوگا۔ اور ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

سورة النازعات

درس اول — (آیت ۱ تا ۱۴)

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّفِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورۃ نازعات مکی ہے اور یہ چھیالیس ۴۶ آیات ہیں اور اس سورۃ میں دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ① وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ② وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ③ فَالسّٰبِقٰتِ
سَبْقًا ④ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ⑤ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ⑥ تَتْبَعُهَا
الرَّادِفَةُ ⑦ قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ⑧ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ⑨ يَقُوْلُوْنَ
ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ⑩ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ⑪ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا
كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ⑫ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ⑬ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ⑭

وقوف لازم — وقوف لازم — وقف لازم

ترجمہ:- قسم ہے ان فرشتوں کی جو غوطہ لگا کر (جانوں کو) کھینچنے والے ہیں ① قسم ہے ان فرشتوں کی جو گرہ کھولنے والے ہیں ② قسم ہے ان فرشتوں کی (جو حکم خداوندی کی تعمیل کے لیے کائنات میں) تیرتے پھرتے ہیں ③ قسم ہے ان فرشتوں کی جو سبقت سے لے جانے والے ہیں ④ قسم ان فرشتوں کی جو (امر الٰہی سے) تدبیر کرتے ہیں ⑤ جس دن کانپنے گی کانپنے والی (یعنی زمین) ⑥ اس کے پیچھے آئے گی پیچھے آنے والی (یعنی نفخہ ثانیہ) ⑦ اُس دن بہت سے دل دھڑکنے والے ہوں گے ⑧ ان کی آنکھیں پست ہوں گی ⑨ یہ کافر لوگ کہتے ہیں کیا ہم پھر الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے ⑩ کیا جب ہم بوسیدہ (بھربھری) ہڈیاں ہو جائیں گے ⑪ یہ لوگ کہتے ہیں ایسا پلٹنا تو یقیناً نقصان دہ ہوگا ⑫ پس بے شک وہ تو ایک ہی ڈانٹ ہوگی ⑬ پھر اچانک وہ تمام لوگ ایک چٹیل میدان میں ہوں گے ⑭

کوائف اور موضوع

اس سورۃ کا نام سورۃ النّٰزعٰت ہے۔ اور یہ اس کے پہلے لفظ سے لیا گیا ہے۔ اس کے دوسرے نام سٰبحٰت اور سٰبقٰت بھی ہیں جو اس سورۃ کی تیسری اور چوتھی آیات سے ماخوذ ہیں۔ تاہم زیادہ رائج نام نازعٰت ہی ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی چھیالیس ۴۶ آیات، ایک سو اناسی ۱۷۹ الفاظ اور سات سو ترپن ۷۵۳ حروف ہیں۔

اس کا مضمون پہلی سورۃ نبا کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ ان سورتوں میں قیامت کا ہی ذکر ہے اس کے بعد بھی دور تک اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ہی ذکر فرمایا ہے۔ جسکے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط

گذشتہ سورۃ میں ایک کسان کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر قیامت کا ذکر کیا گیا تھا۔ "اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا" زمین میں دانہ بونے کے بعد کسان ایک خاص وقت تک فصل کے پکنے اور اس کے کٹنے کا منتظر رہتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں قائم کر کے فیصلے کا ایک دن مقرر کیا ہے۔ اور یہ بات بڑے آسان طریقے سے سمجھائی گئی ہے۔

قانون جذب و کشش

لیکن اس سورۃ میں علماء اور دانشوروں کی ذہنیت کے مطابق قیامت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ پہلی سورۃ کا طرز بیان سیدھا سادھا اور آسان تھا۔ مگر اس سورۃ میں نہایت دقیق فلسفہ پیش کیا گیا ہے۔ جسے عام آدمی نہیں سمجھ سکتا بلکہ بڑے بڑے فضلاء اور فلاسفروں کے سمجھنے کی بات ہے۔ اس میں قانون جذب و کشش کو پیش کر کے قیامت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

قرآن پاک نے قیامت کو طامۃ الکبریٰ کا خطاب دیا ہے جس کا معنیٰ بہت بڑا ہنگامہ ہے۔ اس ضمن میں علم الفلکیات (ASTRONOMY) کے ماہرین کہتے ہیں۔ کہ کائنات میں جتنے بھی سیارے اور ستارے ہیں اور جن میں ہماری یہ زمین بھی شامل ہے۔ یہ سب قانونِ جذب و کشش کے تحت اپنے اپنے دائرہ کار میں کام کر رہے ہیں۔ اگر جذب و کشش کا یہ مادہ نہ ہو تو یہ آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں اور کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ یہ قانونِ کشش ہی ہے جو ہر ایک کو کھینچ رہا ہے اور تصادم سے بچائے ہوئے ہے۔

قرآن پاک میں بسا اوقات کسی معمولی واقعہ کو پیش نظر رکھ کر کوئی اہم بات سمجھائی جاتی ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے فرعون کے واقعہ سے قیامت پر استدلال کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ کی طرف اشارہ کر کے قیامت کا حال بیان کیا ہے۔ اس واقعہ کی متعدد جزئیات میں قانونِ جذب وکشش کارفرما نظر آتا ہے۔ لہٰذا اس نسبت سے یہ واقعہ اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو ایک بڑی نشانی دکھائی یعنی "فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى"۔ یہ بڑی نشانی عصا اور ید بیضا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نو بالکل واضح معجزات عطا کئے جیسا کہ فرمایا "تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ" ید بیضا میں بھی قانون جذب وکشش کام کر رہا ہے ہاتھ کو بغل میں دبا کر نکالنا اور اس میں سورج جیسی چمک پیدا ہو جانا۔ یا عصا کو سانپ کی جنس میں تبدیل کر دینا ایک بالکل بے جان چیز کا خوفناک جاندار چیز میں تبدیل ہو جانا اسی قانون کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ یہاں سے نکل جائیں۔ راستے میں بحیرہ قلزم پڑتا تھا جسے عبور کر کے صحرائے سینا میں پہنچنا تھا۔ بنی اسرائیل پریشان تھے کہ سمندر کو کیسے عبور کیا جائیگا۔ موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی اور فرمایا "اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ" میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ ضرور میری راہنمائی کرے گا۔ سمندر میں راستہ بن جانا یہ بھی قانون جذب وکشش کا کام ہے۔ سمندر کے پانی کو کھینچ لیا گیا اور راستہ بن گیا۔ ایک دو نہیں بلکہ بارہ راستے تیار ہو گئے۔ جہاں سے بنی اسرائیل کے بارہ خاندان سات لاکھ افراد کو لے کر سمندر سے گذر گئے۔ مقصد یہ کہ اس سارے واقعہ میں جذب وکشش کا قانون کارفرما ہے۔

قیامت کیوں ضروری ہے

اس مادی دنیا میں ہم روزمرہ دیکھتے ہیں۔ کہ جب کوئی چیز تہ نشین ہو جاتی ہے۔ تو اُسے کھینچ کر باہر نکالا جاتا ہے۔ زمین کے بیکار پڑے رہنے سے اُس کی نشو ونما کی قوت نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ تو ہل یا ٹریکٹر چلا کر زمین کو اُلٹ دیا جاتا ہے اور اس کی قوتِ روئیدگی کو باہر نکالا جاتا ہے۔ تاکہ نئی فصل کاشت کی جا سکے۔ یہاں بھی قانونِ جذب وکشش ہی کام کرتا ہے۔ کائنات کے نظام کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ روئے زمین پہ جب ساری نیکی تہ نشین ہو جائے گی بالکل مٹ جائے گی، تو قانون جذب وکشش کے تحت کھینچ کر دوبارہ نکالا جائے گا۔ یہی قیامت ہے۔

تجربات کے بعد سائنس دان اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ مادی دنیا کی کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی نہ کسی صورت میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ اسلام کا قانون بھی یہی ہے۔ کہ کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا۔

نیکی ہو یا بدی ہر چیز محفوظ ہو جاتی ہے۔ جیسے قیامت کے روز باہر نکال لیا جائے گا۔ اس مسئلہ کو اس طریقہ پر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ جب خیمہ کی طنابیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ تو انہیں کھینچ کر خیمہ کو سیدھا کر دیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائیگا، تو خیمہ گر جائے گا۔ بالکل اس طرح جب اس پوری کائنات کا یہ خیمہ ڈھیلا پڑ جائے گا۔ زلزلے کے جھٹکے آئیں گے۔ مکانات، پہاڑ، درخت وغیرہ گر جائیں گے۔ یہ قیامت کا پہلا جھٹکا ہو گا۔ تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ہر چیز فنا ہو جائیگی۔ جب دوسرا جھٹکا آئے گا۔ تو ہر مٹی ہوئی چیز کو دوبارہ ظاہر کر دیا جائے گا۔ قانون جذب وکشش کے تحت ہر چیز کو باہر نکال دیا جائے گا۔ یہ نفخۂ ثانیہ ہو گا۔ الغرض وقوع قیامت کے متعلق دلیل یہ پیش کی۔ کہ دنیا میں انجام دیا گیا کوئی بھی کام ضائع نہیں جاتا۔ بظاہر معدوم ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ کسی نہ کسی مقام پر محفوظ ہوتا ہے۔ جیسے قیامت کے دن دوبارہ ظاہر کر دیا جائے گا۔ چونکہ کوئی محال کام نہیں ہے۔ لہذا قیامت ضرور واقع ہوگی۔ اس دلیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے منکرین قیامت کا ردّ فرمایا ہے۔

کفار کی جان کنی

امام شاہ ولی اللہؒ اور دیگر مفسرینؒ ان آیات میں آمدہ الفاظ نٰزِعٰت۔ نٰشِطٰت۔ مُدَبِّرٰت کا معنی فرشتے کرتے ہیں۔ فرمایا وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا قسم ہے اُن فرشتوں کی جو غوطہ لگا کر کھینچنے والے ہیں۔ یعنی انسان کی جان کنی کے وقت اُس کی جان کو اس کے جسم سے غوطہ لگا کر کھینچتے ہیں۔ مسند احمدؒ[۳] کی حدیث میں آتا ہے۔ کہ بعض بدکار آدمیوں کی جان فرشتے کھینچ کر نکالتے ہیں۔ جس سے انہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ فرشتے کہتے ہیں، نفس خبیث نکلو۔ تم خبیث بدن کو آباد کئے ہوئے تھے۔ اب خدا کے غضب کی طرف نکلو۔ وہ نفس نکلنا نہیں چاہتا، مگر فرشتے اسے کھینچ کر نکال لیتے ہیں۔ کفار ومشرکین کی یہ حالت اس لیے ہوتی ہے۔ کہ ان کی صحیح منزل متعین نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے۔ اِس کے بعد کچھ نہیں۔ لہٰذا وہ آخرت کی زندگی کی فکر ہی نہیں کرتے۔ اور جان کنی کے وقت ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔

مؤمنین کی جان کنی

ایک مؤمن شخص دنیا کی پوری زندگی میں آخرت کے لیے متفکر رہتا ہے۔ اس لیے وہ

---

[۱] فتح الرحمان ص — [۲] معالم التنزیل ج۴ ص۲۱۰، خازن ج۷ ص۲۰۴، طبری ج۳ ص۲۷ وغیرہ [۳] مسند احمد ج۴ ص۲۶۴ ج۴ ص۲۸۸، نسائی ج۱ ص۲۶۰

سمجھتا ہے۔ کہ آئندہ منزل اچھی ہوگی وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے۔ اس لیے جان کنی کے وقت اُسے تکلیف تو ہوتی ہے مگر وہ حالت نہیں ہوتی جو کفار کی ہوتی ہے۔ مومن کو اللہ تعالےٰ کے وعدہ پہ یقین ہوتا ہے۔ اُسے اپنی منزل نظر آنے لگتی ہے۔ لہذا اُسے جان کنی کی معمولی تکلیف ہوتی ہے۔ جیسے کسی کو بخار کی حالت میں معمولی تکلیف ہوتی ہے۔ یا کوئی چوٹ لگ جائے تو تکلیف ہوتی ہے۔

فرمایا وَالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا قسم ہے ان فرشتوں کی جو گرہ کھولتے ہیں یعنی فرشتے مومنین کی جان اس طرح آسانی سے نکال لیتے ہیں جس طرح کوئی گرہ آرام سے کھول لی جاتی ہے۔ پھر امر الٰہی کی تعمیل میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور حکم الٰہی کے مطابق اُسے علیّین یا سجّین میں پہنچا دیتے ہیں۔ جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ اگر مرنیوالا مومن ہے تو روح کو علیّین میں حاضر کیا جاتا ہے وہاں رجسٹر میں اس کا اندراج ہوتا ہے۔ اور پھر اُسے واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ اس طرح اگر مرنے والا کافر ہے۔ تو اُسے سجین میں لے جاتا ہے۔

فرمایا وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا قسم ہے ان فرشتوں کی جو حکم خداوندی کی تعمیل کے لیے کائنات میں تیرتے پھرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ مومن مرنے والے کی روح فرشتے اس طرح لیجاتے ہیں۔ جیسے تیرتی ہوئی جارہی ہے۔ جان کنی کے وقت تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوئی۔ مگر اسکے بعد نہایت آرام و سکون کے ساتھ جارہی ہے۔ اور پھر یہیں پہ بس نہیں بلکہ اس نیک روح کو لیجانے کے لیے فرشتے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا قسم ہے ان فرشتوں کی جو سبقت لے جانے والے ہیں۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ کہ نیک روح کو لے جانے کے لیے فرشتے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اسے پاکیزہ لباس میں لے جاتے ہیں۔

فرمایا فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا قسم ہے ان فرشتوں کی جو امر الٰہی سے تدبیر کرتے ہیں۔ فرشتوں کا تدبیر کرنا دراصل اللہ ہی کا تدبیر کرنا ہے۔ کہ فرشتے اسی کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ مُدَبِّر اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور فرشتے اس کی لطیف مخلوق ہے۔ جس طرح اللہ تعالےٰ کا

---

[1] نسائی صفحہ ۲۶۰ ج ۱ مطبع نور محمد کراچی

حکم ہوتا ہے، اُسی کے مطابق فرشتے اس کی تدبیر کرتے ہیں۔

تخلیق کائنات اللہ تعالیٰ کی چار صفات پر مبنی ہے

امام شاہ ولی اللہؒ کی تفسیر[1] کے مطابق تخلیق کائنات اللہ تعالیٰ کی چار صفات پر مبنی ہے پہلی صفت ابداع ہے، جو سب سے مقدم ہوتی ہے۔ اس سے مراد کسی چیز کو بغیر کسی مادے کے پیدا کرنا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی صفت "بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" یعنی آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا بھی ہے۔ اس کا ہم معنی دوسرا لفظ فاطر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ اس لحاظ سے بدیع ہے کہ وہ کسی بھی چیز کو بغیر کسی مادے یا آلے کے پیدا فرما دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اور تجلیات میں کشش پیدا ہوئی اور کائنات کو باہر نکال لیا۔ یہاں بھی کشش کا قانون کام کر رہا ہے۔ ابداع کو سمجھنا آسان نہیں کیونکہ اس کی مثال اس عالم شہادت میں موجود نہیں۔ ایسے معاملات کو سمجھنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت خلق ہے۔ اس سے مراد کسی چیز کو کسی مادے سے پیدا کرنا ہے جیسے "کَمَثَلِ اٰدَمَ ط خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ" آدم علیہ السلام کو مٹی کے مادے سے پیدا فرمایا۔ پہلے فرمایا تھا۔ کہ زمین و آسمان کو بغیر کسی مادے کے پیدا کیا۔ اب جب کہ مادہ پیدا ہو گیا۔ تو اس سے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ اسی طرح جنات کو آگ سے پیدا کیا۔ اور بعض دوسری چیزوں کو دوسرے مواد سے پیدا کیا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی صفت خلق کا ظہور ہے جیسے فرمایا "خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ" ہر چیز کو پیدا کیا۔ کسی چیز کی تخلیق کے لیے پہلے صفت ابداع آتی ہے۔ اور اس کے بعد صفت خلق کا نمبر ہے۔

تخلیق کے سلسلے میں تیسری صفت، صفت تدبیر ہے۔ اس کا معنی آگے پیچھے کرنا، موت و حیات طاری کرنا، عروج و زوال لانا ہے۔ اسی کو تدبیر کہتے ہیں۔ یہ صفت خلق کے بعد آئے گی۔ پہلے نہیں آئے گی۔

شاہ صاحبؒ[2] فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی چوتھی صفت تدلی ہے۔ نوع انسانی کے ہر فرد کے قلب پر تجلی الٰہی پڑتی ہے۔ خواہ وہ خفیف ہی کیوں نہ ہو اس کو تدلی کہا جاتا ہے جیسے فرمایا "ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی" قیامت کے روز جب یہ راز کھلیں گے، تو وہ تجلی سخت کام کرے گی۔ اس کی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص　[2] ہوامع ص　تفہیمات الٰہیہ ص

کشش ادھر عالم بالا کی طرف ہوگی۔ اور انسان کی بُرائی نے چونکہ اسے مادیت میں ڈبو دیا ہے لہٰذا وہ نیچے جانے کی کوشش کرے گی، اور اس تنگ و دَو میں انسان کو سخت تکلیف پہنچے گی۔

صور اوّل و ثانی

ان تمام صفات کو بروئے کار لانے میں اسی ترتیب کے لحاظ سے قوت صرف ہوگی۔ پہلی صفت ابداع میں سب سے زیادہ قوت صرف ہوگی اور دوسری صفت خلق ہیں اس سے کم اسی طرح صفت تدبیر میں اس سے کم اور تدلی میں اُس سے کم طاقت لگے گی۔ یہاں بھی قانون جذب و کشش کام کر رہا ہے۔ اسی لیے فرمایا یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ جس دن کانپے گی کانپنے والی یعنی جب پہلا صور پھونکا جائے گا، تو یہ زمین کانپ اٹھے گی۔ اور آسمان کا حال تو پہلی سورۃ میں گذر چکا ہے "فَكَانَتْ أَبْوَابًا" کہ دریچے دریچے بن جائے گا۔ اسی طرح فرشتوں کا حال بھی بیان ہو چکا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب یہ کانپنے والی کانپے گی تو ہر چیز کو ہلا دے گی، کوئی چیز اپنی جگہ قائم نہیں رہے گی۔

فرمایا تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ اُس کے بعد آئے گی پیچھے آنے والی۔ یعنی پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا۔ دوسرے صور پہ ہر چیز دوبارہ قائم ہو جائے گی، ہر چیز کو کھینچ کر دوبارہ ظاہر کر دیا جائے گا۔ کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی۔ اور ان دو صوروں کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہوگا۔

قیامت کے روز حالتِ زار

فرمایا قیامت کے دن حالت یہ ہوگی کہ "قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ" اس دن بہت سے دل دھڑکنے والے ہوں گے۔ ان پر خوف طاری ہوگا کہ آج کیا ہونے والا ہے أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ آنکھیں ذلیل ہوں گی۔ نگاہیں پست ہونگی۔ ٹکٹکی باندھے لوگ دیکھیں گے کہ کیا ہو رہا ہے۔ جو چیزیں اس دنیا میں نظر نہیں آتیں، وہ ظاہر ہو جائیں گی اور نظر آنے لگیں گی۔ فرمایا منکرین قیامت آج کہتے ہیں ءَ إِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ کیا ہم الٹے پاؤں اٹھا دیے جائیں گے پہلی حالت کی طرف۔ حافرہ سے مراد پہلی حالت یعنی اس دنیا کی سی حالت ہے۔ یعنی جس طرح اس دنیا میں ہمارا روح و جسم کا رشتہ قائم ہے۔ کیا اسی طرح قیامت کو دوبارہ پلٹا دیے جائیں گے۔ یہی نہیں بلکہ ءَ إِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً کیا جب ہم بوسیدہ اور بھربھری ہڈیاں ہو جائیں گے۔ یعنی ہماری ہڈیاں اس قدر بوسیدہ ہو جائیں گی کہ چٹکی میں لینے سے ریزہ ریزہ ہو جائیں گی۔ قَالُوا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہماری ایسی حالت قیامت کو ہوگی تو تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ تو ایسا پلٹنا

یقیناً نقصان دہ ہوگا۔ اگر ایسا ہی ہے۔ پھر تو ہم واقعی مجرم ہوں گے اور پکڑے جائیں گے۔ مگر ہم اس چیز کو تسلیم نہیں کرتے ہم تو کہتے ہیں" ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ" جب ہم مر کر مٹی میں مل جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ نئی زندگی ملے گی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بار بار قرآن کریم میں بیان فرمایا ہے۔ کہ وہ علیم کل اور قادر مطلق ہے۔ اُس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہو سکتی۔ وہ قادرِ مطلق ہو کر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے حیات بعد الممات کے مسئلہ کو بے شمار طریقوں سے سمجھایا ہے۔ فرمایا تمہارے سامنے ہر روز قیامت برپا ہوتی ہے۔ اور نئی زندگی ملتی ہے۔ مگر تم سمجھتے نہیں۔ زمین میں کھیتی پیدا ہوتی ہے۔ پک کر ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر آئندہ فصل نئی زندگی کے ساتھ اُبھرتی ہے۔ تم ان چیزوں پر کیوں غور نہیں کرتے۔ اسی طرح بحیثیت مجموعی پوری کائنات وقت مقررہ پہ درہم برہم ہو جائے گی اور جب اللہ کا حکم ہو گا۔ اس کو کھینچ کر دوبارہ باہر نکالا جائے گا فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ مگر یہ تو ایک ہی ڈانٹ ہو گی ایک ہی دفعہ بگل بجنے سے تمام چیزیں قائم ہو جائیں گی۔ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے اور ہو گا یہ کہ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ اچانک تمام لوگ ایک چٹیل میدان میں ہوں گے سَاهِرَةِ کے معنی بالکل ہموار کے ہیں یعنی" لَا تَرٰى فِیْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا" اس میں کوئی کجی یا اونچ نیچ نہیں ہو گی۔ پورا میدان بالکل ہموار ہو گا۔ ہر چیز اس قدر واضح ہو گی کہ ایک طرف نگاہ اٹھائیں گے تو دوسری طرف تک کی چیزیں نظر آئیں گی۔

بعض فرماتے ہیں کہ سَاهِرَةِ سہر کے مادے سے ہے۔ جسکے معنی بیداری کے ہیں۔ گویا تمام لوگ اچانک بیدار ہو جائیں گے۔ کیونکہ اَلنَّاسُ نِیَامٌ آج لوگ سوئے ہوئے ہیں اِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا جب مر جاتے ہیں تو بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت آنکھ کھلتی ہے۔ کہ ہم کیا سمجھ رہے تھے۔ اور حقیقت کیا ہے ———— آج لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ قیامت کے روز اچانک سارے کے سارے ہوش میں آ جائیں گے۔ بیدار ہو جائیں گے۔

درسِ دوم | (آیت ۱۵ تا ۲۶)

هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ﴿۱۵﴾ اِذۡ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ
طُوًى ﴿۱۶﴾ اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلۡ هَلۡ لَّكَ اِلٰٓى اَنۡ
تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَاَهۡدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخۡشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الۡاٰيَةَ الۡكُبۡرٰى ﴿۲۰﴾
فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدۡبَرَ يَسۡعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ
اَنَا رَبُّكُمُ الۡاَعۡلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الۡاٰخِرَةِ وَالۡاُوۡلٰى ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِىۡ
ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ﴿۲۶﴾ ع ۲۶/۳

ترجمہ:۔ کیا آپ تک موسیٰ (علیہ السلام) کی بات پہنچی ہے ﴿۱۵﴾ جب پکارا اس کو اس کے رب نے مقدس وادی طویٰ میں ﴿۱۶﴾ کہ فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکشی اختیار کر گیا ہے ﴿۱۷﴾ اور اُسے کہو کیا تجھ میں پاک ہونے کی رغبت ہے ﴿۱۸﴾ اور میں تمہیں تمہارے رب کی طرف راہ بتلاؤں تاکہ تیرے اندر خوف پیدا ہو جائے ﴿۱۹﴾ پس موسیٰ علیہ السلام نے اسے بڑی نشانی (عصا) دکھائی ﴿۲۰﴾ پس فرعون نے تکذیب کی اور جھٹلایا ﴿۲۱﴾ پھر وہ پھر اکوشش کرتا ہوا ﴿۲۲﴾ پس اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور پکارا ﴿۲۳﴾ کہنے لگا تمہارا بڑا رب تو میں ہوں ﴿۲۴﴾ پس پکڑا اس کو اللہ تعالیٰ نے آخرت اور دنیا کی عبرتناک سزا میں ﴿۲۵﴾ بے شک یہ واقعہ عبرتناک ہے اس کے لیے جس میں خوف پایا جاتا ہے ﴿۲۶﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سورۃ مبارکہ میں حکما کے نقطہ نظر سے وقوعِ قیامت پر دلیل قائم کی گئی ہے۔ کفار و مشرکین کہتے تھے کہ کیا مرنے کے بعد ہم پھر پہلی حالت پر لوٹائے جائیں گے۔ یعنی اسی طرح جسم و روح کے ساتھ زندہ ہو جائیں گے جیسا کہ دنیوی زندگی میں تھے۔ حالانکہ ہم مر کر "عِظَامًا نَّخِرَةً" بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے اگر ایسا ہوا، تو یہ بہت افسوس ناک بات ہوگی۔ وہ لوگ بعث بعد الممات کو بالکل ناممکن خیال کرتے تھے۔

اس حصہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ بیان فرمایا۔ اس

واقعہ سے ایک طرف آپ کو تسلی دلانا مقصود ہے۔ تو دوسری طرف قیامت کا مسئلہ بھی سمجھا دیا۔ فرعون بھی قیامت کا انکار کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اشارۃً بتا دیا کہ اس کا حشر کیا ہوا۔ کفار کو بتایا کہ تم بھی فرعون کی طرح انکار کرتے ہو۔ اس کے حشر کی طرف دیکھو اور اسی پر اپنے حشر کو تصور کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور جزائے عمل پر ایمان لے آؤ۔

سورۃ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے طریقے سے دوبارہ زندگی پر دلیل قائم کی۔ فرمایا "کُونُوا حِجَارَةً اَوْ حَدِيدًا" پتھر یا لوہا بن جاؤ تو بھی ہم دوبارہ زندہ کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے۔ ہڈیوں میں دوبارہ زندگی ڈال دینا تو زیادہ بعید نہیں۔ ان میں تو پہلے بھی زندگی موجود تھی۔ اب ان کو دوبارہ زندہ کر دینا کیونکر محال ہے۔ اگر تم پتھر اور لوہا بھی بن جاؤ تو بھی اللہ تعالیٰ دوبارہ زندگی دے دیں گے کیونکہ "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ

یہاں پہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اشارۃً بیان فرمایا ہے۔ هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى کیا آپ کے پاس موسیٰ علیہ السلام کی بات نہیں پہنچی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ نبوت سے سرفراز فرمائے جا رہے ہیں۔ قرآن پاک سورۃ قصص میں یہ واقعہ موجود ہے کہ وہ تو اپنی والدہ اور بڑے بھائی سے ملاقات کے لیے جا رہے تھے۔ آپ کا مولد اور منشا مصر تھا۔ آپ وہیں جوان ہوئے اور وہیں قبطی کا واقعہ پیش آیا۔ دو شخص آپس میں جھگڑ رہے تھے موسیٰ علیہ السلام نے مظلوم کو ظلم سے بچانے کے لیے ظالم کو ایک مکہ رسید کر دیا جسے وہ برداشت نہ کر سکا اور مر گیا۔ فرعون اور اس کی قوم کو اس بات پر سخت غصہ تھا۔ کہ ان کا ایک افسر مارا گیا۔ حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کا اسے جان سے مار ڈالنے کا بالکل ارادہ نہ تھا۔ وہ تو اسے محض تنبیہ کرنا چاہتے تھے۔ کہ وہ کیوں ظلم کر رہا ہے۔ بہر حال موسیٰ علیہ السلام اپنے اس فعل کی وجہ سے فرعون کی عملداری سے نکل کر مدین چلے گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا دیا۔ بعض روایات[1] میں حضرت شعیب علیہ السلام کے بھتیجے کا ذکر ہے تاہم مشہور یہی ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۸۴ جلد ۳

کہ آپ حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے وہاں دس سال تک قیام کیا اور شعیب علیہ السلام کی بیٹی سے نکاح ہوا۔

مصر کا واقعہ پرانا ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ فرعون اور اس کے حواری اُس حادثہ کو بھول چکے ہوں گے۔ اُدھر موسیٰ علیہ السلام کو اپنی والدہ اور بھائی ہارون علیہ السلام سے ملاقات کا شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے حضرت شعیب علیہ السلام سے اجازت لی اور اپنی بیوی کے ہمراہ مصر کی طرف چل دیے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے کچھ خادم بھی ساتھ بھیج دیے۔ فقہاء کرام کہتے ہیں[۱] کہ جب موسیٰ علیہ السلام کا نکاح ہو گیا تو اب شعیب علیہ السلام ان کی بیوی کو روکنے کے مجاز نہ تھے۔ لہذا موسیٰ علیہ السلام اُسے حسب منشا، ہمراہ لے جا سکتے تھے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر واپسی کے لیے شام کا راستہ اختیار نہ کیا کیونکہ شام والے فرعون کے دوست تھے۔ اور خطرہ تھا کہ کہیں وہ موسیٰ علیہ السلام کو نقصان نہ پہنچائیں۔ چنانچہ آپ نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا جو کوہ طور کے قریب سے گذرتا تھا۔ آپ شارع عام پر سفر نہیں کر رہے تھے بلکہ بچ بچا کر پہاڑی اور صحرائی راستے پر جا رہے تھے۔ ذی قعدہ کا مہینہ تھا آپ کی بیوی حاملہ تھی۔ اُسے دردِ زہ شروع ہو گیا۔ سردی کا موسم تھا۔ اس زمانے میں آگ جلانے کے لیے لوگ اپنے پاس چقماق رکھتے تھے۔ جس کے ٹکرانے سے تنکوں وغیرہ یا کپڑے میں آگ لگ جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چقماق کو استعمال کیا مگر آگ پیدا نہ ہوئی۔ موسم سرما کی اندھیری رات میں بکریاں بھی گم ہو گئیں[۲]۔ آگ میسر نہ آئی اور اس طرح آپ کو راستے میں سخت دشواری پیش آئی۔

حجاب ناری

اس مقام پر اُس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو اس جگہ پیش آیا ہوا یوں کہ اِذْ نَادٰهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اس مقدس وادی میں پکارا اس وادی کا نام طویٰ ہے۔ جہاں سے آواز آئی تھی۔ اور وہ آواز اس حجاب ناری سے آ رہی تھی جو آگ کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ مگر وہ آگ اس دنیا والی آگ نہیں تھی۔ جو جلا ڈالے بلکہ اس کی وجہ سے درختوں کے پتے اور زیادہ روشن اور سرسبز ہوتے تھے۔ الغرض موسیٰ علیہ السلام نے گھاس کے

---

[۱]

[۲] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۴، ۳۵

تنکوں کا گٹھا بنایا۔ تاکہ وہاں سے آگ حاصل کر سکیں۔ جب اس مقام پر پہنچے تو آواز آئی "اِنِّیٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ" اے موسیٰ علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ ہوں۔ آپ اس مقدس وادی میں ہیں۔ اپنے جوتے اتار دیں۔

جوتے اتارنے کی حکمت

مقدس مقام پر جوتے اتار دینا ادب کے عین مطابق ہے جس مقام پر جس قدر تجلیاتِ الٰہی پڑتی ہیں وہ مقام اسی قدر مقدس ہے۔ مسجدِ حرام تجلیات ربانی کا سب سے بڑا مرکز ہے، لہذا وہ مقدس ترین جگہ ہے۔ اس کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اسی طرح عام مساجد تجلیات الٰہی پڑنے کی وجہ سے مقدس ہیں۔ لہذا ان مقامات پہ جوتوں سمیت جانا خلافِ ادب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی جگہوں پر جوتے اتار دینے کا حکم ہے جوتے اتارنے کی ایک خاص حکمت یہ بھی ہے کہ جسم کے کسی حصہ کا اس مقدس مقام کے ساتھ تلبس ہو جائے۔

عطائے نبوّت

الغرض وادی طویٰ کا یہ مقدس مقام تھا۔ جہاں موسیٰ علیہ السلام آگ حاصل کرنے کیلئے پہنچے۔ رحمت خداوندی جوش میں آئی۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا ہو گئی حالانکہ گئے وہ آگ لینے کے لیے تھے۔

فرمایا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کو یکدم نبوت حاصل ہو گئی، اسی طرح قیامت بھی یکدم برپا ہو جائے گی۔ قرآن پاک نے قیامت کے برپا ہو جانے کا بارہا ذکر کیا ہے تو گویا جس طرح اچانک قیامت آجائے گی اسی طرح بوسیدہ ہڈیوں میں دوبارہ زندگی پیدا ہو جائے گی۔ یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آسکے۔ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے بہت سے پہلو ہیں مگر یہاں پہ صرف اس قدر بیان مقصود ہے۔ کہ آپ کو اچانک نبوت حاصل ہو گئی۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ قیامت بھی اچانک ہی برپا کر دیں گے

مکّے والے توحید اور جزائے عمل کا اسی طرح انکار کرتے تھے جس طرح فرعون اور اس کے حواری کرتے تھے تو کیا یہ لوگ کامیاب ہو گئے ؟ ہرگز نہیں فرعون سب سے بڑا سرکش تھا۔ اللہ تعالےٰ نے اُسے کس طرح ذلیل کیا اور اُسے کیسی عبرتناک سزا ملی۔ کیا عرب والے فرعون سے زیادہ دولت، اقتدار اور قوت والے ہیں۔ لہذا اُس دور کے مشرکین اور کفار اور موجودہ دور کے لوگوں کو غور کرنا چاہیئے کہ جب سب سے بڑے سرکش کا یہ حشر ہوا۔ تو باقی لوگ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کیسے بچ سکتے ہیں۔

وعظ کا حکم
موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرما کر حکم دیا اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکشی اختیار کر چکا ہے۔ طغیٰ کا معنی طغیانی، سرکشی یا حد سے بڑھنا ہے۔ فرعون حد سے تجاوز کر چکا تھا یعنی اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ "وہ بڑے اونچے درجے کا مسرف تھا۔

الغرض موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس جاؤ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى[1] اور اسے کہو کیا تم میں پاک ہونے کی رغبت ہے۔ یہاں تزکّٰی کا لفظ آیا ہے۔ تزکیہ سے مراد اندرونی اور بیرونی پاکیزگی ہے۔ فرعون کو توجہ دلانا مقصود ہے کہ حق کو قبول کرنے کا کوئی مادہ تم میں ہے۔ اگر کوئی ایسی بات تم میں موجود ہے تو آؤ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ میں تمہیں تمہارے رب کی طرف راہ بتلاؤں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا فَتَخْشٰى تاکہ تیرے اندر خوف پیدا ہو جائے۔

تزکیہ
تزکیہ پیغمبروں کے فرائض منصبی میں سے ہے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے "يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ" تو گویا منجملہ دیگر فرائض کے پیغمبر لوگوں کو پاک کرتا ہے اسی لیے موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ فرعون کا تزکیہ کرو۔ اسے کہو کہ کیا تمہیں پاک ہونے کا شوق ہے۔ تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ انسان بری صفات کو ترک کر دے اور اس کے اندر اچھی صفات پیدا ہو جائیں۔

تزکیہ کا پہلا حکم یہ ہے کہ انسان کفر، شرک اور نفاق جیسی بری صفات سے پاک ہو جائے اگر یہ باتیں کسی شخص میں موجود ہوں تو وہ پاک نہیں کہلا سکتا کیونکہ" اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ" مشرکین ناپاک ہیں۔ ایک دفعہ مشرکوں کا ایک وفد حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مسجد میں خیمہ لگا کر ان کو ٹھہرایا۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! یہ تو مشرک لوگ ہیں۔ آپ نے ان کو مسجد کے صحن میں اتار دیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا[2] اِنَّمَا اَنْجَاسُهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ یعنی ان کی گندگی انہی کے نفسوں میں پڑی ہوئی ہے۔ ان کے دل و دماغ میں رچی ہوئی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اس گندگی سے پاک ہونا ضروری ہے۔ سورۃ اعلیٰ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی تو فرمایا" قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى" وہ کامیاب ہو گیا جس نے اپنے آپ کو پاک کر لیا۔ یعنی کفر، شرک، نفاق اور دیگر گندے عقیدوں سے پاک ہو گیا۔

---

[1] طحاوی ص۱۷ ج۱

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں۔ کہ سب سے پہلے گندے عقیدے سے پاکیزگی ضروری ہے۔ اس کے بعد جسم کی پاکیزگی، مال کی پاکیزگی اور جگہ کی پاکیزگی ہے" وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی" اللہ کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔ اگر مذکورہ بالا اشیاء میں سے کوئی بھی ناپاک ہوگی تو نہ نماز ہوگی اور نہ کوئی اور عبادت لہذا پاکیزگی شرط اولین ہے[۱]

مال کے تزکیہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ" اے نبی علیہ السلام! ان لوگوں کے مالوں میں سے زکوٰۃ وصول کرکے ان کے ظاہر و باطن کو پاک فرما دیں۔ تو گویا مال کی پاکیزگی سے بھی یہی مراد ہے کہ مال ظاہری طور پہ بھی پاک ہو۔ جائز طریقے سے حاصل کیا ہو۔ اور اُسے جائز طریقے پر خرچ کیا جائے باطنی طور پہ کفر، شرک اور گندے عقیدے سے بھی انسان پاک ہو۔ شرک گندی چیز ہے اسی لیے فرمایا "فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ" بتوں کی گندگی سے اجتناب کرو۔ اِن کو چھوڑ دو۔ سورۃ مدثر میں بھی فرمایا "وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ" ہر قسم کی گندگی جس میں شرک اور بدعت بھی شامل ہے۔ اُس کو چھوڑ دو تمہارے اندر رذائل کی بجائے فضائل پیدا ہوں گے تو تزکیہ ہوگا۔ اور اسی کی بدولت ایمان، صداقت، اخلاص، صبر و شکر جیسی نعمتیں میسر ہوں گی۔

شرک و بدعت میں ڈوبے ہوئے لوگ تزکیہ کی حقیقت کو کیا سمجھیں گے۔ ایک بزرگ نے بتلایا کہ وہ ایک مسجد میں گئے تو محراب میں "یَا غَوْثُ اَلْمَدَدْ" کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ اب غور کریں کہ مسجد میں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں وہاں ایسے ایسے شرکیہ کلمات آویزاں ہوں۔ تو دوسری جگہوں کا کیا حال ہوگا۔ قبروں کی حالت دیکھ لیں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ہر آنے والا سجدہ کر رہا ہے۔ کوئی قبر کو چاٹ رہا ہے کوئی قبر والے سے مدد مانگ رہا ہے۔ غیر اللہ کی نذر و نیاز ہو رہی ہے۔ لوگ پیر پرستی کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ حالانکہ پیر تو ——— ہدایت کے لیے ہوتے ہیں۔ مگر انہوں نے پیر کی بات کو خدا اور رسول کی بات سے بڑھا دیا۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ حضرت صاحب قرآن و سنت کی بات بتلا رہے ہیں یا شیطان کی نمائندگی کرکے کفر، شرک اور بدعت کی تعلیم دے

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۱۱ پارہ ۲۹ و صفحہ ۱۸۴ پارہ ۳۰

رہے ہیں۔ اور ان کے ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔

الغرض یہ سب چیزیں گندگی ہیں۔ اس نجاست سے نہ مسجدیں محفوظ ہیں اور نہ قبرستان۔ اسی لیے منافقوں کے متعلق فرمایا "فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ" آپ ان کو چھوڑ دیں کہ یہ نفاق کی گندگی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کفر و شرک میں مبتلا ہیں۔ جو کہ حد درجے کی گندگی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے "یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۝" قیامت کے دن کسی کا مال و اولاد کام نہیں آئے گا البتہ فائدہ اس کو حاصل ہوگا۔ جو قلب سلیم لے کر اللہ کی بارگاہ میں پہنچا بزرگان دین فرماتے ہیں۔ کہ قلب سلیم کا حامل وہ شخص ہے جو کفر و شرک اور بدعات سے پاک ہوگا جس کا دل ہر قسم کی برائیوں اور بداخلاقیوں سے مبرا ہوگا۔ جو شخص شرک کے پلندے لے کر اللہ کے ہاں پہنچے گا اس کو خدا کی رحمت حاصل نہیں ہوگی، بلکہ وہ لعنت میں گرفتار ہوگا۔ اسی لیے فرمایا کہ کامیابی کے لیے تزکیہ ضروری ہے۔

صراط مستقیم کی طرف راہنمائی

الغرض اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ کیا تیرے اندر کوئی رغبت ہے کہ تو ہر قسم کی گندگیوں سے پاک ہو جائے۔ اگر ایسا ہے۔ تو پھر میں تیری راہنمائی کروں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے باپ سے یہی کہا تھا کہ تو گمراہی پر ہے میری بات مان، میں تجھے ہدایت کا راستہ بتاؤں۔ "اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا" حالانکہ باپ تھا مگر اُسے بھی بحیثیت پیغمبر کہا تھا "فَاتَّبِعْنِیْ" میرا اتباع کرو۔ ہر نبی کا یہی مشن رہا ہے کہ "یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ" اے میری قوم! میرا اتباع کرو تاکہ تمہاری راہنمائی کروں اور تاکہ تم متقی بن جاؤ تمہارا تزکیہ ہو جائے۔ گویا نبی کا اتباع فرض ہے۔ اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے متعلق بھی ارشاد فرمایا "اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" بلاشبہ آپ صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں۔ وہی صراطِ مستقیم جس پر چل کر آدمی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

خوفِ خدا

موسیٰ علیہ السلام نے بھی فرعون سے یہی بات کہی، بلکہ ہر نبی اپنے اتباع کی دعوت دیتا ہے۔ تاکہ اُمتی کی راہنمائی ہو۔ فَتَخْشٰی اور اس میں خوفِ خدا پیدا ہو۔ پہلی سورتوں میں بھی گذر چکا ہے۔ کہ اس

دنیا میں انسان کا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرے۔ اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کی مذمت ان الفاظ میں بیان ہوئی "وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ" یعنی جب انہیں رکوع کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ رکوع نہیں کرتے۔ اسی طرح سورۃ مدثر کی ابتدائی آیت میں ہے " قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿۳﴾" اٹھو! اور لوگوں کو ڈراؤ۔ کہ وہ رب کی عظمت بیان کریں۔ اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کریں۔ یہی اخبات ہے۔

تو موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی حکم ہوا کہ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جا کر حق کی تبلیغ کرو۔ اور اس کا طریقہ یہ بتایا "فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا" یعنی اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا کیونکہ تبلیغ کے لیے نرمی کی ضرورت ہے۔ البتہ تعزیر میں سختی روا ہے۔ وہاں کوڑے مارے جاتے ہیں تلوار چلائی جاتی ہے مگر جہاں تبلیغ مقصود ہو وہاں نرمی اور سہولت سے بات کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو سمجھا دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات

اس حکم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو دو عظیم نشانیاں یا معجزات بھی عطا کئے یعنی عصا اور ید بیضا۔ نبی کی نبوت کے لیے معجزہ علت نہیں ہوتا البتہ اس کی صداقت کی علامت ہوتا ہے جو اس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ ظاہر فرما دیتا ہے۔ عام مخلوق ایسی چیز پیش کرنے سے عاجز ہوتی ہے۔ تو یہی نشانیاں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس گئے فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى پس اسے بڑی نشانی یعنی عصا دکھایا جو سانپ کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ دوسری سورتوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

فرعون کی طرف سے تکذیب

پھر کیا ہوا فَكَذَّبَ وَعَصٰى فرعون نے تکذیب کی، جھٹلایا اور نافرمانی کی۔ اتباع کرنے کی بجائے الٹا افتراء باندھا۔ سورۃ مومن میں ہے "فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ" سب نے جھٹلایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی تذلیل کی۔ ثُمَّ اَدْبَرَ پھر وہ پھرا يَسْعٰى سعی کرتا ہوا کوشش کرتا ہوا۔ اپنے حواریوں کو جمع کیا۔ فَحَشَرَ فَنَادٰى اور انہیں پکارا اور کہنے لگا " فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ" موسیٰ علیہ السلام جادو کر رہا ہے۔ ہم اس کا توڑ کریں گے۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل بیان فرمائی۔ کہ پھر اس نے تمام جادوگروں کو جمع کیا، مگر وہ جادوگر بھی مسلمان ہو گئے۔ اور فرعون کو سوائے رسوائی کے کچھ حاصل نہ ہوا۔

فرعون کا دعوے خدائی

الغرض اپنے حواریوں کو اکٹھا کر کے کہنے لگا۔ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى تمہارا بڑا رب

تومیں ہوں "مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ" میرے علاوہ تمہارا کوئی اور معبود نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام خواہ مخواہ اللہ کی توحید کی دعوت دے رہا ہے۔ کہیں کہا۔ یہ مصر کی بادشاہی میری ہے نہریں چل رہی ہیں۔ ڈیم بنے ہوئے ہیں۔ میں جو چاہوں کروں۔ میں ہی تمہارا بڑا رب ہوں۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان ہو کر اتنا بڑا دعویٰ کرتا ہے یہ کس کی طرف بلاتا ہے۔ کس کی عبادت کی دعوت دیتا ہے کس کو اللہ کہتا ہے وہ تو میں ہوں۔

نمرود نے بھی وہی بات کی تھی جو فرعون نے کی وہ کہتا تھا "اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ" میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ چنانچہ بے گناہ کو مروا دیا اور گنہگار کو چھوڑ دیا۔ مگر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے طلوع آفتاب کی دلیل پیش کی تو نمرود ذلیل و خوار ہو کر رہ گیا۔

منصورؒ کا نعرۂ انا الحق

شیخ ابن عربیؒ[1] اور دوسرے بزرگان دین فرماتے ہیں کہ منصورؒ متنازعہ فیہ شخصیت ہے۔ اکثریت کی رائے یہ ہے کہ وہ اچھا آدمی تھا۔ غلطی سے "اَنَا الْحَقّ" کا نعرہ لگا دیا۔ جس طرح ظرف کم ہو تو چھلک جاتا ہے۔ اسی طرح منصورؒ بھی چھلک گیا تھا۔ لہٰذا اُسے سزائے موت دی گئی۔ فرعون نے بھی یہی بات کی تھی۔ تو اُسے اللہ کی طرف سے سرکش، کافر اور ذلیل کہا گیا مگر منصورؒ نے "انا الحق" کا نعرہ لگایا۔ تو اسے نیک، ولی یا مقرب سمجھا جاتا ہے۔ بزرگان دین فرماتے ہیں کہ دونوں کا نقطہ نظر الگ الگ تھا۔ جب منصورؒ نے "اَنَا الْحَقّ" کہا تھا۔ تو وہ خود فنا ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ اُسے خدا ہی نظر آیا تھا۔ لہٰذا اس کا مرتبہ بلند ہو گیا۔ برخلاف اس کے فرعون نے اپنے آپ کو دیکھا اور دعوائے خدائی کر دیا۔ اس نے کہا جدھر دیکھتا ہوں اُدھر میں ہی میں ہوں۔ لہٰذا ذلیل و خوار ہوا۔ الغرض نعرہ دونوں کا ایک تھا۔ مگر نظریہ جدا جدا تھا۔ منصورؒ نے اپنے آپ کو فانی تصور کیا تو مقرب ہو گیا۔ اور فرعون نے اپنے کو باقی تصور کیا تو ذلیل ہو کر رہ گیا۔

فرعون کا انجام

فرعون کے اس باطل دعویٰ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَخَذَہُ اللّٰہُ پس پکڑا اس کو اللہ تعالیٰ نے نَكَالَ الْاٰخِرَةِ آخرت کی عبرتناک سزائیں وَالْاُوْلٰی اور دنیا کی عبرتناک سزائیں بھی گویا اُس کو دنیا اور آخرت دونوں مقامات پہ عبرتناک سزا ملی۔ سزا بھی ایسی جو ہمیشہ یادگار رہے گی۔ آخرت

---

[1] تفسیر حسینی ص ۹۳۴

میں تو دائمی سزا کا مستحق ہوگا ہی۔ جہنم میں اپنے حواریوں سمیت داخل ہوگا۔ دنیا میں بھی جو اس کا حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ وہ چھ لاکھ بنی اسرائیل کو ہلاک کرنے کے لیے نکلا تھا، مگر معہ اپنی بارہ لاکھ فوج اور بڑے بڑے سرداروں اور رشتہ داروں میں سے ایک بھی نہ بچا، سب ہلاک ہوگئے۔ فرعون کی لاش کو اس حالت میں باہر پھینک دیا کہ اس نے زرہ پہنی ہوئی تھی۔ اور تھوڑی سی ناک کٹی ہوئی تھی۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَۃً بے شک یہ واقعہ عبرتناک ہے۔

آج بھی جو لوگ فرعون جیسی سرکشی کے مرتکب ہوں گے۔ توحید کا انکار کریں گے۔ قیامت اور جزائے عمل کی تکذیب کریں گے، ان کا حشر بھی فرعون کی طرح ہوگا۔ اور اس میں لوگوں کے لیے مقام عبرت ہے۔ اور یہ عبرت ان لوگوں کے لیے ہے۔ لِّمَنْ یَّخْشٰی جن میں خوف اور عاجزی پائی جاتی ہے۔ جن لوگوں کے دل میں خوف و عاجزی نہیں۔ اخبات و خشوع کا مادہ نہیں، محاسبہ اور جزائے عمل کی فکر نہیں۔ انہیں عبرت حاصل نہیں ہوسکتی، وہ تو اسے قصہ کہانی ہی سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ" یہ پہلے لوگوں کے واقعات ہیں۔ لہٰذا کفر و شرک کا راستہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تباہی اور بربادی کا راستہ ہے۔ ایمان اور ہدایت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ اس پر چل کر ہی کامیابی نصیب ہوسکتی ہے۔

عمّ ۳۰ — النّٰزعٰت ۷۹

درس سوم — (آیت ۲۷ تا ۳۶)

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ﴿۲۸﴾ وَ
اَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾
اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا
لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾ يَوْمَ
يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾

کیا تم (یعنی انسان جیسی چھوٹی چیز) کو پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان (جیسی بڑی چیز) کو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بنایا ہے ﴿۲۷﴾ اس کی بلندی بہت رکھی پھر اس کو برابر کر دیا ﴿۲۸﴾ اور اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس کی دوپہر کو نکالا ﴿۲۹﴾ اور اس کے بعد زمین کو بچھایا ﴿۳۰﴾ زمین سے پانی نکالا اور چارہ ﴿۳۱﴾ اور پہاڑوں کو زمین میں گاڑ دیا ﴿۳۲﴾ یہ تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لیے ہیں ﴿۳۳﴾ پس جب یہ بڑا ہنگامہ واقع ہو گا ﴿۳۴﴾ اس دن انسان یاد کرے گا جو کوشش اس نے کی ہے ﴿۳۵﴾ (اس دن) دوزخ کو ظاہر کر دیا جائے گا ہر دیکھنے والے کے لیے ﴿۳۶﴾

بعث بعد الموت

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر فرمایا ہے۔ اور منکرین قیامت کا رد فرمایا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ "ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ" کیا ہم الٹے پاؤں پہلی حالت پر لوٹائے جائیں گے۔ یعنی کیا ہمیں دنیا والی ویسی ہی زندگی مل جائے گی۔ جو جسم اور روح سے مرکب ہوتی ہے۔ حالانکہ ہماری یہ حالت ہو چکی ہو گی "كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً" کہ بوسیدہ ہڈیاں ہو چکے ہونگے۔ تو ان حالات میں دوبارہ لوٹنا تو بڑا خسارے کا سودا ہو گا۔ حالانکہ مشرکین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسانوں اور باقی مخلوق سب کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے۔ جب انہیں انسان کی پہلی دفعہ پیدائش کا انکار نہیں ہے۔ آسمان کے پیدا کرنے کا بھی انکار نہیں کرتے تو پھر انسان کی دوبارہ پیدائش پر کیوں معترض ہیں۔ کیا کسی چیز کو پہلی دفعہ پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے یا دوسری دفعہ۔ کسی چیز کا اعادہ کرنا تو نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کام اسے

لیے قطعاً دشوار نہیں ہے۔ بلکہ " هُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ " یہ تو اس کے لیے نہایت آسان کام ہے۔

آسمان کی تخلیق

اسی بات کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بطور دلیل پیش کیا۔ فرمایا ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ کہ انسان جیسی چھوٹی سی چیز کو پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان جیسی بڑی چیز کو۔ اللہ تعالیٰ نے تو آسمان جیسی بڑی شے کو پیدا فرمایا۔ تو انسان اسکے مقابلے میں کیا چیز ہے۔ اس مقام پر آسمان کا ذکر فرمایا اور اس کے ساتھ اس کے متعلقات بھی بیان فرمائے۔ فرمایا بَنٰهَا اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بنایا رَفَعَ سَمْكَهَا اس کی بلندی بہت رکھی فَسَوّٰهَا اس کو برابر کیا، کہ اس میں کوئی اونچ نیچ یا ناہمواری نظر نہیں آتی۔ جیسا کہ سورۃ ملک میں ذکر ہے۔

" فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ " اپنی نگاہیں بار بار اٹھا کر دیکھو، کیا آسمان میں کوئی تفاوت، کوئی خرابی یا کوئی خلل نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اس چھت میں کوئی دراڑ ہے؟ یا اس کا پلستر کہیں سے ٹوٹا ہوا ہے؟ بالکل نہیں یہ آسمان اپنی تخلیق کے روز سے لے کر آج تک اسی طرح مکمل ہے۔ اس میں موجود باقی اشیاء۔ اسی طرح اپنا اپنا کام کر رہی ہیں۔

رات دن کی آمد

آسمان کے باقی متعلقات کا ذکر فرمایا وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا اور اسکی رات کو تاریک بنایا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا اور اسکی دوپہر کو نکالا۔ کیونکہ رات اور دن کا آنا آسمان کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیل و نہار آسمانی کرّوں کی حرکت سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ سورج کا تعلق آسمان کے ساتھ ہے۔ جب سورج غروب ہوتا ہے۔ تو رات آجاتی ہے۔ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو دن کی آمد ہوتی ہے۔ یہ ہمارے مشاہدے کی چیزیں ہیں۔ جن سے انکار کی مجال نہیں۔ دن اور رات کا تبدیل ہونا ایک انقلاب ہے۔ جیسا کہ فرمایا " يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ " اللہ تعالیٰ ہی رات اور دن کو پلٹیاں دیتا ہے۔ یہ خود بخود وجود میں نہیں آتے اسی طرح " جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً " رات اور دن کو آگے پیچھے آنے والا بنایا۔

اللہ جل شانہٗ نے رات اور دن کی آمد کو بھی قیامت کے لیے بطور دلیل بیان کیا ہے جس طرح روز و شب انقلاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح قیامت کا برپا ہو جانا بھی ایک انقلاب ہے۔ اسی درس کی ایک اگلی آیت میں " الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى " کا بیان ہے۔ اس میں یہی بات سمجھائی گئی ہے۔ کہ وقوع قیامت ایک بڑا انقلاب ہے۔ اس کائنات میں موجود تمام اشیاء

کی قوتیں جب مخفی ہو جائیں گی تو انقلاب آجائے گا تو قیامت کا مسئلہ حکماء کے نظریے کے پیش نظر قانون جذب وکشش کے اصول پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ ابتدائے سورۃ میں "وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا" سے شروع کیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بیان فرمائے۔ جن میں یہی قانون کارفرما ہے۔ کبھی سمندر کے پانی کو کھینچ کر راستہ بنا دیا، کبھی لاٹھی سانپ میں تبدیل ہو گئی۔ کبھی ہاتھ میں ایسی چمک پیدا ہو گئی، جو سورج کا مقابلہ کر سکے۔ گویا تمام معجزات میں قانون جذب وکشش ہی کام کر رہا ہے۔ جو اس سورۃ میں بنیادی قانون بیان کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ظاہر کیا۔ اس کائنات میں سب سے اعلیٰ مخلوق انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حیوانات کا ذکر فرمایا جو انسان کے خدام ہیں۔

زمین کی تخلیق

تو اس مقام پر اللہ تعالیٰ انسانی مخلوق کو یہ بتلا رہے ہیں۔ کہ یہ تم مانتے ہو کہ آسمان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ اور پھر رات اور دن کو پیدا کرنے والی ذات بھی وہی ہے، اس کے بعد فرمایا وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا یعنی اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ سورۃ دخان میں موجود ہے۔ کہ زمین کا مادہ آسمان کی تخلیق سے پہلے پیدا کیا مگر اس کا بچھانا تخلیق آسمان کے بعد ہے۔ زمین کا اس طریقہ پر بچھانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اسی بچھانے کی وجہ سے ہے کہ اس پر موجود ہر چیز اپنے اپنے معمول پر قائم ہے۔ سمندر کے پانی کو زمین کے ساتھ اس طرح وابستہ کر دیا کہ خلاصۂ کائنات انسان اس سے اچھے طریقہ سے مستفید ہو سکے۔ زمین کو اس عمدہ طریقے سے بچھایا۔

گذشتہ سورۃ میں زمین کو گہوارہ کا لقب دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایسے احسن طریقے سے پیدا کیا ہے۔ کہ انسان اس پر اسی طرح آرام کرتا ہے۔ جس طرح بچہ گہوارے میں سکون حاصل کرتا ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس طور پر پیدا کیا کہ وہ تمام امور اپنی حسب منشاء انجام دیتا ہے۔ اور زمین کی ساخت اور ترتیب اس میں پوری پوری مدد ومعاون ہوتی ہے۔

پانی کی فراہمی

زمین کی تخلیق کے بعد نوعِ انسانی کی سب سے اہم ضرورت کا ذکر فرمایا "اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا" یعنی پانی بھی زمین سے ہی نکالا۔ پانی جیسی عظیم نعمت کہیں چشموں کی صورت میں زمین سے برآمد ہوئی۔ کہیں بارش برسائی اور پانی بہہ نکلا، کہیں زمین میں نہریں چلا دیں۔ کہیں اسی زمین پر پانی کے بڑے بڑے ذخیرے جھیلوں کی صورت میں قائم کر دیئے۔ اور پھر اس پانی کی بدولت وَمَرْعٰىهَا چراگاہیں پیدا کر دیں، یہ درخت، گھاس پھونس جھاڑیاں وغیرہ اللہ تعالیٰ نے سب اپنی حکمت سے

بنائے ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا پہاڑوں کو زمین میں گاڑ دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کیل ٹھونک دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ دوسری جگہ یوں بیان فرمائی "اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ" تاکہ زمین ڈولنے نہ پائے، مضطرب نہ ہو جائے۔ لہٰذا پہاڑوں کو اس پر گاڑ دیا۔

انسان مضبوط ترین مخلوق ہے

ترمذی کی حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ کہ زمین میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر پہاڑ قائم کر دیے۔ فرشتوں نے متعجب ہو کر عرض کیا اے مولا کریم! تیری مخلوق میں پہاڑوں سے سخت چیز بھی کوئی ہے۔ عربوں کے نزدیک پہاڑ مضبوط ترین چیز تصور کیے جاتے تھے۔ اسی لیے وہ کہا کرتے تھے کہ انسان کو اپنے عقیدے میں پہاڑ جیسا مضبوط ہونا چاہیئے۔ اسی طرح انسان کا عہد و پیمان بھی مضبوط ہونا چاہیئے۔ فرشتوں کے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، پہاڑوں سے مضبوط چیز لوہا ہے۔ جو پہاڑوں کو بھی کاٹ دیتا ہے۔ فرشتوں نے پھر عرض کیا۔ یا اللہ! کیا لوہے سے مضبوط بھی کوئی مخلوق موجود ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ لوہے سے سخت چیز آگ ہے۔ جو لوہے کو بھی پگھلا دیتی ہے۔ فرشتوں نے پھر سوال کیا کہ آگ سے سخت چیز بھی تیری مخلوق میں ہے۔ تو اللہ نے جواب دیا۔ ہاں آگ سے سخت چیز پانی ہے جو آگ کو بجھا دیتا ہے۔ فرشتوں نے پھر پوچھا کہ کیا پانی سے سخت چیز بھی کوئی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا پانی سے سخت چیز ہوا ہے جب ہوا کے طوفان چلتے ہیں تو پانی کو بھی اڑا کر لے جاتے ہیں۔ فرشتوں نے پھر عرض کیا۔ کہ اے مالک الملک! کیا ہوا سے سخت مخلوق بھی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا انسان ہے، اور پھر انسانوں میں مومن ہے جو دائیں ہاتھ سے صدقہ کرتا ہے۔ مگر بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی۔ یہ اس کی مضبوطی کی نشانی ہے۔ یہ انسان کے ایمان کا کمال ہے۔ کہ اللہ کی راہ میں اس طرح پوشیدہ طور پہ خرچ کرتا ہے۔

جانور انسان کی خدمت پر مامور ہیں

فرمایا آسمان اور زمین کے درمیان جتنی بھی اشیاء ہیں مَتَاعًا لَّكُمْ یہ تمہارے فائدے کے لیے ہیں وَلِاَنْعَامِكُمْ اور تمہارے جانوروں کے لیے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسی لیے فرمایا[2] کہ جانور پر سواری کرو تو کہا کرو "سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ" اے اللہ تیری ذات پاک ہے جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کر دیا، ورنہ

---

[1] ترمذی ص ۴۸۶، [2] سورۃ زخرف آیت ۱۳، ۱۴، ابوداؤد ص ۳۵ ج ۱، ترمذی ص ۴۹۷، مسند احمد ص ۹۷ ج ۱

ہمارے بس میں نہ تھا کہ ان کو مسخر کرسکتے۔ یہ جنگلی ہاتھی، یہ مست اونٹ اور ان تیز طرار گھوڑوں کو اپنے اختیار میں کرلینا۔ ان سے کام لینا۔ ان کو سواری کے طور پر استعمال کرنا۔ ان سے بار برداری کا کام لینا یہ سب تیری مہربانی سے ہی ممکن ہے۔ تو نے ہی ان جانوروں کے ذہن میں یہ بات ڈال دی۔ کہ وہ انسان کی خدمت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہی جانور بگڑ جاتے ہیں تو انسان کی جان محفوظ نہیں رہتی۔ ہاتھی انسان کو پاؤں تلے روند کر مار ڈالتا ہے۔ تیز رفتار گھوڑا گرا کر ہڈی پسلی ایک کر دیتا ہے۔ مگر عام حالات میں ایک تین سال کا بچہ اونٹ کی مہار پکڑ کر جدھر چاہے لیے پھرتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے کمال حکمت کا کرشمہ ہے۔ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور انسان ان تمام مخلوقات کا خلاصہ ہے۔

قیامت سب سے بڑا ہنگامہ

اللہ تعالیٰ نے ان تمام اشیاء کو بطور انقلابات بیان فرمایا کہ دن اور رات کا تغیر و تبدل زمین و آسمان کی تخلیق، پہاڑوں کا گاڑا جانا۔ چراگاہوں کی موجودگی اور پھر جانوروں کی تسخیر یہ سب انقلاب ہیں جن کا تم خود مشاہدہ کر رہے ہو۔ اسی طرح قیامت بھی ایک انقلاب ہے۔ اور سب سے بڑا انقلاب اور سب سے بڑا ہنگامہ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى جب یہ بڑا ہنگامہ واقع ہوگا۔ تو اس سے کوئی چیز نہیں بچ سکے گی، ہر چیز اس کی لپیٹ میں آجائے گی۔ طامۃ اس چیز کو کہتے ہیں۔ جو باقی سب چیزوں پر چھا جائے۔ جس طرح سیلاب آجاتا ہے۔ اور اس سے کوئی چیز محفوظ نہیں رہتی۔ طوفان نوح آیا تھا تو پہاڑ بھی اس کی زد میں آگئے تھے۔ ایسا سیلاب آبادیوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔ درختوں کو اکھاڑ دیتا ہے۔ ہر چیز کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اسی طرح قیامت بھی ایک بہت بڑا ہنگامہ اور انقلاب ہوگا۔ جس سے کوئی چیز محفوظ نہیں رہے گی۔ وہ سب پر غالب آجائے گا تو گویا جب طامۃ الکبریٰ برپا ہوگا تو وہ اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر قائم نہیں رہے گی۔ نہ زمین موجود رہے گی۔ نہ آسمان اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔ ہر چیز درہم برہم ہو جائے گی۔

فرمایا يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى اس دن انسان یاد کرے گا جو کوشش اس نے کی ہے۔ اس کا ہر کارنامہ اس کے سامنے موجود ہوگا۔ اس وقت بڑا خطرہ ہوگا کیونکہ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى اس دن دوزخ کو ظاہر کر دیا جائے گا۔ ہر شخص اسے اپنی آنکھوں سے

دیکھے گا۔ دوزخ کو دوزخیوں کے قریب کر دیا جائے گا۔ اور بالآخر محاسبہ کے بعد وہ اس میں پہنچ جائیں گے۔

تو فرمایا آج یہ لوگ قیامت اور حشر و نشر کا انکار کر رہے ہیں۔ مگر اُس دِن یہ حال ہو گا کہ اپنی سعی اپنے کیے کرائے کو دیکھ کر پریشان ہو جائیں گے۔ کیونکہ جہنم بھی ان کے سامنے موجود ہو گی اور انہیں اپنا انجام نظر آتا ہو گا۔ اس وقت دنیا میں دو ہی گروہ ہیں "فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ" یا مومن ہیں یا کافر۔ سورۃ کی آخری آیتوں میں دونوں گروہوں کے انجام کا ذکر آئے گا۔

(آیت ۳۷ تا ۴۶)

درسِ چہارم

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۳۹﴾
وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ
هِیَ الْمَاْوٰی ﴿۴۱﴾ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا ﴿۴۲﴾ فِیْمَ اَنْتَ
مِنْ ذِكْرٰهَا ﴿۴۳﴾ اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ﴿۴۴﴾ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ
یَّخْشٰهَا ﴿۴۵﴾ كَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰهَا ﴿۴۶﴾ ع ۲ ۴

ترجمہ: پس جس شخص نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا ﴿۳۷﴾ اور دنیوی زندگی کو ہی ترجیح دی ﴿۳۸﴾
پس بے شک جہنم ہی ایسے شخص کا ٹھکانا ہوگا ﴿۳۹﴾ اور جو شخص اس دنیا میں اپنے رب کے سامنے
کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا ﴿۴۰﴾ پس بے شک جنت ہی
ایسے شخص کا ٹھکانا ہوگا ﴿۴۱﴾ یہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ وہ کب
قائم ہوگی ﴿۴۲﴾ آپ کو اس کے ذکر سے کیا واسطہ ﴿۴۳﴾ قیامت کی انتہا تو تیرے رب کی طرف
ہے ﴿۴۴﴾ بے شک آپ ڈرانے والے ہیں اس شخص کو جو اس قیامت سے خوف کھاتا ہے ﴿۴۵﴾
گویا جس دن وہ لوگ اُس قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے (تو خیال کریں گے) کہ وہ نہیں
ٹھہرے دنیا میں مگر ایک دن کا پچھلا پہر یا دوپہر کا وقت ﴿۴۶﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر حکماء کے نظریہ کے مطابق بیان کیا۔ اور اس ضمن میں ماننے والے اور انکار کرنے والے دونوں گروہوں کے نتائج بھی بیان کر دیے ہیں۔ پہلے منکرین کے حالات بیان ہوئے کہ کہتے ہیں ”ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً“ جب ہم مر کر بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے۔ تو پھر کیسے زندہ ہو جائیں گے۔ اللہ جل شانہٗ نے دوبارہ زندگی کی دلیل کے طور پر فرمایا ”ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا“ کیا تمہارے جیسی چھوٹی چیز کا پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان جیسی بڑی چیز کا بنانا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ اس نے پہلی دفعہ تم کو پیدا کر دیا تھا، تو دوبارہ زندہ کرنا کیسے مشکل ہے۔ اُس نے زمین کو بچھایا، پانی نازل کیا، چراگاہیں قائم کیں، پہاڑوں کو زمین میں گاڑا۔

جب ان تمام چیزوں کو قائم کر دیا تو انسان کو دوبارہ پیدا کر دینا کون سا مشکل کام ہے۔ جب قیامت کا بڑا ہنگامہ برپا ہوگا۔ تو منکرین کو جہنم سامنے نظر آئے گی۔ اس وقت انہیں جزائے عمل کا حال معلوم ہوگا۔

انسان کی عقلی حیثیت

عقلی حیثیت سے دنیا میں انسانوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو اپنی عقل کو صحیح طور پہ استعمال کرتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو اس نعمت سے صحیح طور پہ فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ یہ عقل ہی ہے جس نے انسانوں کو درجہ کمال عطا کیا ہے۔ عقل کی وجہ سے ہی انسان مکلف ٹھہرتا ہے۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو فرمایا "آگے آؤ، پیچھے ہٹو" عقل نے حکم کی تعمیل کی۔ تو اللہ جل شانہٗ نے فرمایا میں تیری وجہ سے ہی مؤاخذہ کروں گا اور تیری وجہ سے روکوں گا۔ چنانچہ قانون کی پابندی عقل کے ساتھ وابستہ ہے۔ کوئی پاگل شخص کسی قانون کا مکلف نہیں گردانا جاتا۔ اسی طرح چھوٹے بچے جو عقل کی پختگی تک نہیں پہنچے ہوتے، وہ مکلف نہیں ہوتے۔ اسی طرح جانور بھی مکلف نہیں۔ اگرچہ اُن میں شعور موجود ہے۔ مگر وہ عقل سے خالی ہیں۔ عقل ہی کو اللہ تعالیٰ نے جوہر کمال قرار دیا ہے اور یہی چیز انسان کو مکلف بناتی ہے۔

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو اپنی عقل کو صحیح طور پہ استعمال نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کفار کی مذمت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ "الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ" یعنی یہ لوگ بہرے اور گونگے بایں معنیٰ ہیں کہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ بعض[2] مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن میں جہاں فرقان کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد جوہر عقل ہے۔ جیسے سورۃ آل عمران کی ابتداء میں موجود ہے "نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝" یہاں دیگر آسمانی کتابوں کے علاوہ تنزیلِ فرقان کا جو ذکر ہے مفسرین کے مطابق یہ جوہر عقل ہے۔ تو جو شخص اس عقل سے درست طور پہ کام لیتا رہے گا۔ وہ صراطِ مستقیم پہ ہوگا۔ وہ راستہ جو انبیاء علیہم السلام کا راستہ ہے۔ جس کی تعلیم انبیاء علیہم السلام دیتے رہے۔ لہٰذا یہ انسان کامیاب و کامران ہوگا۔

---

[1] مشکوٰۃ صفحہ ۴۳۰ بحوالہ بیہقی شعب الایمان [2] ترجمان القرآن صفحہ ۳۱۶/۱ مطبوعہ لاہور

عقل اور خواہشات

بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے ادراک سے عقل قاصر ہے۔ ایسے مواقع پہ عقل کو راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ راہنمائی انبیاء علیہم السلام سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ انسان کا کمال اس بات میں ہے کہ اپنی خواہشات کو عقل کے تابع رکھے جیساکہ آگے آ رہا ہے " وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى " یعنی عقلمند وہ شخص ہے۔ جس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکے رکھا۔ تو گویا خواہشات انسانی کو عقل کے تابع رکھنا انسان کا درجہ کمال ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی خواہشات کو پابند نہیں کر سکتا تو وہ اس کے لیے خرابی کا باعث ہوگا لہٰذا خواہشات کو عقل کا تابع اور عقل کو شریعتِ مطہرہ کا تابع ہونا چاہیئے۔ جو لوگ اس عمل میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے عقل سے صحیح طور پہ کام لیا اور فلاح نصیب ہوئی۔ برخلاف اس کے منکرین قیامت، منکرین محاسبہ، مشرک اور کافر لوگ ایسے ہیں جو عقل سلیم سے کام نہیں لیتے اور جہنم کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

سرکش گروہ

اسی مضمون کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا " فَاَمَّا مَنْ طَغٰى جس نے سرکشی کا راستہ اختیار کیا۔ اپنی عقل سلیم کو بروئے کار نہ لائے وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا اور دنیوی زندگی کو ہی ترجیح دی فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى تو ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہی ہو سکتا ہے۔

دنیوی زندگی کو آخرت پہ ترجیح دینے سے مراد یہ ہے۔ کہ اس شخص نے عقلی تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وقوعِ قیامت اور جزائے عمل کا انکار کیا۔ اس نے اس فانی دنیا سے اپنا تعلق اس طور پہ وابستہ کر لیا کہ آخرت کی منزل کو بالکل فراموش کر گیا۔ سورۃ قیامۃ میں یہی بات بیان کی گئی۔ " كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ " تم جلدی والی زندگی یعنی اس دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہو " وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ " اور آخرت کی دائمی زندگی کو فراموش کر رہے ہو۔ سورۃ دہر میں فرمایا " وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا " اور آگے آنے والے بوجھل دن یعنی قیامت کا خیال ہی نہیں کرتے۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ " يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا " کفر و شرک کے مرتکب یہ لوگ دنیا کی ظاہری زندگی کو خوب جانتے ہیں " وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ "

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صد ۴۵ پارہ ۳۰ مطبوعہ بمبئی

اور آخرت کی زندگی سے بالکل غافل ہو چکے ہیں۔ اسی لیے حضور نبی کریم علیہ السلام دعا کیا کرتے تھے۔ "اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا" ترمذی شریف[1] کی حدیث میں مذکور اس دعا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار! اس دنیا کو ہی ہمارا مبلغ علم اور منتہائے مقصود نہ بنا دے۔ بلکہ ہمیں وہ عقل سلیم عطا کر جو آخرت کی فکر کرے۔

آج امریکہ، روس، چین، برطانیہ، فرانس اور جرمنی جیسے کفار ممالک کا منتہائے مقصود دنیا کی زندگی ہی تو ہے۔ وہ سب دنیوی عروج اور دنیا کی ترقی ہی تو چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اصل کمال دنیا کا کمال ہی ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ دراصل یہ لوگ عقل سے صحیح طور پہ کام نہیں لیتے ورنہ آخرت کا انکار نہ کرتے۔ اور محض دنیا کو ہی ترجیح نہ دیتے۔ فرعون کا حال بھی ابتدائے سورۃ میں آچکا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا "اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی" فرعون کے پاس جائیں وہ سرکشی کا راستہ اختیار کر چکا ہے۔ اُس نے عقل سلیم کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

ایک دوسرے مقام پہ اللہ تعالےٰ نے منکرین قیامت کا بیان اس طرح نقل کیا ہے۔ کہ وہ کہتے ہیں "عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ" اے اللہ! ہم قیامت تک انتظار نہیں کر سکتے جو کچھ ہمیں دینا ہے یہیں پر دے دے بعض کے متعلق فرمایا "فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا" کہتے ہیں کہ مولا کریم! ہمیں دنیا میں ہی عطا کر دے اور اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں "وَمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ" اور ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں وہ لوگ تو دوسری زندگی کے قائل نہیں۔ اُسے تسلیم نہیں کرتے۔ اُسے بعید از عقل خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیشہ اس دنیا کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ اور آخرت کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی نفسانی خواہشات کو عقل کے تابع نہیں رکھا بلکہ عقل کو خواہشات کے تابع کر لیا ہے۔ لہٰذا انہیں لوگوں کے متعلق فرمایا "فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی" جہنم انہیں لوگوں کا ٹھکانا ہے۔ یہ وہی جہنم ہے جس کا ذکر پہلی آیات میں آچکا ہے کہ جب بڑا ہنگامہ برپا ہوگا تو جہنم

---

[1] ترمذی ص ۵۰۴

ایسے لوگوں کے سامنے کر دی جائے گی۔

خوف خدا والا گروہ

اس جہنمی فریق کا حال بیان کرنے کے بعد خوف خدا رکھنے والے گروہ کا ذکر آتا ہے وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جو شخص اس دنیا میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا۔ اُسے معلوم ہے کہ ایک نہ ایک دن اُسے اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ اور اس سے اسکے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ باز پرس ہو گی۔ ایسا شخص یقیناً برائی، معصیت، شرک اور کفر سے اجتناب کرے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى کہ وہ اپنے نفس کو خواہشات سے روکے گا فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى انہیں لوگوں کا ٹھکانا جنت ہے۔

خواہش نفسانی

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ خواہش کیا ہے جس کی مذمت کی گئی ہے۔ اور جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے " اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ " کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا، جس نے اپنی خواہش کو ہی معبود بنا لیا ہے۔ جدھر خواہش کہتی ہے۔ اُدھر ہی چلتا ہے۔ عقلی تقاضے پورے نہیں کرتا۔ شریعت کی پابندی نہیں کرتا۔ خوف خدا سے خالی ہے۔ محاسبے کی پروا نہیں، محض خواہش کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ گویا خواہش اس کا معبود ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت اور دوسری روایتوں[1] میں آتا ہے۔ کہ زمین و آسمان کے درمیان انسان کا سب سے بڑا دشمن خواہش ہے۔ اسی کی وجہ سے انسان گمراہ ہوتا ہے۔ ایمان و ہدایت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں فرمایا " وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ " اے داؤد (علیہ السلام) آپ اللہ کے خلیفہ ہیں۔ اُس کے نبی ہیں۔ دیکھنا خواہش کے پیچھے نہ چلنا، یہ تمہیں اللہ کے راستہ سے گمراہ کر دے گی۔

اتباع خواہش کو دوسرے الفاظ میں اتباع شیطان بھی کہہ سکتے ہیں۔ اہل ایمان کو حکم ہوتا ہے " يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ " یعنی اے ایمان والو قانون خداوندی کی پابندی کرتے ہوئے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ۔ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ یہی اتباع ہوی ہے۔ شیطان قانون کی پابندی سے

---

[1] تفسیر روح المعانی ص ۲۴/۱۹۶

روکتا ہے۔ اور اس وجہ سے انسان کی تباہی آتی، شرک، بدعت، عصبیت وغیرہ سب اتباعِ ہوی ہے۔ کیونکہ عقلی تقاضوں کو چھوڑ کر ہی انسان اِن برائیوں کیطرف مائل ہوتا ہے۔ اور اتباعِ شریعت کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔

جذبہ اور عقل

فرمایا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف کیا اور نفس کو خواہش سے روکا، جنت اسی کے مقدر میں ہے۔

انسان کی طبیعت میں مختلف قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے جو جذبہ عقل کے خلاف ہوگا وہ ہوی ہے۔ اور جو جذبہ عقل سے مطابقت رکھتا ہے وہ صحیح ہے۔ تو جس نے ربِّ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے سے خوف کھایا اور نفس کو خواہش سے روک کر عقلی تقاضوں کو پورا کیا، تو انہیں کے متعلق فرمایا فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى جنت انہی لوگوں کا ٹھکانا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا خاصہ بھی یہ ہے کہ انسان میں خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اسی بات کی دعوت دی تھی "وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى" آئیں تجھے تیرے رب کی طرف راہنمائی کروں تاکہ تیرے اندر خوف پیدا ہو جائے۔ کہ ایک دن تمہیں اللہ کے حضور کھڑا ہو کر اعمال کا حساب دینا ہے۔ جس نے اس بات کو سمجھ لیا اس کا ٹھکانا بہشت ہی ہوگا۔

وقوعِ قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے

دونوں گروہوں کے نتائج بیان کرنے کے بعد روئے سخن پھر مکذبین کی طرف ہوتا ہے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ یہ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں اَيَّانَ مُرْسٰىهَا کہ وہ کب قائم ہوگی اَرسٰی کا لفظی معنی جہاز کا لنگر انداز ہونا ہے۔ جب جہاز کو کسی جگہ ٹھہرانا مقصود ہوتا ہے۔ تو اس کے لنگر سمندر میں پھینک دیے جاتے ہیں۔ جس میں وہ ٹک جاتا ہے۔ ارسٰی کے معنی گاڑنے کے بھی ہیں جیسا کہ پہلی آیت میں گذر چکا ہے "وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا" اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو گاڑ دیا۔ اسی طرح قیامت کے لنگر انداز ہونے یا گاڑے جانے سے مراد اس کا برپا ہو جانا ہے۔ تو یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں۔ کہ قیامت کب واقع ہوگی۔ تو اس سوال کا جواب یہ دیا۔ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا آپ کو اس کے ذکر سے کیا واسطہ۔ یعنی آپ کو اس کے وقوع کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا قیامت کی انتہاء تو تیرے رب کی طرف ہے۔ وہی اس کے وقوع کا وقت جانتا ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ قیامت کی نشانیاں اور اس میں پیش آنے والے

واقعات سے خبردار کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے واقع ہونے کے وقت کے متعلق کسی نبی مقرب کو بھی خبردار نہیں کیا گیا۔" اِنَّ اللّٰہَ عِندَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ" وقوع قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ اے نبی علیہ السلام! اِنَّمَآ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ یَّخۡشٰھَا آپ خوفِ خدا رکھنے والے لوگوں کو ڈرانے والے ہیں۔ کہ نبی کا کام ڈرا دینا اور آگاہ کر دینا ہے۔ کہ اس قسم کے واقعات پیش آنے والے ہیں سنبھل جاؤ اور اُس مشکل وقت کے لیے اس وقت تیاری کر لو۔

اللہ تعالےٰ نے وقوع قیامت کے وقت کو خاص مصلحت کی خاطر مخفی رکھا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں فرمایا "اَکَادُ اُخۡفِیۡھَا" میں اس کو مخفی رکھتا ہوں "لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا تَسۡعٰی" تاکہ ہر نفس کو اس کے کیے کا پھل مل سکے۔ اس کی سعی کا ثمرہ اُس کے سامنے آسکے۔ مولانا روم ؒ نے خواہش نفسانی کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا ہے۔ ؎

خلق اطفال اند جز مرد خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ھوی

تمام لوگ بچے ہیں سوائے اس کے کوئی بالغ نہیں جو خواہشات سے بچا ہوا ہے۔ جو شخص خواہشات میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کو ڈرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ تو دنیوی زندگی میں منہمک ہے۔ اُسے خدا کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف ہی نہیں ہے۔ آپ تو اس شخص کو ڈرانے والے ہیں جس کے دل میں خوفِ خدا موجود ہے۔ باقی رہا قیامت کے وقت کا بتانا۔ تو یہ آپ کے فرائض منصبی میں شامل نہیں۔ آپ ان کے اس قسم کے سوالات سے نہ گھبرائیں۔

دنیوی زندگی بالکل مختصر ہے

فرمایا آج تو یہ لوگ قیامت کے واقع ہونے کا وقت پوچھتے ہیں۔ مگر جب وہ برپا ہو جائے گی کَاَنَّھُمۡ یَوۡمَ یَرَوۡنَھَا گویا جب وہ قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو خیال کریں گے لَمۡ یَلۡبَثُوۡٓا کہ ہم نہیں ٹھہرے دنیا میں اِلَّا عَشِیَّۃً اَوۡ ضُحٰھَا مگر ایک پچھلا پہر یا ایک دوپہر کا وقت گویا اس دن انہیں زندگی اس قدر مختصر محسوس ہوگی کہ وہ سمجھیں گے کہ ہم نے دنیا میں ایک پورا دن بھی نہیں گذارا۔ بس دن کا حصہ یعنی جس طرح دوپہر کا کچھ حصہ جلدی سے گذر جاتا ہے یا پچھلا پہر ہوتا ہے۔ ساٹھ، ستر یا سو سالہ زندگی اتنی مختصر معلوم ہوگی۔ یہ اس وجہ سے ہوگا کہ آخرت کی زندگی ابدی اور لامتناہی ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں دنیا کی پوری زندگی دن کے ایک حصہ کے برابر ہے۔ آج یہ لوگ بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ قیامت کا

انکار کرتے ہیں۔ اس کو قصے کہانیاں بتاتے ہیں۔ اور وقوع قیامت کو بعید خیال کرتے ہیں۔ مگر اُس دن اُن پر حقیقت منکشف ہو گی۔ اور یہ کف افسوس ملتے رہ جائیں گے۔

٢ ـ [illegible]
[illegible] .

سورة عبس

عـــہ ۳۰
درس اوّل

عبس ۸۰
(آیت ۱ تا ۱۶)

سُوْرَۃُ عَبَسَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اِثْنَتَانِ وَاَرْبَعُوْنَ اٰیَۃً وَّفِیْھَا رُکُوْعٌ وَّاحِدٌ وَّکَذَا اِلٰخ

سورۃ عبس مکی ہے اور یہ بیالیس ۴۲ آیتیں ہیں اور اس سورۃ میں ایک رکوع ہے اور ایسا ہی یہاں سے آخر قرآن تک (ہر سورۃ میں ایک ہی رکوع ہے)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ تعالٰی کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ۝۱ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ۝۲ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی ۝۳
اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی ۝۴ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۝۵ فَاَنْتَ لَہٗ
تَصَدّٰی ۝۶ وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ۝۷ وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی ۝۸
وَھُوَ یَخْشٰی ۝۹ فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی ۝۱۰ کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ ۝۱۱ فَمَنْ
شَآءَ ذَکَرَہٗ ۝۱۲ فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ ۝۱۳ مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَھَّرَۃٍ م ۝۱۴ وقف لازم
بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ ۝۱۵ کِرَامٍ م بَرَرَۃٍ ۝۱۶

ترجمہ: چین بجبیں ہوئے (پیغمبر علیہ السلام) اور التفات نہ کیا ۝۱ کہ ان کے پاس ایک نابینا شخص آیا ۝۲ اور آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ پاک ہو جائے ۝۳ یا وہ نصیحت حاصل کرلے تو وہ نصیحت اس کیلئے فائدہ مند ثابت ہو ۝۴ مگر جس شخص نے (آپ سے) استغناء برتا ۝۵ تو آپ ایسے شخص کے درپے ہوتے ہیں ۝۶ حالانکہ یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ ضرور ہی تزکیہ حاصل کرلے ۝۷ اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے ۝۸ اور وہ ڈرتا بھی ہے ۝۹ پس آپ اس سے تغافل اختیار کرتے ہیں ۝۱۰ خبردار یہ (آیات قرآن) نصیحت ہے ۝۱۱ پس جس کا جی چاہے اس نصیحت کو قبول کرلے۔ ۝۱۲ یہ نصیحت عزت والے صحیفوں میں لکھی ہے ۝۱۳ جو بلند اور پاک ہیں ۝۱۴ (وہ صحیفے) ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں ۝۱۵ جو بزرگ اور نیک ہیں ۝۱۶

نام اور کوائف اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ عبس ہے۔ صاحب روح المعانی نے اس کا نام سورۃ اعمٰی بتایا ہے اس کا تیسرا نام سورۃ سفرہ بھی ہے۔ مگر ان تینوں میں مشہور تر نام عبس ہی ہے۔ جو کہ سورۃ کی پہلی آیت میں آتا ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی بیالیس ۴۲ آیتیں ہیں یہ سورۃ ایک سو تیس ۱۳۰ الفاظ اور پانچسو پینتیس ۵۳۵ حروف پر مشتمل ہے۔

موضوع اس سورۃ کا مرکزی مضمون وہی ہے جو اس سے پہلی اور بعد والی سورتوں کا ہے یعنی قیامت کا ذکر: تاہم سورۃ کے ابتداء میں ایک اندھے شخص کا واقعہ بیان کر کے آپ کو اور آپ کے ماننے والوں کو تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے درمیانی حصہ میں اللہ تعالیٰ نے ناشکر گذاروں کا شکوہ کیا ہے۔ اور آخری حصہ میں قیامت کا مضمون ہے۔ اس مقام پر قیامت کا ذکر انسانی جماعت اور انسان کے خویش و اقرباء کو مدنظر رکھ کر کیا گیا ہے کہ اس اعتبار سے قیامت کے اثرات کیا ہوں گے۔ مثلاً فرمایا "فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ" یعنی جب قیامت کی چیخ سنائی دیگی تو انسان اپنی نجات کے لیے اس قدر متفکر ہو گا۔ کہ کسی قریبی رشتہ دار کی طرف توجہ نہیں کر سکے گا "لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ" اس دن ہر شخص اپنی نجات کے لیے چیخ چلائے گا۔ تو یہاں گویا اپنے خویش و اقرباء یا جماعت کے اعتبار سے قیامت کا مسئلہ سمجھایا گیا ہے۔

یاد رہے کہ گذشتہ سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر مختلف انداز سے بیان فرمایا ہے سورۃ قیٰمۃ میں قیامت کا حال نفس انسانی کے حالات کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے کہ انسانوں کے نفوس پر قیامت کا کیا اثر ہو گا۔ اسی طرح سورۃ دہر میں ابرار اور فجار کے انجام کے اعتبار سے قیامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ مرسلٰت میں انبیاء علیہم السلام کے لیے وقت مقرر کرنے کے اعتبار سے یہی مضمون بیان ہوا ہے یعنی "اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ" جب نبیوں کے لیے وقت مقرر کیا جائے گا۔ امتوں کو حاضر کیا جائے اُس دن تکذیب کرنے والوں کا بہت بُرا حشر ہو گا۔

سورہ نبا میں کسانوں اور کاشتکاروں کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر یہی مضمون دہرایا

ا روح المعانی ص ۲۹/۳۰

گیا ہے۔ وقوع قیامت کی مثال ایسی دی گئی ہے۔ جیسے کسان زمین میں دانہ بوتا ہے۔ اور پھر مقررہ وقت تک فصل کی کٹائی کا منتظر رہتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں قائم کیا ہے۔ تو اس کے لیے فیصلے کا ایک دن بھی مقرر ہے "اِنَّ یَوۡمَ الۡفَصۡلِ کَانَ مِیۡقَاتًا" اسی طرح سورۃ النّٰزِعٰت میں قانون جذب وکشش کو سامنے رکھ کر قیامت کا مسئلہ سمجھایا گیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز میں یہ قانون کام کر رہا ہے۔ چونکہ حکماء اس اصول کو سمجھتے ہیں۔ لہذا انکی ذہنیت کے مطابق یہ مسئلہ واضح کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات عصا اور یدبیضا کا ذکر ہے۔ چھڑی کا سانپ بن جانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بحر قلزم پہ پہنچنا اور پانی کا رُک جانا یہ قانونِ جذب وکشش کی وجہ سے ہے۔ یہی بات پیش کر کے قیامت پہ دلیل قائم کی ہے ایک دن انقلاب برپا ہو گا جب یہ قانون ٹوٹ جائے گا۔ قیامت کا بہت بڑا حادثہ پیش آئے گا جو ہر چیز کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔ اسی لحاظ سے قیامت کا مسئلہ بیان ہوا ہے۔

اگلی سورۃ میں یہ مضمون آئے گا۔ کہ کائنات کی تمام چیزوں پہ قیامت کا مجموعی اثر کیا ہو گا۔ اور اس سے بعد والی سورۃ میں اس بات کی وضاحت ہے کہ انسان کے باطن پر قیامت کا کیا اثر ہو گا۔ اُس سے اگلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے تاجرانہ ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر قیامت کا حال بیان فرمایا ہے۔ گویا ان تمام سورتوں میں تقریباً قیامت کا حال ہی مذکور ہے۔

پس منظر

اکثر مفسرین کرام[1] فرماتے ہیں کہ اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ فرمائی ہے۔ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ مکی زندگی میں حضور علیہ السلام ایک موقع پہ صنادید اور سرداران قریش کو اسلام کی باتیں سمجھا رہے تھے۔ درمنثور[2] والے نے ان کے نام ابوجہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ بتائے ہیں۔ اس دوران حضور علیہ السلام کا ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ آگیا۔ وہ قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس شخص نے حضور علیہ السلام کو آواز دینی شروع کی کہ اے اللہ کے رسول! عَلِّمۡنِیۡ مِمَّا عَلَّمَکَ اللّٰہُ[3] یعنی جو

---

[1] روح المعانی ص ۳۹/۳۰ و تفسیر کبیر ص ۵۴/۳۱ تفسیر ابن کثیر ص ۴۷۰/۴ وغیرہ

[2] درمنثور ص ۳۱۴/۶ و روح المعانی ص ۳۹/۳۰ [3] روح المعانی ص ۳۹/۳۰، درمنثور ص ۳۱۵/۶

کچھ اللہ تعالےٰ نے آپ کو سکھایا ہے۔ اس میں سے مجھے بھی کچھ تعلیم دیں۔ مگر حضور علیہ السلام نے اُس کی بات کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ کیونکہ اس وقت آپ کا اجتہاد یہ تھا کہ کفار و مشرکین کے لیے تبلیغ کا یہ سنہری موقع ہے۔ اگر بات ان کی سمجھ میں آگئی تو اسلام کے لیے زیادہ فائدہ مند ہوگی لہٰذا آپ نے اس نابینا شخص کی طرف التفات نہ فرمایا۔

دنیا کا ایک عام قانون اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ ہے۔ یعنی لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے۔ جب بڑے لوگ کسی بات کو تسلیم کر لیتے ہیں تو عام لوگ اُسے آسانی سے مان لیتے ہیں۔ اس لیے حضور علیہ السلام کا خیال درست تھا۔ اسکا تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ اولین مسلمانوں میں سے ہیں۔ آپ کی وجہ سے بہت لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ اور حضرت امیر حمزہؓ کے اسلام لانے کی وجہ سے اسلام کو بڑی تقویت حاصل ہوئی اسی بنا پر حضور علیہ السلام نے اُن سرداران کی طرف توجہ فرمائی۔ نابینا شخص کو اپنی جماعت کا فرد سمجھتے ہوئے اُسے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ وہ شخص بار بار آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتا رہا، لہٰذا آپ کو یہ چیز ناگوار گزری۔ چنانچہ اس بنا پر اللہ تعالےٰ نے تنبیہ نازل فرمائی۔

انسان کی ظاہری اور باطنی کیفیت

اس کا منشاء یہ ہے۔ کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے۔ جو بظاہر مہذب، شائستہ، دانا، خوشحال عاقل اور تمیز والے ہوتے ہیں مگر وہ لوگ غور و فکر کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں، گویا باطنی طور پر وہ نادان اور بیوقوف ہوتے ہیں۔ لوگوں کی دوسری قسم وہ ہے جن میں ظاہری طور پر لوگ بالکل کچھ نہیں ہوتے۔ عام معمولی خوبصورتی سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ جیسے نابینا ہونا۔ مال و اسباب کا فقدان ہونا، مگر باطنی طور پر یہ لوگ غور و فکر کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ علت و معلول کو سمجھتے ہیں۔ سبب اور مسبب کو سمجھتے ہیں (CAUSE AND FACT) کو جانتے ہیں۔ ان میں نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ گویا اُن کا باطن روشن ہوتا ہے۔

حضور علیہ السلام سے محبوبانہ خطاب

یہاں پہ اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔ حضور علیہ السلام ان لوگوں کی طرف زیادہ توجہ فرما رہے تھے جو بظاہر مہذب اور شائستہ نظر آتے تھے۔ مگر باطن میں بیوقوف تھے۔ اور اس شخص سے توجہ ہٹا رہے تھے جو ظاہر میں تو کوئی خاص شخصیت نہ تھی۔ مگر

باطن میں غور و فکر کا مادہ موجود تھا۔ اُس کی باطنی استعداد اور صلاحیت اچھی تھی۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو عتاب کے پیرایہ میں خطاب فرمایا مگر مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں۔ کہ یہاں پر عنوان تو عتاب کا ہے۔ مگر حقیقت میں عتاب نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے غائب کے صیغے میں نہایت محبوبانہ انداز میں بات شروع کی ہے۔ اور یہ بات سمجھادی ہے کہ جو لوگ باطل پر مُصر ہیں۔ اگرچہ وہ ظاہر میں مہذب ہیں۔ آپ ان کی طرف توجہ نہ فرمائیں۔ بلکہ ان لوگوں کی طرف نظر التفات فرمائیں۔ جو بظاہر معمولی آدمی ہیں مگر ان کا باطن پاک وصاف ہے۔ آپ کی توجہ کے یہ لوگ زیادہ مستحق ہیں۔ اس مضمون کو قرآن پاک میں عام طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً حضور علیہ السلام کو خطاب ہے "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" آپ اپنے رشتہ داروں کو ڈرائیں یا پھر "وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ" آپ مومنوں پر شفقت کے پر پھیلائیں جس طرح پرندہ اپنی شفقت کا پر اپنے بچوں پر پھیلا دیتا ہے تاکہ انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اسی طرح آپ بھی مومنین کے سر پر دستِ شفقت دراز کریں۔

آغازِ کلام

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا عَبَسَ جبین بجبیں ہوئے، تیوری چڑھائی، اُدھر التفات نہ کیا وَتَوَلّٰى اور منہ پھیر لیا، اس وجہ سے کہ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى آپ کے پاس ایک اندھا شخص آیا۔ حالانکہ اندھے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ وہ اور زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔

یہاں تک تو بات غائبانہ انداز میں تھی۔ اب آگے براہ راست خطاب ہوتا ہے۔ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى اور آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ پاک ہو جائے۔ اُسے تزکیہ حاصل ہو جائے اَوْ يَذَّكَّرُ یا نصیحت حاصل کرے فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى اور یہ نصیحت اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔ تزکیہ ابرار اور کاملین کی منزل ہے۔ کہ وہ ہر حالت میں اپنے آپ کو پاک صاف رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ اعلیٰ درجہ ہے۔ البتہ ابتدائی درجہ نصیحت حاصل کرنے کا ہے۔ اور وہ بتدریج نیکی کی منزل تک پہنچتا ہے تو گویا یہاں پر یہی بات بیان کی جارہی ہے۔ کہ آپ اس نابینا سے بے التفاتی نہ برتیں، ہو سکتا ہے یہی شخص نصیحت حاصل کرنے کے بعد

؎۱ بیان القرآن ص۱۲۶ طبع مجتبائی دہلی۔

تزکیہ کی منزل تک پہنچ جائے۔ اور درجہ کمال کو پالے یہی شخص اخلاق عالیہ کا مالک بن سکتا ہے۔

فرمایا اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی جو شخص آپ سے استغنی برتتا ہے۔ جیسا کہ صنادید قریش ہزار سمجھانے کے باوجود نہیں سمجھتے۔ آپ کو نعوذ باللہ مفتری اور کذاب کہتے ہیں۔ آپ کو نبی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بیہودہ قسم کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اللہ کی کتاب کو نہیں مانتے۔ اگرچہ ظاہری طور پر ان کے پاس مال و دولت ہے۔ مہذب اور شائستہ نظر آتے ہیں۔ مگر آپ سے مستغنی ہیں۔ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی اور آپ ایسے شخص کے درپے ہوتے ہیں۔ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی حالانکہ یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ ضرور ہی تزکیہ حاصل کرلیں۔

حضور علیہ السلام کا کام پیغام پہنچا دینا ہے

بعض مفسرین فرماتے ہیں[1] کہ حضور علیہ السلام سے اس انداز میں خطاب عتاب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس افراط سے روکا ہے۔ جو آپ لوگوں کو سمجھانے اور تبلیغ کرنے میں رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا " لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ " کیا آپ گلا گھونٹ کر ہلاک ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ حالانکہ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ " آپ اُن پر بمنزلہ داروغہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ " اِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ " آپ کا کام تو صرف بات ان تک پہنچا دینا ہے۔ آپ اپنا فریضہ مکمل طور پر ادا کر دیں۔ احکام ان تک پہنچا دیں۔ کل آپ سے یہ نہیں سوال ہوگا کہ وہ ایمان کیوں نہیں لائے۔ کسی ہادی یا مبلغ سے صرف یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنا فریضہ پورا کیا ہے یا نہیں۔ کوئی مانے یا نہ مانے، اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے " فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ " آپ کا کام پہنچانا ہے۔ اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔ چونکہ حضور علیہ السلام کو بہت اشتیاق تھا کہ لوگ ایمان لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ آپ اس معاملہ میں اتنا انہماک نہ فرمائیں۔ محض اپنا فریضہ ادا کرتے رہیں۔ اور جو لوگ دین کے ساتھ رغبت رکھتے ہیں۔ ان کی طرف زیادہ توجہ دیں

تبلیغ کے لیے تقدیم و تاخیر کا اصول

فرمایا وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی جو آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے۔ وَهُوَ يَخْشٰی اور وہ ڈرتا بھی ہے۔ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی آپ اس سے تغافل اختیار کرتے ہیں۔ یہ بات

---

[1] روح المعانی ص ۴۱/۳۰

درست نہیں ہے۔ تو یہ مسئلہ در پیش ہے، کہ ایک طرف کافر اور مشرک ہے اور دوسری طرف ایماندار ہے۔ تو تعلیم و تربیت میں مقدم کس کو رکھا جائے۔ عقل کا فیصلہ تو یہ ہے کہ کافر کو مقدم رکھنا چاہیے کیونکہ وہ کفر میں مبتلا ہے اور اُسے کفر سے بچانا بڑی بات ہے برخلاف اس کے کہ ایمان والا تو پہلے ہی موصوف بالایمان ہے۔ اگر اس کی تربیت مؤخر بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں مگر ایسا نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں جو اصول بیان فرمایا ہے۔ وہ اس کا الٹ ہے، قرآن پاک چاہتا ہے۔ کہ کافر و مشرک جو خطرناک بیماری میں مبتلا ہے اس کی بجائے اس شخص پر توجہ دی جائے جو حق کا متلاشی ہے۔

اس کی مثال ایسے ہے کہ کسی ڈاکٹر کے پاس دو مریض آتے ہیں ایک ہیضے جیسے خطرناک بیماری کا مریض ہے جب کہ دوسرا صرف زکام میں مبتلا ہے۔ ایسی صورت میں عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ ڈاکٹر ہیضے کے مریض کی طرف فوری توجہ دے اور زکام والے کو مؤخر کر دے مگر یہاں پر اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرمایا کہ ہیضے کا مریض اگرچہ مہلک بیماری میں مبتلا ہے۔ مگر وہ علاج کا طالب نہیں۔ برخلاف اس کے زکام جیسی معمولی بیماری کا مریض علاج کا طالب ہے۔ لہٰذا پہلے اس کی طرف توجہ کی جائے گی۔

ایک طرف نابینا شخص ہے۔ جو ہدایت کا طالب ہے اور دوسری طرف کفار ہیں جو مُصر علی الکفر ہیں۔ لہٰذا ان کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی بلکہ اس نابینا آدمی کی دلجوئی کی جائے گی۔ جو حق کا متلاشی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں کے اسلام لانے کے لیے بہت زیادہ حریص ہونا بھی کوئی ضروری نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس بات سے روک دیا۔ اور فرمایا کہ اپنا فرض پورا کرو۔ "وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ" آپ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ جہنم میں کیوں گئے بلکہ یہ تو دوزخیوں سے سوال ہو گا "مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ" تم جہنم میں کس وجہ سے آئے۔ اس کی جوابدہی انہیں خود کرنی ہوگی۔ آپ کا فرض تو یہ ہے "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ" آپ پر جو کچھ نازل ہوا ہے اُسے پہنچا دیں" وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ" اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا، "فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ" تو آپ نے گویا حق رسالت ادا نہیں کیا۔ لہٰذا مبلغین کا کام یہ ہے کہ خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیں کوئی نہیں مانتا تو اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔

اس کی ذمہ داری مبلغ پر نہیں ہے۔ ہاں اگر پہنچانے میں کوتاہی کرتا ہے۔ تو اس کا ذمہ دار ہے۔

تبلیغ دین کا فریضہ

اس زمانے میں تو پہنچانے کا بھی کوئی معقول پروگرام نہیں ہے۔ یہ تبلیغی جماعتیں جو دور دراز علاقوں تک نکل رہی ہیں۔ دین کی بڑی خدمت کر رہی ہیں۔ ان کے دلوں میں دین کا جذبہ موجزن ہے۔ خدا کا پیغام اپنوں تک پہنچانا بھی بڑی بات ہے۔ تاہم یہ کوشش ایک فیصد سے زیادہ نہیں۔ ننانوے فی صد لوگ اس سے محروم ہی ہیں۔ مسلمان قوم کی دولت۔ ان کی سلطنتیں اور ان کا سرمایہ عیاشی فحاشی، فیشن اور دیگر واہیات چیزوں پر خرچ ہو رہا ہے۔ بلڈنگوں کی تعمیر، زیب و زینت کے کاموں اور رسم و رواج کی نذر ہو رہا ہے۔ کہیں شادی بیاہ کی رسومات پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ کہیں موت کی رسمیں ادا ہو رہی ہیں۔ مگر دین کی تعلیم و اشاعت پر کتنی رقم خرچ ہوتی ہے۔ یہ تو صفر کے برابر ہے۔ نہ سربراہان مملکت اس طرف توجہ دیتے ہیں۔ اور نہ امراء اور تاجر اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ لے دے کر یہ تبلیغی جماعتیں ہیں، جو دنیا بھر میں سرگرم عمل ہیں۔ عرب ممالک سے لوگ یہاں آتے ہیں۔ یہاں کی جماعتیں سپین ہانگ کانگ اور جاپان تک پہنچی ہیں۔ اللہ تعالٰے انہیں پھر سے یہ جذبہ عطا کرے۔ ان کے دلوں کو اس فریضہ کی طرف راغب کرے تاکہ وہ اپنے مشن کو سمجھ سکیں۔

قرآن پاک نصیحت ہے

فرمایا جو شخص اعراض کرتا ہے کَلَّآ خبردار! ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ آپ اعراض کرنے والے کی طرف زیادہ توجہ دیں اور جو دوڑ کر آتا ہے۔ صلاحیّت کا مالک ہے۔ غور و فکر کرنے والا ہے۔ اس سے آپ توجہ ہٹا لیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اِنَّھَا قرآن پاک کی یہ آیتیں یا یہ سورۃ مبارکہ تَذْكِرَةٌ نصیحت ہے۔ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ جس کا جی چاہے اس نصیحت کو قبول کرے کسی کے سر پہ یہ نصیحت ٹھونسی نہیں جائے گی۔ کسی کے دل میں زبردستی نہیں اتاری جائیگی۔ یہ تو خوشی کا سودا ہے "قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" ہدایت بھی واضح ہو گئی ہے اور گمراہی بھی۔ اپنی خوشی سے "فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ" جس کا جی چاہے ایمان لائے، جس کا جی چاہے کفر کرے اگر کفر کرے گا تو آگے سزا بھی تیار ہے۔ مگر اس بارے میں جبر نہیں ہو گا۔ کہ جبراً کسی کو ہدایت دیکر مسلمان بنایا جائے۔ یہ بات نہیں ہو گی۔

فرمایا فِیْ صُحُفٍ مُّکَرَّمَةٍ یہ نصیحت بلند عزت والے صحیفوں میں لکھی ہوئی ہے۔ لوح محفوظ میں مکتوب ہے۔ مُکَرَّمَةٍ کے معنی عزت والے صحیفے۔ قرآن پاک کی ہر سورۃ صحیفہ ہے مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بلند ہیں اور پاک ہیں۔ بلند اس اعتبار سے کہ جو شخص ان پہ ایمان لائے گا۔ بلند اخلاق سے موصوف ہوگا۔ اور پاکیزہ اس وجہ سے کہ ان پہ ایمان لانے والا خدا کی وحدانیت علم اور پاکیزہ اخلاق سے روشناس ہوگا۔ کیونکہ یہ پاکیزہ تعلیم دیتے ہیں۔ نیز ان کی ایک صفت یہ بھی ہے۔ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ایسے لکھنے والے ہاتھوں میں ہیں جو بزرگ ہیں اور بڑے نیک ہیں۔ اللہ کریم کے ملائکہ ان کو لاتے ہیں۔ اور وہ لکھنے پر مامور ہیں۔ دنیا میں جن کے پاس یہ قرآن پاک آتا ہے۔ اُن کا بھی فرض ہے۔ کہ وہ بھی پاک صاف ہو کر اس کو لیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ خدائی سفیر بن کر اس کی پاکیزہ کتاب کا پیغام دوسروں تک پہنچائیں۔ یہ کام پاکیزہ اخلاق کے حاملین ہی انجام دے سکتے ہیں، گندی اغراض اور ناپاک ذہنیت کے لوگ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لہذا جو شخص نور ایمان سے منور ہے۔ اور خوشی سے اُسے قبول کرتا ہے۔ اُس پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔ آپ اس کی طرف زیادہ توجہ دیں اور جو کوئی اعراض کرتا ہے۔ اس کی طرف متوجہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔

عمّ-۳۰ عبس ۸۰

درس دوم (آیت ۱۷ تا ۳۲)

قُتِلَ الْإِنسَانُ مَآ أَكْفَرَهُ ﴿١٧﴾ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ﴿١٨﴾ مِن نُّطْفَةٍ
خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ﴿١٩﴾ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ﴿٢١﴾
ثُمَّ إِذَا شَآءَ أَنشَرَهُ ﴿٢٢﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ أَمَرَهُ ﴿٢٣﴾ فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ
إِلَىٰ طَعَامِهِ ﴿٢٤﴾ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿٢٥﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ
شَقًّا ﴿٢٦﴾ فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ﴿٢٧﴾ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ﴿٢٨﴾ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ﴿٢٩﴾
وَحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿٣٠﴾ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ﴿٣١﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ﴿٣٢﴾

مارا جائے انسان کس قدر ناشکر گذار ہے وہ (۱۷) کس چیز سے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے؟ (۱۸)
ایک حقیر قطرہ آب سے اللہ تعالیٰ نے اس (انسان) کو پیدا کیا اور اس کا ایک اندازہ ٹھہرایا (۱۹) پھر
اس کے لیے راستہ آسان کیا (۲۰) پھر اُس پر موت طاری کی پھر اس کو قبر میں ڈالدیا (۲۱)
پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا (دوبارہ) اسکو زندہ کرکے کھڑا کرے گا (۲۲) خبردار نہیں پورا کیا انسان
نے ابھی تک جو اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا تھا (۲۳) پس چاہیئے کہ انسان اپنے کھانے کی طرف
دیکھے (۲۴) کہ بے شک ہم نے بہایا پانی کو بہانا (۲۵) پھر پھاڑا ہم نے زمین کو پھاڑنا (۲۶) پھر
اس زمین میں ہم نے اناج اگایا (۲۷) اور انگور اور ترکاریاں (۲۸) اور زیتون اور کھجوریں (۲۹)
اور گھنے باغات (۳۰) اور پھل اور چارا (۳۱) سامان زیست ہے تمہارے لیے اور تمہارے
مویشیوں کے لیے (۳۲)

گذشتہ سے پیوستہ اس سورۃ مبارکہ کا پہلا حصہ تمہید ہے اُس آخری حصے کی جو سورۃ کا اصل موضوع ہے ۔
ایک نابینا شخص جو بظاہر محتاج ہے ۔ ظاہری خوبصورتی سے بھی محروم ہے ۔ مگر وہ حقیقت کو سمجھنے
کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ اور غور و فکر کرتا ہے ۔ اُسکے متعلق اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کو عتاب کے طریق پہ فرمایا کہ ایسے شخص سے روگردانی نہیں کرنی چاہیئے ۔ اس کے برخلاف
جو ظاہر میں مہذب، شائستہ، خوشحال، آسودہ حال اور خوبصورت ہیں، آپ ان کی طرف زیادہ

توجہ فرماتے ہیں ۔ حالانکہ وہ ہدایت کے طالب ہی نہیں ۔ البتہ یہ نابینا شخص طلب گار بن کر آیا ہے اس کے سینے میں جذبہ ہے ، اور نیت بھی درست ہے یہ توجہ کا زیادہ مستحق ہے ۔

اس کے بعد قرآن پاک کو تذکرہ یعنی نصیحت کہا گیا ہے ۔ لہٰذا جو شخص چاہے اس سے نصیحت پکڑ لے ۔ یہ کتاب عزت والے اوراق میں لکھی ہوئی ہے یہ معزز اور بلند ہے ۔ اس میں تغیر و تبدل یا آمیزش کا کوئی امکان نہیں " لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ " یعنی آگے پیچھے کسی طرف سے بھی اس میں باطل شامل نہیں ہو سکتا " تَنْزِيلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ " یہ تمام کائنات کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے ۔ پاکیزہ کتاب ہے جو بھی اس کی تلاوت کرتا ہے ، وہ اللہ کی وحدانیت ، خدا پرستی ، نیکی کامل درجے کے اخلاق اور اعلیٰ درجے کے اخلاق اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرتا ہے ۔ یہ قرآن پاک بزرگ اور نیک لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے ۔ اسے عالم بالا سے لاتے پر ملائکہ مامور ہیں اور اس دنیا میں حضرات صحابہؓ منجملہ اُن کے حضرت ابوبکرؓ ، عثمانؓ ، علیؓ ، عمرؓ ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھ کر دوسروں تک پہنچایا ۔ یہ سب لوگ نیک اور بزرگ ہیں ۔ خدائی سفیر ہیں ۔ جب یہ لوگ قرآن پاک کو لے کر آگے بڑھیں گے تو کامیابی حاصل کریں گے ۔

حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ

یہ نابینا شخص حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا موذن[۱] تھا آپ سے قرابت داری بھی تھی ۔ یہ اُم المومنین حضرت خدیجہؓ کی خالہ کے فرزند[۲] تھے ۔ ان کی صلاحیت کا یہ عالم تھا ۔ کہ حضور علیہ السلام سفر پر تشریف لے گئے تو اپنے بعد دو دفعہ انہیں مدینہ میں قائم مقام مقرر فرمایا[۳] ۔ اس نابینا شخص کے متعلق حضرت شیخ الاسلامؒ تفسیر[۴] میں لکھتے ہیں کہ آپ زرہ پہنے ہاتھ میں جھنڈا لیے قادسیہ کی جنگ میں شریک ہوئے ۔ اور اسی معرکہ میں شہید ہوئے ۔ باوجود نابینا ہونے کے آپ نے بہادری کے جوہر دکھلائے ۔

---

۱ تفسیر ابن کثیر ص ۴۷۱ ج ۴ ۲ روح المعانی ص ۳۹ جلد ۳۰

۳ معالم التنزیل ص ۲۱۲ ج ۴ ، مظہری ص ۱۹۷ ج ۱۰ ، تفسیر کبیر ص ۵۴ ج ۳۱

۴ تفسیر عثمانی ص ۷۷۱ و معالم التنزیل ص ۲۱۲ ج ۴ روح المعانی ص ۳۹ ج ۳۰ ۔

غربار و مساکین اوّلین متبعین ہیں

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کہیں یہ شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ کہ شاید اسلام صرف بڑے لوگوں کا خیال رکھتا ہے۔ اور غریب و معذور لوگوں کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس تنبیہ کے ذریعے اس باطل خیال کو بھی ردّ فرما دیا۔ حالانکہ ابتدا میں اسلام قبول کرنے والے یہی غریب، مساکین اور نادار لوگ ہوتے ہیں هُمْ اَتْبَاعُ الرُّسُلِ[1] انبیاء علیہم السلام کا پیروکار یہی گروہ ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں موجود ہے "وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" اور یہی بات اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی "وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ" ایسے غریب لوگوں کو مت دھکیلو "فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" اگر ایسا کرو گے تو ظالم بن جاؤ گے۔ ہر وقت اُن پہ نگاہ شفقت رکھو۔ کیا آپ دنیا کی زینت کو چاہتے ہیں اسکی ہر گز ضرورت نہیں۔ لہٰذا جو لوگ خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ وہ اگرچہ کمزور و ضعیف ہیں مگر آپ اپنی نگاہ شفقت انہیں کی طرف رکھیں۔ گویا یہ معاملہ بالکل صاف کر دیا کہ اسلام امتیازی سلوک کا روادار نہیں ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی صداقت اور سب سے بڑا کمال ہے۔

انسان کی طرف سے ناشکر گزاری

ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے معذور اور ضعیف اشخاص سے بات کو شروع کیا۔ اب اس مقام پہ ان لوگوں کا شکوہ بیان کیا ہے۔ جو بظاہر دولت مند اور آسودہ حال ہیں۔ مگر باطن میں نادان ہیں فرمایا قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ایسا انسان مارا جائے یہ کسقدر ناشکر گزار ہے۔ یہاں انسان سے مراد کافر اور مشرک ہے۔ قُتِلَ مجہول کا صیغہ ہے۔ بددعا یا زجر و توبیخ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جب لفظ قُتِلَ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو اس کا مطلب ہوتا ہے خدا کرے یہ مارا جائے۔ تباہ و برباد ہو۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو بددعا کرنے کی ضرورت نہیں وہ تو مالک ہے جب چاہے ہلاک کر دے یہ محض ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ کہ ایسا شخص تباہ کرنے کے لائق ہے۔ کہ کس قدر ناشکر گذار ہے مَآ اَكْفَرَهٗ فعل تعجب ہے کہ کتنا ناشکر گزار ہے۔ کفر و شرک پر مصر ہے۔ قرآن پاک جیسی پاکیزہ کتاب سے روگردانی کرتا ہے۔ جو انسان کو اس کے فرائض سے آگاہ

---

[1] بخاری ص۴ ج۱، مسلم ص۹۸ ج۲

کرتی ہے۔ اُسے توحید اور ایمان کی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔ اخلاق عالیہ کی تعلیم دیتی ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ قرآن پاک ایک بہت بڑی روحانی نعمت ہے۔ مادی نعمتوں کا ذکر آگے آرہا ہے۔ جو ہر ایک کو حاصل ہے۔ لہذا انسان کو شکر گذار بننا چاہیئے۔ کفران نعمت نہیں کرنا چاہیئے۔

تخلیق انسانی

فرمایا! انسان کو غور کرنا چاہیئے۔ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے کس چیز سے پیدا کیا ہے۔ ذرا اپنی تخلیق پہ غور تو کرے اپنی ہستی کا جائزہ تو لے۔ فرمایا اگر شرم وحیا کی وجہ سے خود نہیں بتا سکتا تو ہم خود بتلاتے ہیں مِنْ نُّطْفَةٍ انسان کو حقیر قطرہ آب سے پیدا کیا وہ قطرہ جو پیشاب کے راستے سے خارج ہوتا ہے۔ اور خون اور گندگی سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ" کیا ہم نے تمہیں حقیر قطرہ آب سے پیدا نہیں کیا۔ جو ناپاک اور نجس ہوتا ہے۔ جو کپڑے سے لگ جائے تو نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اس کو صاف کرنا پڑتا ہے۔ جو جسم سے لگ جائے تو اس کا دھونا فرض ہو جاتا ہے۔ کیا انسان کو ایسے حقیر قطرہ آب سے پیدا نہیں کیا؟

اور پھر دیکھو خَلَقَهٗ اللہ تعالیٰ نے انسان کو حقیر قطرہ آب سے پیدا کرکے کس طرح درجہ کمال تک پہنچایا اور فَقَدَّرَهٗ اس کا ایک اندازہ ٹھہرایا۔ کہ اس کے مختلف اعضاء اس طرح ہونے چاہئیں۔ اور اس کو کائنات کی خوبصورت ترین مخلوق بنا دیا۔ جیسے سورۃ التین میں فرمایا "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" یعنی اللہ تعالیٰ نے انسانی ڈھانچہ نہایت احسن طریقے پہ بنایا۔ اس کے قویٰ اور اعضاء، کمال درجے کے اعتدال پہ پیدا فرمائے "اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ" جس نے تمام اعضاء وقویٰ کو تمام خوبیوں کے ساتھ ٹھیک ٹھیک بنایا "فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ" اور جس صورت میں چاہا مرکب کر دیا۔ جیسی صورت اللہ نے پسند فرمائی ویسی ہی بنا دی۔ دوسری جگہ فرمایا "هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ" اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثال اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ جو شکم مادر میں قطرہ آب پہ تمہاری تصویر بناتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی خالق ومعبود نہیں۔ کوئی پیدا کرنے والا نہیں۔ کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں۔ تم مسیح ابن مریم (علیہ السلام) کو خدا بنائے بیٹھے ہو

شرم وحیا کرنی چاہیے۔

راہ ہدایت

انسان کو پیدا کرنے کے بعد فرمایا ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ پھر اس کے لیے راستہ آسان کیا شکم مادر سے باہر آنے کا راستہ بھی اور دنیا میں چلنے کے لیے بھی انسان کے لیے راستہ واضح کیا۔ یہ راستہ خواہ سفر کا راستہ ہو۔ یا تجارت، علم کا راستہ ہو یا سیاست کا سب راستے اللہ نے آسان بنا دیے۔ خاص طور پر دین اور ایمان کا راستہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا۔ کہ اس راستہ پر چل کر منزل مراد کو پہنچ جاؤ گے۔ اسی لیے فرمایا "وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ" ہم نے انسان کی راہنمائی دو بڑی گھاٹیوں کی طرف کی۔ یہ بڑی گھاٹیاں خیر و شر کی گھاٹیاں ہیں۔ ایمان اور کفر کی گھاٹیاں ہیں۔ ہدایت اور ضلالت کی گھاٹیاں ہیں۔ جن کو ہم نے واضح کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے کس قدر احسان فرمایا۔

موت اور تدفین

فرمایا پھر کیا ہوا ثُمَّ اَمَاتَهٗ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ انسان پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ جیسا فرمایا "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ج موت کے لیے وقت بھی مقرر ہے۔ موت آنے کے بعد فرمایا فَاَقْبَرَهٗ انسان کو قبر میں دفن کرنے کا حکم دیا۔ فرمایا مردہ کو یونہی کھلا نہ چھوڑ دو۔ جیسے مجوسی مردے کو اپنے ناؤوس (مجوس کا قبرستان) میں چھوڑ دیتے ہیں کہ پرندے اس کو نوچتے ہیں۔ اور مردے کی بے قدری ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ مُردے جلاؤ بھی نہیں۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ بلکہ مرنے والے کو قبر میں داخل کرو۔ چنانچہ فقہاء کرام نے مُردے کی تدفین کو واجب قرار دیا ہے[1]۔

ہندو لوگ اور چینی باشندے مُردے کو جلاتے ہیں۔ مسلمان جب نئے نئے ہندوستان میں آئے۔ اور انہوں نے مُردوں کو دفن کیا۔ تو ان پر طرح طرح کے اعتراضات کیے گئے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس قسم کے اعتراضات کے باقاعدہ جواب دیے۔ کہتے ہیں کہ کوئی برہمن مسلمانوں کی عبادات کو بغور دیکھتا رہا۔ آخر اس نے ایک عالم دین سے پوچھا کہ آپ کی باقی ساری باتیں تو اچھی ہیں مگر مُردے کی تدفین سے زمین متعفن ہو جاتی۔ آپ کی یہ بات اچھی نہیں ہے۔ اُس عالم نے برہمن کو سمجھایا کہ انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ یعنی جسم اور

---

[1] البدائع الصنائع ص ۳۱۸ ج ۱

روح جسم کا مادہ مٹی ہے۔ اور اس میں عناصر اربعہ شامل ہیں۔ جب کہ روح ایک لطیف چیز ہے۔ جو عالم بالا سے آتی ہے۔ اسے ہندو اور عیسائی بھی مانتے ہیں۔ بلکہ دنیا کی اکثر اقوام اس بات کو تسلیم کرتی ہیں۔ اب روح انسانی جسم کی مربی یعنی تربیت کرنے والی ہے۔ اور بمنزلہ باپ کے ہے۔ تو پنڈت جی! ذرا یہ تو بتاؤ کہ جب کوئی شخص سفر پہ روانہ ہوتا ہے۔ تو اپنے بیٹے کو اس کی ماں کے سپرد کرتا ہے۔ یا اس عورت کے جو صرف کھانا پکاتی ہے۔ ہندو نے جواب دیا۔ ظاہر ہے کہ ماں کے سپرد کرنا ہی بہتر ہے۔ تو اس عالم دین نے فرمایا کہ انسان کے لیے مٹی یا زمین بمنزلہ حقیقی ماں کے ہے۔ اور آگ کا کام صرف کھانا پکانا ہے۔ اور یہ ہر چیز کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ چونکہ روح بمنزلہ باپ کے ہے۔ اس لیے جب یہ جسم سے جدا ہونے لگتی ہے۔ تو اسے اس مردہ (جسم) کو زمین یعنی حقیقی ماں کے سپرد کرنا چاہیئے یا آگ کے جو صرف کھانا پکاتی ہے۔ بلکہ جلا ڈالتی ہے۔ تو اس طرح اس برہمن کو ماننا پڑا کہ مسلمانوں کا دفن کرنے کا طریقہ ہی بہتر ہے۔[1]

دیانند سرسوتی نے مولانا نانوتوی کے سامنے اعتراض پیش کیا تھا۔ کہ مسلمان مُردے کو دفن کر کے زمین کو خراب کرتے ہیں۔ تو آپ نے بہت سے جوابات دیے۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی تھا۔ کہ مُردے کا اگر کوئی فضلہ ہو تو اس کے پیٹ کے اندر ہی ہوتا ہے۔ اور ظاہر میں اس کو نہلا دھلا کر اور کفن پہنا کر دفن کیا جاتا ہے۔ مگر تم ہر وقت بول و براز کرتے ہو جس سے بدبو اٹھتی ہے۔ تعفن پیدا ہوتا ہے۔ ہوا بھی خراب ہوتی ہے۔ اس لیے ہندوؤں کو چاہیئے کہ اپنا بول و براز کپڑے میں لپیٹ کر رکھیں اور پھر اسے جلائیں۔ تاکہ زمین گندی نہ ہو۔[2] ظاہر ہے کہ مردہ دفن کرنے کی نسبت بول و براز زمین پر پھینکنے سے زمین زیادہ گندی ہوتی ہے۔ جب اس سے زمین اور فضا خراب نہیں ہوتی تو باعزت طریقے سے مردہ دفن کرنے سے زمین کیسے خراب ہو گی۔

بہر حال مردے کو جلانا اچھا نہیں۔ آدم علیہ السلام سے لے کر تمام شرائع میں مُردوں کو دفن کرنے کا ہی حکم ہے۔ اور اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے۔ کہ دفن کے کچھ عرصہ بعد مُردے کا جسم بکھرنے لگتا ہے۔ تو اس کے تمام عناصر اپنے اپنے مرکز کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ہوائی حصہ

---

[1] انتصار الاسلام ص ۴۴ طبع کتب خانہ اعزازیہ دیوبند [2] انتصار الاسلام ص ۴۲

ہوا میں چلا جاتا ہے۔ خاکی عنصر خاک میں مل جاتا ہے۔ آبی حصہ پانی میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور آتشی حصہ آگ میں چلا جاتا ہے۔ تو یہ فطری عمل درست ہے۔ کیا سب کو جلا کر سب کا ستیاناس کر دینا بہتر ہے۔ عقل اسے تسلیم نہیں کرتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر دفن کرنے سے بدبو پیدا ہوتی ہے تو جلانے سے اس سے بھی زیادہ تعفن پیدا ہوتا ہے۔ ہوا گندی ہو جاتی ہے۔ مرگھٹوں کے ارد گرد سخت بدبو پھیل جاتی ہے۔ لہٰذا یہ بیوقوفی کا اعتراض ہے۔ کہ مسلمان مردوں کو دفن کیوں کرتے ہیں۔

بعث بعد الموت

موت طاری کرنے اور قبر میں دفن کرنے کے بعد فرمایا ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ جب اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ دوبارہ زندہ کر کے کھڑا کر دے گا۔ تاکہ اس سے دنیوی زندگی کا حساب کتاب لیا جائے۔ مگر حالت یہ ہے کہ كَلَّا خبردار لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا، انسان نے اس کو پورا نہیں کیا۔ اسے چاہیئے تھا۔ کہ خدا کی وحدانیت کو مانتا، اس کی کتاب پر ایمان لاتا۔ اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرتا۔ مگر افسوس انسان نے ایسا نہیں کیا۔ اسے چاہیے تھا کہ خدا کی نعمتوں کی قدر کرتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا۔ وہ اپنی پیدائش پر ہی غور کرتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ نامہ سے انسان کو کس کمال تک پہنچایا۔

خوراک کی بہم رسانی

پھر فرمایا۔ اگر انسان کو اپنی تخلیق کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ تو اپنے طعام کی طرف ہی دیکھ لے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت سے انسان کی خوراک کا کیسا بندوبست کیا۔ فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف ہی دیکھ لے۔ کہ کوئی فردِ واحد اپنے لیے خوراک مہیا نہیں کر سکتا۔ خوراک کی بہم رسانی کے لیے بے شمار قوتیں مصروفِ کار ہوتی ہیں۔ تب جا کر انسان کو ایک لقمہ خوراک یا ایک گلاس پانی میسر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیںؒ[1] اگر انسان کو کہا جائے کہ اسباب کے دائرے میں رہ کر ذرا اپنے لیے روٹی تیار کر لو۔ تو وہ صبح سے شام تک کام کرنے کے باوجود روٹی مہیا نہ کر سکے۔ باقی ضروریات تو اس کے علاوہ ہیں۔ کوئی شخص ہل چلائے۔ بیج ڈالے فصل پکنے تک اس کی حفاظت کرے، پانی لگائے، وقت پر فصل کاٹے۔ غلہ کو پیس کر آٹا تیار کرے۔ پھر روٹی پکانے کے آلات مہیا کرے۔ تو یہ اس قدر کٹھن کام ہے۔ کہ کوئی شخص خود اپنے

---

[1] البدور البازغہ ص۶۶ مطبوعہ بجنور (یوپی)

لیے روٹی بہم پہنچانے پر قادر نہیں ہے۔ چہ جائیکہ وہ اپنے لیے اسی طرح کپڑا مہیا کرے، سواری اور دیگر ضروریات کا انتظام کرے۔

یہ تو قدرت نے ایسا انتظام کر دیا۔ کہ مختلف قوتیں اپنے اپنے مقام پہ کام کر رہی ہیں، کوئی فصل اگاتا ہے۔ کوئی آٹا پیستا ہے۔ کوئی آلات مہیا کرتا ہے۔ کوئی روٹی پکاتا ہے۔ اور کوئی کھاتا ہے۔ تو اس طرح گویا سارے اسباب مل کر انسان کی خوراک کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ انسان ذرا اپنے طعام کی طرف ہی دیکھے کہ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا بے شک ہم نے بہایا پانی کو بہانا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا پھر پھاڑا زمین کو پھاڑنا ورنہ اتنا نرم و نازک پودا زمین سے باہر نہ آسکتا۔ فَاَنْبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا پھر اس میں ہم نے اناج اگایا۔ وَعِنَبًا اور انگور وَقَضْبًا اور ترکاریاں جنہیں کچا بھی کھایا جاتا ہے۔ جیسے گاجر، مولی وغیرہ وَزَیْتُوْنًا اور زیتون وَنَخْلًا اور کھجوریں وَحَدَآئِقَ غُلْبًا اور گھنے باغات وَفَاکِهَةً اور پھل وَاَبًّا اور چارا۔ یعنی یہ تمام چیزیں ہم نے زمین سے پیدا کیں۔ جو کہ مَتَاعًا لَّکُمْ وَلِاَنْعَامِکُمْ تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے سامان زیست ہیں۔

فرمایا انسان کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور کفران نعمت نہیں کرنی چاہیئے۔ سب سے پہلے اُسے اپنی تخلیق پہ غور کرنا ہوگا۔ کہ اللہ نے اُسے کس حقیر قطرۂ آب سے پیدا کیا۔ پھر اُسے تمام قویٰ عطا کیے۔ پھر ایک وقت آیا کہ اُسے موت دے دی اور پھر وہ قیامت کے روز دوبارہ زندہ ہوگا۔ فرمایا۔ انسان اپنی خوراک کی طرف ہی دیکھ لے۔ تو اُسے سمجھ آجائے گی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کن کن ذرائع سے اس کے لیے خوراک اور دوسری ضروریات مہیا کیں۔

درسِ سوم (آیت ۳۳ تا ۴۲)

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ﴿٣٣﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿٣٤﴾ وَأُمِّهِ
وَأَبِيهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ
شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿٣٧﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ
مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ ع ۴۲ / ۵
أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

ترجمہ: پس جب آئے گی چیخ (قیامت کا صور) ﴿۳۳﴾ جس دن بھاگے گا آدمی اپنے بھائی سے ﴿۳۴﴾ اور بھاگے گا اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے ﴿۳۵﴾ اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے ﴿۳۶﴾ ہر آدمی کے لیے ان میں سے اس دن ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) مستغنی کرد ے گی ﴿۳۷﴾ کئی چہرے اس دن روشن ہوں گے ﴿۳۸﴾ ہنسنے والے اور خوشیاں منانے والے ہوں گے ﴿۳۹﴾ اور کئی چہروں پر اس دن گرد و غبار چڑھا ہوا ہوگا ﴿۴۰﴾ ان پر سیاہی چڑھی ہوگی ﴿۴۱﴾ یہ فسق و فجور کرنے والے کافر لوگ ہیں ﴿۴۲﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اِس سورۃ مبارکہ میں پہلے ایک نابینا شخص کا حال بیان کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کی توجہ اس بات کی طرف دلائی گئی۔ کہ کمزوروں اور ناداروں کا خیال رکھنا مقدم ہے۔ کیونکہ وہ ہدایت کے طالب ہیں اور کمال شوق سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ برخلاف اس کے سرمایہ دار حضرات ناشکر گذاری کرتے ہیں۔ ہدایت کے طالب نہیں۔ لہٰذا ان کی طرف زیادہ توجہ نہ دی جائے۔ یہی لوگ ہیں جو بے پروا اور متکبر ہیں۔ انہیں تزکیہ حاصل کرنے کا بھی شوق نہیں ہے۔ پچھلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرعون کے متعلق فرمایا "هَلْ لَّكَ إِلَىٰ أَن تَزَكَّىٰ" کیا تیرے اندر اس بات کی رغبت ہے کہ تو پاک ہو جائے۔ اور تاکہ تیری راہنمائی کروں اور پھر تجھ میں خوف پیدا ہو۔ اسی لیے گذشتہ درس میں ہم سن چکے ہیں "قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ" انسان ناشکر گذار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتا۔ خصوصاً قرآن پاک جیسی عظیم نعمت اور پیغمبر خدا

(علیہ السلام) کی ذات جیسی نعمت کا کفران کرتا ہے۔ اس میں نخوت و تکبر بھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی نہیں کرتا۔ حالانکہ دنیا میں انسان کا یہ سب سے بڑا فریضہ ہے۔ سب سے اہم اور مقدم کام ہے۔ فرمایا "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" "اپنے رب کی بڑائی بیان کرو۔ مگر ان مشرکین کی حالت یہ ہے کہ "وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ" جب انہیں رکوع کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ اپنے رب کی تسبیح بیان کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ تو ایسا نہیں کرتے۔

قیامت کی آمد

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے انسان کے اقربا اور رشتہ داروں کا ذکر فرمایا۔ کہ انسانی جماعت اور اعزہ کے اعتبار سے قیامت کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ فرمایا "فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ۔ جب آئیگی وہ چیخ صاخہ چیخ یا خوفناک آواز کو کہتے ہیں۔ اور اس سے مراد قیامت کا صور ہے۔ "يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ" جب صور پھونکا جائے گا۔ پہلے صور پر تمام کائنات اور انسان فنا ہو جائیں گے۔ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ دوسری سورتوں میں نفخہ اولیٰ اور نفخہ ثانیہ کا تفصیل سے ذکر ہے۔ "ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ" پھر جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا "فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ" تو انسان کھڑے ہو جائینگے اور دیکھیں گے۔ اور حساب کتاب کی منزل کیطرف بڑھیں گے۔ دو صوروں کے درمیان چالیس دن یا چالیس سال کا وقفہ ہے۔ چالیس کا لفظ حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔

اقرباء سے فرار

اس مقام پر صاخہ سے مراد پہلا صور ہے۔ جس سے کائنات درہم برہم اور فنا ہو جائے گی۔ اور اس کی وجہ سے چیخ و پکار شروع ہو جائے گی۔ تمام انسان چیخ و پکار کرتے رہیں گے۔ فرمایا جس دن کانوں کو بہرہ کر دینے والی چیخ آئے گی۔ اس دن کیا حال ہوگا۔ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ اس دن بھاگے گا انسان اپنے بھائی سے۔ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ اور بھاگے گا اپنی ماں سے اور باپ سے وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ اور اپنی بیوی اور اولاد سے بھی بھاگے گا۔ اس خوف سے بھاگے گا رشتہ داروں سے کنی کترائے گا کہ کہیں ضرورت کے وقت مجھ سے کوئی نیکی نہ طلب کر لیں۔

---

[1] مسلم ص ۴۰۶ ج ۲، بخاری ص ۷۱۰ ج ۲، در ص ۳۲۵

حضرت عکرمہؓ نے مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے حوالے سے بیان کیا ہے[1] کہ قیامت کے روز جب خاوند بیوی سے ملے گا تو کہے گا۔ تو جانتی ہے کہ دنیا میں میں تیرے ساتھ کتنا اچھا سلوک کرتا تھا۔ اور تمہارے حق میں کتنا بہتر خاوند تھا۔ بیوی اقرار کرے گی کہ ہاں ایسا ہی تھا۔ خاوند کہے گا۔ پھر مجھے ایک نیکی دیدے تاکہ میں کامیابی حاصل کرلوں۔ بیوی کہے گی بات تو معمولی ہے۔ اور دنیا میں تو نے مجھ پہ احسان بھی بہت کیے مگر مجھے خود ڈر ہے کہ میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ اس لیے آج تمہیں نیکی دینا ممکن نہیں۔ اسی طرح باپ اور بیٹے کے درمیان گفتگو ہوگی۔ اور وہ بھی ایک دوسرے سے بھاگیں گے۔ مبادا کہ دوسرا کوئی نیکی نہ طلب کرے۔ ہر ایک کو اپنی اپنی فکر ہوگی۔ مسلم شریف[2] کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ اس دن انبیاء (علیہم السلام) پر بھی خوف و دہشت طاری ہوگی۔ وہ بھی نفسی نفسی پکاریں گے۔ اَللّٰھُمَّ سَلِّمْ اے اللہ! آج کے دن بچالے۔ بھاگنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ کوئی حقوق کا مطالبہ نہ کرے۔ دنیا میں جس کسی کا حق غصب کیا تھا وہ قیامت کے دن اس کا مطالبہ پیش کرے گا۔

اس جگہ اللہ تعالےٰ نے انسان کے عزیز و اقربا کا اسی ترتیب سے ذکر کیا ہے جس ترتیب کے ساتھ دنیا میں ان کا تعلق قائم تھا۔ سب سے پہلے بھائی کا ذکر کیا "یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ" بچپن میں بھائی بھائی کے ساتھ کھیلتا ہے۔ آپس میں دوستی ہوتی ہے۔ نفع ونقصان میں شریک ہوتے ہیں۔ اور سب سے قریبی تعلق ہوتا ہے۔ اسی لیے سب سے پہلے بھائی کا ذکر کیا۔

اگر بھائی بھائی پہ زیادتی کرتا ہے۔ تو وہ بھاگ کر ماں کے پاس فریاد کرتا ہے۔ ماں اس پہ شفقت کرتی ہے اس کو تسلی دیتی ہے۔ اس لیے بھائی کے بعد ماں کا ذکر ہے "وَاُمِّهٖ" فارسی کا مقولہ ہے "ہر کہ برادر نہ دارد، قوت بازو نہ دارد۔ ہر کہ مادر ندارد، شفقت نہ دارد" یعنی جس کا بھائی نہیں ہوتا، اس کی قوت بازو نہیں ہوتی اور جس کی ماں نہیں ہوتی وہ شفقت سے محروم ہوتا ہے۔ لہٰذا دوسرے نمبر پہ ماں کا ذکر ہے۔ اگر ماں بھی کسی معاملہ میں فیصلہ نہ کرسکے۔ تو باپ کے پاس شکایت کی جاتی ہے۔ کہ میرے ساتھ یہ زیادتی ہوئی ہے۔ بچہ سمجھتا ہے کہ باپ سرپرست ہے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۴۷۳/۴ [2] مسلم ص ۱۰۱/۱، بخاری ص ۹۷۳/۲ ۔

وہ شکایت کا ازالہ کرے گا۔ چنانچہ باپ زیادتی کرنے والے کو تنبیہ کرتا ہے۔ تمام بچوں کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔ لہذا بھائی اور ماں کے بعد تیسرے نمبر پہ باپ کا ذکر ہے۔ "وَأَبِيهِ"

جب انسان سن بلوغت کو پہنچ جاتا ہے۔ اُس پر تمام فرائض عاید ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی الگ حیثیت کا مالک بن جاتا ہے۔ پھر اُسے بیوی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ طبعی فلسفہ کے مطابق وہ بیوی کا خاوند بنتا ہے۔ اس لیے چوتھے درجے میں اللہ تعالیٰ نے بیوی کا ذکر کیا ہے۔ وَصَاحِبَتِهِ خاوند اور بیوی کے تعلق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" پردہ پوشی، عزت اور ناموس کی حفاظت کے لیے تمہاری بیویاں تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ اور انسانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ سورۂ روم میں فرمایا "وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً" ہم نے میاں بیوی کے درمیان دوستی اور مہربانی کا جذبہ رکھ دیا۔

میاں بیوی کے باہمی تعلقات کا نتیجہ اولاد کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اولاد میں سے بیٹے نسبتاً زیادہ عزیز ہوتے ہیں کیونکہ بیٹا کسی شخص کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اولاد نرینہ سے محروم ہو تو اُسے بڑا فکر ہوتا ہے۔ اس لیے ہر شخص بیٹے کی خواہش رکھتا ہے۔ کہ وہ اس کی زندگی کا آخری نچوڑ اور خلاصہ ہوتا ہے۔ لہذا بیوی کے بعد بیٹے کا ذکر فرمایا وَبَنِيهِ کہ انسان اپنے بیٹوں سے بھی قیامت کے دن بھاگے گا۔ پہلے گذر چکا ہے "وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ" اُس دن تمنا کرے گا کہ بیوی، بیٹا، اولاد، رشتہ دار، اقرباء، خاندان سب کو فدیہ میں دیکر جان چھڑائے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکے گا۔

الغرض قیامت برپا ہو جانے کے بعد کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ سب ایک دوسرے سے بھاگیں گے۔ سب کو اپنی اپنی فکر ہو گی لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ہر ایک ایسی حالت میں مبتلا ہو گا۔ جو اُسے دوسروں سے مستغنی کر دے گی۔ شان کے معنی حالت اور کیفیت کے ہیں۔ کہ ہر انسان کی یہ کیفیت ہو گی۔ کہ اپنی فکر میں ہو گا۔ دیگر دوست واحباب اور اعزہ واقارب کے متعلق کچھ نہیں پوچھے گا۔ دوسری جگہ موجود ہے کہ اس دنیا میں جو بڑے بڑے دوست مانے سمجھے جاتے ہیں اور جن کی وجہ سے جائز اور ناجائز کام کیے جاتے ہیں۔ اس

دن ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ ہاں البتہ وہ متقی جن کا دوستانہ محض اللہ کی خاطر تھا۔ وہ اس دن بھی قائم رہے گا۔ باقی سب اپنی اپنی فکر میں ہوں گے۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہو گا۔

روشن چہرے

جیسا کہ پہلی سورتوں میں ذکر آچکا ہے۔ کہ قیامت کے دن دو گروہ بن جائیں گے۔ ایک گروہ کا یہ حال ہو گا۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ بعض چہرے اُس دن روشن ہوں گے۔ اسفار روشنی کو کہتے ہیں۔ ایسے چہروں پہ نورانیت کی چمک نمایاں ہوگی۔ وہ چہرے ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ہنسنے والے اور خوشیاں منانے والے ہوں گے۔ وہ نور ایمان اور توحید سے منور ہوں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا "تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ" وہ چہرے سفید ہوں گے۔ یہ تقویٰ اور خشیت الٰہی والوں کے چہرے ہوں گے۔ ان لوگوں کے چہرے جنہوں نے دنیا میں تزکیہ حاصل کیا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کیا۔

سیاہ چہرے

فرمایا دوسرے گروہ کی حالت یہ ہوگی وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ کہ اُن کے چہروں پہ گرد و غبار چڑھا ہوا ہو گا جس طرح کوئی سفر میں جاتا ہے۔ تو اُس کا چہرہ گرد آلود ہو جاتا ہے۔ اُن کی یہ حالت ہوگی۔ یہ لوگ نور ایمان و توحید سے خالی ہوں گے۔ ان کے چہروں سے نورانیت مفقود ہوگی۔

حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ وضوء کرنے والے لوگوں کے وضوء کے اعضاء قیامت کے دن چمکدار ہوں گے۔ نورانیت سے بھرپور ہوں گے۔ پتہ چلے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اُمتی دنیا میں وضوء کر کے نمازیں پڑھتے تھے۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ" اُن کا نور اُن کے آگے اور ان کے دائیں دوڑتا ہو گا۔ دائیں طرف نیکی اور اطاعت کی روشنی ہوگی۔ اور پل صراط پہ ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ راستہ نہایت آسانی کے ساتھ طے کر جائیں گے۔

برخلاف اس کے بعض چہرے گرد آلود ہوں گے تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ان پر سیاہی چڑھی ہوئی ہوگی، اُن پر کفر، غم اور باطل کے اندھیرے نمایاں ہوں گے۔ دیکھنے والوں کو پتہ چلے گا کہ

---

[1] بخاری صـ ۲۵/ج۱ مسلم صـ ۱۲۶/ج۱

کہ یہ کون لوگ ہیں۔ فرمایا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکَفَرَۃُ الْفَجَرَۃُ یہ فسق و فجور کرنے والے کافر لوگ ہیں۔ یہ انتہائی درجے کے گنہگار اور پھر گناہ پہ اصرار کرنے والے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو عاجزی نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے تھے اور تزکیہ حاصل نہیں کرتے تھے۔ یہ متکبر اور مستغنی تھے۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے۔ خدا کے سامنے اخبات نہیں کرتے تھے۔ ایمان کی بجائے کفر اور توحید کی بجائے شرک اختیار کرتے تھے۔ یہی بدکار لوگ ہیں۔

آخر میں سورۃ کا اصل موضوع بیان کرنے کے بعد فریقین کا نتیجہ بھی بیان فرما دیا۔ کہ ایمان والوں کے چہرے روشن، ہنستے والے اور خوش ہوں گے برخلاف اس کے کفر کرنے والوں کے چہرے سیاہ ہوں گے ان پہ گرد و غبار چڑھا ہوا ہوگا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو دنیا میں خدا تعالےٰ کی نافرمانی کرتے تھے۔ اور جنہوں نے کفر و شرک کا راستہ اختیار کیا۔

سُورَةُ التَّكْوِيرِ

عمّ۔۳۰ — تکویر ۸۱

درس اوّل — (آیت ۱ تا ۱۴)

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۃ تکویر مکی ہے اور یہ انتیس۲۹ آیات ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان اور نہایت رحم کرنیوالا ہے

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (١) وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (٢) وَاِذَا الْجِبَالُ
سُيِّرَتْ (٣) وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (٤) وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (٥)
وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (٦) وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (٧) وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ
سُئِلَتْ (٨) بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (٩) وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (١٠)
وَاِذَا السَّمَاۗءُ كُشِطَتْ (١١) وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ (١٢) وَاِذَا الْجَنَّةُ
اُزْلِفَتْ (١٣) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (١٤)

ترجمہ:۔ جب سورج (کی روشنی) کو تہ کر دیا جائے گا (۱) اور جب ستارے میلے ہو جائیں
گے (۲) اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے (۳) اور جب گابھن اونٹنیاں بیکار چھوڑ دی جائیں گی (۴)
اور جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے (۵) اور جب سمندروں کو گرم کیا جائے گا (۶) اور
جب نفسوں کو ملایا جائے گا (۷) اور جب زندہ درگور کی گئی بچیوں سے پوچھا جائے گا (۸) کہ
انہیں کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا (۹) اور جب اعمالنامے کھول دیے جائیں گے (۱۰)
اور جب آسمان کی کھال اتار دی جائے گی (۱۱) اور جب جہنم کو بھڑکا دیا جائے گا (۱۲)
اور جب جنت کو قریب کر دیا جائے گا (۱۳) جان لے گا ہر نفس جو اس نے حاضر کیا (۱۴)

نام وکوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ تکویر ہے۔ اس کی پہلی آیت میں کُوِّرَتۡ کا لفظ آیا ہے۔ جس سے سورۃ کا نام تکویر ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی، اس کی انتیس ۲۹ آیات ہیں۔ یہ سورۃ ایک سو چار ۱۰۴ الفاظ اور پانچسو تنتیس ۵۳۳ حروف پر مشتمل ہے۔

موضوع اور گذشتہ سورۃ سے ربط

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر اس نسبت سے کیا ہے۔ کہ کائنات کی ارضی اور سماوی اشیاء پر قیامت کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ سورۃ کے آخر میں قرآن کریم کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ اور اسکی صداقت وحقانیت کا بیان ہے۔

سابقہ کئی سورتوں میں قیامت کا ذکر مختلف انداز سے آرہا ہے۔ کہ قیامت کا اثر مختلف چیزوں پر کیا ہو گا۔ سورۃ عبس میں قیامت کا ذکر اس اعتبار سے تھا کہ انسان پر اس کے خویش و اقارب پر قیامت کا کیا اثر ہو گا۔ جیسے فرمایا "اِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ" جب وہ چیخ آئے گی "یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ" اس دن بھائی بھائی سے بھاگے گا۔

حدیث[1] میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ کَاَنَّهٗ رَأْیَ عَیْنٍ جو شخص قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے چاہیئے کہ سورۃ تکویر پڑھے۔ اس کے علاوہ سورۃ "اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ" اور بعض دوسری سورتوں کا بھی ذکر آتا ہے۔ ان سورتوں کو پڑھ کر قیامت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض[2] کیا۔ کہ حضور! کیا بات ہے آپ پر بڑھاپا طاری ہو رہا ہے۔ تو آپ نے فرمایا شَیَّبَتْنِیْ سُوْرَةُ هُوْدٍ وَالْوَاقِعَةُ وَاِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ، وَالْمُرْسَلٰتُ وَالنَّبَاُ یعنی بڑھاپا فکر کی وجہ سے آرہا ہے۔ قیامت کی فکر سے۔ ان سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ کہ ان میں قیامت کا حال پڑھکر مجھے فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ گویا بڑھاپا طاری ہونا غم اور فکر کی وجہ سے ہوتا ہے۔

عربی کی کہاوت[3] ہے۔ کسی شخص نے طبیب سے پوچھا مَا شَیَّبَتْنِیْ مجھے کس چیز نے بوڑھا کر دیا ہے؟ طبیب نے جواب دیا قَالَ بَلْغَمٌ یعنی بلغم کی زیادتی نے۔ جب جسم میں بلغم زیادہ

---

[1] ترمذی ص ۴۸۱ [2] ترمذی ص ۴۷۳ مستدرک ص ۳۴۳ ج ۲ [3] تفسیر عزیزی فارسی ص ۷ پارہ ۳۰۔

ہو جاتے اور دوسرے اخلاط کم ہو جائیں، تو بال سفید ہو جاتے۔ ضعف طاری ہو جاتا ہے تو اُس شاعر نے حکیم سے کہا ؎

فَقُلْتُ لَہٗ عَلٰی عَیْنِ احْتِشَامٍ　　لَقَدْ اَخْطَأْتَ فِیْمَا قُلْتَ بَلْ غَمٌّ

آپ غلط کہتے ہیں میرا بڑھاپا بلغم کی وجہ سے نہیں بلکہ غم کی وجہ سے آرہا ہے۔ ابن ماجہ[1] کی روایت میں ہے غم نصف الہرم ہے یعنی آدھا بڑھاپا غم کی وجہ سے آتا ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ان سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ کیونکہ ان میں قیامت کا ذکر ہے۔ محاسبہ کا ذکر ہے۔ مختلف اقوام کے ساتھ جو سلوک ہو چکا ہے یا آئندہ ہونے والا ہے۔ اس کا ذکر ہے اور اس غم کی وجہ سے بڑھاپا طاری ہو رہا ہے۔

نظام شمسی

فرمایا اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ جب سورج کی روشنی کو ختم کر دیا جائے گا۔ تکویر کا معنی لپیٹنا ہوتا ہے۔ جس طرح چادر کو لپیٹ دیا جاتا ہے۔ تو اُس دن سورج کی روشنی بالکل چھین لی جائے گی۔ سورج سفید ٹکیہ کی مانند رہ جائے گا۔ جس طرح میدہ یا پنیر کی ٹکیہ ہوتی ہے اور بعد میں اس کو درہم برہم کر دیا جائے گا۔

جب سے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو پیدا کیا ہے، سورج کا یہ نظام قائم ہے۔ سورج اتنا مشہور اور اہم سیارہ ہے کہ دنیا کا نظام اسی سیارے کی طرف منسوب ہے۔ ہم اسی نظام شمسی (SOLAR SYSTEM) میں رہتے ہیں۔ سورج کا حجم اس قدر ہے کہ ماہرین فلکیات (ASTRONOMY) والے بتاتے ہیں کہ سورج کا حجم، زمین کے حجم سے تیرہ لاکھ گناہ بڑا ہے۔ چونکہ زمین سے بہت دور ہے اسی لیے بظاہر چھوٹا نظر آتا ہے۔ سورج زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلے پہ واقع ہے۔

قرآن پاک میں شعریٰ ستارے کا بھی ذکر ہے۔ فلکیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ سیارہ سورج سے بیس ہزار گناہ بڑا ہے۔ عرب کے بعض پرانے مشرک اس ستارے کی پرستش کرتے تھے۔ اس میں خاص قسم کی روحانیت مان کر اس سے حاجتیں طلب کرتے تھے۔

---

[1] ـــ

ستاروں کے نام پر مندر بنائے ہوئے ہیں کوئی زہرہ کا مندر ہے کوئی سورج کا مندر ہے پرانے بابلیوں کے ہاں اور مصریوں میں بھی ستارہ پرستی پائی جاتی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں ستارہ پرست بہت زیادہ تعداد میں تھے۔ یہ ستاروں کو معبود مان کر ان سے حاجت روائی کرتے تھے۔ آج کے ستارہ پرست بھی ستاروں میں کرشمہ مانتے ہیں۔

بہرحال سورج بہت بڑا سیارہ ہے۔ قیامت کے دن جب صور پھونکا جائے گا۔ تو اس کی روشنی ختم کر دی جائے گی جس طرح چادر لپیٹ دی جاتی ہے۔ سورج ایک ٹکیہ کی مانند رہ جائے گا۔ مگر بعد میں وہ بھی باقی نہیں رہے گی۔ یہ تو سورج کا حال ہوگا۔ زمین تو اس کے مقابلہ میں بہت چھوٹا سیارہ ہے۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قیامت کے روز زمین کی کیا حالت ہوگی۔

ماہرین فلکیات کی تحقیق کے مطابق کل سات سیارے ہیں۔ جن میں سورج، چاند، زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد ہیں۔ انہیں سبعہ سیارات کہا جاتا ہے۔ یہ سارا نظام شمسی ہے۔ اور ہم اسی نظام کے ساتھ منسلک ہیں۔ ان میں سے پانچ سیارے (زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، عطارد) خمسہ متحیرہ کہلاتے ہیں (کیونکہ ان کی رفتار باقاعدہ نہیں ہے) یہ تمام بڑے بڑے سیارے ہیں۔ بعض زمین سے بڑے ہیں۔ بعض چاند سے بڑے ہیں۔ مگر سورج کی نسبت باقی سب چھوٹے ہیں اور اس کے ماتحت سمجھے جاتے ہیں۔ بعض سیارے زمین سے چودہ کروڑ میل دور ہیں اور بعض کے بُعد کا کوئی حساب نہیں لگایا جا سکتا۔

سورج اور چاند مقررہ چال سے چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جو منزل مقرر کی ہے ان پر گامزن ہیں۔ سال میں بارہ منزلیں طے کرتے ہیں۔ کل بارہ برج ہیں، سورج ہر ماہ ایک برج میں ہوتا ہے پھر اس کی چال بدل جاتی ہے۔ اسی طرح چاند کی کیفیت ہے مگر ان کے علاوہ جو باقی پانچ سیارے ہیں ان کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں۔ ان کی چال یکساں نہیں ہے۔ ان کا مفصل بیان اس سورۃ کے آخر میں آئے گا۔

سارا نظام درہم برہم ہو جائیگا

فرمایا جب قیامت آئے گی تو سورج بے نور کر دیا جائے گا۔ اس کی روشنی لپیٹ دی جائے گی۔ بعض روایتوں[1] میں آتا ہے کہ سورج اور چاند دونوں کو توڑ پھوڑ کر جہنم میں پھینک

[1] تفسیر کبیر ص ۶۶ ج ۳۱ و تفسیر روح المعانی ص ۵۰ ج ۳۰ و تفسیر درمنثور ص ۳۱۸ ج ۶ بحوالہ ابن ابی حاتم و دیلمی تفسیر ابن کثیر ص ۴۷۵ ج ۴

دیا جائے گا۔ فرمایا وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ جب یہ بڑے چمکدار ستارے میلے ہو جائیں گے۔ ان کی روشنی سلب ہو جائے گی۔ وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ اور جب پہاڑ چلائے جائینگے۔ آج تو پہاڑ بڑے مضبوط نظر آتے ہیں۔ ان میں صرف زلزلے کے وقت تھوڑا سا تغیر آتا ہے۔ ورنہ وہ تمام حوادثات سے صحیح سلامت گزر جاتے ہیں۔ قیامت کے روز یہی ناقابل تسخیر پہاڑ اُون کے گالوں کی طرح اڑتے پھیریں گے۔ پھر فرمایا وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ اور جب گابھن اونٹنیاں بیکار چھوڑ دی جائیں گی۔ عربوں کے نزدیک اونٹنیاں بہت پسندیدہ مال ہوا کرتا تھا۔ ان کی معیشت اور کاروبار انہی پر منحصر تھا۔ اسے بار برداری اور خوراک کے لیے بھی استعمال کرتے تھے۔ خاص طور پہ جب دس ماہ کی گابھن اونٹنی بچہ جننے کے قریب ہو۔ تو بہت بڑی جائیداد سمجھی جاتی تھی۔ اور اس کی حفاظت کی جاتی تھی۔ مگر قیامت کے دن نفس نفسی کی یہ حالت ہو گی۔ کہ گابھن اونٹنی جیسے قیمتی مال کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔

فرمایا وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ اور جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے۔ جنگلی جانور مثلاً شیر، ریچھ، بندر، ہاتھی وغیرہ بھاگ کر آبادیوں کی طرف آئیں گے۔ اُن پہ دہشت اور خوف کا یہ عالم ہوگا کہ جنگلی درندے انسانی بستیوں میں پناہ ڈھونڈیں گے۔ مگر کوئی کسی کا پرسان حال نہیں ہوگا۔ بعض اوقات سیلاب کے دوران لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے کہ سانپ اور انسان ایک ہی چھپر پر پناہ گزیں ہیں۔ کوئی کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ ہر کسی کو اپنی جان کی فکر ہے۔ قیامت کے روز انسانوں اور جانوروں کا یہی حال ہوگا۔ کہ سب اکٹھے ہو جائیں گے۔

فرمایا وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ اور جب دریاؤں یا سمندروں کو گرم کیا جائے گا۔ جھونک دیا جائے گا۔ تسجیر کے دو معنی آتے ہیں۔ یعنی بھرنا یا پُر کرنا۔ اور گرم کرنا۔ قیامت کے روز دریا اور سمندر گرم کیے جائیں گے اور وہ بھاپ بن کر اُڑ جائیں گے وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ اور جب نفسوں کو ملایا جائے گا۔ نکاح کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے ایک مرد اور ایک عورت کو ملا دیا جاتا ہے۔ بعض[1] فرماتے ہیں کہ اس سے یہ مراد ہے

---

[1] کنز العمال صفحہ ۲۴۵ ج ۲ و تفسیر کبیر صفحہ ۶۹ ج ۳۱ و مظہری صفحہ ۲۰۶ ج ۱۰

کہ قیامت کے دن روح اور جسم کو دوبارہ جوڑ دیا جائے گا۔ زیادہ صحیح استدلال[1] ہے کہ ہر صنف کے آدمیوں کو اکٹھا کیا جائے گا۔ یعنی نمازی نمازیوں کے ساتھ مل جائیں گے۔ شرابی شرابیوں کے گروہ میں شامل ہو جائیں گے اور علیٰ ہذا القیاس۔

زندہ درگور کرنے والوں سے باز پرس

فرمایا وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ اور جب زندہ درگور کی جانے والی بچیوں سے پوچھا جائیگا بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ کہ انہیں کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا۔ عربوں کے بعض قبائل عورتوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ لہٰذا بچی پیدا ہوتے ہی اُسے زندہ گاڑ آتے تھے۔ سورۃ نحل اور بعض دوسری سورتوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ بچی پیدا ہونے پر بعض لوگ گھر سے ہی بھاگ جاتے تھے۔ وہ ایسی خوشخبری سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اور بعض شرم کے مارے اتنا خفا ہو جاتے تھے کہ اُسے زندہ درگور کر آتے تھے۔ اگرچہ تمام عربوں میں یہ رواج نہیں تھا۔ تاہم بعض جاہل لوگ اس قسم کی جہالت کے عادی تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بچی کی پیدائش کو عار سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہ انتہائی درجے کی حماقت اور بیوقوفی تھی۔ آخر مرد بھی تو کسی عورت کے بطن سے ہی پیدا ہوا اس کی بیوی بھی تو کسی کی بیٹی ہے۔ جب اپنے ہاں بیٹی پیدا ہوتی تو اسے زندہ درگور محض اس لیے کر دیا کہ یہ کسی دوسرے کے گھر جائے گی، وہ ہمارا داماد بنے گا۔ جو کہ شرم کی بات ہے۔ یہ سب جہالت اور نادانی کی باتیں ہیں۔ آج بھی بعض لوگ اس قسم کی خلافِ عقل باتیں کرتے ہیں۔ کہ بیٹی جوان ہو گی تو جہیز کہاں سے آئے گا۔ اس کی پرورش کا خرچہ کون برداشت کرے گا۔ مشرکین بھی اولاد کو اسی لیے قتل کرتے تھے۔ کہ ان کو کون کھلائے پلائے گا۔ یہ ہمارے آرام میں مخل ہوں گے۔

جب قیامت برپا ہو گی۔ تو قتل ناحق کے متعلق باز پرس ہو گی۔ عام قانون بھی یہی ہے کہ قتل کے مقدمہ میں مدعی خود حکومت ہوتی ہے۔ لہٰذا اُس دن خود اللہ تعالیٰ پوچھیں گے۔ کہ ان بے گناہ بچیوں کو کیوں قتل کیا گیا۔ طبرانی[2] کی روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام کے ایک صحابی صعصعہؓ بن ناجیہ تھے۔ تابعین میں حضرت علیؓ کے شاگرد (مشہور شاعر) فرزدقؒ کے دادا تھے انہوں نے

---

[1] مستدرک حاکم ص ۵۱۶ ج ۲ [2] روح المعانی ص ۵۳ ج ۳۰ بحوالہ طبرانی و درمنثور ص ۳۲۰ ج ۶

حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ جاہلیت کے زمانے میں میں نے تین سو ساٹھ بچیوں کی جان بچائی۔ مشرکین ان کو زندہ درگور کرنا چاہتے تھے۔ مگر میں نے ہر بچی کے عوض دو گابھن اونٹنیاں اور ایک اونٹ دے کر ان کی جان بچائی۔ حضور! یہ فرمائیں کہ اس عمل کا مجھے کوئی فائدہ ہو گا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کیا یہ کم فائدہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے اسلام کی توفیق بخشی۔ تو نے یہ نیکی کا کام کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے تجھے یہ صلہ دیا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہو گا۔ تو زندہ درگور ہونے والی بچیوں سے پوچھا جائے گا۔ کہ تمہیں کس جرم میں قتل کیا گیا۔

فرمایا وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ جب اعمال نامے کھول دیے جائیں گے دوسری جگہ آتا ہے: کِتٰبًا یَّلْقٰہُ مَنْشُوْرًا یعنی اعمال نامہ سامنے ہو گا۔ اس کے بعد فرمایا وَاِذَا السَّمَآءُ کُشِطَتْ جب آسمان کی کھال اتار دی جائے گی۔ مطلب یہ کہ جس طرح اوپر سے کھال اُتار دی جائے تو پیچھے گوشت پوست نظر آنے لگتا ہے۔ اس طرح قیامت کے روز جب آسمان کی کھال اتار دی جائے گی۔ تو اوپر کی تمام چیزیں نظر آنے لگیں گی۔ سورۃ نبا میں ذکر آ چکا ہے۔ " وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ اَبْوَابًا " آسمان کھول دیا جائے گا۔ تو دریچے دریچے نظر آئیں گے۔ ان دروازوں سے عالم بالا کی سب چیزیں نظر آنے لگیں گی۔ مگر بعد میں سب چیزوں کو درہم برہم کر دیا جائے گا۔ یہ آسمان تبدیل کر دیا جائے گا۔ پھر دوسرا زمین و آسمان قائم ہو گا اور حساب کتاب ہو گا۔

ہر چیز واضح نظر آئے گی

وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ جب جہنم کو بھڑکا دیا جائے گا۔ گرم کر دیا جائے گا۔ پچھلی سورۃ میں گذر چکا ہے کہ جہنم کو حشر کے میدان کے قریب کر دیا جائے گا۔ مجرمین اُسے دیکھیں گے تو انہیں یقین آ جائے گا۔ کہ وہ اس میں جانے والے ہیں فرمایا وَاِذَا الْجَنَّۃُ اُزْلِفَتْ اور جب جنت کو قریب کر دیا جائے گا۔ یعنی جنت بھی نظر آنے لگے گی۔ مراد یہ کہ تمام نظام تبدیل کر دیا جائے گا۔ اور کائنات کی ہر چیز پر قیامت اثر انداز ہو گی۔ یہ ایسا اثر ہو گا جو آج انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ پھر اس وقت کیا ہو گا عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ جان لے گا ہر نفس جو اس نے حاضر کیا۔ انسان نے اس دنیا میں جو بھی نیکی یا بدی کی ہو گی، سب اُس کے سامنے ہو گی۔ اُسے پتہ چل جائے گا کہ اُس نے اس دنیا کی زندگی میں کیا کمایا اور کیا کھویا۔ اُس کے ہر فعل کا نتیجہ اُس کے سامنے آنے والا ہے۔

عمّ ۳۰ تکویر ۸۱

درس دوم (آیت ۱۵ تا ۲۹)

فَلَآ اُقۡسِمُ بِالۡخُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الۡجَوَارِ الۡکُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَالَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ﴿۱۷﴾
وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾ اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿۱۹﴾ ذِیۡ قُوَّۃٍ عِنۡدَ
ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُکُمۡ
بِمَجۡنُوۡنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدۡ رَاٰہُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲۳﴾ وَمَا ہُوَ عَلَی الۡغَیۡبِ
بِضَنِیۡنٍ ﴿۲۴﴾ وَمَا ہُوَ بِقَوۡلِ شَیۡطٰنٍ رَّجِیۡمٍ ﴿۲۵﴾ فَاَیۡنَ
تَذۡہَبُوۡنَ ﴿۲۶﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۷﴾ لِمَنۡ شَآءَ مِنۡکُمۡ
اَنۡ یَّسۡتَقِیۡمَ ﴿۲۸﴾ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۹﴾ ع

ترجمہ:- پس میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے (ستاروں) کی ﴿۱۵﴾ سیدھے چلنے والے (پھر) رُک جانے والے ﴿۱۶﴾ اور قسم ہے رات کی جب وہ چلی جاتی ہے ﴿۱۷﴾ اور قسم ہے صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے ﴿۱۸﴾ بے شک یہ (قرآن) بڑی عزت والے قاصد کا کلام ہے ﴿۱۹﴾ بڑی طاقت والا ہے عرش والے (خدا تعالیٰ) کے نزدیک بڑے مرتبے والا ہے ﴿۲۰﴾ وہاں (عالم بالا) پر اس کی بات مانی جاتی ہے امانتدار ہے ﴿۲۱﴾ اور تمہارے صاحب (جن پر قرآن نازل ہوا ہے) کوئی (معاذ اللہ) دیوانے نہیں ہیں ﴿۲۲﴾ اور تحقیق اس (نبی علیہ السلام) نے اس (جبرائیل علیہ السلام) کو کھلے کنارے پر دیکھا ہے ﴿۲۳﴾ اور نہیں ہے وہ (حضور علیہ السلام) غیب کی بات (وحی الٰہی) کے بتلانے پر بخل کرنے والے ﴿۲۴﴾ اور یہ (قرآن) شیطان مردود کی بات نہیں ہے ﴿۲۵﴾ پھر تم کدھر جا رہے ہو ﴿۲۶﴾ یہ تو تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے ﴿۲۷﴾ جو کوئی تم میں سے سیدھے راستے پر چلنا چاہے ﴿۲۸﴾ تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے ﴿۲۹﴾

گذشتہ سے پیوستہ سورۃ کے پہلے حصہ میں قیامت کا ذکر تھا۔ اس درس میں قرآن کریم کا ذکر ہے - قرآن پاک کی صداقت، اس کی حقانیت، اس کا مُنَزَّل مِنَ اللہ ہونا، اس کو لانے والے

فرشتے اور خود نبی علیہ السلام کی حیثیت کا بیان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت اور قرآن پاک آپس میں مربوط ہیں۔ اسی لیے دونوں کا اکٹھا ذکر ہے۔ قیامت کا ذکر اس لحاظ سے ہے۔ کہ اس کا اثر کائنات کی مختلف اشیاء پر کیا ہوگا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں نظام شمسی کے سب سے بڑے کرّے سورج کا ذکر ہے۔ کہ اس کی روشنی ختم ہو جائے گی۔ اس کے بعد باقی سیاروں کا ذکر ہے۔ سورج اور چاند کے متعلق فرمایا کہ یہ دو سیارے ایک خاص نظام کے تحت مقررہ راستے پر چل رہے ہیں۔ اور انہی کی وجہ سے دن اور رات کا نظام قائم ہے۔ قرآن پاک نے اسے "جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً" کہا ہے۔ یعنی رات اور دن ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ہیں۔ گویا سورج اور چاند کی حرکت اس قدر باقاعدہ ہے۔ کہ اس میں ذرا بھی فرق نہیں آتا۔

خمسہ متحیرہ

البتہ ان کے علاوہ جو باقی پانچ سیارے زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد ہیں ان کا نظام کچھ عجیب سا ہے۔ یہ غیر منظم ہیں۔ ماہرین فلکیات انہیں خمسہ متحیرہ یعنی پانچ حیران کن سیارے کہتے ہیں۔ اس مقام پہ اللہ تعالیٰ نے ان سیاروں کا ذکر کر کے قیامت کے ساتھ ان کا ربط بھی بیان فرما دیا ہے۔

فرمایا فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ پس میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والوں کی۔

اَلْجَوَارِ ان کی جو سیدھے چلتے ہیں اَلْکُنَّسِ ان سیاروں کی جو رک جاتے ہیں۔

خُنَّس کا معنی پیچھے ہٹ جانا، خناس اسی سے مشتق ہے۔ قرآن پاک میں ہے "مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ" میں پناہ مانگتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والوں یعنی شیاطین کے بار بار وسوسہ ڈالنے کے شر سے۔ اَلْجَوَارِ جاریہ سے ہے۔ یعنی جو سیدھے چلتے ہیں۔ الکنس یعنی وہ سیارے جو ایک جگہ دبک جاتے ہیں۔ رک جاتے ہیں۔ ٹھہر جاتے ہیں۔ کنس سے کناسہ ہے جو کہ جانور کی خواب گاہ کو کہا جاتا ہے۔ جب خرگوش یا دیگر جانور اپنی خواب گاہ میں آکر چھپ جاتے ہیں، آرام کرتے ہیں تو ان پر کنس کا لفظ بولا جاتا ہے تو ان سیاروں سے وہی پانچ سیارے مراد ہیں۔ جو کہ حیران کن چال چلنے کی وجہ سے خمسہ متحیرہ کہلاتے ہیں۔ ان کا نظام، شمسی نظام سے مختلف ہے۔ حضرت علی رضؓ سے

منقول ہے[۱]۔ کہ ان پانچ سیاروں کی چال بے ڈھب ہے۔ عام طور پر ان کی چال مغرب سے مشرق کی جانب ہوتی ہے۔ چلتے چلتے جب یہ سورج کے قریب آتے ہیں۔ تو رُک جاتے ہیں نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی چال مشرق سے مغرب کی جانب شروع ہو جاتی ہے۔ تو گویا یہ سیارے کبھی سیدھے چلتے ہیں۔ کبھی رُک جاتے ہیں۔ کبھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کا اپنا ایک نظام ہے۔

رات اور دن کا تغیر و تبدل

فرمایا وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ اور قسم ہے رات کی جب وہ پھیل جاتی ہے۔ سب چیزوں پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ عَسْعَسَ کا لفظ متضاد معانی کو بولا جاتا ہے۔ اس سے مراد رات کا ہٹ جانا بھی ہے۔ اور رات کا چھا جانا بھی ہے۔ اس مقام پر چھا جانے کا مفہوم زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وَالصُّبْحِ اور قسم ہے صبح کی إِذَا تَنَفَّسَ جب وہ سانس لیتی ہے۔ جس طرح مچھلی پانی میں سانس لیتی ہے۔ تو پانی کی فوار اوپر نکلتی ہے۔ اسی طرح جب سورج طلوع ہونے کے قریب ہوتا ہے۔ تو اس کی شعاعیں کناروں پر پھیل جاتی ہیں اور پھر پوری روشنی نمودار ہوتی ہے صبح کے سانس لینے کا یہی مطلب ہے۔ الغرض صبح و شام کی آمد ایک نظام کے تحت ہے۔ سورج اور چاند کی حرکات مقررہ راستوں پر جاری ہیں۔ البتہ خمسہ متحیرہ غیر منظم طریقے سے مصروف عمل ہیں۔ کبھی یہ سیدھے چلتے ہیں۔ کبھی رُک جاتے ہیں۔ کبھی اُلٹے چلتے ہیں، اور بعض اوقات کئی کئی دن تک غائب رہتے ہیں نظر نہیں آتے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اس بحث سے معلوم ہوا کہ کائنات میں دو قسم کے نظام چل رہے ہیں۔ ایک نظام سورج اور چاند کا منظم نظام ہے جس سے رات اور دن پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسرا نظام خمسہ متحیرہ کا غیر منظم نظام ہے۔ گویا سورج اور چاند والا نظام نظر آتا ہے۔ اور آسانی کے ساتھ سمجھ میں آرہا ہے۔ دوسرا نظام نظروں سے اوجھل ہے۔ اسی لیے اُسے سمجھنے کیلئے ماہرین کے غور و فکر کی ضرورت ہے اسے وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ عام آدمی کی سمجھ سے بالا ہے۔ ان دو نظاموں کے ذکر سے سمجھانا یہ مقصود ہے۔ کہ جہاں صرف یہی نہیں جو نظر آتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی کائنات لامحدود ہے۔

---

[۱] روح المعانی صفحہ ۵۵/۳۰ بحوالہ ابن عساکر و ابن ابی حاتم و کنز العمال صفحہ ۲۴۶/۲۔

اُسے سمجھنے کے لیے انسان کو اپنی نگاہ مزید اونچا کرنے کی ضرورت ہے۔ غور و فکر کی ضرورت ہے کہ یہ دونوں نظام بھی کسی تیسرے ان سے اوپر والے نظام کے تحت چل رہے ہیں۔

حظیرۃ القدس

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اصطلاح میں اس تیسرے نظام کو حظیرۃ القدس کا نظام کہا گیا ہے۔ کائنات کا شمس و قمر والا نظام ہو یا خمسہ متحیرہ کا غیر منظم نظام ہو۔ یہ حظیرۃ القدس والے کے تحت چل رہے ہیں۔ آج یہ نظام شمسی نظر آ رہا ہے۔ مگر جب قیامت برپا ہوگی۔ تو اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظام ظاہر ہوگا۔ اتنی بڑی تجلی ظاہر ہوگی جس کی وجہ سے سورج بالکل تاریک ہو کر رہ جائے گا۔ نظام شمسی ختم ہو جائے گا اور حظیرۃ القدس والا نظام کارفرما ہو جائے گا۔ قرآن کریم کا نزول بھی اسی نظام کے تحت ہوا ہے۔

جبرئیل علیہ السلام کی طاقت

قرآن پاک کے متعلق فرمایا[1] انّہ لقول رسول کریم یہ بڑی عزت والے قاصد کا کلام ہے۔ قرآن تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ مگر اس مقام پر اُسے لانے والے جبرائیل علیہ السلام کے کلام سے موسوم کر کے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ کیونکہ جبرائیل علیہ السلام کو قرآن پاک لانے کی وجہ سے اس کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ اور جبرائیل کیا چیز ہے۔ ذی قوۃ بڑی طاقت کا مالک ہے۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری قوت کا ذکر کیا ہے ذرا بتاؤ کہ تمہاری طاقت کتنی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس قدر طاقت عطا کی ہے جس کا اندازہ قوم لوط کی تباہی سے کیا جا سکتا ہے بحر میت کے قریب شرق اُردن میں چھ بڑے بڑے شہر تھے۔ جن کی مجموعی آبادی چار لاکھ نفوس سے زیادہ تھی[2] زمین تھی۔ باغات تھے، مگر جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا، میں نے اپنے پر کے ایک ذرا سے کنارے سے پورے علاقہ کو اٹھا کر اتنی بلندی پر لے گیا کہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آسمان پر سنائی دینے لگیں۔ پھر میں نے ان کو زمین پر پٹخ دیا۔ بحر مردار کی آج تک یہ حالت ہے کہ اس کے پانی میں کوئی جانور زندہ نہیں رہ سکتا۔

---

[1] تفسیر روح المعانی ص ۵۹ ج ۳۰ و تفسیر در منثور ص ۳۲۱ ج ۶ بحوالہ ابن عساکر

[2] تفسیر ابن کثیر ص ۲۵۹ ج ۴

الغرض! جبرائیل علیہ السلام بڑی طاقت کا مالک ہے۔ نیز وہ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ عرش کے مالک یعنی خدا تعالیٰ کے نزدیک صاحبِ مرتبہ ہے۔ وہ مُّطَاعٍ ہے وہاں پر اس کی بات مانی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ سردار ہے۔ دوسرے فرشتے اور ملاءِ اعلیٰ کی جماعت اس کے ماتحت ہے۔ ثَمَّ وہاں پر اَمِیْنٍ امانتدار ہے۔ یہ جبرائیل علیہ السلام کی تعریف بیان کی گئی ہے وہ قرآن کریم کو حظیرۃ القدس سے لانے والا ہے۔

فرمایا وَمَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ تمہارے صاحب جن پر قرآن نازل ہوا ہے۔ (نعوذ باللہ) کوئی دیوانے نہیں ہیں۔ مشرک اور کافر حضور علیہ السلام کے متعلق کہتے تھے اِنَّکَ لَمَجْنُوْنٌ آپ دیوانے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بیہودہ بات کی تردید فرمائی۔ سورۃ نٓ اور بعض دیگر سورتوں میں آچکا ہے۔ کہ آپ کو دیوانہ کہنا محض اتہام ہے۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اعلیٰ درجے کی استعداد اور صلاحیت بخشی ہے۔ ایسی صلاحیت جو ساری کائنات میں کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔

جبرائیل علیہ السلام اپنی اصلی صورت میں

جیسے کہ پہلے بیان ہوا جبرائیل علیہ السلام کا تعلق قرآن پاک کے واسطہ سے نظام بالا کے ساتھ ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے۔ وَلَقَدْ رَاٰہُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ یعنی نبی علیہ السلام نے جبرائیل علیہ السلام کو کھلے کنارے پر دیکھا ہے۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ ابتدائے نبوت کے زمانہ میں حضور علیہ السلام نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اپنی اصل شکل میں دیکھا تھا جبرائیل علیہ السلام کرسی پر بیٹھے تھے اور آسمانی فضا بھری ہوئی تھی آپ نے مشاہدہ کیا تو دہشت طاری ہوگئی گھر تشریف لائے اور فرمایا مجھ پر کمبل ڈال دو پھر آپ نے سارا واقعہ بیان کیا۔ اس کے بعد آپ نے دوسری مرتبہ جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا۔ اس کا ذکر سورۃ نجم میں موجود ہے "وَلَقَدْ رَاٰہُ نَزْلَةً اُخْرٰی" مگر کس مقام پر، معراج کے موقع پر حظیرۃ القدس میں "عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی" سدرۃ المنتہیٰ کے قریب "عِنْدَھَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی" جہاں بہشت بھی پاس ہی ہے۔ فرمایا مشاہدے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں "مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" نبی علیہ السلام نے جو کچھ مشاہدہ فرمایا صاف صاف

---

[1] بخاری ص ۳ ج ۱ و مسلم ص ۱ ج ۱

واضح طور پر تھا۔ الغرض فرمایا جبرائیل علیہ السلام کو قرآن پاک لانے کی بنا پر حظیرۃ القدس کے نظام سے تعلق ہے۔ ○

حضور علیہ السلام اور قرآن پاک

فرمایا تمہارا صاحب یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کاہن کی طرح نہیں ہے۔ جو جنات سے خبر معلوم کرکے اس میں جھوٹ ملاتے ہیں۔ اور پھر فیس لے کر دوسروں کو حال بتلاتے ہیں۔ خود بھی راستے سے بھٹکتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ حضور علیہ السلام کو جب کوئی غیب کی خبر معلوم ہوتی ہے تو وہ اس کو ظاہر کرنے میں بخل نہیں کرتے نہ کوئی معاوضہ طلب کرتے ہیں۔ بلکہ ٹھیک ٹھیک دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ آپ کا قرآن پاک کے ساتھ اتصال ہے۔ اور یہ ایسی کتاب ہے۔ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ یہ شیطان مردود کی بات نہیں ہے۔ مشرک لوگ حضور علیہ السلام پر الزام لگاتے تھے کہ آپ جنات سے کلام سیکھتے ہیں اور آگے بطور قرآن پیش کرتے ہیں۔ یا جیسے عیسائی الزام لگاتے تھے۔ کہ آپ نے یہ کلام کسی راہب سے سیکھا ہے۔ فرمایا یہ شیطان کا کلام نہیں ہے۔ کیونکہ شیطان ہمیشہ برائی کی بات کرتا ہے۔ مگر قرآن پاک نہایت پاکیزہ تعلیم پیش کرتا ہے۔ اخلاق عالیہ، توحید الٰہی، عبادات ربانی، اور اعلیٰ وارفع قوانین پیش کرتا ہے۔ بھلا ایسی چیز شیطان کیسے پیش کر سکتا ہے۔ یہ تو محض ان کا الزام ہے۔

دعوت فکر

فرمایا اس تمام تر حقیقتِ حال کے واضح ہو جانے کے بعد فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ تم کدھر جا رہے ہو ذرا غور و فکر کرو۔ کیسی الٹی باتیں کر رہے ہو۔ قرآن پاک کی اصلیت یہ ہے کہ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ یہ تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔ یاددہانی ہے نعمت ہے اور منزل من اللہ ہے۔ اس کو لانے والا وہ فرشتہ ہے جس کی صفات سن چکے جس ذات پاک پر نازل ہوا۔ اس کی تعریف بھی معلوم ہو گئی اور خود قرآن پاک کی حقیقت سے بھی تم آگاہ ہو گئے یہاں پر اشارۃً یہ بات سمجھا دی کہ حقیقی ترقی قرآن پاک ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر کائنات کے کسی حصے میں ترقی کا کوئی امکان نہیں، سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت و حرفت میں موجودہ مادی ترقی کے باوجود نسل انسانی جب تک قرآن پاک کو نہیں اپنائے گی۔ گڑھے کا گڑھا رہے گی۔ لوگ حقیقی انسانیت سے محروم رہیں گے۔ فرمایا جو کوئی تم میں سے

سیدھا ہونا چاہیے لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ اُسے چاہیے کہ وہ قرآن پاک کا دامن پکڑے کیونکہ یہ پاسپورٹ ہے۔ ترقی کا پاسپورٹ ہے۔ اسی کے ذریعے حقیقی ترقی کی منازل طے کی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا جو شخص راہ راست پر آنا چاہتا ہے۔ اُسے قرآن پاک سے وابستہ ہونا پڑے گا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

قیامت اور قرآن پاک کا باہمی ربط

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن پاک نظام بالا سے آیا ہے۔ اور قیامت اس نظام کے ظہور کا نام ہے۔ گویا قرآن اور قیامت دونوں کا تعلق نظام بالا سے ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں آپس میں مربوط ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات مختصہ قدیم ہیں مگر قرآن پاک پیغمبر علیہ السلام کی ذات پر زمانہ آخر میں نازل ہوا۔ تو اس لحاظ سے صفات الٰہیہ اور قرآن میں تطبیق ہوگی۔ اس مسئلہ کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح سمجھایا ہے کہ جس طرح قدرت، علم، مشیت، ارادہ وغیرہ اللہ کی صفات ہیں اسی طرح خدا کا کلام بھی اس کی صفت ہے۔ اور جس طرح دوسری صفات ازلی ہیں، اسی طرح اُس کا کلام بھی ازلی ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ اللہ کا کلام ذاتِ خداوندی سے تجلّی کی صورت میں حظیرۃ القدس میں نازل ہوتا ہے۔ وہاں پر ملاءِ اعلیٰ کی جماعت اور ان کے سردار جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ تو یہ تجلّی جبرائیل علیہ السلام کے قلب پر منقش ہوجاتی ہے پھر اس مادی دنیا میں جب منصب نبوت کے لیے کوئی ہستی منتخب کرلی جاتی ہے۔ تو جبرائیل علیہ السلام حکم الٰہی سے اللہ تعالیٰ کے کلام کی اُس تجلّی کو اپنے خاص الفاظ اور معانی کے ساتھ لاکر نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ[1] کے مصداق پیغمبر علیہ السلام کے قلب مبارک پر نازل کرتے ہیں۔ یہ فرشتے اور پیغمبر کا ربط بھی ہوگیا۔

قرآن پاک حقیقی ترقی کا ذریعہ ہے

یہ بات بیان ہوچکی کہ صراطِ مستقیم کے حصول کے لیے قرآن پاک سے وابستگی ضروری ہے۔ اور سیدھا راستہ اسی کے حصے میں آئے گا لِمَنْ شَآءَ جو اسے حاصل کرنا چاہے گا۔ آگے فرمایا وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ یعنی تم ٹھیک نہیں چل سکتے، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر تم صحیح راستے پر نہیں چل سکتے۔ یہاں بھی اسی کے محتاج ہو۔ اس

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۲ و ۲۴ ج ۱

دنیا میں قرآن پاک کی تعلیمات سے وہی شخص فائدہ اٹھائے گا۔ جس میں اسے سمجھنے اور عمل پیرا ہونے کی استعداد اور صلاحیت ہو گی۔ اور یہ صلاحیت بھی خدا تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ لہذا قرآن پاک کی تعلیم سے مستفید ہونا بھی رضائے الٰہی پر موقوف ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کے دل و دماغ میں وہ صلاحیت ہی پیدا نہیں کی۔ یا ان کی پے در پے نافرمانیوں کی وجہ سے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے تو ایسے لوگ فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کا یہی مطلب ہے۔ یعنی تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ وہ جس میں صلاحیت رکھتا ہے وہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ قرآن پاک واضح طور پر خبردار کرتا ہے کہ قیامت آنے والی ہے۔ اُس کے لیے تیاری کر لو اس لحاظ سے قیامت اور قرآن پاک کا اتصال ہے۔ اور اس لحاظ سے بھی کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اس کے بعد کوئی کتاب نہیں۔ صرف قیامت ہی آنی ہے۔ درمیان میں نہ کوئی نبی ہے اور نہ کوئی اور پروگرام ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے بعد قیامت ہی آئے گی۔[1]

خلاصہ سورۃ

اس سورۃ مبارکہ کے پہلے حصہ میں قیامت کا بیان اس لحاظ سے ہے۔ کہ کائنات کی مختلف اشیاء پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ انسان نے جو کچھ اس دنیا میں کمایا، قیامت کے روز اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ سورۃ کے دوسرے حصے میں نظام شمسی اور خمسہ متحیرہ کا ذکر ہے۔ اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ ان دونوں نظاموں کا تعلق حظیرۃ القدس کے بالائی نظام سے ہے۔ پھر فرمایا کہ قرآن پاک بھی اُس بالائی نظام سے آیا ہے۔ لہذا قرآن کریم اور قیامت آپس میں مربوط ہیں۔

---

[1] مسلم صفحہ ۴۰۶ ج ۲، بخاری صفحہ ۹۶۳ ج ۲

سورة الانفطار

عــمّ ۳۰ | الانفطار ۸۲

درس اوّل | (آیت ۱ تا ۸)

سُوْرَۃُ الْاِنْفِطَارِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ تِسْعَ عَشْرَۃَ اٰیَۃً

سورۃ انفطار مکی ہے اور اس میں انیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿۱﴾ وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ ﴿۲﴾ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿۳﴾ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ﴿۴﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ﴿۵﴾ یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ ﴿۶﴾ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ﴿۷﴾ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ﴿۸﴾

ترجمہ :- جب آسمان پھٹ جائے گا ﴿۱﴾ اور جب ستارے بکھر جائیں گے ﴿۲﴾ اور جب دریا چلائے جائیں گے ﴿۳﴾ اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی ﴿۴﴾ ہر شخص جان لے گا جو کچھ اس نے آگے بھیجا ہے اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے ﴿۵﴾ اے انسان! رب کریم کے بارے میں تجھے کس چیز نے دھوکا دیا ہے ﴿۶﴾ وہ جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے (تیرے اعضاء کو) درست کیا پھر تجھے (خاص اعتدال کے ساتھ) برابر کیا ﴿۷﴾ پھر جس طرح چاہا اس نے تیری ویسی ہی شکل وصورت بنادی ﴿۸﴾

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سورۃ الانفطار ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی انیس[۱۹] آیتیں ہیں۔ یہ سورۃ اسی الفاظ اور تین سو انتیس[۳۲۹] حروف پر مشتمل ہے۔

موضوع اور ربط اس سورۃ میں بھی قیامت کا بیان ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر اس اعتبار سے کیا کہ انسان کے باطن پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ پہلی سورۃ کی ابتداء میں قیامت کا ذکر تھا اور اس سورۃ میں بھی قیامت کا ہی حال بیان ہوا ہے۔ گذشتہ سورۃ کے آخری حصے میں قرآن کریم کا ذکر تھا۔ اور اس میں محاسبے کا بیان ہے۔ اعمال کی حفاظت اور نگرانی کا ذکر ہے۔ پہلی سورۃ میں

یہ بات سمجھائی گئی تھی کہ قیامت کا اثر کائنات پر کیا ہو گا۔ اور اس سورۃ میں یہ ذکر ہے۔ کہ انسان کے باطن پر قیامت کا کیا اثر ہو گا۔ اس طرح دونوں سورتیں آپس میں مربوط ہیں۔

اس سورۃ میں ایک نئی بات یہ بتائی گئی ہے۔ کہ قیامت کو یَوۡمُ الدِّیۡنِ کیوں کہا جاتا ہے نیز یہ کہ اس دن انسان مکمل طور پر بے بس ہو گا۔ اور اس کے دل میں سخت ندامت ہو گی۔ قیامت کے حالات کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو قیامت کی شدت کا احساس ہو سکے۔ گناہوں سے باز آ جائیں اور آخرت کی فکر کریں۔

قیامت سب سے بڑا حادثہ ہو گا

تخلیق کائنات کی ابتدا سے لے کر اب تک جتنے واقعات پیش آ چکے ہیں یا آئندہ پیش آنے والے ہیں۔ ان میں قیامت کا واقعہ سب سے بڑا ہو گا۔ اسی لیے قیامت کو اَلۡقَارِعَۃ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ ایک حادثہ ہو گا، جو جھٹکا دینے والا ہو گا۔ قیامت کا ایک نام واقعہ بھی ہے۔ کہ ایک واقعہ پیش آنے والا ہے۔ جب کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں رہے گی۔ اس طرح اسے الطَّآمَّۃُ الۡکُبۡرٰی بھی کہا گیا ہے۔ یعنی سب سے زوردار حادثہ یا ہنگامہ، تو گویا ان سورتوں میں مختلف اشیاء پر قیامت کے اثرات بیان کر کے اللہ تعالےٰ نے تنبیہ فرمائی ہے۔ کہ ہر شخص محاسبے کے لیے تیار رہے۔

قرآن کریم کے ساتھ ربط

قرآن کریم کی تعلیم بھی یہی ہے۔ کہ انسان قیامت کے محاسبے سے بچ جائے۔ قرآن پاک تذکرہ اور نصیحت ہے۔ لہٰذا جو شخص چاہے اس سے فائدہ اٹھا لے۔ یہ اس کی اپنی مرضی اور خواہش پر منحصر ہے۔ کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات سے کس حد تک مستفید ہوتا ہے۔ اسی تعلیم کو پیش نظر رکھ کر قیامت کے لیے تیاری کرنی ہو گی۔ اگر وہ اس کلام پاک سے توجہ ہٹائے گا۔ تو بھٹک جائے گا۔ اور اللہ تعالےٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکے گا یہ "گرد قرآن گرد" کے مصداق انسان کو قرآن پاک کے گرد ہی گھومنا چاہیے۔ جو شخص قرآن کا دامن تھام لے گا، وہ اس جہان میں عقوبت سے چھوٹ جائے گا۔ اور اس دنیا میں فتنوں سے محفوظ رہے گا۔ سنائیؒ کا شعر ہے۔ ع

زاں جہاں از عقوبت زیں جہاں از فتن

دوسری بات یہ ہے۔ کہ بنی نوع انسان اگر مزید پچاس ہزار یا ایک لاکھ سال بھی آباد رہے۔ مگر اسے پروگرام قرآن پاک سے ہی لینا ہو گا۔ لہٰذا لازم ہے کہ انسان اپنا رابطہ قرآن

پاک کے ساتھ قائم رکھے ۔

آسمان پھٹ جائے گا

اس سورۃ میں قیامت کا ذکر جن اشیاء کے حوالے سے کیا جا رہا ہے۔ ان میں آسمان سرفہرست ہے۔ فرمایا اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ چونکہ عام انسانوں کی ذہنیت اس قسم کی ہوتی ہے۔ کہ کسی غیر معمولی واقعہ کو دیکھ کر فوراً متوجہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک کے پروگرام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس قسم کے غیر معمولی واقعات کا تذکرہ فرمایا، تاکہ لوگ توجہ کریں، غور و فکر کریں۔ اور حقیقت کو سمجھیں۔ چنانچہ آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر کیا۔ کہ جب قیامت کا پہلا صور پھونکا جائے گا۔ کوئی چیز اپنے مستقر پر نہیں ٹھہر سکے گی۔ ہر چیز درہم برہم ہو جائے گی۔ آسمان پھٹ جائے گا جیساکہ سورۃ نبا میں آ چکا ہے " وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا " آسمان کھول دیا جائے گا۔ اور فضا میں دروازے نظر آئیں گے۔ اور آسمان سے پرے کی ہر چیز نظر آنے لگے گی۔ اس دن فرشتے بھی اتر پڑیں گے۔ حیرت انگیز منظر ہوگا، ہر چیز پر دہشت طاری ہوگی، اس دن مقربین الٰہی بھی خوفزدہ ہونگے حضرت آدم علیہ السلام کہیں گے [1]

اِنَّ رَبِّیْ غَضِبَ الْيَوْمَ غَضَبًا لَمْ يَغْضَبْ قَبْلَهٗ مِثْلَهٗ وَلَمْ يَغْضَبْ بَعْدَهٗ مِثْلَهٗ ۔

یعنی اللہ تعالیٰ آج اس قدر غصے میں ہیں۔ کہ نہ اس سے پہلے کبھی ہوئے اور نہ آج کے بعد ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی قہری تجلی نازل ہوگی۔ جسے غمام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ غمام بادل کو کہتے ہیں۔ اور مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز قہری تجلی میں نزول فرمائے گا۔

ستارے بکھر جائیں گے

فرمایا کہ قیامت کی ایک نشانی یہ بھی ہوگی وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ جب ستارے بکھر جائیں گے۔ ٹوٹ پھوٹ جائیں گے، گر جائیں گے، اپنی جگہ پر قائم نہیں رہیں گے ۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ اور جب دریا چلائے جائیں گے۔ آج تو اپنی اپنی جگہ پر بہ رہے ہیں۔ بحر ہند اور بحیرہ روم اپنے ٹھکانوں پر ہیں۔ مگر جب قیامت واقع ہوگی، سب خلط ملط ہو جائیں گے۔ ایک بن جائیں گے۔ کوئی اپنی جگہ پر قائم نہیں رہے گا۔ اس کے بعد آگ کی تپش سے سارے بھاپ بن کر اڑ جائیں گے۔ پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہے گا۔

---

[1] مسلم ص ۱/۱۱۱ ، ترمذی ص ۳۵۱

قبریں اکھاڑ دی جائیں گی

فرمایا وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ جب قبریں زیر وزبر کر دی جائیں گی۔ اکھاڑ دی جائیں گی۔ اور ان میں مدفون لوگوں کو نکالا جائے گا۔ ان پر خوف و دہشت طاری ہو گا۔ پھر جس طرف سے آواز آرہی ہوگی، اُن کو اس میدان کی طرف چلایا جائے گا۔ اور وہ اس طرح دوڑتے ہوئے جائیں گے جس طرح تیر اپنے نشانے کی طرف جاتا ہے۔ تو ان قبروں کے اکھاڑنے کو حشر اجساد بھی کہتے ہیں

روح اور جسم کا دوبارہ ملاپ

یونانی اور بعض دیگر پرانے فلاسفروں کا اعتقاد ہے۔ کہ جسم ایک دفعہ فنا ہو گیا تو ختم ہو گیا۔ یہ دوبارہ زندہ نہیں ہو گا۔ اگر دوبارہ زندگی کا کوئی تصور ہے۔ تو وہ محض روحانی ہو سکتا ہے۔ جسمانی نہیں۔ ان کی یہ بات درست نہیں ہے۔ قبریں اکھاڑ دینے والے الفاظ بتا رہے ہیں کہ قبروں سے روحوں کو نہیں بلکہ اجسام کو اٹھایا جائے گا۔ ہر جسم کا اُسی روح کے ساتھ تعلق قائم ہو گا جس کے ساتھ دنیا میں قائم تھا۔ کیونکہ اگر قیامت کے دن دنیا کی نسبت مختلف ارواح و اجسام کو اکٹھا کیا گیا۔ تو یہ سخت زیادتی ہوگی۔ دنیا میں انجام دی گئی نیکی یا بدی کی جزا و سزا صرف اُسی صورت میں دی جاسکتی ہے۔ جب کہ قیامت کو انہیں اجسام و ارواح کا تعلق قائم ہو۔ جن کا دنیا میں تھا۔ جب یہ کام مکمل ہو جائے گا، روح اور جسم کا ملاپ ہو جائے گا۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ہر شخص جان لے گا۔ جو کچھ اس نے آگے بھیجا ہے۔ اور جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے۔ اُس دن انسان حیران و پریشان ہو جائے گا۔ اور اللہ تعالےٰ فرمائیں گے "ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ" یہ تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے۔ نیز یہ کہ "وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ" خداوند تعالیٰ کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔ یہ سب تیرا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ جو کوئی اچھی رسم اپنے پیچھے چھوڑتا ہے۔ جتنے لوگ اس پر عمل کریں گے۔ اُس کا صلہ اُس کو بھی ملتا ہے۔ اسی طرح جو شخص بُری رسم چھوڑے گا۔ اس پر دوسرے لوگ عمل کریں گے تو ہر ایک کے بدلے ایک گناہ اس کو بھی پہنچے گا۔ الغرض جو بھی عمل پیچھے چھوڑا ہے۔ اس کا بدلہ پائے گا۔ اگر حرام مال چھوڑ گیا ہے

---

[1] مسلم صفحہ ۳۲۷ ج ۱

تو سزا پائے گا اور کوئی نیکی کا کام چھوڑ گیا۔ تو اسکے بدلے جزا پائے گا۔

خالق اور مخلوق کا تعلق

اب اللہ تعالیٰ کا خطاب براہ راست انسان کی طرف ہوتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کے باطن پر قیامت کے کیا اثرات ہوں گے ارشاد ہوتا ہے یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ اے انسان! رب کریم کے بارے میں تجھے کس چیز نے دھوکا دیا ہے۔ تیرا رب بڑا کریم ہے۔ اُس نے تم پر بڑی مہربانیاں کی ہیں۔ مگر تو اس کے بارے میں دھوکے میں کیوں پڑا ہوا ہے اس کے کرم کا تقاضا تو یہ تھا کہ تو اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا مگر تو دھوکے میں پڑا ہوا ہے۔ سمجھتا ہے کہ تجھ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ تیرا وہ رب کریم ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَكَ جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہیں وجود کی نعمت اور احسن شکل وصورت عطا کی۔ اس کے بغیر کوئی پیدا کرنے والا نہیں " قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ " وہی ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے۔ اُس نے نہ صرف پیدا کیا بلکہ فَسَوّٰىكَ تجھے ٹھیک ٹھاک کر دیا فَعَدَلَكَ تمہیں تمام ظاہری اور باطنی قوتوں سے نوازا۔ تیرے تمام اعضاء کو برابر کیا۔ باقی تمام مخلوق سے ممتاز کیا۔ تمہارے لیے تمام ضروری سامان مہیا کیا۔ پچھلی سورتوں میں بھی گذر چکا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اُسے تمام ظاہری اور باطنی لوازمات مہیا کیے۔ انسانی جسم کے لیے خوراک، لباس، رہائش کے لیے مکان اور دیگر چیزیں عطا کیں۔ اس طرح انسان کی باطنی قوتوں کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہے سب کچھ مہیا کیا۔ مگر انسان پھر بھی بھٹک جاتا ہے۔ اپنے حقیقی سرپرست اور مالک الملک سے روگردانی کرتا ہے۔ پھر دوسروں کو سرپرست بنا لیتا ہے۔ اور شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کی تعلیم یہ ہے۔ کہ حقیقی سرپرست صرف خداوند کریم ہے۔ مسلمان خواہ کتنا امیر کبیر ہو۔ حتیٰ کہ بادشاہ ہو پھر بھی وہ بحیثیت انسان سب کے ساتھ برابر ہے۔ اگر کسی پر اللہ تعالیٰ نے کرم نوازی کی ہے۔ اس میں کوئی کمال رکھا ہے۔ تو اس کی مہربانی ہے۔ ورنہ اس کمال کی وجہ سے مشکل کشا، حاجت روا یا معبود تو نہیں بن جاتا۔

انسان کے بھٹک جانے کی مثال ایسی ہے۔ جیسے دنیا کا کوئی با اختیار بادشاہ ہو۔ اور اس کا شہزادہ غلط سوسائٹی کا شکار ہو کر گھر سے نکل جائے۔ دوسروں کو دوست اور سرپرست

بنا لے پھر زندگی کے کسی موڑ پر گھر واپس پلٹ آئے۔ تو جب وہ باپ کے سامنے پیش ہوگا۔ تو اُسے پتہ چلے گا کہ وہ کس طرح بھٹکتا رہا۔ حالانکہ یہاں سب کچھ موجود ہے۔ مال و دولت، اختیار، عہدہ، علم غرض ہر آسائش موجود ہے۔ مگر میں خواہ مخواہ بھٹکتا رہا۔ ان حالات میں بیٹے کو کتنی ندامت اور پشیمانی ہوگی۔ اس مقام پر یہی بات سمجھانا مقصود ہے۔ کہ انسان اپنے حقیقی سرپرست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جب دوسروں کے ہاں بھٹکتا رہے گا۔ تو قیامت کے دن اُسے سخت ندامت اٹھانی پڑے گی۔ اُس دن اُسے معلوم ہوگا۔ کہ اُس نے کتنا نقصان اٹھایا ہے۔

طبرانی شریف[۱] کی روایت میں ہے کہ اگر کوئی شخص نماز کے دوران اپنی توجہ ادھر اُدھر کرے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کیا مجھ سے اچھی چیز بھی کوئی ہے۔ جو میری بجائے دوسری طرف توجہ کرتے ہو۔ پھر جب دوسری دفعہ توجہ ہٹاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کیا مجھ سے افضل چیز بھی کوئی ہے جس کی طرف دھیان دے رہے ہو۔ اس کے بعد جب تیسری دفعہ کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اس کے حال پہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں۔ جاؤ اب ہماری رحمت تم پر نہیں ہوگی اسی لیے فرمایا[۲] اَلْاِلْتِفَاتُ هُلْكَةٌ نماز میں ادھر اُدھر التفات کرنا ہلاکت کا باعث ہے۔ دنیا میں تو انسان اللہ تعالیٰ سے توجہ ہٹاتا رہا۔ مگر قیامت کے روز جب محاسبہ کا وقت آئے گا۔ تو سخت ندامت ہوگی۔ چنانچہ انسان کے باطن پر بڑا شدید اثر ہوگا۔

فرمایا اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے رب سے مغرور کر دیا۔ حالانکہ اُس نے تمہیں پیدا کیا۔ تمہیں ٹھیک ٹھاک بنایا، تمہارے اعضاء درست کیے یہی نہیں بلکہ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ پھر جس طرح چاہا، ویسی ہی شکل و صورت بنا دی۔ باقی تمام مخلوق جانور، چرند، پرند سب سے ممتاز صورت میں پیدا کیا۔ پھر آپس میں بھی ایسا امتیاز قائم کر دیا کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی الگ الگ پہچان میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ ہر شخص آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر چہرے میں ایسا تفاوت رکھ دیا ہے کہ آپس میں خلط ملط

---

۱ کنز العمال ص۲۵۹ ج۴ بحوالہ بزار ۲ ترمذی ص۱۱ و کنز العمال ص۲۵۴ ج۴

نہیں ہو سکتے۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا "یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ" اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جو شکم مادر میں انسان کو ایسی صورت بخشتا ہے جیسی چاہتا ہے۔

فرمایا اللہ تعالیٰ کی ان بے پایاں نعمتوں کے باوجود تو کس بات پر مغرور ہو رہا ہے۔ جب محاسبہ کا وقت آئے گا۔ تو سخت ندامت اٹھانی پڑے گی۔ قیامت کا یہی اثر انسان کے باطن پر ہوگا۔

درس دوم (آیت ۹ تا ۱۹)

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّيْنِ ﴿۹﴾ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾
يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ
جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ ﴿۱۶﴾
وَمَآ أَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَآ أَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾ يَوْمَ
لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۭ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾ ع

ترجمہ:- خبردار! بلکہ تم انصاف کو جھٹلاتے ہو ﴿۹﴾ اور بے شک تمہارے اوپر البتہ حفاظت کرنے والے مقرر ہیں ﴿۱۰﴾ وہ باعزت لکھنے والے ہیں ﴿۱۱﴾ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو ﴿۱۲﴾ بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے ﴿۱۳﴾ اور بے شک فجار جہنم میں ہوں گے ﴿۱۴﴾ انصاف والے دن اس میں داخل ہوں گے ﴿۱۵﴾ اور وہ اس سے رہا بھی نہیں ہو سکیں گے ﴿۱۶﴾ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ یوم الدین کیا ہے ﴿۱۷﴾ پھر آپ کو کس نے بتلایا کہ یوم الدین کیا ہے ﴿۱۸﴾ وہ دن ایسا ہوگا کہ جس میں کوئی نفس دوسرے نفس کے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا اور تمام ظاہری اور باطنی معاملہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ ﴿۱۹﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اُن انعامات کا ذکر فرمایا، جو اُس نے انسان پر کیے "اَلَّذِیْ خَلَقَكَ" اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے رب کے ساتھ مغرور کیا، حالانکہ اُس نے تمہیں پیدا کیا فَسَوّٰىكَ پھر ٹھیک ٹھاک کیا "فَعَدَلَكَ" پھر برابر کیا۔ تمام اعضاء اور جوڑوں کو درست کیا۔ ان میں تناسب رکھا۔ عقل، شعور، اخلاق، مزاج تمام قوٰی مہیا کیے اور پھر جس قسم کی چاہی صورت بخشی۔ ان تمام حقائق کے باوجود تم اپنے رب سے کیوں روگردانی کرتے ہو۔ اور قیامت کا کیوں انکار کرتے ہو۔

انصاف کا دن

فرمایا کَلَّا خبردار! بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ بلکہ تم انصاف کو جھٹلاتے ہو۔ تم سمجھتے ہو۔ کہ یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم غفلت اور نادانی کی وجہ سے انصاف کے دن کا انکار کرتے ہو۔ وہ دن تو آکر رہے گا۔ اور تمہیں اپنے اعمال کا حساب چکانا ہی ہوگا۔

سورۃ فاتحہ میں بھی اُس دِن کا ذکر آیا ہے۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" انصاف کے دِن کا مالک خداوند تعالیٰ ہی ہے۔ دنیا میں مجازی طور پر اُس نے کچھ اختیار دے رکھے ہیں۔ جو حاکم ہے۔ جو بادشاہ ہے۔ مگر قیامت کے دن تمام اختیارات سلب ہو جائیں گے۔ اُس دِن حکم صرف اللہ تعالےٰ کا چلے گا۔ لہذا تم نادانی کی وجہ سے انصاف کے دِن کا انکار نہ کرو۔ بلکہ انبیاء علیہم السلام اور قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق اُس دن کے لیے تیاری کرو۔ غفلت کو ترک کرو۔ انصاف کا دن آنے والا ہے۔ اُس دِن انسان نے نیکی اور بدی جو کچھ بھی کیا ہے۔ سب سامنے آجائے گا۔

تمام اعمال حاضر کئے جائیں گے

فرمایا " عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ" اُس دن انسان جان لے گا، جو اُس نے آگے بھیجا ہے اور جو پیچھے چھوڑا ہے۔ سب چیزیں حاضر ہوں گی۔ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا " اپنا ہر عمل وہاں موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔ تمہاری یہ خام خیالی ہے۔ کہ مرنے کے بعد انسان کا وجود ختم ہو جائے گا۔ یا اس کے اعمال پیش نہیں ہوں گے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ بے شک تمہارے اوپر البتہ حفاظت کرنے والے مقرر ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو پیدا فرمایا۔ اُسے اچھی شکل و صورت، اچھے اعضاء، ظاہری اور باطنی قویٰ سے نوازا ہے، تو ان اعضاء اور اعمال کی حفاظت کا بندوبست کیا ہے۔ یہ تمام چیزیں فنا نہیں ہوتیں بلکہ کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتی ہیں۔ قیامت کے دن وہ پھر اپنی اصلی حالت میں سامنے آجائیں گی۔ تمام انسان اسی جسم اور روح کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوں گے۔ ان کا محاسبہ ہوگا اور وہ جزاء و سزا کے مستحق قرار پائیں گے۔

کراماً کاتبین

انسان کے اعمال کی حفاظت کا کام اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں یعنی كِرَامًا كَاتِبِيْنَ کے سپرد کیا ہے۔ یہ فرشتے تمہارے اعمال اور اقوال کو محفوظ کر رہے ہیں۔ ہر نیکی بدی لکھی جارہی ہے دوسری آیت میں آتا ہے کہ یہ فرشتے ہر وہ بات لکھتے ہیں۔ مَا تَنْطِقُوْنَ جو تم بولتے ہو۔ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا" یہود بھی بہت زیادہ گستاخیاں کرتے تھے۔ فرمایا ان کی تمام باتیں ہمارے حکم سے ہمارے فرشتے لکھتے ہیں۔ محافظ قوتیں اللہ تعالےٰ نے تمہارے اوپر مقرر کی ہیں۔ وہ تمہارے اقوال و افعال کی نگرانی کرتے ہیں كِرَامًا كَاتِبِيْنَ یعنی عزت والے لکھنے والے ہیں اور يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ جو کچھ تم کرتے ہو، وہ

جانتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں۔

حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک انسان کے ساتھ دو فرشتے کراماً کاتبین مقرر فرمائے ہیں۔ جو انسان کے دائیں اور بائیں کندھے پہ ہوتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں[2]۔ کہ آدمی کے سامنے کے دو دانتوں پہ بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر کندھوں پہ بیٹھنے کی روایت زیادہ معروف ہے۔ الغرض کراماً کاتبیں وہ عزت اور بزرگی والے ہیں۔ ان کی بزرگی کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ نظر نہیں آتے اگر وہ نظر آنے لگیں تو انسان کوئی کام نہ کر سکے، خواہشات کو پورا نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام فرما دیا ہے کہ فرشتے نظر بھی نہیں آتے مگر اپنا کام برابر کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر بُرے کام کو جاننے اور لکھنے کے باوجود وہ انسان کو دنیا میں رسوا نہیں کرتے۔ جیسا کہ سعدی صاحبؒ نے کہا ہے[3] کہ نعوذ باللہ پناہ بخدا! اگر خدا کے سوا کوئی غیب دان ہوتا، تو کوئی شخص بھی آرام کی زندگی نہ گذار سکتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہے۔ جو ہر عیب دیکھنے کے باوجود پردہ پوشی کرتا ہے۔ مگر ہمسایہ ہے کہ دیکھتا نہیں مگر شور مچا دیتا ہے۔

کراماً کاتبین ایک نظام کے تحت اپنے کام میں مصروف ہیں وہ کسی کو رسوا نہیں کرتے۔ بڑی عزت والے ہیں حضور علیہ السلام[4] نے فرمایا جب کوئی انسان برائی کرتا ہے۔ تو فرشتے لکھنے میں توقف کرتے ہیں، شاید یہ شخص توبہ کر لے۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے۔ اگر وہ استغفار کر لے تو وہ گناہ نہیں لکھتے، اور اگر اس پہ اصرار کرے، تو ایک ہی بُرا عمل لکھا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی نیک عمل کرتا ہے، تو دس گنا لکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں موجود ہے "مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا" اور اگر کوئی شخص بُرے کام کا ارادہ کرتا ہے، مگر فی الواقع وہ کام نہیں کر پاتا تو بھی اس کے حق میں نیکی لکھی جاتی ہے۔

بہر حال انسان کے ہر اچھے یا بُرے اقوال و افعال کو محفوظ کیا جاتا ہے۔ سورۃ قٓ میں

---

[1] روح المعانی ص ۶۵/۳۰ [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۰۱ پارہ ۳۰،
[3] گلستان ص ۲۴ باب ۵ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان [4] تفسیر ابن کثیر ص ۲۲۴/۴

فرمایا "مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ" انسان جو بھی بات منہ سے نکالتا ہے۔ نگران اس کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ اور ایک دن وہ سارا ریکارڈ انسان کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ حدیث شریف[لے] میں آتا ہے۔ کہ کراماً کاتبین کے اس اہم کام کے پیش نظر حضور علیہ السلام نے فرمایا اَکْرِمُوا کِرَامًا کَاتِبِیْنَ یعنی کراماً کاتبین کی عزت کیا کرو وہ ہر حالت میں تمہارے ساتھ ہوتے ہیں۔ مگر تین حالتیں ایسی ہیں کہ وہ انسان سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ یعنی بول و براز کے وقت، مباشرت کے وقت اور جب کوئی کپڑے اتار کر غسل کرتا ہے۔ ایک دوسری حدیث[لے] میں اِیَّاکُمْ وَالتَّعَرِّیْ اپنے آپ کو برہنگی سے بچاؤ۔ کیونکہ ایسا کرنے سے فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ انسان کے اقوال و افعال کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے باوجود فرشتوں کے ذریعے ریکارڈ مرتب کرنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ انسان پر اتمام حجت ہو جائے۔ فرشتوں کے پاس رجسٹروں میں ہر چیز کا اندراج ہوتا ہے۔ جب وقت آئے گا تو وہ سارا ریکارڈ پیش کر دیا جائے گا۔ اعمال کو لکھنے اور قیامت کے روز انہیں تولنے کا کام محض لوگوں کے اذہان کو مطمئن کرنے کے لیے ہے۔ جب لکھا ہوا سامنے آئیگا تو یقین آجائے گا۔ اور جب نیک و بد اعمال کا وزن ہوگا، تو انسان کو اپنے نتیجہ کا علم ہو جائیگا۔

ابرار اور فجار کا انجام

لکھے ہوئے ریکارڈ کے علاوہ قیامت کے دن ہر عمل پر گواہی بھی پیش ہوگی۔ انسان کے اپنے اعضاء اس کے خلاف یا اس کے حق میں گواہی دیں گے۔ اس کے علاوہ باہر کی چیزیں بھی گواہی دیں گی۔ منجملہ ان کے فرشتے بھی شہادت دیں گے کہ اس شخص نے فلاں اچھا یا بُرا کام انجام دیا تھا۔ تو گویا انسان کا ہر قول اور فعل مکمل طور پر محفوظ ہے۔ یہ سارا انتظام اللہ تعالیٰ نے اس لیے کیا ہے۔ کہ ہر نیک و بد کو اس کے کئے کی جزا یا سزا مل سکے چنانچہ فرمایا اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ یاد رکھو نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اللہ تعالےٰ نے ایک قانون بنا دیا کہ ہر نیکوکار جسے ایمان کی دولت نصیب ہوگی۔ جس نے اچھے اعمال کئے

لے تفسیر ابن کثیر صہ ۴۸۲/۴ بحوالہ ابن ابی حاتم تفسیر درمنثور صہ ۳۲۳/۶ بحوالہ ابن مردویہ
لے روح المعانی صہ ۶۵/۳۰ بحوالہ بزار

ہوں گے وہ نعمتوں میں ہوگا۔ بعض مفسرینؒ فرماتے ہیں۔ کہ ابرار وہ لوگ ہیں جن کی نگاہ ہر وقت نیکی کی روح پر ہوتی ہے۔ ایک ظاہری عمل ہوتا ہے اور ایک اس کی روح ہوتی ہے۔ جیسے ظاہری طور پر نماز کی ایک شکل وصورت ہے۔ مگر اس کی ایک روح بھی ہے۔ اور روح یہ ہے کہ کَاَنَّکَ تَرَاہُ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو، گویا کہ تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ یعنی عبادت میں حضوری اور اخلاص عبادت کی روح ہے۔ اور ابرار اُس پر نگاہ رکھتے ہیں شیخ ابو طالب مکیؒ لکھتے ہیں[۲] کہ مقربین وہ ہیں جن کی نگاہ ازل پر لگی ہوئی ہے۔ کہ پتہ نہیں ہمارا شمار کس گروہ میں ہوگا۔ وہ ہر وقت اسی بات کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ کہ پتہ نہیں ہم کامیاب لوگوں میں شامل ہوں گے یا ناکام لوگوں میں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[۳]۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِیْمِ یعنی اعمال کا دارومدار خاتمے پر ہے۔ جس کا خاتمہ اچھا ہوگیا وہ کامیاب ہوگیا۔ بسا اوقات کوئی شخص ساری عمر اچھے کام کرتا ہے۔ مگر خاتمہ کفر پر ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات ساری عمر بُرے اعمال کا ارتکاب کرتا رہتا ہے مگر خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے۔ اسی لیے ابرار کی نگاہ ہمیشہ خاتمہ پر رہتی ہے۔

فرمایا نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے اور وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ فجار جہنم میں ہوں گے یَّصْلَوْنَهَا یَوْمَ الدِّیْنِ انصاف والے دن اس میں داخل ہوں گے یعنی جس دن اعمال کی جزا اور سزا کا فیصلہ ہوگا۔ جہنم میں اُس دن داخل ہوں گے اور داخل بھی ایسے ہوں گے۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ اس سے رہا بھی نہیں ہو سکیں گے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں پڑے رہیں گے۔ اگر کفر و شرک کی وجہ سے جہنم رسید ہوئے ہیں تو دائمی طور پہ اس میں رہیں گے۔ ان کی رہائی کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ البتہ تزکیہ کی خاطر کچھ عرصہ کے لیے جہنم میں گئے ہیں تو پاک ہونے کے بعد وہاں سے رہا ہو جائیں گے۔ یہاں پر ایسے لوگوں کا ذکر نہیں ہے۔ صرف ان لوگوں کا ذکر ہے، جو مشرک کافر یا بدعقیدہ لوگ ہیں۔ ساری عمر برائیاں کرتے رہے اور اُسی فاسد عقیدہ پہ ان کا خاتمہ ہوا وہ جہنم سے غائب یعنی آزاد نہیں ہو سکیں گے۔

۱ے ۲ے

۳ے بخاری ص ۹۷۸ / ج ۲

یوم الدین کی وجہ تسمیہ

ایک بات تو پہلے بتادی کہ قیامت کا اثر انسان کے باطن پر کیا ہوگا۔ یعنی "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ"، جب ساری نیکی بدی سامنے ہوگی تو مان لے گا کہ میں دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہوں۔ پھر جب خدا کی جانب سے محاسبہ ہوگا۔ کہ تمہیں کس چیز نے مغرور کیا تو سخت ندامت ہوگی۔ اس کے بعد انصاف کا وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَمَا اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ آپ کو کس نے بتلایا کہ یوم الدین کیا چیز ہے اور قیامت کو یوم الدین کیوں کہتے ہیں پھر تاکیداً فرمایا ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ پھر بتلائیں کہ یوم الدین کیا چیز ہے۔ مخاطب کو متوجہ کرنے کے لیے یہ ایک طریقہ ہے۔ کہ بات دہرائی جائے۔ تاکہ مخاطب اچھی طرح متوجہ ہوجائے پھر اس سوال کا جواب بھی خود ہی ارشاد فرمایا يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا۔ یہ وہ دن ہوگا کہ جس دن کوئی نفس دوسرے کے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا۔ اس دن ہر کوئی اسقدر بے بسی کے عالم میں ہوگا۔ کہ کلام کرنے کی طاقت بھی نہیں ہوگی۔ اس دن بولنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ کوئی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔ تمام ظاہری اور باطنی چیزیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوں گی۔ اس دنیا میں جو اختیارات مجازی طور پر بھی دے دیئے گئے ہیں۔ وہ سب سلب ہوجائیں گے اور حکومت صرف اللہ کی ہوگی۔

حقیقی مالک ذات خداوندی ہے

ابوبکر واسطیؒ فرماتے ہیں۔ کہ حقیقی حکومت دنیا اور آخرت میں اللہ ہی کی ہے۔ حقیقی سرپرست اور مالک وہی ذات ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام اسی بات کی تعلیم دیتے رہے۔ مگر لوگ اپنی بدبختی کی وجہ سے دوسروں کو حاکم ماننے لگتے ہیں۔ اور شرک میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اگر انسان اپنی حیثیت کو پہچان لے، اپنی پیدائش، اعضاء اور قویٰ پہ ہی غور کرلے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا سرپرست نہ بنائے۔ انسان کا کوئی کام اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔ نہ اس کی مشکل کشائی ہوسکتی ہے اور نہ حاجت روائی۔ قیامت کو معلوم ہوگا۔ کہ دنیا کی زندگی تو محض امتحان تھا۔ حقیقی مالک تو وہاں بھی خدا تھا اور یہاں بھی وہی ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ پوچھے گا "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ" آج بادشاہی کس کی ہے، مگر کوئی جواب نہیں دے سکے گا۔

لہ

اللہ تعالیٰ خود فرمائیں گے "لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ" آج حکومت اللہ ہی کے لیے ہے جو واحد ہے اور قہار ہے۔ تمام قوتوں کا مالک وہی ہے۔ اُس دن انسان بالکل بے بس ہو گا۔ اور وہ دن ایسا ہو گا۔ یَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْـًٔا ط" جس دن کوئی نفس کسی چیز کا مالک نہیں ہو گا وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ اور تمام ظاہری اور باطنی معاملہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہو گا۔ اس لیے قیامت کے دن کو یوم الدین یا انصاف کا دن کہتے ہیں۔ کہ اُس روز ہر ایک کو اپنے کردار اور اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ یہ قطعی اور یقینی ہے۔

سُورَةُ المُطَفِّفِين

درس اوّل (آیت ۱ تا ۶)

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّثَلٰثُوْنَ اٰيَةً

سورۃ تطفیف مکی ہے اور یہ چھتیس ۳۶ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ① الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ② وَاِذَا
كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ③ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ
مَّبْعُوْثُوْنَ ④ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑤ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑥

ترجمہ: خرابی (ہلاکت) ہے (ماپ تول میں) کمی کرنے والوں کے لیے ① وہ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں ② اور جب وہ لوگوں کو ماپ کر دیتے ہیں یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا دیتے ہیں ③ کیا یہ خیال نہیں کرتے کہ مرنے کے بعد یہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے ④ ایک بڑے دن میں ⑤ جس دن کھڑے ہوں گے تمام لوگ رب العلمین کے سامنے ⑥

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سورۃ تطفیف یا مطففین ہے اس کی پہلی آیت میں مطففین کا لفظ ہے اور اسی سے اس کا نام ماخوذ ہے۔ تطفیف کا معنیٰ ناپ تول میں کمی کرنا ہے۔ زمانہ نزول میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین[1] کہتے ہیں۔ کہ یہ سورۃ مدنی زندگی میں نازل ہوئی مگر زیادہ مشہور یہ ہے۔ کہ یہ مکی سورۃ ہے۔ اس کی ۳۶ آیات ہیں۔ یہ سورۃ مبارکہ ایک سو انہتر ۱۶۹ الفاظ اور سات سو تیس ۷۳۰ حروف پر مشتمل ہے۔

پہلی سورۃ سے ربط اس سورۃ کا پچھلی سورتوں کے ساتھ خصوصی ربط ہے۔ زمانہ نزول کے لحاظ سے گذشتہ

---

[1] روح المعانی، ج ۳۰ ص ۶۷ و تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۱۰ پارہ ۳۰

سورتوں کی طرح یہ بھی مکی سورۃ ہے۔ اور موضوع کے لحاظ سے جس طرح سابقہ سورتوں میں قیامت کا ذکر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے اس میں بھی قیامت کا ذکر ہے۔ سابقہ سورۃ انفطار میں قیامت کا ذکر اس اعتبار سے تھا کہ جب قیامت واقع ہو گی تو اس کا اثر انسان کے باطن پہ کیا ہو گا۔ اس کے بعد انسان کے اعمال کا محاسبہ ہو گا۔ دنیا میں کیا ہوا ہر چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی محفوظ ہوتا ہے۔ یہ عمل ظاہر ہو یا مخفی، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے محافظ قوتیں مقرر کر رکھی ہیں، جو اس کا ریکارڈ محفوظ رکھتی ہیں اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ" بے شک تمہارے اوپر نگران اور حفاظت کرنے والے مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ عزت والے فرشتے ہیں۔ جو تمہارے ہر عمل کو لکھتے ہیں اگرچہ ہر بات اللہ تعالیٰ کے علم اور لوح محفوظ میں محفوظ ہے۔ مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے۔ جو محاسبہ کے وقت سارا ریکارڈ پیش کر دیں گے۔ اور انسان کے لیے کوئی حجت باقی نہیں رہے گی۔

موضوع

اس سورۃ میں بھی اللہ نے قیامت اور محاسبے کا ذکر فرمایا ہے۔ اور پھر انسانوں کے دو گروہوں یعنی ابرار اور فجار اور ان کے انجام کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس مقام پہ قیامت کا ذکر تاجروں کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ اگلی آیتوں میں آ رہا ہے کہ اہل جنت کامیابی کے ساتھ تختوں پہ بیٹھیں گے اور نہایت آرام دہ زندگی بسر کریں گے۔ اس دنیا میں بھی تاجر لوگ دولت کمانے کے بعد عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر ان کی اکثریت عیاشی اور فحاشی کے کاموں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ لوگ شراب نوشی اور دیگر برے کاموں میں پڑ جاتے ہیں۔ کھیل تماشے اور دیگر افعال قبیحہ میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ دولت کی وجہ سے ان میں غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ انہوں نے بڑی دولت کمائی ہے۔ تو گویا اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے تاجروں کی ذہنیت کے پیش نظر قیامت کا حال بیان کیا ہے۔

ڈنڈی مارنے والوں کی مذمت

ارشاد ہوتا ہے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ویل کا معنی خرابی یا ہلاکت اور تباہی ہے۔ بعض احادیث[1]

---

[1] مستدرک حاکم صفحہ ۵۹۶ ج ۲ و مسند احمد صفحہ ۷۵ ج ۳

سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ویل جہنم کے ایک طبقے کا نام بھی ہے۔ خاص قسم کے لوگوں کو اس میں داخل کیا جائے گا۔ مگر لفظی معنیٰ تباہی اور بربادی ہی ہے۔ جس طرح ویح کا لفظ افسوس کے لیے آتا ہے وَیْحَكَ افسوس ہے تیرے لیے۔ تو ویل بددعا کے مقام پر استعمال ہوتا ہے جیسے وَیْلٌ لَّكَ تباہی ہے تمہارے لیے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ خرابی اور ہلاکت ہے کم کرنے والوں کے لیے یا کم تولنے والوں کے لیے۔ تطفیف کا معنیٰ پیمانے اور پیمائش میں کمی کرنا ہے۔ یعنی ڈنڈی مارنے والے لوگ حقوق العباد کا لحاظ نہیں رکھتے۔ بلکہ کرتے یہ ہیں اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ جب وہ لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں یَسْتَوْفُوْنَ تو پورا پورا لیتے ہیں۔ یہاں پر علیٰ، مِنْ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ یہ حروف ایک دوسرے کے معنوں میں استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ اور استیفاء کا معنیٰ پورا پورا وصول کرنا، جتنا وصول کرنے کا حق ہے۔ فرمایا ادھر تو یہ حال ہے۔ کہ جب لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔ مگر وَاِذَا کَالُوْهُمْ جب ان لوگوں کو ماپ کر دیتے ہیں اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یا تول کر دیتے ہیں تو یُخْسِرُوْنَ گھٹا دیتے ہیں۔ یعنی ماپ اور تول میں دیتے وقت پورا نہیں دیتے بلکہ کم کر دیتے ہیں۔ فرمایا ایسے ہی لوگوں کے لیے تباہی اور بربادی ہے۔

یہاں پر تاجروں کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر جزائے عمل اور محاسبے کی بات کی گئی ہے۔ یہ حقوق العباد کا معاملہ ہے۔ کسی کا نقصان کرنا، کسی کا حق دبانا حرام ہے۔ اپنا حق پورا پورا وصول کر لینا اور جب دوسروں کی باری آئے تو ڈنڈی مار جانا یہ قطعی حرام ہے۔ اور ایسی کمائی حرام کی کمائی ہے۔ حدیث قدسی میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ اے ابن آدم! جس طرح تم دوسروں سے اپنا حق پورا پورا لینا پسند کرتے ہو۔ اسی طرح ان کو بھی پورا پورا حق ادا کرو۔ جب کوئی عقلمند آدمی سودا طے ہو جانے کے بعد کسی کمی کو برداشت نہیں کرتا تو پھر اُسے دیتے وقت بھی اُسی اصول پر قائم رہنا چاہیئے۔ فرمایا۔ اے ابن آدم! جس طرح تم اپنے لیے انصاف پسند

لہ تفسیر عزیزی فارسی صد ۱۱۲ پارہ ۳۰

کرتے ہو اسی طرح دوسروں کے لیے بھی انصاف ہی چاہو۔ جب تم اپنے ساتھ ظلم و زیادتی کو پسند نہیں کرتے تو دوسروں کے لیے کیسے کرتے ہو۔ تو گویا تطفیف کا معنیٰ کمی کرنا ہے۔

نماز میں کمی کرنا باعثِ نقصان ہے

مؤطا امام مالک[1] میں حدیث مذکور ہے۔ کہ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے دیکھا۔ کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ مگر رکوع و سجود ٹھیک طرح سے ادا نہیں کر رہا ہے۔ آپ نے اُسے سخت تنبیہ فرمائی۔ اور فرمایا ہر چیز میں تطفیف یعنی کمی ہوتی ہے۔ تو نے نماز میں تطفیف کیسے کر دی۔ گویا رکوع اور سجود اچھے طریقے سے ادا نہ کرنے کو تطفیف سے تعبیر فرمایا۔ یعنی جس طرح تاجر ڈنڈی مار کر دوسرے کا حق کم کرتا ہے۔ اسی طرح تو نے بھی نماز میں تطفیف کر دی۔ فرمایا ہر چیز کے لیے وفا یعنی تکمیل ہوتی ہے اور ہر چیز کے لیے تطفیف یعنی کمی ہوتی ہے۔

ایک دوسری حدیث[2] میں آتا ہے اِنَّمَا الصَّلٰوۃُ مِکْیَالٌ نماز ایک پیمانہ ہے۔ جس نے پورا پورا ادا کیا وُفِّیَ لَہٗ اس کو بدلہ بھی پورا ملے گا۔ اور جس نے کمی کی، اس کو بھی ایسے ہی نقصان ہوگا۔ تو گویا نماز وفا اور تطفیف کا پیمانہ ہے۔

ماپ تول میں کمی باعثِ نقصان ہے

ترمذی شریف[3] کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام بازار تشریف لے گئے اور تاجروں سے خطاب فرمایا قَدْ وُلِّیْتُمْ اَمْرَیْنِ ھَلَکَتْ فِیْہِ الْاُمَمُ السَّالِفَۃُ قَبْلَکُمْ تمہیں دو چیزوں کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ جن کی وجہ سے تم سے پہلے کئی امتیں تباہ ہوئیں۔ منجملہ ان کے ایکہ اور مدین والوں کا حال تو قرآن پاک میں موجود ہے۔ حدیث[4] سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس بیماری میں اور بھی کئی امتیں تباہ ہوئیں۔ عذاب میں مبتلا ہو کر ختم ہو گئیں۔ فرمایا وہ باتیں کیا ہیں۔ اَلْمِکْیَالُ وَالْمِیْزَانُ وہ ماپ اور تول ہیں۔ جب ان امتوں نے ماپ اور تول میں کمی کی تو اللہ تعالےٰ ناراض ہو گیا۔ اور وہ قومیں تباہ ہوئیں۔ اسی لیے پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا۔ کہ دیکھو! کسی کا حق مت ضائع کرو۔ کسی کا مال دھوکے سے ہضم کرنا۔ ماپ تول میں ڈنڈی مارنا حرام ہے۔

---

[1] مؤطا امام مالکؒ ص۸۰ [2] تفسیر درمنثور ص۳۲۴ ج۶ بحوالہ ابن ابی شیبہ، فیض القدیر ص۲۴۹ ج۴ بحوالہ بیہقی

[3] ترمذی ص۱۹۶ [4] ترمذی ص۱۹۶

تجارت میں جھوٹ اور شیطان کا دخل

تجربات سے ثابت ہے کہ تاجروں کی عام ذہنیت یہ ہے کہ خود زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے اور دوسروں کو کم سے کم دیا جائے۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ کہ تجار! جب تم تجارت کرتے ہو۔ تو شیطان بھی حاضر ہوتا ہے۔ اور جھوٹ بھی۔ جو کہ روا نہیں۔ تاجر لوگ رقم میں کمی کرتے ہیں۔ فرمایا اپنی تجارت اور کمائی کے ساتھ صدقے کو ملاؤ۔ محدثین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس کا معنی یہ نہیں ہے۔ کہ جھوٹ بول کر اور شیطان کے پیچھے چل کر تھوڑا سا صدقہ دے دو، تو بات ٹھیک ہو جائیگی ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرو کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو۔ کاروبار میں جھوٹ نہ بولا جائے۔ اور کوئی خرابی نہ آئے۔ اس کے باوجود نادانستہ طور پر اگر کوئی غلطی ہو جائے تو خدا تعالیٰ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صدقہ دو[2]۔ دوسری طرف جو صحیح تجارت کرنے والے لوگ ہیں حضور علیہ السلام نے اُن کی بہت تعریف فرمائی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو دوسروں کا حق ضائع نہیں کرتے، جھوٹ نہیں بولتے جھوٹی قسمیں نہیں کھاتے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[3] جس نے تجارت میں جھوٹی قسم کھائی اس کی کمائی سے برکت اٹھ گئی۔ سودا تو بے شک چل گیا مگر ساری برکت اڑ گئی۔ یہ جھوٹی قسم سودے کو چلا دیتی ہے۔ مگر برکت کو زائل کر دیتی ہے۔

سچے تاجروں کے لیے اجر

حضور علیہ السلام نے فرمایا[4] اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ یعنی سچے اور امانتدار تاجروں کا حشر نبیوں، شہیدوں اور صدیقوں کے ساتھ ہوگا۔ یہ لوگ اتنے اونچے درجے پر ہوں گے۔ تجارت کا پیشہ ایک عظیم پیشہ ہے۔ خود انبیاء علیہم السلام تجارت کرتے رہے۔ تاہم اس میں خرابی یہ ہے۔ کہ عام تاجرانہ ذہنیت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع کماؤ۔ حلال و حرام کی کوئی تمیز نہیں۔ اس وجہ سے ان کی مذمت کی گئی ہے اس بری ذہنیت کی وجہ سے یہ لوگ دنیا میں تباہ برباد ہوتے ہیں۔ طرح طرح کی خرابیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور مصائب کا شکار ہوتے ہیں۔ البتہ جو لوگ اپنی کمائی میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں، غرباء و مساکین کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ بڑی حد تک بچے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان

---

1 ترمذی ص ۱۹۵ 2 مستدرک حاکم ص ۵ ج ۲ 3 مسلم ص ۳۲ ج ۲ بخاری ص ۲۸۰ ج ۱

4 دارمی ص ۱۶۳ ج ۲ ترمذی ص ۱۹۵

کو کئی قسم کے حادثات سے محفوظ رکھتا ہے۔ لہذا پورا لینا اور پورا دینا احسن فعل ہے۔

قیامت کے روز محاسبہ

فرمایا ماپ تول میں کمی کرنے والے۔ کیا خیال کرتے ہیں کہ ان کا محاسبہ نہیں ہو گا؟ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ اور وہ منزل کب آئے گی۔ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ بڑے دن کو آئے گی۔ بڑا دن قیامت کا دن ہو گا۔ جس دن وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اور ان کا محاسبہ ہو گا۔ اس روز یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ جب لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ وہ رب جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ ابن ابی حاتم کی روایت[1] میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ السلام نے حضرت بشیر غفاریؓ سے فرمایا اے بشیر! اس دن کیا کرو گے جب اللہ کے حضور کھڑا ہونا پڑے گا۔ اور دنیا کے شب و روز کے حساب سے تین سو سال گنہ رہائیں گے وہ بڑا دن اتنا لمبا ہو گا۔ اس دن بڑی تلخی ہو گی۔ لوگ پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ حضرت بشیرؓ نے عرض کیا حضور! اَلْمُسْتَعَانُ بِاللّٰہِ یعنی اللہ تعالیٰ ہی مدد فرمائے ان مشکل گھڑیوں کو آسان فرمائے۔ ورنہ انسان کے بس کی یہ بات نہیں ہے۔ اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا[2] کہ جب بستر پہ لیٹو تو اللہ تعالیٰ سے قیامت کی تنگی اور بے چینی سے پناہ مانگو۔ دوسری دعا[3] میں آتا ہے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ ضِیْقِ الدُّنْیَا وَضِیْقِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اے اللہ میں دنیا کی تنگی سے اور خاص طور پر قیامت کی تنگی سے تیری ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں۔

مسلم شریف[4] کی روایت میں آتا ہے کہ لوگ کھڑے ہوں گے اور سورج ایک یا دو میل کی مسافت پہ ہو گا۔ ایسی تپش ہو گی۔ کہ لوگوں کو پگھلا رہا ہو گا۔ پسینہ کسی کے ٹخنوں تک ہو گا کسی کی کمر تک اور کسی کو پسینہ کی لگام لگائی ہوئی ہو گی پسینے میں یہاں تک پہنچے ہوں گے تو فرمایا ایسے تاجر جو خود زیادہ نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور دوسروں کو ان کا جائز حق بھی پورا نہیں دینا چاہتے۔ کیا ان کو یہ خیال نہیں ہے کہ ایک دن وہ رب العلمین کے سامنے کھڑے ہونگے

---

1 تفسیر در منثور ص ۳۲۴ ج ۶ ابن کثیر ص ۴۸۴ ج ۴ بحوالہ ابن ابی حاتم 2 ترمذی ص ۴۸۹ در منثور ص ۳۲۴ ج ۶
ابن کثیر ص ۴۸۴ ج ۴ 3 ابوداؤد ص ۳۳۸ ج ۲ 4 مسلم ص ۳۸۴ ج ۲ ، بخاری ص ۹۶۷ ج ۲

انہیں اپنے اعمال کا محاسبہ پیش کرنا ہوگا۔ اس وقت ایسے لوگوں کا کیا حشر ہوگا۔

اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے فجار کا انجام اور ان کی تفصیل اور اسی طرح ابرار کا انجام اور ان کی تفصیل بیان کی ہے۔ اور ضمناً تاجرانہ ذہنیت کے مطابق قیامت کے مسئلہ پر مزید روشنی ڈالی ہے۔

عم ۳۰ — التطفیف ۸۳

درس دوم — (آیت ۷ تا ۱۷)

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ ﴿۷﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّیْنٌ ﴿۸﴾ كِتٰبٌ
مَّرْقُوْمٌ ﴿۹﴾ وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِیْنَ یُكَذِّبُوْنَ بِیَوْمِ
الدِّیْنِ ﴿۱۱﴾ وَمَا یُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ ﴿۱۲﴾ اِذَا تُتْلٰى
عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۳﴾ كَلَّا بَلْ ٚ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَىٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿۱۵﴾
ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ یُقَالُ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ
تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۷﴾

ترجمہ:۔ خبردار! بے شک فجار کا اعمالنامہ البتہ سجین میں ہوگا ﴿۷﴾ اور آپ کو کس نے بتلایا سجین کیا ہے ﴿۸﴾ یہ ایک دفتر ہے لکھا ہوا ﴿۹﴾ ہلاکت ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ﴿۱۰﴾ وہ لوگ جو انصاف کے دن کی تکذیب کرتے ہیں ﴿۱۱﴾ انصاف کے دن کو نہیں جھٹلاتا مگر ہر زیادتی کرنے والا گنہگار ﴿۱۲﴾ جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی تو کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں ﴿۱۳﴾ خبردار! (ہرگز ایسا نہیں) بلکہ ان کے دل زنگ آلودہ ہو گئے ہیں ان اعمال (بد) کی وجہ سے جو وہ کماتے تھے ﴿۱۴﴾ خبردار! بے شک یہ لوگ اُس دن اپنے رب سے حجاب میں رکھے جائینگے ﴿۱۵﴾ پھر یہ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے ﴿۱۶﴾ پھر ان سے کہا جائے گا یہی ہے وہ جس کی تم تکذیب کرتے تھے ﴿۱۷﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سورۃ مبارکہ میں بھی قیامت کا ہی ذکر ہے۔ اس مقام پر تاجرانہ ذہنیت کو سامنے رکھ کر قیامت کے مسئلہ پر کلام کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تاجروں کی مذمت بیان کی ہے جو ماپ تول میں کمی کر کے لوگوں کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ اپنا فرض پورا نہیں کرتے۔ اور دوسروں کو ان کا پورا حق ادا نہیں کرتے۔ گویا اپنے لیے انصاف پسند کرتے ہیں۔ اور دوسروں کے

پلیے ظلم۔ خود زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ انہیں لوگوں کے متعلق فرمایا۔ کہ کیا یہ گمان کرتے ہیں کہ دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا یہ اُن کی خام خیالی ہے انہیں ایک عظیم دن میں اپنے رب کے حضور کھڑا ہونا ہے۔ اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے نظریہ کی بھی تردید فرمائی۔ کہ کوئی یہ گمان نہ کرے کہ مرکر ضائع ہو جائیں گے۔ اور اعمال کا حساب وکتاب نہیں ہوگا۔ بلکہ جیسا کہ پہلی سورۃ میں بیان ہو چکا ہے۔ وَاِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ "بے شک تمہارے اوپر محافظ مقرر ہیں۔ جو کہ کراماً کاتبین ہیں، تمہارے ہر عمل کو لکھ رہے ہیں" یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ "تم جو کچھ بھی کرتے ہو، وہ اُس سے واقف ہیں کوئی بات ان سے مخفی نہیں رہتی۔ لہٰذا وہ دن یقیناً آنے والا ہے۔ جس دن ہر شخص کو اپنے کیے کی سزا یا جزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

فجار کا انجام

فرمایا کَلَّآ ہرگز نہیں۔ ان لوگوں کے تمام گمان غلط ہیں۔ اِن کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل بات یہ ہے۔ اِنَّ کِتٰبَ الۡفُجَّارِ لَفِیۡ سِجِّیۡنٍ بے شک فجار کا اعمالنامہ البتہ سجین میں ہے۔ کتاب کا معنی نوشتہ، یا لکھی ہوئی چیز اور مراد اعمالنامہ ہے۔ فجار کے معنے گنہگار کے ہیں۔ اور یہ دو قسم ہیں۔ مومن بھی فجار کی فہرست میں آجاتے ہیں۔ جب کہ وہ قانون الٰہی کو تسلیم کرتے ہوئے اُسے توڑتے ہیں۔ یہ قانون شکن فاجر ہیں۔ اور جو لوگ سرے سے قانون الٰہی کو مانتے ہی نہیں۔ وہ تو فاجر ہیں ہی۔ تو فرمایا فجار کا اعمالنامہ سجین میں ہے۔ اب رہا لفظ سجین۔ تو اس کا مادہ سجن ہے، اور سجن عربی میں قید خانے کو کہتے ہیں۔ اس میں تنگی۔ ضیق تسفل یا پستی کا معنیٰ پایا جاتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں۔ کہ سجین ساتوں زمینوں کے نیچے ہے۔ حدیث شریف[1] سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب روح جسم سے جدا ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس کی حاضری علیین یا سجین میں ہوتی ہے۔ اگر نیک روح

---

[1] درمنثور صفحہ ۳۲۴ ج ۶ معالم التنزیل صفحہ ۳۱۸ ج ۴ مظہری صفحہ ۲۲۰ ج ۱۰

ہے۔ تو وہ علیین ہیں جاتی ہے۔ اور اگر کافر، منافق، فاجر ہے۔ تو اس کی روح سجین میں حاضر کی جاتی ہے۔ اس حاضری کے بعد برزخ کے معاملات پیش آتے ہیں۔ تو فرمایا فجار کے اعمالنامے سجین میں ہیں۔

اس کے بعد فرمایا وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ اور آپ کو کیا معلوم کہ سجین کیا ہے۔ پھر خود ہی بتایا كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ یہ ایک دفتر ہے لکھا ہوا۔ امام بغویؒ[1] اور امام ابن کثیرؒ[2] نے کتاب مرقوم کا معنی مُہر لگایا ہوا نوشتہ کیا ہے۔ اگر یہ معنی لیا جائے تو یہ اعمالنامے کی صفت ہوگی۔ یعنی فجار کے تمام اعمال جو بھی انہوں نے اپنی پوری زندگی میں انجام دیے۔ انہیں ایک نوشتہ میں درج کر کے مہر لگا دی جاتی ہے۔ اب ان میں کسی کمی بیشی یا خلط ملط یا ضائع ہونے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ وہ بالکل محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور قیامت کے روز پیش کر دیا جائیگا۔

مکذبین قیامت

فجار کے نامہ اعمال کے دفتر کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ہلاکت ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔ یعنی محاسبے اور جزائے عمل کے منکرین کے لیے خرابی ہے اور وہ کون لوگ ہیں۔ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ جو خاص طور پر انصاف کے دن کی تکذیب کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ وہی سرمایہ پرست قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ جو لوگوں کے حقوق غصب کرتے ہیں۔ اور پھر اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے کہتے ہیں کہ قیامت کا اور انصاف کا کوئی دن مقرر نہیں ہے جو کچھ ہے بس اسی دنیا میں ہے۔ لہذا زیادہ سے زیادہ نفع کما لو۔ آگے کچھ نہیں ہے۔ اس کی فکر مت کرو۔ فرمایا حقیقت یہ ہے وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ انصاف کے دن کو نہیں جھٹلاتا اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ مگر ہر زیادتی کرنے والا اور اَثِيْمٍ گنہگار یعنی قیامت کے دن کو جھٹلانیوالے وہی لوگ ہیں۔ جو دوسروں پر تعدی، ظلم اور زیادتی کرتے ہیں۔ ان کے حقوق کو ضائع کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے گنہگار اور پاپی کہلاتے ہیں۔

منکرین قیامت

ایسے لوگوں کی مزید صفات یہ بیان فرمائیں۔ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا جب اُن کو

---

[1] معالم التنزیل صفحہ ۲۱۸ ج ۴ [2] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۴۸۵ ج ۴

ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔ قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ تو کہتے ہیں۔ کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ حالانکہ ان آیات میں ایک طرف عقیدے کی پاکیزگی کا ذکر ہوتا ہے تو دوسری طرف قیامت کا بیان ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی فکر پاک رکھنی چاہیئے۔ ایمان کی فکر کرنی چاہیئے کہ اس کا ذہن، روح اور دل پاک رہے۔ شرک اور کفر کی آلودگی سے پاک ہو۔ اور ساتھ یہ تنبیہ بھی ہوتی ہے کہ محاسبے کا ایک دن مقرر ہے۔ قیامت آنے والی ہے۔ ہر شخص کا ہر قول و فعل محفوظ ہے اور وہ اس دن پیش کیا جائے گا۔ جزائے عمل سے کوئی بھی بچ نہیں سکے گا۔ نیز یہ بھی دیکھو کہ تم سے پہلے جن لوگوں نے قیامت کا انکار کیا، ان کا کیا حشر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے لوگوں کا یہ حال سمجھانے کے لیے بیان کیا ہے کہ جس طرح وہ لوگ جزائے عمل سے نہ بچ سکے۔ اسی طرح تم بھی نہیں بچ سکو گے۔ انہوں نے بھی ہماری آیتوں کا انکار کیا۔ وہ بھی منکرین توحید تھے۔ کفر اور شرک میں مبتلا تھے۔ تو جس طرح ان لوگوں پر طرح طرح کے عذاب آئے۔ اسی طرح تم پر بھی آسکتے ہیں۔ یہ قرآن پاک محض قصے کہانیاں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تو نصیحت ہے۔ اور پہلے لوگوں کے حالات عبرت کی خاطر بیان کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے جگہ جگہ اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے "نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ" ، "ہم آپ کو بہترین قصہ سناتے ہیں اور فرمایا "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ" اس میں چشم بینا رکھنے والوں کے لیے عبرت کا سامان ہے۔ کہ نافرمانی کرنے والوں کو اللہ تعالےٰ نے کس طرح ذلیل و خوار کیا۔ "وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَۃِ اَکْبَرُ" اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا عذاب ہے۔ یہ تو بعد میں آئے گا۔ ایسے لوگوں کا جو حال ہوا۔ اسی سے عبرت پکڑو۔

ان کے دل زنگ آلود ہیں

فرمایا یہ تعدی کرنے والے گنہگار کس طرح روزِ جزا کا انکار کرتے ہیں کَلَّا یہ قصے کہانیاں ہرگز نہیں ہیں بلکہ عبرت آموز باتیں ہیں یہ تو حقائق ہیں اور بصیرت کی باتیں ہیں۔ اصل خرابی ان منکرین میں ہے۔ اور وہ یہ کہ بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ کہ ان کے دل زنگ آلود ہو گئے ہیں مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ سو کچھ انہوں نے کمایا۔ اس وجہ سے یہ لوگ تکذیب کرتے ہیں۔ کہ دلوں پر زنگ چڑھ جانے کی وجہ سے ان کی صلاحیت ہی خراب ہو گئی ہے۔ یہ حق بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اور کہتے ہیں۔ کوئی قیامت نہیں ہے۔

کوئی محاسبہ نہیں ہے۔

حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ انسان جب پہلی مرتبہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر توبہ کرے، تو وہ داغ دُھل جاتا ہے۔ اور دل صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر توبہ نہ کرے، معافی نہ مانگے اور دوسرے گناہ کا ارتکاب کرے تو سیاہ نقطہ بڑھ جاتا ہے۔ اس طریقہ سے جوں جوں کوئی شخص گناہوں کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔ اُس کا دل سیاہ ہوتا رہتا ہے اسی کو اللہ تعالےٰ نے بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ سے تعبیر کیا ہے۔ کہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ" میں بیان کیا ہے۔ کہ اُن کے دلوں پر مُہریں لگ گئیں ہیں۔

دوسری حدیث شریف[2] سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وَاعِظُ اللّٰهِ فِیْ کُلِّ قَلْبِ مُؤْمِنٍ یعنی ہر مومن کے دل میں اللہ کا واعظ ہوتا ہے۔ یہ زندہ ضمیر بھی ابتدا میں انسان کو بُرائی سے منع کرتا ہے مگر جوں جوں وہ گناہوں میں ملوث ہوتا رہتا ہے۔ وہ ضمیر مردہ ہو جاتا ہے جس طرح نمی والی جگہ پر پڑا رہنے سے لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے۔ اسی طرح بار بار گناہ کرنے کی وجہ سے انسان کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس پر گناہوں کا زنگ چڑھ جاتا ہے۔ اور پھر اُسے نیکی اور بدی میں تمیز نہیں رہتی۔

دیدار الٰہی سے محرومی

فرمایا کَلَّا خبردار۔ یہ لفظ ردع (منع کرنے) کے لیے ہوتا ہے۔ اس میں زجر اور تنبیہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ فرمایا ایسا ہرگز نہیں۔ جو یہ سمجھ رہے ہیں بلکہ اِنَّهُمْ بے شک یہ لوگ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ اُس دن اپنے رب سے حجاب میں رکھے جائیں گے اور یہ سب سے بڑی سزا ہوگی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں[3]۔ کہ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان والوں کو خدا تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔ کفار اور منکرین اس سے محروم رہیں گے۔ بعض روایات[4] میں آتا ہے کہ کافر لوگ تمنا کریں گے کاش ہم اپنے مالک کو ایک نگاہ دیکھ لیتے مگر ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوگی۔ فرمایا ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ پھر یہ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے جو کہ تمام

---

[1] ترمذی ص۴۸۱ ابن ماجہ ص۳۱۳ مستدرک حاکم ص۵/ج۱ [2] ترمذی ص۴۰۵ مسند احمد ص۱۸۳/ج۴

[3] تفسیر ابن کثیر ص۴۸۵/ج۴ معالم التنزیل ص۲۱۹/ج۴ روح المعانی ص۷۳/ج۳۰ [4]

مصائب اور تکالیف کا گھر ہے۔ ثُمَّ يُقَالُ پھر ان سے کہا جائے گا هٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ یہی ہے وہ جس کا تم انکار کرتے تھے۔ کہتے تھے کوئی دوزخ نہیں ہے یہ سب مولویوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ طرح طرح کی باتیں بناتے تھے۔ قیامت اور جزائے عمل کی تکذیب کرتے تھے۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ موجود ہے "فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا" اب صبر کرو یا بے صبری، تمہارا ٹھکانا یہی ہے کیونکہ تم اسے جھٹلاتے تھے۔

یہاں پر فجار کا حال بیان ہوا ہے اب آئندہ آیات میں دوسرے گروہ یعنی ابرار کا ذکر ہوگا۔

عم ۳۰ — التطفیف ۸۳

درس سوم — (آیت ۱۸ تا ۲۸)

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾
كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾
عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾
يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ط وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ
الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا
الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾

ترجمہ:- خبردار! بے شک نیکو کاروں کا نامہ اعمال علّیّین میں ہوگا ﴿۱۸﴾ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ علّیّین کیا ہے ﴿۱۹﴾ ایک دفتر ہے لکھا ہوا ﴿۲۰﴾ (اس مقام پر) مقرب (فرشتے) حاضر ہوتے ہیں ﴿۲۱﴾ بے شک ابرار لوگ البتہ نعمتوں میں ہونگے ﴿۲۲﴾ تختوں پر بیٹھ کر (نظارے) دیکھیں گے ﴿۲۳﴾ (اے مخاطب) تو ان کے چہروں پر معلوم کرے گا نعمتوں کی تروتازگی ﴿۲۴﴾ ان کو پلائی جائے گی خالص شراب جو سربمہر ہوگی ﴿۲۵﴾ اس کی مہر کستوری کی ہوگی اور اس بات میں چاہیئے کہ رغبت کریں رغبت کرنے والے ﴿۲۶﴾ اور ملاوٹ اس (شراب طہور) کی تسنیم سے ہوگی ﴿۲۷﴾ (وہ تسنیم) ایک چشمہ ہے کہ اس سے پیئیں گے مقرب لوگ ﴿۲۸﴾

گذشتہ سے پیوستہ

جیسا کہ گذشتہ درسوں میں بیان ہو چکا ہے۔ اس سورۃ میں اللہ رب العزت نے تاجروں کی ذہنیت کے پیش نظر قیامت کا حال بیان فرمایا ہے۔ ان کی طرف سے ماپ تول میں کمی و بیشی کو مذموم قرار دیا ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے تمام اعمال کا ذخیرہ محفوظ ہے۔ انہیں اس بڑے دن کا انتظار کرنا چاہیے۔ جس دن سب لوگ اللہ رب العلمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ اور انہیں اپنا محاسبہ پیش کرنا ہوگا۔ فرمایا فجار کے اعمالنامے سجین میں درج ہیں۔ وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے اور اللہ تعالےٰ کے دیدار سے محروم ہوں گے

جو کہ سب سے بڑی سزا ہے۔

جزائے عمل یقینی ہے

قرآن پاک کا یہ عام اسلوب ہے۔ کہ جہاں ترہیب کا بیان ہے۔ اس کے ساتھ ترغیب بھی دی گئی ہے۔ فجار کے مقابلے میں ابرار کا ذکر ہے۔ اور مفسدین یا فاسقین کے ساتھ ساتھ مومنین اور متقین کا ذکر بھی ہے۔ گویا جزائے عمل کو ہر مقام پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یعنی دنیا میں جس کسی کا جیسا عمل ہو گا۔ ویسی ہی اس کو جزا ملے گی۔ سورۃ دہر میں بھی ہر دو گروہوں یعنی ابرار اور فجار کا انجام بیان کیا گیا تھا۔ اور اس مقام پر بھی ان دو گروہوں کا تذکرہ ہے۔ پھر ان کے آخری انجام کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جزائے عمل ہر حالت میں پایہ تکمیل کو پہنچے گا۔ قیامت یقیناً آئے گی۔ جس طرح انسان کو اپنی پیدائش میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح جزائے عمل بھی قطعی اور یقینی ہے۔

ابرار کے نامہ ہائے اعمال علیین میں ہیں

گذشتہ درس میں فجار کا تذکرہ بیان ہوا تھا۔ اب ابرار کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ کَلَّا ہرگز نہیں۔ یعنی یہ لوگ قیامت اور جزائے عمل کی تکذیب کر رہے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ یہ محض ان کی خام خیالی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اِنَّ کِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ بے شک نیکو کاروں کا نامہ اعمال علیین میں ہے۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّیُّوْنَ اور آپ کو کیا معلوم کہ علیین کیا ہے کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ایک دفتر ہے مہر کیا ہوا یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ جہاں پر مقرب فرشتے حاضر رہتے ہیں۔ کتاب کا لفظی معنی لکھی ہوئی چیز یا نوشتہ ہے۔ مگر یہاں اعمالنامہ مراد ہے۔ قرآن پاک کے بعض دوسرے مقامات پر بھی اعمالنامے کو کتاب کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے "کِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا" یعنی قیامت کے دن انسان اپنی کتاب یا اعمالنامے کو اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا۔ ارشاد ہو گا "اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ط اپنا اعمالنامہ خود پڑھ لو۔ آج تمہارا نفس ہی تمہارے محاسبے کے لیے کافی ہے۔ کسی بیرونی شہادت کی ضرورت نہیں۔

لفظ علیین کا مادہ علو ہے اور اس کا معنی بلندی ہے۔ عَلِیٌّ بلند کو کہتے ہیں۔ جیسے "فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ" یعنی بلند بہشت، گویا اس میں بلندی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اسی قرآن وسنت سے بالتصریح ثابت ہے۔ کہ جنت آسمانوں سے اوپر ہے۔ سورۃ نجم میں واقعہ معراج میں آتا ہے "عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى" آپ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس پہنچ گئے

"عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاوٰی" اور جنت وہاں ہے۔ گویا ساتوں آسمانوں کو عبور کر کے جنت کا مقام آتا ہے۔

الغرض! فرمایا نیکو کاروں کے اعمالنامے علیین میں ہیں۔ بعض مفسرینؒ فرماتے ہیں۔ کہ علیین ایک بہت بڑا دفتر ہے۔ جہاں تمام ابرار کے اعمال نامے رجسٹروں میں درج ہوتے ہیں۔ حدیثِ پاک[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نیک آدمی کی روح جسم سے الگ ہوتی ہے تو اللہ کے حکم سے فرشتے اس روح کو علیین کے مقام پر لے جاتے ہیں۔

فرشتے نیک روح کے ہمرکاب ہوتے ہیں

بعض مرفوع روایات[3] سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی نیک شخص کی روح کو فرشتے لے کر چلتے ہیں۔ تو اس کے ساتھ فرشتوں کی ایک اچھی منتخب جماعت ہو لیتی ہے۔ ہر آسمان سے گذرتے وقت اُس آسمان کے مقرب فرشتے بھی شامل ہو جاتے اور اس طرح یہ پوری جماعت علیین میں پہنچتی ہے جہاں متوفی کا اعمال نامہ درج ہوتا ہے، يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ اس مقام پر مقرب حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اس کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں[4]۔ کہ علیین میں موجود ملاءِ اعلیٰ کی جماعت تین قسم کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پہلی قسم درجہ اوّل کے ملائکہ ہیں۔ جو سب سے افضل ہیں جیسے جبرائیل میکائیل (علیہما السلام) وغیرہ اس کے بعد درجہ دوم کے ملائکہ ہوتے ہیں جو ان سے کم تر ہوتے ہیں۔ اور تیسری قسم افاضل الآدمیین کی ہے۔ یعنی انسانوں میں سے جو بڑی فضیلت والے ہوتے ہیں۔ ان کی روحیں بھی وہاں موجود ہوتی ہیں۔ ان تینوں کی مشترکہ روشنی کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مقام پر بہت سی بتیاں اکٹھی روشن کر دی گئی ہوں۔ یا جیسے کسی کمرے میں دس بیس بلب اکٹھے روشن کر دیے جائیں تو اُن کی روشنی خوب پھیل جاتی ہے۔ یہ روشنی جس مقام تک پہنچتی ہے اس کو علیین کہتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں[5] کہ ملاءِ اعلیٰ کی تینوں جماعتوں کے اکٹھا ہونے سے جو روحانیت پیدا ہوتی ہے۔ اس حصے کو علیین کہا جاتا ہے اور یہیں پر حاضری ہوتی ہے۔

---

[1] روح المعانی صفحہ ۷۴/۳۰ [2] مسند احمد صفحہ ۲۸۷/۴ [3] مسند احمد صفحہ ۲۸۷/۴ در منثور صفحہ ۳۲۶/۶ روح المعانی صفحہ ۷۴/۳۰ [4] حجۃ اللہ صفحہ ۱۵/۱ ۱۶ [5] ہوامع شرح حزب البحر صفحہ ۵

بعض[1] فرماتے ہیں۔ کہ مقربین کی ارواح کا مستقر تو علیین ہی ہے۔ مگر ان کا تعلق برزخ کے ساتھ بھی قائم رہتا ہے۔ اور یہ عین ممکن ہے۔ کہ ایک چیز کا تعلق بیک وقت دو مقامات سے ہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح جبرائیل علیہ السلام کا اصل مستقر تو عرش کے قریب ہے۔ کہ وہ چار حاملین عرش فرشتوں میں سے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اللہ کے حکم سے وحی لے کر زمین پر بھی آتے رہے ہیں اسی طرح ان کا تعلق مختلف مقامات سے ہو سکتا ہے۔

روح کا تعلق علیین اور برزخ کے ساتھ

بعض[2] احادیث میں آتا ہے۔ کہ جب کسی مقرب کی حاضری علیّین میں ہوتی ہے۔ تو وہاں کے مقرب ملائکہ کہتے ہیں کہ ہم اس کا نامہ اعمال دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ اعمالنامہ دیکھتے ہیں۔ اس میں نیکیوں کا اندراج ہوتا ہے۔ اس کے بعد کوئی سوال وجواب ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالےٰ کی جانب سے ارشاد ہوتا ہے۔ صَدَقَ عَبْدِیْ یعنی میرے بندے نے سچ کہا۔ لہٰذا اسے واپس لوٹا دو۔ چنانچہ حاضری کے بعد اُسے واپس لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس طرح گویا اس کا تعلق برزخ سے قائم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مستقر کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ اس کا تعلق برزخ اور قبر کے ساتھ ضرور ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان جسم کے ساتھ راحت یا سزا محسوس کرتا ہے۔ یا کم از کم اتنا تعلق ضرور ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر حدیث شریف میں مذکور باتیں پوری ہو سکیں۔ اسی لیے اہلسنت والجماعۃ کا یہ متفق علیہا مسئلہ ہے۔ کہ عذاب قبر برحق ہے۔ اس کا اشارہ قرآن پاک کی آیات اور احادیث صحیحہ[3] سے بخوبی ملتا ہے۔ عذاب قبر کے متعلق بھی علماء حق کا مسلک یہ ہے۔ کہ یہ روح اور جسم دونوں کو ہوتا ہے۔ جب کوئی سزا ملتی ہے تو جسم اور روح دونوں محسوس کرتے ہیں۔ خواہ جسم سالم موجود ہو یا اس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہو۔ اور یہ سلسلہ جسم کے بالکل گل سڑ جانے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

صحیح حدیث[4] میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ مرنے کے بعد اکثر انسانوں کے

۱؎

۲؎ درمنثور ص ۳۲۷ ج ۶ ۳؎ بخاری ص ۱۸۳ ج ۱ مسلم ص ۳۸۶ ج ۲

۴؎ مسلم ص ۴۰۷ ج ۲ مسند احمد ص ۲۸ ج ۳ مستدرک حاکم ص ۶۰۹ ج ۴

جسم گل جاتے ہیں۔ اور یہ عام مشاہدہ میں بھی آتا رہتا ہے۔ کہ مردے کو دفن کرنے کے کچھ عرصہ بعد اُس کا جسم گل سڑ جاتا ہے۔ مگر دُمچی کی ہڈی کا ایک حصہ محفوظ رہتا ہے۔ وہ حصہ کس شکل میں محفوظ ہوتا ہے۔ یہ بات ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ نہ ہی اُس جہان کی باتوں کو عقل سے قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس جہان میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ دل و دماغ اور عقل سے سوچتے سمجھتے ہیں۔ مگر اُس جہان کی چیزوں کو اس جہان پر قیاس نہیں کر سکتے۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ عالم برزخ میں روح اور جسم دونوں کو راحت ہوتی ہے۔ یا دونوں کو سزا ہوتی ہے۔

بہرحال علیین میں اعمالنامے محفوظ ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد وہاں حاضری ہوتی ہے وہاں ایک رجسٹر ہے۔ وہ ایک دفتر ہے۔ جس میں ہر شخص کی نیکیاں درج ہوتی ہیں۔ مقربین ملاء اعلیٰ کی جماعت وہاں حاضر ہوتی ہے۔ اللہ کے حکم سے دوسرے مقربین وہاں جاتے ہیں دوسرے ملائکہ نیک آدمی کی روح کا استقبال کرتے ہیں۔ وہاں پر حاضری ہوتی ہے۔ اور پھر اُن کو اللہ کے حکم سے لوٹا دیا جاتا ہے۔ یہ گویا اللہ تعالےٰ نے ابرار کا حال بیان فرمایا۔

جنت میں داخلہ ایمان پر موقوف ہے

اس کے بعد ان انعامات کا ذکر ہے جو ابرار کو ملنے والے ہیں۔ اس کے متعلق فرمایا اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ سن لو! بے شک ابرار لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔ یعنی اللہ تعالےٰ کے عطا کردہ انعامات میں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس مقام پر پہنچنا ہی کامیابی کی نشانی ہے جیسا فرمایا " فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ " یعنی جو شخص بہشت میں داخل کر دیا گیا۔ وہ کامیاب ہو گیا۔ وہ فائز المرام ہو گیا۔ وہاں پہ اپنے اپنے اعمال کے مطابق بے شمار نعمتیں میسر ہوں گی۔ جنت کا دخول ایمان پہ منحصر ہے۔ حدیث[1] شریف میں آتا ہے۔ مَنْ کَانَ اٰخِرُ کَلَامِهٖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دنیا میں جس شخص کی آخری بات لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہو گی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ یہ بھی فرمایا[2] مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی جنت کے دروازے کی چابی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ گویا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ جنت کا دروازہ ایمان اور توحید کامل سے کھلے گا۔ جو شخص شرک، کفر، نفاق، ارتداد، شک

---

[1] ابوداؤد صفحہ ۸۸ ج ۲، مسند احمد صفحہ ۲۳۳ ج ۵ [2] مسند احمد صفحہ ۲۴۲ ج ۵۔

اور الحاد میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ اس کے لیے جنت کا دروازہ کیسے کھلے گا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے " اِنَّ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ " یعنی اونٹ سوئی کے ناکے میں گذر سکتا ہے مگر کافر کے لیے جنت کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ جنت کا داخلہ اس قدر محال ہے۔ اس کو تعلیق بالمحال کہتے ہیں۔ بلاشبہ جنت کا داخلہ ایمان پر موقوف ہے۔

ابرار کے لیے انعامات

جنت میں داخلے کے بعد وہاں کے درجات اعمال کی بدولت نصیب ہوں گے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جنت کے سو درجے ہیں۔ ہر درجہ دوسرے سے اتنا بلند ہے۔ جتنا زمین سے آسمان۔ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لیے اعلیٰ درجے رکھے ہیں " وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا " اہل ایمان کے لیے ویسے ہی درجات ہوں گے جیسے اُن کے اعمال ہوں گے اسی لیے فرمایا اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ یعنی ابرار لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔ اور عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ تختوں پر بیٹھ کر نظارے دیکھیں گے۔ اریکہ تخت کو کہتے ہیں۔ صوفے سیٹ لگے ہوئے ہوں گے اور ابرار لوگ ان پر آرام سے بیٹھے اللہ کی نعمتوں کا نظارہ کرتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس منظر کو اس طرح بیان فرمایا۔

آج کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ تاجر اور سرمایہ دار ناپ تول میں کمی بیشی کر کے یا دیگر حرام طریقوں سے دولت کماتے ہیں اور پھر فرصت کے اوقات میں ہوٹلوں اور کلبوں میں جاتے ہیں۔ وہاں پر آرام سے بیٹھتے ہیں۔ شراب نوشی کرتے ہیں۔ ڈانس سے دل بہلاتے ہیں۔ گپیں ہانکتے ہیں۔ دوستوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ حرام کی کمائی حرام کے راستے اڑاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہم عیش و عشرت کر کے کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہم اس دنیا کے لوازمات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ سب چیزیں وبال جان بن جائیں گی۔ کامیابی کا نظارہ کرنا ہے تو اہل بہشت کو دیکھو۔ تختوں پر براجمان ہوں گے۔ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِیْمِ۔ ان کے چہروں سے نعمتوں کی تروتازگی عیاں ہوگی۔ نورانیت اور چمک دمک ہوگی۔ انہیں پینے کے لیے

ل ترمذی ص ۳۶۲ مستدرک حاکم ص ۸۰/۱ مسند احمد ص ۲۴۱/۵

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ شراب پیش کی جائے گی جس پر مہر لگی ہوئی ہوگی اور مہر کس چیز کی ہوگی خِتٰمُهٗ مِسْكٌ" کستوری کی ہوگی۔ اس مہر سے کستوری کی خوشبو آئے گی۔ دوسری جگہ فرمایا پانی، دودھ، شہد اور شرابِ طہور کی نہریں جاری ہوں گی۔ یہ نہریں تو عام مومنین کے لیے ہوں گی۔ انہیں حسب منشار استعمال کریں گے۔ مگر ابرار کے لیے جو سربمہر شراب ہوگی۔ اس کا سرور کچھ اور ہی ہوگا۔

نیکی کی طرف رغبت

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ وَفِیْ ذٰلِكَ اس بات میں فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ چاہیئے کہ رغبت کرنے والے رغبت کریں۔ ہر انسان کو دنیا میں کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ فکر اور عقیدہ پاک ہو۔ اعمال اور اخلاق پاکیزہ ہوں۔ تاکہ آئندہ ابدی زندگی میں یہ نعمتیں میسر آسکیں۔ اور شرابِ طہور نصیب ہو۔ حقیقی کامیابی یہی ہے۔ اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے حدیث شریف[1] میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ" سلو! اللہ کا سودا بڑا مہنگا ہے۔ اور خدا کا سودا بہشت ہے" اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ" اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایمان والوں کے مال اور جانیں خرید لی ہیں۔ اور اس کے بدلے اللہ تعالیٰ انہیں جنت عطا کرے گا جب جان اور مال اللہ کے راستے پر لگائے گا، جہاد کرے گا۔ اللہ کے احکام کی تعمیل کرے گا۔ حقوق ادا کرے گا۔ فرائض انجام دے گا۔ انصاف کا دامن پکڑے گا۔ کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ ہر قسم کی پاکیزگی اختیار کرے گا۔ تو اس کو کامیابی نصیب ہوگی۔ یہ ہے خدا کا سودا جو کہ بڑا مہنگا ہے۔ کہ اس میں جان اور مال کھپانا پڑتا ہے۔

یہی بات اللہ تعالیٰ نے توراۃ، انجیل اور قرآن میں فرمائی ہے۔ کہ خدا کا سودا خریدنا ہے تو جان اس میں لگاؤ۔ مال خرچ کرو۔ اگر جان و مال شیطان کے راستے پہ لگائی ہے۔ تو آگے کامیابی کی توقع نہ رکھنا۔ یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ رغبت ایسی چیز میں رکھنی چاہیئے۔ جو دائمی اور ابدی ہے اور جس کی کوئی مثال اور نمونہ

---

[1] ترمذی ص۳۵۳

آج موجود نہیں۔ دنیا کی نعمتیں بطورِ مثال ہی بیان کی گئی ہیں۔ ورنہ یہ پھل اور نعمتیں بہشت کی نعمتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ تو صرف نام کی مشابہت ہے تاکہ انسان ان کی کیفیت کو کسی حد تک سمجھ سکے۔ ان کی اصل حقیقت تو وہاں پہنچ کر ہی سمجھ میں آئے گی۔

اس دنیا میں یہ طریقہ ہے۔ کہ جب کوئی مشروب استعمال کرتے ہیں۔ تو خوشبو کے لیے اس میں کیوڑا وغیرہ ملا دیا جاتا ہے۔ جس سے اس کا سرور دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بہشت میں جو مشروب حاصل ہوگا۔ وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ اس میں تسنیم کی ملاوٹ ہوگی۔ اور تسنیم کیا ہے۔ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب لوگ سیراب ہوں گے۔ تاہم عام ابرار کو بھی اس میں سے کچھ حصہ ملا کر دیا جائے گا۔

یہ خاص قسم کی شراب ہوگی۔ دنیا کی شراب پر اس کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کو قرآن میں بار بار واضح کیا گیا ہے۔ اس دنیا کی شراب نوشی سے لبا اوقات سرگرانی اور مخبوط الحواسی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مگر بہشت کی شراب میں لطف و سرور ہوگا۔ اس میں بدمزاجی کی کوئی بات نہیں ہوگی نہ اس کے استعمال سے کسی قسم کی تکلیف کا کوئی خطرہ ہوگا۔ یہ بھی علی قدر المراتب ہوگی۔ مقربین کے لیے خصوصی شراب ہوگی، مگر اس میں سے کچھ حصہ ابرار کو بھی ملا کر دیا جائے گا۔ وہ بھی اس سے محروم نہیں رہیں گے۔ اگرچہ یہ ان کی مکمل خوراک نہیں ہوگی۔ دنیا میں جیسی جیسی تکلیفیں اور دکھ اٹھائے ہیں۔ اللہ کی محبت میں جو مقام پیدا کیا ہے۔ اس کے اثرات ظاہر ہوں گے۔ اور اسی کے مطابق جنت میں مقام حاصل ہوگا۔ تو یہاں گویا ابرار کے لیے تیار کی گئی نعمتوں کا تھوڑا سا حال بیان کر دیا گیا ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ابرار کا مختصر سا حال بیان فرمایا ہے۔ اور قیامت کے برحق ہونے کے متعلق دو طریقوں سے مسئلہ سمجھایا ہے۔ آخری آیات میں پھر منکرین توحید و ایمان اور منکرین قیامت کا رد ہے۔ ان آیات میں اللہ نے بعض دوسری برائیوں اور ان کے انجام کا حال بیان فرمایا ہے۔

عـــوٌ ۳۰ — التطفیف ۸۳

درس چہارم — (آیت ۲۹ تا ۳۶)

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ
يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا
رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ
﴿۳۳﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ
يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ ع

ترجمہ:۔ بے شک جو لوگ مجرم (گنہگار) تھے وہ ایمانداروں پر ہنستے تھے ﴿۲۹﴾ اور جب وہ (مجرم لوگ) ان (غریب ایمانداروں) کے پاس سے گذرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے ﴿۳۰﴾ اور جب وہ لوگ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے تھے تو دل لگی کرتے ہوئے پلٹتے تھے ﴿۳۱﴾ اور جب یہ لوگ ان (ایمان والوں) کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے بے شک یہ تو گمراہ لوگ ہیں ﴿۳۲﴾ اور حالانکہ یہ (مجرم لوگ) ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے ﴿۳۳﴾ تو آج (روز جزاء) کے دن ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے ﴿۳۴﴾ تختوں (بچھوں) پہ (بیٹھ کر) دیکھ رہے ہوں گے ﴿۳۵﴾ کیا کافروں کو بدلہ دیا گیا اس کا جو وہ (دنیا میں) کیا کرتے تھے ﴿۳۶﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سورۃ مبارکہ میں قیامت ہی کا ذکر ہے اس میں تاجروں کی ذہنیت کے پیش نظر قیامت کا مسئلہ سمجھایا گیا ہے۔ ابرار اور فجار کے انجام کا بھی ذکر ہے۔ کہ آئندہ زندگی میں ان کے ساتھ کیا معاملات پیش آنے والے ہیں۔ اب ان آخری آیات میں کفار اور مشرکین کے اُس بُرے سلوک کا ذکر ہے جو وہ اہل ایمان سے روا رکھتے تھے۔

ایمانداروں کے ساتھ استہزاء

ارشاد باری تعالیٰ ہے اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا جو لوگ مجرم یعنی گنہگار ہیں۔ اُن کا حال یہ ہے کہ كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ یہ ایمانداروں پر ہنستے ہیں۔ کفار و مشرکین عام طور پر یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ پہلے ادوار میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام

کی قوم کا حال اللہ تعالےٰ نے بیان فرمایا ہے۔ کہ اس قوم کے بڑے بڑے آسودہ حال لوگ کمزور ایمانداروں سے تمسخر اور ٹھٹا کرتے تھے۔ یہ بات قرآن پاک میں موجود ہے۔ اہل مکہ بھی مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کرتے تھے۔ وہی اہل مکہ جو کفر و شرک میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لوگوں کے حقوق غصب کرتے تھے۔ جیسا کہ شروع سورۃ میں موجود ہے۔ کہ جب لیتے تھے تو پورا ماپ لیتے تھے مگر دیتے وقت ان کے حقوق میں کمی کرتے ہیں۔ یہی لوگ مجرم ہیں۔ اور ان میں خاص طور پہ وہ ہیں۔ جن کا عقیدہ باطل ہے اور جن کی فکر فاسد ہے۔

مجرمین کون ہیں

اللہ تعالیٰ نے مجرمین کا حال اور ان کا انجام مختلف سورتوں میں بیان فرمایا ہے۔ جہاں متقین اور صالحین کا حال بیان کیا ہے۔ وہاں مجرمین کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ اور جرائم میں شرک سے بڑھ کر کونسا جرم ہو سکتا ہے۔ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" دنیا میں سب سے بڑا ظالم کافر ہے، جو خدا کے دین اور اس کی شریعت کا منکر ہے۔ یہ لوگ اس دین کا انکار کرتے ہیں جو دین اللہ تعالیٰ نے انسان کی بہتری کے لیے نازل فرمایا۔ مجرمین میں وہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جو قانون کو مانتے ہوئے اس کے خلاف چلتے ہیں۔ اس مقام پہ اللہ تعالےٰ نے جن مجرمین کا ذکر کیا ہے۔ ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو کفر اور شرک میں مبتلا ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ضائع کرتے ہیں۔ کلام کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو دین داروں کے ساتھ ٹھٹا کرتے تھے۔ مکے کے یہ روساء غریب مسلمانوں پہ ہنستے تھے۔

ضعفاء پہ طعن

فرمایا وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ جب یہ آسودہ حال لوگ غریب دینداروں کے قریب سے گذرتے تھے۔ يَتَغَامَزُوْنَ تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں دیکھو! یہ پھٹے پرانے لباس والے جنت کے والی جا رہے ہیں۔ نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان ہے۔ نہ ان کے پاس سواریاں ہیں۔ مالی حالت نہایت کمزور ہے۔ اور دعوےٰ یہ ہے کہ ہم کامیاب ہیں "نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا" ہم ان سے مال و اولاد میں زیادہ ہیں۔ ہم کو سزا دینے والا کون ہے۔ اور معترضین آسودہ حال لوگ ہی تھے۔ دوسری جگہ فرمایا "وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ" یہ پشت پیچھے عیب جوئی کرنے والے اور سامنے طعنہ دینے والے ان کو

کس چیز کا گھمنڈ ہے "اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ" یہ مال و دولت کی وجہ سے شیخی بگھارتے ہیں اور اپنے آپ کو بہتر سمجھتے ہیں۔ کمزور اور غریب اہل ایمان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ ان کی شکلوں پر اعتراض، ان کے لباس پر اعتراض، ان کی وضع قطع پر اعتراض، ان کی نمازوں پر اعتراض اس طرح یہ امیر لوگ غریب ایمان والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کی تذلیل کرتے تھے۔

کسی کو حقیر نہیں جاننا چاہیئے

یہ اُس زمانے کے کفار کا حال ہے۔ اس دور میں جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا وطیرہ بھی یہی ہے۔ یہ لوگ بھی علماء اور صلحاء کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ سرسید کی پارٹی کے لوگ جو دین سے بے بہرہ اور جدید علوم سے فیض یاب لوگ ہیں۔ وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں یہ ایک وبا ہے۔ جو مومن کہلانے والے مسلمانوں میں پھیل رہی ہے۔ حالانکہ یہ لوگ برائے نام مسلمان ہیں۔ ہر ایماندار اپنے ایمان کی وجہ سے قابلِ قدر ہے۔ اس کا احترام ضروری ہے۔ اور کسی مومن کو حقیر نہیں جاننا چاہیئے۔ بشرطیکہ مومن ہو۔

حضرت جنید بغدادیؒ کے زمانے کا مشہور واقعہ ہے[1]۔ کہ ایک پولیس والا مر گیا۔ بڑا ظالم شخص تھا۔ زندگی میں لوگوں پر بہت ظلم کیا کرتا تھا۔ لوگ اس کا جنازہ حضرت جنید بغدادیؒ کی مسجد میں اٹھا لائے۔ کہ حضرت اس کا جنازہ پڑھا دیجیے۔ مگر آپ نے صاف انکار کر دیا۔ کہ میں ایسے ظالم شخص کا جنازہ پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ لوگ میت اٹھا کر لے گئے۔ جنازہ پڑھا اور دفن کر دیا۔ رات کو آپ خواب میں دیکھتے ہیں کہ وہی پولیس والا نہایت عالیشان مکان میں مقیم ہے۔ میں نے پوچھا تمہارا کیا حال ہے۔ تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ اللہ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ تو اس نے کہا اللہ نے مجھے معاف کر دیا۔ میرے گناہ معاف کر دیے۔ دریافت کیا، کس بنا پر کہنے لگا۔ کہ تم نے مجھے حقیر جانا میرا جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا، مگر خدا تعالیٰ نے مجھے معاف کر دیا۔ اگرچہ خواب کے واقعہ پر حجت قائم نہیں کی جا سکتی۔ مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ خاص طور پر ایمان والے کو خواہ وہ کیسی ہی کمتر حالت میں ہو۔ اسی لیے حضور علیہ السلام

---

[1] الزھر الفائح صـ۲۳ (للامام محمد بن محمد بن یوسف الجزریؒ ۸۳۳ھ) طبع مصر

نے فرمایاؐ کہ اگر تم صحت مند ہو۔ خوشحال ہو، اور کسی تکلیف زدہ آدمی کو دیکھو۔ تو یوں کہو۔ کہ اے اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ تو نے مجھے عافیت دی اس چیز سے جس میں یہ مبتلا ہے۔ مگر یہ بات اس مصیبت زدہ کے سامنے مت کہو، تاکہ اُس کو اذیت نہ پہنچے۔

مکے کے سرداران ابوجہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ حضرت بلالؓ و صہیبؓ جیسے ناتواں اور کمزور مسلمانوں کو ذلیل و حقیر سمجھتے تھے۔ ان کی مجلس میں بیٹھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ قرآن پاک میں صاف موجود ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کو فرمایا" وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ ج تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج آپ اپنی نگاہِ شفقت ان غربا سے بالکل نہ ہٹائیں۔ کیا آپ دنیا کی زینت کا ارادہ کرتے ہیں۔ ہم نے ان کو دنیا کا مال و دولت اس لیے دیا ہے " لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ " تاکہ ان کی آزمائش کریں مگر یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ مال و دولت انہیں عیش و آرام کے لیے دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کے ہاں مقبول لوگ ہیں۔ فرمایا ایسا نہیں ہے۔ بلکہ یہ آزمائش ہے۔ اصل چیز تو ایمان اور نیکی ہے۔ اللہ کے ہاں مقبولیت کے لیے ان چیزوں کو دیکھا جائے گا۔ نہ کہ مال و دولت کو۔

فرمایا یہ مجرم اور گنہگار لوگ ایمان والوں پہ ہنستے تھے۔ اور جب ان کے پاس سے گذرتے تھے تو اشارے کرتے تھے۔ دیکھو! یہ حوروں کے خاوند جا رہے ہیں۔ یہ جنت کے والی جا رہے ہیں۔ ان کی حالت دیکھو۔ اور ان کی صورتیں دیکھو۔ اس طرح کی باتیں کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام کا فرمانؐ ہے[2] دیکھو اپنے بھائی سے مزاح بھی نہ کرو جس سے اس کی تحقیر ہوتی ہو۔ اگرچہ مزاح مباح ہے مگر تحقیر مقصود ہو تو جائز نہیں۔ آنکھ کا اشارہ کرنا بھی ممنوع ہے۔

مجرمین بمقابلہ مؤمنین

مجرمین کی دوسری صفت یہ بیان کی۔ کہ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ جب یہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ تو باتیں بناتے ہوئے پلٹتے ہیں۔ فُكَاهَةٌ کے معنی ا خوش طبعی کرنا یا گپیں مارنا۔ یہ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہوئے اور خوش طبعی کرتے ہوئے گھروں کو جاتے ہیں کہ ان کے پاس تو سب کچھ موجود ہے۔ مگر مؤمنین کے پاس کچھ نہیں۔ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وَاِذَا رَاَوْهُمْ جب یہ لوگ ایمان والوں کو دیکھتے ہیں قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ تو کہتے ہیں

۱ـ ترمذی صد ۴۹۵ ۔ ۲ـ ترمذی صد ۲۹۳

یہ تو گمراہ لوگ ہیں۔ جو جنت کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہماری طرح مال و دولت نہیں سمیٹتے۔ حالانکہ کمال یہی ہے کہ مال و دولت جمع کرو۔ اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرو۔ مگر یہ تو بہکے ہوئے لوگ ہیں جو دنیوی آسائشوں سے بے نیاز ہوئے بیٹھے ہیں۔ حلال و حرام کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ قیامت کے محاسبے کا غم کھائے بیٹھے ہیں۔ اور یہ کہ خدا کے ہاں عدل و انصاف ہوگا۔

اس کے برخلاف ایک مؤمن حلال و حرام میں تمیز کرتا ہے۔ جو دولت کماتا ہے اس کو جائز طریقے پر خرچ بھی کرتا ہے۔ خدا کی عبادت کرتا ہے۔ مگر یہ مُترف اور سرمایہ دار لوگ نیکو کاروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ ان کو آخرت کی بات اچھی نہیں لگتی۔ مومنین کو دیکھتے ہیں۔ تو کہتے ہیں کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ عبادت و ریاضت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اپنے آپ کو کھپا رہے ہیں۔ اپنا آبائی دین اور دنیا کی عیش و عشرت کو چھوڑ رکھا ہے۔ ان کی یہ طرز ٹھیک نہیں ہے۔ یہ گمراہ لوگ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ کیا یہ بڑے بڑے سرمایہ دار، ان غریب ایمانداروں کے محافظ ہیں۔ ان پر انسپکٹر لگے ہوئے ہیں۔ جو ان کے طرز عمل کو غلط بتا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بہکے ہوئے ہیں۔ خدا نے ان کو ایسا ہرگز مقرر نہیں فرمایا۔ ان کو اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ کہ ان کا اپنا انجام کیا ہونے والا ہے۔ مگر یہ لوگ غرباء پر طعن کرتے ہیں۔ اور ان کو بیوقوف کہتے ہیں۔

قیامت کے روز ایماندار کافروں پر ہنسیں گے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر ایسا ہے تو فَالْيَوْمَ ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ جس دن الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ آج اللہ کی وحدانیت اور قیامت پر ایمان لائے ہیں مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ وہ کافروں پر ہنسیں گے۔ کیونکہ یہ ایک اصول ہے جو کسی پر ہنستا ہے اُس پر ہنسا جاتا ہے۔ جس طرح کافر دنیا میں مسلمانوں پر ہنستے تھے اس آنے والے قیامت کے دن مومن کافر پر ہنسیں گے۔ یہ مؤمنین عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ تختوں یا منچوں پر بیٹھ کر دائیں بائیں نظارہ کرتے ہوں گے۔ لطف اندوز ہوں گے۔ اس دن مومن لوگ کافروں کو کہیں گے۔ کہ تم نے دنیا کی فانی چیزوں میں پھنس کر اپنے ایمان کو برباد کیا اور اب آخرت کو بھی برباد کیا۔ لہٰذا آج ان فانی نعمتوں کا لطف اٹھاؤ۔ تم نے دائمی نعمتوں کے بدلے دنیا کی فانی نعمتوں کو پسند کیا ایمان سے محروم رہے۔ کفر و شرک کی

رسموں کو پورا کرتے رہے۔ تم لوگ اپنی فکر کرنے کی بجائے کمزور مسلمانوں پر ہنستے تھے۔ ان کو بیوقوف اور گمراہ کہتے تھے۔ اپنی بدباطنی کا آج لطف اٹھاؤ۔

اللہ تعالےٰ نے فرمایا هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ کیا کافروں کو بدلہ دیا جائے گا اسکا جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے اس وقت انہیں کہا جائے گا کیا تمہیں بدلہ ملا، یا نہیں۔ تم نے اپنی کرتوتوں کا انجام دیکھ لیا یا نہیں۔ تم دنیا میں شرکیہ اور کفریہ کام کرتے تھے۔ استہزاء اور تحقیر کرتے تھے آج اس کا بدلہ اور مزہ چکھ لیا تم نے۔ یقیناً ان کا انجام ان کے سامنے ہو گا۔ اور اپنے کیے کا بدلہ ان کو مل کر رہے گا۔

سُورَةُ الانشِقَاق

عم ۳۰ — الانشقاق ۸۴

درس اوّل — (آیت ۱ تا ۱۵)

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسٌ وَّ عِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۃ انشقاق مکی ہے اور یہ پچیس ۲۵ آیتیں ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝١ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝٢ وَاِذَا الْاَرْضُ
مُدَّتْ ۝٣ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ۝٤ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ
۝٥ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۝٦
فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۝٧ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا
يَّسِيْرًا ۝٨ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝٩ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ
وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝١٠ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝١١ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝١٢
اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝١٣ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝١٤ بَلٰٓى اِنَّ (نصف الربع)
رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ۝١٥

ترجمہ:- جب آسمان پھٹ جائے گا ۱ اور وہ اپنے رب کی بات سنے گا اور اس کے لیے یہی بات ثابت ہے ۲ اور جب زمین کو پھیلا دیا جائے گا ۳ اور نکال دے گی وہ جو کچھ اسکے اندر ہے اور خالی ہو جائے گی ۴ اور وہ سُنے گی اپنے رب کی بات اور یہی اس کے لیے ثابت ہے ۵ اے انسان بے شک تو تکلیف اٹھانے والا ہے اپنے رب کی طرف تکلیف اٹھانا پس اس سے ملنے والا ہے ۶ پس بہرحال جس کو اس کا نامہ اعمال اسکے دائیں ہاتھ میں مل گیا ۷ پس عنقریب اس سے آسان حساب لیا جائے گا ۸ اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوش خوش لوٹے گا ۹ اور بہرحال جسے اس کا نامہ اعمال پشت کے پیچھے سے دیا گیا ۱۰ پس عنقریب وہ پکارے گا ہلاکت کو ۱۱ اور وہ داخل ہوگا جہنم میں ۱۲

بے شک وہ (دنیا کی زندگی میں) اپنے گھر والوں میں خوش تھا ⑬ بے شک وہ خیال کرتا تھا کہ وہ ہر گز اپنے رب کے سامنے پلٹ کر نہیں جائے گا ⑭ کیوں نہیں بے شک اس کا پروردگار اسے دیکھنے والا تھا ⑮

نام اور کوائف — اس سورۃ کا نام سورۃ انشقاق ہے۔ اس کی پہلی آیت میں انشقت کا لفظ آیا ہے۔ اسی لفظ سے اس کا نام انشقاق ماخوذ ہے۔ انشقاق کا معنی پھٹ جانا ہے۔ چونکہ اس سورۃ میں آسمان و زمین کے پھٹ جانے کا ذکر ہے اسی لیے سورۃ کا یہ نام موزوں ہے۔ یہ مکی سورۃ ہے۔ اسکی پچیس ۲۵ آیات صرف ایک رکوع ایک سو نو ۱۰۹ الفاظ اور چار سو تیس ۴۳۰ حروف ہیں۔

موضوع — سابقہ کئی ایک سورتوں کی مانند اس سورۃ میں بھی قیامت ہی کا ذکر ہے۔ اس سے متصل گذشتہ سورۃ میں تاجروں کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر قیامت کا محاسبہ سمجھایا گیا تھا اور اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطری ترقی کے پیش نظر قیامت کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ اگر انسان فطری طور پر ترقی کرتا جائے۔ تو اس کی اگلی منزل قیامت ہی ہوگی۔ مگر لوگ اپنی فطرت کو خراب کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی فطری ترقی رک جاتی ہے۔ جب اس دنیا کا سلسلہ ختم ہوگا۔ تو انسان دوسری منزل کی طرف روانہ ہوگا۔ فطری ترقی کے مطابق بلندی پر پہنچ جائے گا۔ اور اس کی اوپر کی منزل بہشت ہے۔ تو اس طرح انسان بہشت تک پہنچ جائے گا۔ اسی کو فرمایا "لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ" یعنی جب اس زمین والا طبقہ ختم ہو جائے گا۔ تو اس کے بعد قیامت اور پھر بہشت کی منزل ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں[1]۔ کہ انسان ملکیت اور بہیمیت دو چیزوں کا مرکب ہے۔ اس دنیا میں انسان پر بہیمیت کا غلبہ ہے، اور اس کے احکام ظاہر ہیں۔ جب موت واقع ہوتی ہے۔ تو ملکیت کے احکام غالب آجاتے ہیں۔ ملکیت کی کشش اوپر کے مقام کی طرف ہے۔ جہاں پر تجلی الٰہی واضح طور پر واقع ہوتی ہے۔ ملکیت کا تقاضا ہے۔ کہ اس کی کشش اوپر کی طرف ہوگی۔ اگر انسان نے فطری ترقی کی ہے۔ تو ملکیت کی کشش کے مطابق وہ

---

[1] حجۃ اللہ صفحہ ۶۹ ج ۱

بہشت میں پہنچ جائے گا۔ اور اگر اُس نے فطری ترقی نہیں کی بلکہ اپنی فطرت کو خراب کیا ہے۔ تو یہ خرابی اُسے نیچے کی طرف کھینچے گی۔ اس طرح اوپر نیچے کھینچا تانی میں انسان کو سخت تکلیف پہنچے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اوپر بہشت کی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ بلکہ جہنم کے اس گڑھے میں جا گرے گا۔ جو ساتوں زمینوں سے بھی نیچے ہے۔ یہ ہے وہ مسئلہ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطری ترقی کو سامنے رکھ کر سمجھایا ہے۔

آسمان پھٹ جائے گا

ارشاد ہوتا ہے۔ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ سب سے پہلے کہکشاں والے مقام سے آسمان پھٹے گا۔ یہ وہی مقام ہے۔ جہاں بہت دور چھوٹے چھوٹے ستارے اکٹھے نظر آتے ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ آسمان کیوں پھٹے گا۔ وہ اس لیے کہ اُس دن عرش الٰہی پر قہری تجلی نازل ہوگی۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ کہ آج حاملین عرش فرشتوں کی تعداد چار ہے۔ قیامت کے دن انکی تعداد آٹھ ہو جائے گی۔ اس دن بڑا ثقل واقع ہوگا۔ بڑا دباؤ پڑیگا۔ جس کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا۔ آسمان کے پھٹنے پہ ابتدا میں دریچے نظر آئیں گے۔ بعد میں پورا آسمان درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ سارا سلسلہ ختم ہو کر دوسرا سلسلہ قائم ہوگا۔ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ وہ اپنے رب کی بات سنے گا۔ اور اس کے لیے یہی بات ثابت ہے۔ جو نکہ تکوینی طور پر ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہے۔ اس لیے آسمان بھی اللہ کے حکم کے سامنے مجبور ہوگا۔ اور اس کے حکم کی تعمیل میں پھٹ جائے گا۔

سب سے پہلے حضور علیہ السلام کی قبر مبارک شق ہوگی

فرمایا وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ اور جب زمین کو پھیلا دیا جائے گا۔ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ اور نکال دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے۔ اور خالی ہو جائے گی۔ اس دن اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہر چیز اُگل دے گی۔ اسی لیے فرمایا۔ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ یعنی وہ سنے گی اپنے رب کی بات۔ اور یہی اس کے لائق ہے۔ کہ وہ اس کی تعمیل کرے۔ زمین کہاں سے پھٹے گی۔ اس کے متعلق خود حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔[۲] اَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ

---

[۱] کنز العمال ص ۳۴۷ ج ۲ تفسیر درمنثور ص ۳۲۹ ج ۶ و تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۳۳ پارہ ۳۰

[۲] مسلم ص ۲۴۵ ج ۲

قیامت کے روز سب سے پہلے میری قبر شق ہوگی۔ نیز یہ بھی ارشاد فرمایا[1] فَأُكْسَى الْحُلَّةَ مِنْ حُلَلِ الْجَنَّةِ اس وقت جنت سے لاکر مجھے لباس پہنایا جائے گا۔ بخاری شریف[2] کی حدیث میں ہے کہ حشر کے میدان میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ کیونکہ کافروں نے آپ کو رسیوں سے باندھ کر برہنہ حالت میں آگ میں پھینکا تھا۔ اللہ تعالےٰ آپ کو یہ اعزاز بخشے گا۔ کہ میدان حشر میں سب سے پہلے آپ کو لباس عطا ہوگا۔ تاہم حضور علیہ السلام نے اپنے متعلق فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے میری قبر شق ہوگی۔ اور اسی وقت مجھے بہشت کی پوشاک پہنائی جائے گی۔ حشر کا معاملہ تو بعد میں پیش آئے گا۔

زمین بدل دی جائیگی

دوسری روایات[3] میں آتا ہے کہ آپ کے قبر سے برآمد ہونے کے بعد وہاں کے دوسرے لوگ نکلیں گے۔ پھر مکے اور مدینے کے درمیان کے لوگ قبروں سے نکلیں گے۔ اور پھر باقی جگہوں کے لوگ۔ اور زمین کو اس طرح پھیلا دیا جائے گا۔ جیسے کپڑے کو کھینچ کر تان دیا جاتا ہے۔ زمین اپنے تمام دفینے اور خزائن باہر نکال دے گی۔ اس سے پوچھا جائے گا یہ کیا ہے تو وہ جواب دے گی۔ کہ رب تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ کہ میں خالی ہو جاؤں۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ قرآن پاک میں موجود ہے" يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ" زمین و آسمان دونوں بدل دیے جائیں گے۔ موجودہ زمین کی جگہ دوسری سفید زمین بچھائی جائے گی۔ اور محاسبہ کا عمل اُس دوسری زمین پر پیش آئے گا۔ جس زمین پر انسان کے گناہوں کی آلودگی نہیں ہو گی۔ اب رہی یہ بات کہ تبدیلی زمین کے وقت لوگ کہاں ہوں گے، تو حدیث شریف[4] میں آتا ہے۔ کہ اس درمیانی عرصہ میں تمام لوگ پلصراط کے ایک کنارے پر ہوں گے۔

رب کے سامنے حاضری ہوگی

آسمان و زمین کے پھٹ جانے اور زمین کے خالی ہونے کے ذکر کے بعد خطاب کا رُخ انسان کی طرف ہو جاتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ یعنی اے انسان اِنَّكَ كَادِحٌ بے شک تم تکلیف اٹھانے والے ہو اِلٰی رَبِّكَ كَدْحًا اپنے رب کی طرف تکلیف اٹھانا فَمُلٰقِيْهِ

---

۱ ترمذی ص ۵۱۹ ۲ بخاری ص ۹۶۶/۲ ، مسلم ص ۳۸۴/۲ ، ترمذی ص ۳۴۹

۳

۴ ابن ماجہ ص ۳۱۶ مسند احمد

پس اُس سے ملنے والے ہو۔ یہ بھی ترقی کی بات ہو گی۔ انسان کو ہر صورت میں مشقت برداشت کرنا ہے "لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ" بے شک انسان کو ہم نے مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کوئی انسان مشقت سے خالی نہیں۔ اور پھر یہی مشقت ـــــ برداشت کرتے کرتے اپنے رب کے حضور پیش ہو جاتا ہے۔ اگر انسان نے اپنی اس ترقی کو خراب نہ کیا، تو آگے خوشحالی نصیب ہو گی۔ اور اگر اسے خراب کر دیا، تو آگے بُرا حال ہو گا۔ بہر حال ٹھوکریں کھا کر، مشقت برداشت کر کے ایک دن اپنے رب کے سامنے پہنچ جاتا ہے۔ وہاں کی حاضری لازمی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1] کہ جبرائیل علیہ السلام آئے اور نبی علیہ السلام سے کہا۔ یَا مُحَمَّدُ عِشْ مَا شِئْتَ فَاِنَّکَ مَیِّتٌ یعنی اے نبی کریم! آپ جب تک چاہیں زندہ رہیں مگر ایک دن موت ضرور آنی ہے۔ نیز یہ بھی کہا وَاَحْبِبْ مَا شِئْتَ دنیا میں آپ جس سے چاہیں محبت کریں فَاِنَّکَ مُفَارِقُہٗ ایک دن جدائی ضرور ہو گی۔ وَاعْمَلْ مَا شِئْتَ فَاِنَّکَ مُلَاقِیْہِ آپ جو چاہیں عمل کریں۔ اُس کا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا۔ مطلب یہ کہ انسان تکلیف اٹھا کر، مشقت برداشت کر کے ایک دن ضرور اللہ کے ہاں پیش ہو گا۔ اس لیے انسان کو لازم ہے کہ دنیوی زندگی میں اپنے ترقی کے راستے کو خراب نہ کرے۔ اپنی فطرت کو نہ بگاڑے بلکہ اپنی اصل فطرت پر گامزن رہے۔ اور یہ وہی فطرت ہے جو انبیاء علیہم السلام کا راستہ ہے لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ توحید اور نیکی کے راستہ پر چلتا رہے اور اپنی فطرت کو نہ بگاڑے۔

آسان حساب

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ کر لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَہٗ بِیَمِیْنِہٖ جسے اپنا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں مل گیا اور ظاہر ہے کہ دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ اُسے ملے گا جس نے توحید، ایمان اور نیکی کا راستہ اختیار کیا اور سیدھی فطرت پر ترقی کرتا چلا گیا۔ سورۃ حاقہ میں بھی بیان آچکا ہے کہ جس کو دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ ملے گا تو وہ خوشی سے دوسروں کو دکھائے گا کہ یہ دیکھو میرا اعمالنامہ پڑھ لو۔ یہاں فرمایا کہ جس کا اعمالنامہ اُسے دائیں ہاتھ میں مل گیا فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا عنقریب

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۴۸۸ ج ۴ بحوالہ ابو داؤد طیالسی

اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا مَنْ نُوْقِشَ فِی الْحِسَابِ هَلَكَ جس سے حساب میں مناقشہ کیا گیا وہ ہلاک ہوگیا۔ ام المؤمنینؓ نے عرض کیا کہ حضور! حِسَابًا یَّسِیْرًا کیا ہے۔ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ حساب کتاب کا اللہ کے حضور پیش ہوجانا ہی عرض ہے اور یہی حساب یسیر ہے۔ جس شخص سے پوچھ لیا گیا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا وہ مناقشے میں آگیا۔ ایسا شخص بچ نہیں سکے گا۔ آسان حساب یہ ہے کہ بس حساب پیش ہوگیا کچھ تعرض نہ فرمایا، جان بچ گئی۔

بعض اوقات حضور علیہ السلام نماز میں یہ دعا فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا آگے سورۃ غاشیہ میں آرہا ہے۔ آخر سورۃ میں جب آتا ہے "ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَهُمْ" یعنی ان کا حساب لینا ہمارے ذمہ ہے تو حضور علیہ السلام یہی دعا فرماتے تھے۔ کہ اے اللہ! آسان حساب لینا۔

جب اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں مل گیا تو پھر وَّیَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا وہ اپنے گھر کی طرف خوش خوش لوٹے گا۔ اس کا گھر تو وہاں جنت ہوگا۔ وہاں سے پلٹ کر وہ جنت میں چلا جائے گا۔ کیونکہ اس نے صحیح فطری ترقی اختیار کی۔ اُسے محاسبے میں بھی آسانی پیدا ہوگئی۔ جنت کا ویزا مل گیا۔ دائیں ہاتھ میں اعمالنامہ ملنے کا یہی مطلب تھا۔

پس پشت اعمالنامے ملنے والا گروہ

اس کے بعد دوسرے گروہ کا ذکر فرمایا وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ جسے اس کا اعمالنامہ پشت کے پیچھے سے دیا گیا سامنے سے نہیں دیا گیا بلکہ ذلت و رسوائی کے لیے پیٹھ کے پیچھے سے دیا گیا فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا پس وہ پکارے گا ہلاکت کو وہ کہے گا۔ کاش موت ہی آجائے جو بالکل فنا کر دے اور اس محاسبے سے بچ جائے۔ دوسری جگہ فرمایا کہ ایک ہلاکت کو نہ پکارو تمہارے لیے بہت سی ہلاکتیں ہیں۔ وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا ایسا شخص جہنم میں داخل ہوگا۔ سعیر کا معنی بھڑکتی ہوئی آگ۔ اور یہ اس وجہ سے کہ اِنَّهٗ كَانَ فِیْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا وہ دنیا کی زندگی میں اپنے گھر میں خوش تھا۔ خواہشات، لذات اور رعنائیوں میں مگن تھا۔ اُسے

۱؎ مسلم ص ۳۸۷ ج ۲، ترمذی ص ۴۸۱، بخاری ص ۹۶۷ ج ۲، مستدرک حاکم ص ۵۷ ج ۱، ۲؎ مستدرک حاکم ص ۵۷، ۲۵۵ ج ۱

آخرت کی کوئی فکر نہ تھی۔ اس نے اس منزل کے لیے کوئی سامان پیدا نہ کیا۔ فطری ترقی کے لیے کوئی مشقت برداشت نہ کی۔ فطرت کو بگاڑ کر فطری ترقی سے محروم رہا اور آج یہ حال ہوا کہ نامہ اعمال پشت کے پیچھے سے ملا۔

دنیا میں وہ یہی خیال کرتا تھا۔ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ کہ وہ رب کے سامنے پلٹ کر نہیں جائے گا۔ وہ فاسد العقیدہ تھا۔ اُس کی سوچ درست نہیں تھی اُسے اپنے رب کے ہاں حاضری کا یقین نہیں تھا۔ نہ وہ قیامت پر ایمان رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بَلٰٓی کیوں نہیں۔ اُسے اللہ کے سامنے ضرور پیش ہونا ہے۔ قیامت برحق ہے۔ محاسبہ کا عمل یقینی ہے۔ یہ سب کچھ ہو گا۔ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا دنیا میں اللہ تعالیٰ اُسے دیکھنے والا ہے۔ انسان کے ہر عمل پر اس کی نگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس پر نگران ہے۔ ایک دن ضرور اس کی پکڑ میں آئے گا۔

درس دوم (آیت ۱۶ تا ۲۵)

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ
﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا
قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ
﴿۲۲﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۴﴾
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾

ترجمہ :- پس میں قسم اٹھاتا ہوں شفق کی ﴿۱۶﴾ اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو رات اپنے اندر سمیٹتی ہے ﴿۱۷﴾ اور قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے ﴿۱۸﴾ البتہ تم ضرور ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی پر چڑھو گے ﴿۱۹﴾ پس ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے ﴿۲۰﴾ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ نہیں کرتے ﴿۲۱﴾ بلکہ وہ لوگ جو کافر ہیں وہ جھٹلاتے ہیں ﴿۲۲﴾ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں ﴿۲۳﴾ تو انہیں عذاب الیم کی خوشخبری سنا دیجئے ﴿۲۴﴾ مگر جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال انجام دیے ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر (ثواب) ہے ﴿۲۵﴾

گذشتہ سے پیوستہ

جیسا کہ گذشتہ درس میں عرض کیا جا چکا ہے اس سورۃ مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے قیامت ہی کا ذکر کیا ہے۔ مختلف سورتوں میں مختلف انداز سے قیامت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ تاہم اس سورۃ مبارکہ میں انسان کی فطری ترقی کے اعتبار سے قیامت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے ابتداء میں غیر معمولی واقعات مثلاً آسمان کا پھٹ جانا، زمین کا شق ہونا وغیرہ کا ذکر تھا اس کے بعد دو گروہوں کا ذکر ہے۔ ایک وہ گروہ جس کو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا۔ اور دوسرا وہ جس کو پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا۔ پھر اس دوسرے گروہ کی بدبختی کا حال بھی بیان ہوا۔ اور اشارۃً یہ بات بھی بتا دی کہ انسان ٹھوکریں کھاتا ہوا بہر حال مشقت برداشت کرتا ہوا اور تکلیفیں اٹھاتا ہوا، ایک دن اپنے رب سے ملنے والا ہے۔ اس کی جزائے عمل کا سلسلہ

وہیں مکمل ہو گا۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم اٹھا کر یہ بات سمجھائی کہ "لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" تم ضرور سوار ہو گے ایک طبقے سے دوسرے طبقے تک یا ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی تک یا ایک حال سے دوسرے حال تک چنانچہ اس سلسلہ میں اگر انسان نے اپنی فطرت میں بگاڑ نہیں پیدا کیا، بلکہ اسی فطرت کے مطابق ترقی کرتا گیا۔ تو وہ یقیناً اعلیٰ منزل تک پہنچ جائے گا۔ اور اگر انسان فطرت کے خلاف غلط راستے پر چل نکلا۔ تو وہ پستی میں جا گرے گا۔

شفق کیا ہے

ظاہر ہے کہ اس موجودہ زمین کا طبقہ تو ختم ہو جائے گا۔ تو اس کے بعد انسان کی منزل کون سی ہوگی۔ یا تو انسان اپنے اعمال صالحہ کی بدولت بلندی کی طرف پرواز کرے گا اور بہشت میں پہنچ جائے گا۔ یا پھر اپنی کوتاہیوں کے باعث ہلاکت کے گڑھے یعنی جہنم میں جا گرے گا۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان چند چیزوں کی قسم اٹھا کر مسئلہ کی وضاحت فرمائی ہے۔ جن چیزوں کو انسان کی موجودہ زندگی یا برزخ کی زندگی یا قیامت کے ساتھ نسبت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ۔ میں قسم اٹھاتا ہوں شفق کی۔ شفق کا اطلاق سُرخی اور سفیدی دونوں چیزوں پر ہوتا ہے۔ جب سورج غروب ہوتا ہے۔ تو اس کے بعد تھوڑی دیر تک آسمان پر سُرخی نمایاں رہتی ہے اس کے مزید کچھ دیر بعد تک سفیدی رہتی ہے۔ اور پھر تاریکی چھا جاتی ہے گویا شفق سے مراد وہ سُرخی یا سفیدی ہے جو غروب آفتاب کے بعد کچھ عرصہ کے لیے قائم رہتی ہے۔

غروب شفق اور نماز مغرب

حدیث[1] میں آتا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا نماز مغرب کا وقت اس وقت تک ہوتا ہے مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ جب تک شفق غائب نہ ہو جائے۔ امام شافعیؒ اور امام اعظمؒ کے دونوں شاگرد یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا مسلک[2] یہ ہے کہ جب سرخی غائب ہو جائے تو نماز مغرب کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اور عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے مغرب کی نماز جلدی پڑھنے کا حکم ہے۔ چنانچہ فقہائے احناف کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کا فرمان[3] ہے کہ ہر اذان کے بعد نفل ہوتے ہیں۔ مگر اذان مغرب کے بعد نفل پڑھنا بہتر نہیں۔ اگرچہ پڑھ لینا بھی جائز ہے۔ وجہ یہی ہے کہ وقت کم ہوتا ہے۔ گویا یہ حضرات شفق سے سرخی

---

[1] مسلم ص ۲۲۳ ج ۱، [2] ہدایہ ص ۸۲ ج ۱ [3] زجاجۃ المصابیح ص ۳۳۵ ج ۱ بحوالہ بزار

مراد لیتے ہیں۔ البتہ امام ابو حنیفہؒ[1] اور بہت سے صحابہؓ سے بھی منقول ہے۔ کہ شفق سے مراد سفیدی ہے یہ سفیدی مغرب کے بعد تقریباً سوا گھنٹہ تک قائم رہتی ہے۔ اس سفیدی کے اختتام کے ساتھ نماز مغرب کا وقت بھی ختم ہو جاتا ہے۔ گویا امام صاحبؒ کے نزدیک نماز مغرب کے وقت میں کچھ توقف (توسع) ہے۔ تاہم شفق کا اطلاق سرخی اور سفیدی دونوں پہ ہوتا ہے۔

موت کے بعد تین حالتیں پہلی حالت شفق

جس طرح غروب آفتاب پہ شفق پیدا ہوتی ہے اسی طرح جب انسانی زندگی کا سورج غروب ہوتا ہے تو تین قسم کی حالتیں پیش آتی ہیں انسان کی موت کے فوراً بعد شفق کی حالت پیش آتی ہے۔ اور شفق کا وقفہ دن کے ساتھ ملتا جلتا ہے جب تک سرخی یا سفیدی قائم رہتی ہے وہ حصہ دن کے حکم میں ہی آتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد کچھ عرصہ تک میت کو دنیا کے حالات کے ساتھ مناسبت رہتی ہے۔ دنیا کے ساتھ اس کا تعلق جلدی منقطع نہیں ہوتا۔ جس طرح کچھ عرصہ کے لیے شفق کو دن کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے۔ اسی طرح مرنے والے کی نسبت اس دنیا کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ اسی لیے حدیث شریف[2] میں آتا ہے۔ کہ جب کسی نیک شخص کو دفن کیا جاتا ہے۔ اور سوال وجواب کی نوبت آتی ہے تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے سورج غروب ہو رہا ہے۔ وہ فرشتوں کو کہتا ہے۔ دَعُونِي اُصَلِّيْ ذرا مجھے مہلت دے دو، میں نماز پڑھ لوں۔ نماز کا وقت جا رہا ہے۔ گویا کچھ عرصہ کے لیے ایک سال یا چالیس دن کے عرصہ تک مرنے والے کا رخ اس جہاں کی طرف رہتا ہے۔ اس لیے فقہاء کرامؒ[3] فرماتے ہیں۔ کہ ایسی حالت میں مرنے والے کے لیے دعا، استغفار یا ایصال ثواب بہت مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا رخ ادھر ہوتا ہے لہٰذا جہاں تک ممکن ہو اُسے فائدہ پہنچانا چاہیئے۔ اس کے لیئے بخشش کی دعا کرنی چاہیئے غرباء ومساکین کو کچھ دیکر ایصال ثواب کرنا چاہیئے۔

دوسری حالت رات

شفق کا وقت گذرتا ہے تو رات کی تاریکی چھا جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے شفق کے بعد رات کی قسم کھائی وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ اسی طرح میت پہ دوسرا دور عالم برزخ کا آتا ہے پہلے شفق والے عرصہ میں دنیا کی طرف رخ زیادہ تھا اب رات ہو گئی اور اس کا

---

[1] طحاوی ص ۱۰۵ ج ۱ ہدایہ ص ۸۲ ج ۱ [2] ابن ماجہ ص ۳۱۶ [3]

تعلق دنیا سے کٹ کر برزخ کے ساتھ قائم ہوگیا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ یہ ایسا عرصہ ہوتا ہے۔ جب انسان اپنے نیک و بد اعمال کے مطالعہ میں مصروف ہوتا ہے۔ دنیا میں کئے گئے تمام اعمال اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ وہاں اس کو راحت اور دکھ بھی پہنچتا رہتا ہے۔ چنانچہ جب وہ اپنے اعمال کا مطالعہ مکمل کرے گا۔ اور سمجھ لے گا کہ میرے اعمال یہی ہیں ان کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اسی دن حشر برپا ہو جائے گا۔

تیسری حالت بدر

اور حشر کی مثال ایسی ہے جیسے فرمایا وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ اور قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ شروع ماہ میں ہلال تھا پھر بتدریج بڑھتے بڑھتے چودھویں تاریخ کو مکمل ہو جاتا ہے۔ اور بدر کہلاتا ہے۔ فرمایا مرنے والے انسان کی تیسری حالت کی مثال یہی ہے۔ جس طرح چاند پورا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی باقی منازل طے کر کے تیسرے مرحلے پہ حشر میں پہنچ جاتا ہے اور اس کا محاسبہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا مرنے کے بعد انسان پر یکے بعد دیگرے تین حالات گذرتے ہیں

زندگی کے مختلف ادوار

فرمایا اسی طرح لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ تم ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی پر چڑھو گے۔ یا ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو گے۔ جس طرح اس دنیا کی زندگی کے مختلف ادوار سے گذرے، اس طرح مرنے کے بعد کئی منازل طے کرنا ہوں گی۔ انسان کی پیدائش اور اسکی مختلف کیفیات خود قرآن پاک نے بیان فرمائیں۔ ابتداء میں لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا انسان کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا اُسے رحم مادر میں قطرۂ آب کی شکل میں داخل کیا۔ پھر چالیس دن تک اس میں تغیرات وارد ہوئے۔ اُن میں تبدیلی آئی چالیس دن کے بعد وہ گوشت میں تبدیل ہوا۔ مزید چالیس دن کے بعد ہڈیاں وغیرہ بن گئیں اور اس کے بعد روح الٰہی کا تعلق قائم ہو گیا۔ انسان کی غذا ماں کے خون سے مل رہی ہے۔ پھر جب شکم مادر سے باہر آتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ دو سال تک اس کی روزی ماں کی چھاتیوں میں مقرر کر دیتا ہے۔ پھر بچپن کا زمانہ آتا ہے۔ کھیل کود میں مشغول ہوتا ہے۔ پھر شعور کا زمانہ

؎ تفسیر عزیزی صفحہ ۱۴۰ پارہ ۳۰

آیا، انسان تعلیم و تربیت میں جکڑا گیا۔ اب اُسے ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ پھر عالم شباب میں پہنچتا ہے۔ شادی ہوتی ہے۔ بال بچے ہوتے ہیں اب مکان کی فکر ہے، اولاد کی پرورش کی ذمہ داری ہے۔ اس کے بعد بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے۔ طرح طرح کے امراض لاحق ہونے لگتے ہیں۔ انسان ضعیف ہو جاتا ہے اور آخر ایک دن قبر میں پہنچ جاتا ہے۔ تو گویا انسان اس دنیوی زندگی میں اتنے مراحل طے کرتا ہے۔ اُسے اتنے طبقات (حالات) پر سے گذرنا پڑتا ہے۔

انسان کی آخری منزل

جس طرح انسان اس زندگی میں کئی طبقات عبور کر کے موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اسی طرح موت کے بعد کئی سیڑھیوں پر گذر کر اپنی آخری منزل تک پہنچے گا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا انسان مرنے کے بعد شفق، رات اور بدر کی منازل طے کر کے اپنی آخری منزل بہشت تک پہنچے گا لوگ قبر کو آخری منزل قرار دے دیتے ہیں۔ قبر پر کتبہ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ فلاں شخص کی آخری آرام گاہ ہے۔ حالانکہ قبر کی زندگی تو انتظار گاہ کی زندگی ہے۔ انسان کا ویٹنگ روم ہے۔ ابھی تو اُسے برزخ اور حشر کی منازل طے کر کے آخری منزل بہشت تک پہنچنا ہے۔ اگر اُس کے اعمال اچھے ہیں۔ فطرت کے مطابق ترقی کی ہے۔ تو لامحالہ اپنی آخری آرامگاہ جنت میں جائے گا۔ اور اگر اس زندگی کو لہو و لعب میں ضائع کر دیا ہے، کفر و شرک کی گندگی سے آلودہ رہا ہے تو اسے ناقابل برداشت حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس کی آخری منزل جہنم ہوگی۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ میں یہی بات سمجھائی گئی ہے۔

انسان سے شکوہ

اللہ تعالیٰ کی تمام تر نعمتوں اور ہدایت کے باوجود جب انسان راہِ راست پر نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ شکوہ کرتے ہیں۔ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ وہ ایمان نہیں لاتے، حالانکہ فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ انسان توحید اور ایمان کے ساتھ متلبس ہو کر ترقی کی راہ پر چلتا ہے۔ اور اپنے اصل ٹھکانے پر پہنچ جائے۔ مگر یہ لوگ کفر و شرک کی نجاست سے کیوں آلودہ ہیں۔ یہ لوگ کیوں دہریت اور الحاد میں پڑتے ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔

برخلاف اس کے ان کی حالت یہ ہے۔ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ [السجدة] جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی نہیں کرتے۔ قرآن کریم تو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ یہ تو ترقی کا پروگرام پیش کرتا ہے۔ مگر یہ لوگ

اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے لَا يَسْجُدُوْنَ کا لفظی ترجمہ ہے۔ سجدہ نہیں کرتے۔ مگر اس مقام پہ مراد عاجزی ہی ہے۔ یعنی یہ لوگ تلاوت قرآن کے وقت عاجزی نہیں کرتے۔ حالانکہ انہیں اپنے خدا کے حضور عاجزی کا اظہار کرنا چاہیے۔

سجدۂ تلاوت واجب ہے

قرآن پاک میں چودہ مقامات ایسے ہیں کہ جب یہ آیات تلاوت کی جائیں۔ تو پڑھنے اور سننے والوں سب پر سجدہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رح کا مسلک[1] ہے البتہ امام مالک رح اور امام شافعی رح اسے سنت موکدہ قرار دیتے ہیں[2]۔ امام صاحب رح کی دلیل زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسے مقامات پہ سجدہ نہ کرنے پہ اللہ تعالیٰ نے سخت ملامت کی ہے لہٰذا اس وعید کے پیش نظر اس حکم کی ضرور تعمیل کرنی چاہیے۔

سجدہ اور شیطان

حدیث شریف[3] میں آتا ہے۔ جب ابن آدم سجدہ کرتا ہے۔ تو شیطان الگ کھڑا ہو کر اپنے سر پر مٹی ڈالتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ آدم کے بیٹے کو حکم دیا گیا، تو وہ سجدہ کر کے کامیاب ہو گیا، اس کو قربِ الٰہی حاصل ہو گیا۔ مگر افسوس! کہ مجھے سجدہ کا حکم ہوا، تو میں نے انکار کر دیا، لہٰذا میرے مقدر میں تباہی ہے۔ شیطان یہ بات حسرت اور حسد کی بنا پہ کہتا ہے۔ مگر توبہ کرنے کے لیے پھر بھی تیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابلیس کی توبہ کا تو مسئلہ ہی ختم ہو چکا ہے۔ اُسے یہ توفیق نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس سے پہلے سورۃ نون میں گذر چکا ہے کہ قیامت کے دن سجدہ کا امتحان ہو گا۔ لوگوں کو کہا جائے گا۔ کہ خدا تعالیٰ کے سامنے سجدہ کرو۔ پس جس نے دنیا میں عاجزی، انکساری اور نیاز مندی کے ساتھ سجدہ کیا ہو گا۔ وہ وہاں بھی سجدہ کرے گا۔ اور جس کو دنیا میں سجدے کی توفیق نہیں ملی وہ زندگی بھر اکڑ کر چلتا رہا یا جس نے ریاکاری اور نفاق کا سجدہ کیا، اس کی پشت تختے[4] کی طرح سخت ہو جائے گی وہ قیامت کے روز سجدہ نہیں کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا[5] میں نے دنیا میں تجھے تندرستی دی، کمر بھی ٹھیک ٹھاک عطا کی مگر تم نے سجدہ نہ کیا لہٰذا آج تو سجدہ نہیں کر سکے گا۔ آج تیری ناکامی کا دن ہے۔

---

[1] جامع صغیر ص ۱۶ میزان الکبریٰ ص ۱۷۷ ج ۱ ہدایہ ص ۱۶۳ ج ۱ [2] میزان الکبریٰ ص ۱۷۷ ج ۱ روح المعانی ص ۸۳ ج ۳۰

[3] مسلم ص ۶۱ ج ۱، ابن ماجہ ص ۷۳ [4] بخاری ص ۷۳۱ ج ۲ [5] مسلم ص ۱۰۲ ج ۱

سورۃ مرسلت میں رکوع کا ذکر بھی آچکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو رکوع کرنے کا حکم بھی دیتا ہے۔ مگر بعض لوگ ایسے بھی ہیں "وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ" کہ جب انہیں رکوع کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ تو نہیں کرتے۔ رکوع کے ذریعے پشت کو ٹیڑھا کرنے کا مقصد یہ ہے۔ کہ انسان جھک گیا۔ اور کہہ رہا ہے۔ کہ اے پروردگار! تو جو بھی ذمہ داری مجھ پہ ڈالے گا۔ میں پوری کروں گا۔ مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ انسان اپنا وعدہ پورا نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہے۔ "وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ" اس دن جھٹلانے والوں کے لیے تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

سجدۂ تلاوت فی الفور ضروری نہیں

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت[1] میں ہے۔ حضرت ابورافعؓ کہتے ہیں۔ کہ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ آیت پڑھی تو سجدہ کیا۔ میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا۔ کہ میں نے حضرت ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے یہ آیت سنی۔ آپ نے پڑھی اور سجدہ کیا۔ لہٰذا میں بھی مرتے دم تک اس مقام پر سجدہ کرتا رہوں گا۔ اس روایت سے بھی ثابت ہوا کہ سجدہ کی آیت پڑھنے پر پڑھنے اور سننے والوں سب پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص قصداً سنے تو جبھی سجدہ واجب ہوگا۔ بلکہ اگر بغیر قصد کے بھی ایسی آیت سن لی۔ تو سجدہ ضروری ہوگیا۔ ہاں اگر کوئی تلاوت کے وقت سجدہ کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا وضو نہیں یا کوئی اور عذر ہے تو سجدہ تلاوت فی الفور واجب نہیں۔ بلکہ بعد میں بھی ادا ہو سکتا۔ حضرت عمرؓ[2] نے ایک مرتبہ یہ آیت منبر پر پڑھی تو سجدہ کیا۔ مگر ایک دوسرے موقع پر پڑھی تو سجدہ نہ کیا مسئلہ یہ سمجھانا مقصود تھا کہ سجدہ تلاوت فی الفور ضروری نہیں۔ یہ پڑھنے سننے والے کے ذمے واجب ہوگیا۔ آپ کسی وقت بھی ادا کر سکتے ہیں۔ بہر حال ہے یہ ضروری۔

کفار کے لیے عذاب الیم

فرمایا بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ بلکہ جو کافر ہیں وہ جھٹلاتے ہیں تکذیب کرتے ہیں نہ توحید کو مانتے ہیں نہ قیامت پر ایمان ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ اور اللہ ہی جانتا ہے، جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں، جو برے عقیدے ان کے دلوں میں ہیں۔ اور جو اعمال

---

[1] مسلم ص ۲۱۵/۱ج [2] طحاوی ص ۲۴۴/۱ج

سیئہ اور حسنہ انہوں نے جمع کیے۔ اللہ تعالیٰ سب کو جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی حلال وحرام کمائی سے خوب واقف ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ جو قرآن پاک جیسی بلند پایہ نعمت کو سن کر عاجزی نہیں کرتے۔ اس کا اقرار کرنے کی بجائے انکار کرتے ہیں۔ اور برائیوں کو سمیٹ رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ انہیں عذاب الیم کی خوشخبری سنا دیجئے۔ جو کہ محض تباہی ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اس روش کا جو تم اختیار کئے ہوئے ہو۔

اہلِ ایمان کے لیے اجرِ عظیم

فرمایا برخلاف اس کے اِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا جو لوگ ایمان لائے انہوں نے اپنے دلوں میں نور توحید کو سمیٹا، خدا کی وحدانیت، انبیاء علیہم السلام اور قیامت اور تمام احکام شرعیہ کو تسلیم کیا۔ کفر، شرک، نفاق اور بد عقیدگی سے اپنے آپ کو بچایا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اور نیک اعمال انجام دے۔ حضرت مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں[1]۔ ایمان کے بعد حسن اعمال کا دارومدار ہے۔ منجملہ ان کے نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ بنیادی اعمال ہیں۔ ان اعمال پر کاربند رہنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بخشش کا وعدہ فرمایا ہے۔ باقی تمام اعمال صالحہ صدقہ، خیرات وغیرہ مذکورہ بنیادی اعمال کے تحت آجاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضور علیہ السلام نے فرمایا[2] لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئًا نیکی کی چھوٹی سی چیز کو بھی حقیر نہ سمجھو۔ اس کی قدر و قیمت اعمال تلنے کے وقت ہوگی۔ ایک ایک نیکی حاصل کرنے کے لیے لوگ دوڑتے پھیریں گے۔ مگر کہیں میسر نہیں آئے گی۔ انسان اپنے اہل و اولاد، رشتہ داروں اور دوستوں سے کہے گا خدا کے لیے ایک نیکی دیدو تو میرا کام بن جائے گا۔ مگر وہ کہیں گے کہ جاؤ اپنا کام کرو ہمارا اپنا معاملہ پھنسا ہوا ہے۔ ہم تجھے کہاں سے نیکی دے دیں۔ اسی لیے فرمایا کہ کسی نیکی کو حقیر نہ جانو۔ یہ وقت پر بڑے کام آنے والی چیز ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[3] اپنے بھائی کے ساتھ ہنس مکھ چہرے سے بات ہی کر لو۔ تو یہ بھی نیکی ہے۔ راستہ سے پتھر یا کانٹا ہی ہٹا دو کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچے یہ معمولی سی نیکی بھی قیامت کے روز بڑا فائدہ پہنچائے گی۔ اسی لیے فرمایا جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر و ثواب ہے غَيْرُ مَمْنُونٍ کا معنی غیر منقطع یا ہمیشہ رہنے والا ہے۔

---

[1] مکتوبات صـ [2] مسلم صـ ۳۲۹ ج ۲ [3] ترمذی صـ ۲۸۹ و صـ ۲۹۱

سُورَةُ البُرُوجِ

درس اول — (آیت ۱ تا ۱۱)

سُورَةُ الْبُرُوجِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَعِشْرُونَ آيَةً

سورۂ بروج مکی ہے اور یہ بائیس ۲۲ کل آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالے ہے

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ﴿۱﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُودٍ
﴿۳﴾ قُتِلَ أَصْحَابُ الْأُخْدُودِ ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ﴿۵﴾ إِذْ هُمْ
عَلَيْهَا قُعُودٌ ﴿۶﴾ وَّهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ﴿۷﴾
وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ﴿۸﴾ الَّذِي
لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۹﴾ إِنَّ
الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ
جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ﴿۱۰﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۵ الّا تخفیف ۱۲
لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ﴿۱۱﴾

ترجمہ:۔ قسم ہے ستاروں والے آسمان کی ﴿۱﴾ اور اس (قیامت کے) دن کی جس کا وعدہ کیا
گیا ہے ﴿۲﴾ اور قسم ہے حاضر ہونے والے (جمعہ کے دن) کی اور قسم ہے اس (عرفے کے دن)
کی جس کے پاس حاضری ہوتی ہے ﴿۳﴾ کھائیوں والے مارے گئے ﴿۴﴾ کہ وہ ایندھن والی آگ
تھی ﴿۵﴾ جب کہ وہ (ظالم) اس (آگ) کے قریب بیٹھے ہوئے تھے ﴿۶﴾ اور وہ اہل ایمان
کے ساتھ جو زیادتیاں کر رہے تھے ان کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھ رہے تھے ﴿۷﴾ اور انہوں نے
نہیں عیب پایا ان ایمان والوں میں سوائے اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے جو غالب (اور)
تعریفوں والا ہے ﴿۸﴾ وہی (اللہ تعالیٰ) جس کی حکومت تمام آسمانوں اور زمین پر ہے اور

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے (۹) بے شک جن لوگوں نے ایماندار مردوں اور ایماندار عورتوں کو فتنے میں ڈالا پھر (اس قبیح فعل سے) توبہ نہ کی تو ایسے لوگوں کے لیے جہنم کی سزا ہے اور ان کے لیے (سخت) جلانے والی سزا مقرر ہے (۱۰) بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی یہ بہت بڑی کامیابی ہے (۱۱)

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ البروج ہے اس کی پہلی آیت میں بروج کا لفظ مذکور ہے۔ جس سے اس سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔ بروج برج کی جمع ہے۔ اور اس سے مراد آسمان کی منزلیں ہیں جن میں سورج اور چاند ہر دن اور ہر ماہ مقررہ پروگرام کے مطابق پہنچتے ہیں بعض مفسرین[1] فرماتے ہیں کہ برج سے مراد آسمان کے ستارے ہیں۔

یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی بائیس[۲۲] آیتیں، ایک سو نو[۱۰۹] الفاظ اور چار سو اڑتیس حروف ہیں۔

سابقہ سورۃ کے ساتھ ربط

اس سے پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا ذکر انسان کی فطری ترقی کو سامنے رکھ کر کیا تھا۔ کہ اگر انسان فطرت کے مطابق ترقی کی منازل طے کرے گا۔ تو اس کا اگلا قدم قیامت اور بلندی کی طرف ہوگا۔ اس سورۃ میں بھی اللہ تعالیٰ نے قیامت، اس کے محاسبے اور جزائے عمل کا ذکر کیا ہے۔ اور نوع انسانی میں بدامنی کے پیش نظر قیامت پہ دلیل قائم کی ہے۔ بنی نوع انسان میں بدامنی، ظلم اور زیادتی کا قدرتی تقاضا ہے۔ کہ قیامت واقع ہو۔ اور جزائے عمل کی نوبت آئے۔

حدیث شریف[2] میں حضرت ابوہریرہؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ سے منقول ہے کہ حضور علیہ السلام عشاء کی نماز میں سورۃ بروج، سورۃ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ اور سورۃ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى تلاوت فرمایا کرتے تھے۔

اصحاب الاخدود کا واقعہ

اخدود۔ خد کی جمع ہے۔ جس کا معنی گڑھا ہے۔ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ سے مراد گڑھے والے لوگ ہیں۔ اور یہ ایک تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جس سے نوع انسانی میں بدامنی کی

---

[1] روح المعانی صفحہ ۸۵/۳۰ تفسیر کبیر صفحہ ۱۱۴/۳۱ در منثور صفحہ ۳۳۱/۶ [2] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۴۹۱/۴

بات سمجھ میں آتی ہے۔ اور جزائے عمل پر دلیل قائم ہوتی ہے۔

اس سورۃ کو چند قسموں سے شروع کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد اَصْحَابُ الْاُخْدُوْد کی طرف اشارہ ہے۔ یہ واقعہ مسلم[1]، ترمذی اور مسند احمد میں مذکور ہے۔ بعض دوسری کتب میں بھی واقعہ کی تفصیلات ملتی ہیں، مگر وہ صحیح نہیں ہیں۔ اصل واقعہ حدیث کی کتابوں میں ہی ملتا ہے۔

یہ واقعہ حضور علیہ السلام کی بعثت سے تقریباً ۷۰ سال قبل پیش[2] آیا۔ یمن میں ذونواس نامی بادشاہ تھا۔ جو کافر و مشرک تھا۔ بعض[3] کہتے ہیں مجوسی تھا۔ تاہم یہ ایران کے بادشاہ کے زیر اثر تھا۔ اور اس کی حیثیت وائسرائے کی طرح تھی۔ اپنے علاقے میں با اختیار تھا۔ اس کے ہاں ایک جادوگر تھا۔ جسے امورِ مملکت میں بڑا عمل دخل تھا۔ بادشاہ اس سے مشورہ طلب کرتا تھا، اور اس کے مطابق کام انجام دیتا تھا۔ اس زمانے میں اکثر سربراہانِ مملکت ساحر، نجومی یا رمل وغیرہ والے لوگوں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ جو اپنے فن کے مطابق حکمرانوں کو مشورہ دیتے تھے۔ جس طرح آج کل فنی مشورے ڈاکٹروں، انجینیروں یا سائنس والوں سے لیے جاتے ہیں، اس زمانے میں جادوگر قسم کے لوگ حکومت کے مشیر ہوتے تھے۔

شاہ یمن کا ساحر جب بوڑھا ہو گیا۔ تو اس نے بادشاہ سے کہا۔ کہ کوئی قابل اور ذہین لڑکا تلاش کرو۔ جسے میں اپنا فن سکھا دوں۔ جو میرے بعد تمہارے کام آئے۔ چنانچہ اس کام کے لیے ایک ہوشیار لڑکا منتخب کر کے ساحر کے حوالے کیا گیا۔ جس نے جادوگر سے تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جس راستے پر ہو کر لڑکا ساحر کے پاس جاتا تھا۔ اس راستے میں کسی راہب کا عبادت خانہ تھا۔ وہ راہب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیح دین پر تھا۔ لڑکا اس کے پاس آنے جانے لگا۔ حتیٰ کہ اس کا دین قبول کر لیا۔ راہب نے اس کی تربیت اتنی اچھی کی کہ وہ بچہ صاحب کرامت بن گیا۔ ایک دن ایسا واقعہ پیش آیا کہ کسی موذی جانور نے شارع (راستہ) روک رکھا تھا۔ وہ کوئی خوفناک شیر یا اژدھا تھا۔ جس کی موجودگی میں لوگوں کا اس راستے

---

[1] مسلم ص ۴۱۵/۲، ترمذی ص ۴۸۲، مسند احمد ص ۱۷/۶ [2] معالم التنزیل ص ۲۲۳/۴

[3] روح المعانی ص ۸۸/۳۰

سے گذرنا محال تھا۔ لوگ سخت پریشان تھے۔ اس لڑکے کو علم ہوا تو اس نے بڑا پتھر ہاتھ میں لے کر دعا کی کہ اے اللہ! اگر راہب کا دین سچا ہے تو میرے اس پتھر سے یہ موذی جانور ہلاک ہو جائے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اس کے پتھر سے جانور ہلاک ہو گیا اور اس کرامت کی وجہ سے بچہ بڑا مشہور ہو گیا۔ کہ یہ کوئی بڑا علم جانتا ہے۔ اسی دوران ایک اندھا شخص اُس لڑکے کے پاس آیا۔ اور اس سے آنکھیں اچھا کرنے کی درخواست کی۔ لڑکے نے کہا کہ اچھا کرنے والی ذات تو وحدہٗ لاشریک ہے۔ اگر تو اس پر ایمان لے آئے تو میں تیرے حق میں دعا کروں گا۔ اللہ تمہیں بینائی عطا کر دے۔ وہ اندھا شخص ایمان لے آیا۔ لڑکے نے دُعا کی اور اللہ نے اسے بینا کر دیا۔ اس کرامت کے ظاہر ہونے سے وہ اور زیادہ مشہور ہوا۔ اور اس نے اس طریقے سے تبلیغ شروع کر دی۔ وہ ہر کسی سے یہی کہتا کہ میری تو کچھ طاقت نہیں، کام کرنے والا تو وحدہٗ لاشریک ہے۔

ہوتے ہوتے یہ خبر بادشاہ تک پہنچی۔ اس نے لڑکے کو بلا کر کہا، کہ تم اب جادو میں ماہر ہو گئے ہو۔ اور علم حاصل کر لیا ہے۔ پہلے تو لڑکے نے حقیقت حال کو چھپانے کی کوشش کی مگر اصل بات ظاہر ہو گئی۔ لڑکے نے صاف صاف کہہ دیا۔ یہ جادو وغیرہ کچھ نہیں نفع و نقصان کا مالک تو اللہ کی ذات ہے یہ سُن کر بادشاہ سخت ناراض ہوا، اُس راہب اور اس اندھے کو بلا لیا جو لڑکے کی دعا سے بینا ہو گیا تھا۔ پہلے تو انہیں ڈرایا دھمکایا۔ اور پھر ان دونوں کو قتل کر دیا۔ لڑکے کے بارے میں حکم دیا۔ کہ اس کو پہاڑ پر لے جاؤ۔ اگر یہ اپنا دین ترک کر دے تو چھوڑ دینا، ورنہ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا دینا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جو کارندے لڑکے کو پہاڑ پر لے گئے وہ خود گر کر ہلاک اور لڑکا صحیح سلامت واپس آ گیا، اس واقعہ سے بادشاہ کو سخت رنج ہوا۔ اس نے اپنے عمال کو حکم دیا۔ کہ لڑکے کو کشتی میں سوار کر کے گہرے پانی میں لے جاؤ۔ اور اسے اپنا دین چھوڑنے کی دعوت دو۔ اگر وہ اس پر آمادہ نہ ہو تو غرق کر دو۔ اللہ تعالیٰ کی مدد یہاں بھی شامل حال ہوئی اور حکومت کے کارندے خود ڈوب گئے اور لڑکا پھر واپس آ گیا۔

اب تو بادشاہ کو سخت تشویش ہوئی۔ لوگ بچے کے یہ حالات دیکھ کر دھڑا دھڑ ایمان لا رہے تھے۔ اور بادشاہ کی آتش انتقام مزید بھڑک رہی تھی۔ اُس نے کھڈے یا خندق کھدوائے، اُن میں آگ جلائی اور ہزاروں کی تعداد میں ایمان والوں کو ان بڑے بڑے آگ کے گڑھوں میں

پھینک کر زندہ جلا دیا۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ ان میں ایک ایماندار عورت بھی لائی گئی۔ جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا آگ کے شعلے دیکھ کر عورت کو تردد پیدا ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے اُس چھوٹے بچے کو قوت گویائی عطا کی۔ اور وہ کہنے لگا۔ یَا اُمِّیْ اِصْبِرِیْ اِنَّکِ عَلَی الْحَقِّ۔ اے ماں صبر کر تم حق پر ہو۔ گھبرانا نہیں۔ اگرچہ آگ میں ڈال دی جاؤ۔

اس صاحب کرامت لڑکے کو ہلاک کرنے کے لیے جب بادشاہ کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ تو اس لڑکے نے خود بادشاہ کو تجویز پیش کی کہ اگر تو مجھے ضرور ہی ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ تو مجھے کسی اونچی جگہ پر کھڑا کر کے مجھ پر تیر چلاؤ۔ اور تیر چلانے والا، تیر چلانے وقت زبان سے یہ الفاظ ادا کرے۔ بِاسْمِ اللّٰہِ رَبِّ الْغُلَامِ۔ یعنی اس بچے کے رب کے نام پر تیر چلاتا ہوں چنانچہ اس تجویز پر لڑکے کو بلند جگہ پہ لٹکا کر تیر چلایا گیا جو اس کی کنپٹی پہ لگا اور وہ ہلاک ہو گیا۔ اپنے رب کے نام پر قربان ہو گیا۔ یہ نظارہ ہزاروں آدمی دیکھ رہے تھے۔ وہ سب کے سب ایمان لے آئے بادشاہ آتش غیظ و غضب میں بھڑک اٹھا اور اس نے ہزاروں آدمیوں کو آگ کے ان بڑے کھڈوں میں ڈال کر ہلاک کر دیا۔ یہ ہے وہ تاریخی واقعہ جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں اشارہ کیا ہے۔

ستاروں کی گواہی

اس تاریخی واقعہ پر اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی گواہی پیش کی ہے۔ اُن میں ستارے سرفہرست ہیں۔ ارشاد ہے۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ قسم ہے ستاروں والے آسمان کی یہ ستارے دیکھ رہے ہیں کہ کس قدر ظلم ہو رہا ہے۔ ستر ہزار انسانوں کو آگ کے گڑھوں میں ڈال دیا گیا[2]۔ یہ ظلم و زیادتی کی انتہا ہے۔ اسی لیے سورۃ کے دوسرے حصے میں فرمایا۔ کہ اگر تم اس قدر بدامنی اور ظلم کا ارتکاب کرو گے۔ تو "اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ" تیرے رب کی پکڑ بھی بڑی سخت ہے جب اس کی گرفت میں آ گیا۔ تو پھر بچ نہیں سکے گا۔ فرمایا وَالْیَوْمِ الْمَوْعُوْدِ اور اس بات پر وعدہ کیا گیا دن بھی گواہ ہے۔ اور وہ قیامت کا دن ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے یہ بدامنی خود گواہ ہے کہ قیامت کا آنا قطعی اور یقینی ہے۔ جزائے عمل ایک دن ضرور واقع ہوگی۔

---

[1] مسلم ص ۴۱۵ ج ۲ [2] روح المعانی ص ۸۶ ج ۳۰ معالم التنزیل ص ۲۲۴ ج ۴

اور ظالموں کو اپنے کئے کا بھگتان کرنا پڑے گا۔

ذات البروج کا معنیٰ بعض مفسرین نے برجوں والا آسمان کیا ہے۔ اور اس سے وہ بارہ برج مراد نہیں ہیں جو یونانیوں کی اصطلاح ہے۔ یا ماہرین فلکیات مراد لیتے ہیں۔ عام مفسرین[1] بروج سے ستارے مراد لیتے ہیں۔ یعنی قسم ہے آسمان کی جو ستاروں سے بھرا پڑا ہے یہ ساری ظلم و زیادتی ان کے سامنے ہو رہی ہے۔ یہ اس کے چشم دید گواہ ہیں۔

شاہد اور مشہود

اس کے بعد فرمایا وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُودٍ اور قسم ہے حاضر ہونے والے کی اور قسم ہے اُس کی جس کے پاس حاضری ہوتی ہے۔ حدیث شریف[2] میں آتا ہے شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے، جو ہر شہر میں آتا ہے۔ اور اہل ایمان کو کہیں دور نہیں جانا پڑتا۔ اور مشہود سے مراد عرفہ کا دن یعنی نویں ذوالحجہ ہے۔ جب دنیا کے کونے کونے سے حج کے لیے آنے والے سعادتمند اس مقام پر حاضر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بے شمار فرشتے بھی وہاں حاضر ہوتے ہیں۔

اصحٰب الاخدود کی ہلاکت

مطلب یہ کہ یہ سب چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ بدامنی کا نتیجہ خطرناک ہو گا۔ اصحٰب الاُخدود نے ظلم کیا تھا اس کا نتیجہ بھی یہی ہوا۔ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ یعنی کھڈوں یا کھائیوں والے مارے گئے یا قتل کیے گئے۔ یعنی جن لوگوں نے ایمانداروں کو ناحق آگ کے گڑھوں میں پھینکا تھا، وہ بھی اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں بھی سزا دی اور آخرت کا عذاب تو ان کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اصحٰب الاخدود مارے گئے۔ اور وہ کیا چیز تھی جس میں لوگوں کو ڈالا گیا النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ وہ ایندھن والی آگ ہے جس کو جلایا گیا۔ اور ان ظالموں کی حالت یہ تھی۔ کہ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ وہ اس بھڑکتی ہوئی آگ کا مشاہدہ کرنے کے لیے اس پر یعنی اس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ اور وہ اہل ایمان کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ کہ کس طرح ان کو پکڑ پکڑ کر آگ میں جھونکا جا رہا ہے۔ مگر اس ظلم کی وجہ کیا

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۴۹۱ ج ۴، روح المعانی ص ۸۴ ج ۳۰، مظہری ص ۲۳۴ ج ۱۰ [2] تفسیر کبیر ص ۱۱۴ ج ۳۱، روح المعانی ص ۸۴ ج ۳۰
تفسیر ابن کثیر ص ۴۹۱ ج ۴ [3] ترمذی ص ۴۸۱ ، سنن الکبریٰ بیہقی ص ۱۷۰ ج ۳

تھی۔ فرمایا وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اہل ایمان سے کس چیز کا بدلہ لیا جا رہا تھا۔ ان کی کیا خرابی تھی انہوں نے کونسا جرم کیا تھا۔ کیا انہوں نے کسی کو قتل کیا تھا یا کسی کا مال دبایا تھا۔ انہوں نے نہیں بدلہ لیا اُن سے اِلَّا اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ مگر محض اس لیے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے جو کہ عزیز اور حمید ہے۔ بس یہ جرم تھا ان کا جس کی وجہ سے وہ آگ میں ڈالے گئے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اشارۃً مکے والوں کو بھی بات سمجھادی۔ کہ جس طرح اصحٰب الاخدود اہل ایمان کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح اے مکے والو! تم بھی اہل ایمان کو برداشت نہیں کرتے پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کس جرم کی سزا دے رہے ہو۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔ اس قسم کی کئی آیات حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام رضؓ کے متعلق موجود ہیں۔

الغرض اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں۔ کہ اُن ظالموں نے اہل ایمان سے بدلہ محض ان کے ایمان کا لیا اور کوئی وجہ نہ تھی سوائے اس کے وہ عزیز اور حمید جیسی صفات کے مالک رب العزت پہ ایمان لائے اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وہی خدا جس کی حکومت تمام آسمانوں اور زمین پہ ہے۔ اور یقین جانو کہ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔ ہر کام اس کے سامنے ہو رہا ہے۔ ہر چیز اس کے علم میں ہے۔

ان کے لیے جہنم کی سزا

فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جن لوگوں نے ایماندار مردوں اور ایمان دار عورتوں کو فتنے میں ڈالا، دین سے گمراہ کرنا چاہا پوری کوشش کی کہ لوگ اس لڑکے کے دین سے پلٹ جائیں۔ اور دوبارہ کفر کا راستہ اختیار کرلیں ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا پھر اس قبیح فعل کے ارتکاب کے بعد توبہ بھی نہیں کی۔ اپنے اللہ سے معافی بھی نہیں مانگی فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ایسے لوگوں کے لیے جہنم کی سزا ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ خدا تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے سخت جلانیوالی سزا مقرر ہے۔ جس طرح یہ دنیا میں ایمان والوں کو زندہ جلا رہے ہیں، قیامت کے روز یہ بھی جہنم میں آگ کا ایندھن بنیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اپنی خاص رحمت و بخشش کی طرف بھی اشارہ فرمادیا۔ کہ اتنے بڑے جرم کے ارتکاب کے بعد بھی اگر یہ لوگ توبہ کرلیں، مجھ سے معافی مانگ لیں،

تو میں معاف کر دوں گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حلم اور بردباری کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ کہ اس کی بخشش ہر وقت گنہگاروں کی تلاش میں رہتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا کوئی بندہ جہنم کا شکار بنے بلکہ وہ تو لوگوں کو اس آگ سے بچانا چاہتا ہے۔ جو اس دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ سخت ہے۔

ایمانداروں کے لیے اجر

فرمایا برخلاف اس کے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ ایمان لائے۔ اللہ وحدہٗ لاشریک کی توحید کو قبول کیا۔ قیامت کو تسلیم کیا۔ انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کی۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور نیک اعمال انجام دیئے۔ اللہ کے ہاں نجات کا دارومدار حکومت، تجارت یا دولت پر نہیں بلکہ ایمان، نیکی اور تقویٰ پر ہے۔ لہٰذا جنہوں نے ایمان کی دولت حاصل کر لی ہے، اور پھر اعمال صالحہ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج انجام دے رہے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد پورے کرتے رہے ہیں۔ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں کی زندگی نہایت آرام دہ ہوگی۔ وہاں پر کسی تکلیف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور جو شخص اس جنت تک پہنچ گیا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر راضی ہو کر اسے بہشت میں داخل کر دے۔ ایماندار اور اعمال صالحہ اختیار کرنے والے لوگوں کی اللہ تعالیٰ ایسی ہی عزت افزائی فرمائیں گے۔

درس دوم (آیت ۱۲ تا ۲۲)

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ⑫ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ⑬ وَهُوَ الْغَفُوْرُ
الْوَدُوْدُ ⑭ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ⑮ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ⑯ هَلْ اَتٰىكَ
حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ⑰ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ⑱ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ
تَكْذِيْبٍ ⑲ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ⑳ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ
مَّجِيْدٌ ㉑ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ㉒ ع ۲۲/۱۰

ترجمہ:۔ بے شک تیرے رب کی پکڑ البتہ سخت ہے ⑫ بے شک وہ وہی ذات ہے جو ابتداء میں پیدا کرتا ہے اور پھر دوبارہ لوٹائے گا ⑬ اور وہی معاف کرنے والا اور محبت کرنے والا ہے ⑭ عرش کا مالک (اور) بزرگی والا ہے ⑮ وہ اپنے ارادے سے جو چاہے کرتا ہے ⑯ کیا آپ کے پاس ان لشکروں کی بات آئی ہے؟ ⑰ فرعون اور (قوم) ثمود کی ⑱ بلکہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہ تکذیب میں (لگے ہوئے) ہیں ⑲ اور اللہ تعالیٰ ان کو ہر طرف سے گھیرنے والا ہے ⑳ بلکہ یہ تو قرآن ہے بڑی بزرگی والا ㉑ (یہ) لوح محفوظ میں (درج) ہے ㉒

گذشتہ سے پیوستہ

اس سورہ مبارکہ میں بھی قیامت کا ذکر اس صورت میں ہے کہ اس دنیا میں ظلم و زیادتی کرنا اس امر کا متقاضی ہے کہ قیامت ضرور قائم ہو، اس سلسلے میں اصحٰب الاخدود جیسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں ظلم کرنے والوں کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ مفسرین کرام[1] فرماتے ہیں۔ کہ ابتداء میں جن چار قسموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمام اشیاء اس بات کی گواہ ہیں کہ تیرے رب کی پکڑ بہت سخت ہے جب وہ گرفت کرتا ہے۔ تو مجرمین کو ضرور سزا دیتا ہے۔ یمن کے ایک ظالم بادشاہ نے جب اہل ایمان کو آگ کے گڑھو

---

[1] تفسیر عزیزی ص ۱۵۰ پارہ ۳۰، معالم التنزیل ص ۲۲۵ ج ۴

میں ڈالا تو وہ بھی خدا کے غضب سے نہ بچ سکا۔ اس دنیا میں بھی اس کو سزا ملی اور آخرت میں بھی سخت سزا کا مستحق ٹھہرا۔

مفسرین بیان فرماتے ہیں۔ کہ خندقوں میں ڈال کر زندہ جلا لے کا کوئی ایک خاص واقعہ نہیں ابلکہ مختلف ممالک میں ایسے بہت سے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں تاہم اصحٰب الاخدود کا واقعہ وہی ہے جو یمن میں پیش آیا۔ ذو نواس نامی ایک ظالم بادشاہ نے ہزاروں اہل ایمان کو آگ کی خندقوں میں گرا کر زندہ جلا دیا۔ اور وہ اہل ایمان بچہ اپنی جان کی قربانی خدا کے نام پہ پیش کر کے عام لوگوں کے لیے ایمان کا ذریعہ بن گیا۔

ظلم کی سزا اس دنیا میں

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فتح الرحمٰن کے حاشیہ[۲] میں لکھتے ہیں اور شاہ عبدالقادر دہلوی[۳] نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ کہ بادشاہ کے ظلم کے بدلے میں جب اللہ کا غضب وارد ہوا۔ تو خندقوں کی وہی آگ جس میں ہزاروں اہل ایمان ہلاک ہو گئے تھے۔ اس قدر پھیلی کہ بادشاہ اور اس کے امراء کے تمام گھر جلا کر خاکستر کر دیے۔ بے شمار لوگ مارے گئے۔ بعض[۴] روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ آگ سے ڈر کر بھاگ رہا تھا اور آگ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ آخر اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور اس میں ڈوب کر مر گیا۔ یہ تفسیری روایات ہیں کسی صحیح حدیث میں اس کا ذکر نہیں۔ تاہم باعث عبرت بات یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ظالموں کو اس دنیا میں ہی سزا دے دی مگر یہ ضروری نہیں کہ ظالم فوری طور پر گرفت میں آجائے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں ”وَاُمْلِیْ لَهُمْ“ میں ان کو مہلت دیتا ہوں مگر ”اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ“ میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔ میں جب چاہتا ہوں ظلم کی دراز رسی کو کھینچ لیتا ہوں۔ میری پکڑ بڑی سخت ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہی پکڑ لیا، ان کے بعض نمونے بھی بتلا دیے۔

قبر میں لڑکے کی حالت

صاحب کرامت لڑکے کی شہادت کے بعد جو واقعہ پیش آیا اس کا کچھ حصہ ترمذی شریف[۵] میں موجود ہے۔ یہ واقعہ حضور علیہ السلام سے صرف ستر[۶] سال قبل کا ہے۔ اس لیے عرب اسے

۱؎ معالم التنزیل ص ۲۲۴ ج ۴، تفسیر ابن کثیر ص ۴۹۵ ج ۴، ۲؎ فتح الرحمٰن مع جلالین ص ۶۲۲ مطبع ہاشمی دہلی،
۳؎ موضح القرآن ص تفسیر حسینی، تفسیر عزیزی ص ۱۵۸ ج ۳، ۴؎ تفسیر ابن کثیر ص ۴۹۵ ج ۴ و مظہری ص ۲۳۰ ج ۱۰،
۵؎ ترمذی ص ۴۸۲ ۶؎ معالم التنزیل ص ۲۲۳ ج ۴، مظہری ص ۲۳۰ ج ۱۰۔

جانتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں کسی ضرورت کے تحت اُس جگہ کو کھودا گیا[1] جہاں وہ بچہ دفن تھا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں۔ کہ خدا کی قدرت سے وہ لڑکا اپنے مقام پر صحیح سلامت بیٹھا تھا۔ اور اس کا ہاتھ اس کی کنپٹی پر تھا۔ جہاں اُسے تیر لگا تھا۔ جب لوگ اس کا ہاتھ زخمی جگہ سے ہٹاتے تو اُس کے زخم سے خون جاری ہو جاتا۔ اور جب اس کا ہاتھ چھوڑ دیتے۔ تو ہاتھ خود بخود اُسی جگہ پر واپس چلا جاتا۔ بعض[2] نے ذکر کیا ہے۔ کہ لڑکے کے ہاتھ میں انگوٹھی تھی۔ جس پر یہ الفاظ کندہ تھے رَبِّیَ اللّٰہ یعنی میرا رب اللہ ہے۔ یمن کے عامل نے اس واقعہ کی اطلاع خلیفہ وقت حضرت عمرؓ کو بھجوائی تو آپ نے جواباً حکم بھیجا کہ اس لڑکے کو فوراً اُسی جگہ پر دفن کر دو، جہاں وہ پہلے تھا۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا۔ کہتے ہیں[3] کہ اس لڑکے کا نام عبداللہ بن تامر تھا۔

سخت پکڑ کا مفہوم

مذکورہ واقعہ میں ظالمین کا انجام بیان کرنے کے بعد فرمایا اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ مفسرین کرام[4] بطش شدید کا مفہوم اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ لبا اوقات مجرمین اس دنیا میں سزا سے بچ جاتے ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی ذریعے سے ہو۔ کسی کی منت سماجت کی جائے۔ سفارش پہنچ جائے۔ یا کسی اور وجہ سے مجرم بچ سکتا ہے۔ مگر احکم الحاکمین کی پکڑ اس لحاظ سے سخت ہے کہ اس کے ہاں ایسا کوئی طریقہ کارآمد نہیں ہو سکتا۔ نہ وہاں منت خوشامد کام آسکتی ہے، نہ سفارش بچا سکتی ہے۔ نہ کوئی فدیہ کام آسکتا ہے۔ بلکہ اُسے ہر حالت میں مقررہ سزا بھگتنی پڑے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ دنیوی سزا زیادہ سے زیادہ سزائے موت ہو سکتی ہے۔ ایک دفعہ موت واقع ہو گئی سزا مکمل ہو گئی۔ اس کے بعد اور کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ فرعون کے جادوگروں نے یہی کہا تھا۔ کہ ہمیں قتل کی دھمکیاں دے رہے ہو۔ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے ہو"اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا" ہماری اس دنیوی زندگی کو ہی ختم کر دو گے۔ اس زندگی کے بعد کسی کو مزید سزا دینے کی دسترس نہیں ہے۔ کیونکہ موت کے بعد کوئی کسی کو زندہ نہیں کر سکتا، معدوم کو لوٹا نہیں سکتا۔ لہذا موت کے بعد سزا کا تصور نہیں

---

[1] ترمذی ص ۴۸۲، [2] مظہری ص ۲۳۷ ج ۱۰ معالم التنزیل ص ۲۲۳ ج ۴

[3] تفسیر ابن کثیر ص ۴۹۴ ج ۴ و مظہری ص ۲۳۷ ج ۱۰ [4] تفسیر عزیزی فارسی ص ۱۶۱ پارہ ۳۰۔

کیا جاسکتا مگر اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے۔ جو مُردہ کو دوبارہ زندہ کر دے اور معدوم کو لوٹا دے۔ لہذا وہ سزا بھی بار بار دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل دوزخ کی سزا کا قانون قرآن پاک میں فرما دیا۔ "کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ط" جب مجرمین کے جسم کی کھالیں دوزخ کی آگ میں جل جائیں گی ہم ان کی جگہ دوسری کھالیں تبدیل کر دیں گے۔ جسم کے جلے ہوئے عناصر دوبارہ پیدا ہو جائیں گے۔ اس طرح اُن کو بار بار سزا ملتی رہے گی۔ اس لحاظ سے بھی خدا کی پکڑ بڑی سخت ہے۔

دنیا میں جو سزا ملتی ہے۔ اس کا اثر بعض اوقات جسموں تک محدود ہوتا ہے۔ انسانی ذہن اس سے متاثر نہیں ہوتے، جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ "غبار خاطر"[1] میں لکھتے ہیں۔ کہ جب کبھی مجھے سزا کے طور پر تنہائی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کا اثر میرے ذہن تک نہیں پہنچتا۔ بلکہ میرا دل و دماغ ہمیشہ تر و تازہ رہتا ہے۔ میں دماغی طور پر خوب ورک (کام) کرتا ہوں مطالعہ کرتا ہوں، کتاب لکھتا ہوں، اپنے دماغ کو مصروف رکھتا ہوں۔ اس طرح جسمانی سزا کا اثر میرے ذہن پر نہیں ہوتا۔ مگر آخرت کی سزا کا معاملہ مختلف ہو گا۔ وہاں پر جسم کے ساتھ دماغ کو بھی قید کر دیا جائے گا۔ سزا کا اثر اس پر بھی برابر ہو گا۔ کوئی شخص چاہے کہ دماغ کو کسی دوسری طرف لگا دے، اللہ کی سزا میں ایسا ممکن نہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ

اور اس رب تعالیٰ کی صفت یہ ہے اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ یعنی وہ وہی ذات ہے جس نے تمہیں ابتدا میں پیدا کیا۔ اس بات کو تم بھی تسلیم کرتے ہو۔ لہذا وہ دوبارہ لوٹا کر مجرموں کو سزا بھی ضرور دے گا۔ اور یہ بھی کہ اس کی گرفت بھی بڑی سخت ہے، جب وہ مجرم کو پکڑتا ہے تو سزا دیے بغیر نہیں چھوڑتا اس کی سزا سے کوئی بچ بھی نہیں سکتا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ وہ غفور ہے کہ جرم کے ارتکاب کے بعد اگر اس سے معافی مانگ لی جائے۔ تو وہ معاف بھی کر دیتا ہے۔ اور وَدُوْد اس لحاظ سے ہے۔ کہ

---

[1] غبار خاطر صفحہ ۹۰

وہ اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے نفرت نہیں کرتا۔ اس کو اپنے بندوں کے ساتھ ماں سے زیادہ محبت ہے، مگر یہ انسان ہیں جو اپنی صلاحیت کو ضائع کر کے، مجرم، باغی اور متکبرین کر اس کے غضب کو دعوت دیتے ہیں۔ ورنہ وہ تو غفور بھی ہے اور ودود بھی ہے۔

اور وہ خدا ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ بڑی بزرگی والا۔ عرش کا مالک ہے۔ جو تمام کائنات پر محیط ہے۔ اور جس پر اس کی تجلی ہر وقت پڑتی رہتی ہے۔ اس سے تمام کائنات رنگین ہوتی ہے اور اس کے اثرات پھیلتے ہیں۔ تم تو دنیا کے ان چھوٹے چھوٹے بے حقیقت تختوں پر بیٹھ کر گھمنڈ کرنے لگتے ہو۔ مگر رب تعالیٰ تو بڑے تخت کا مالک ہے۔ تو کیا تم خیال کرتے ہو کہ خدا کا مقابلہ کر لیں گے یا اس کی گرفت سے بچ جائیں گے، یہ ناممکن ہے۔

اور پھر اُس وحدہٗ لاشریک کے اختیارات اس قدر وسیع ہیں۔ کہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ وہ اپنے ارادے سے جو چاہے کرے، اُس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں۔ فعّال مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یعنی بہت زیادہ کرنے والا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ تمام چیزیں اس کے ارادے میں ہوتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، کمال حکمت کے ساتھ کرتا ہے مگر کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔ اُس کا اعلان ہے "وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ" اس کی بادشاہی میں ظلم کبھی نہیں ہوتا، "وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ" بہرحال وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ اس کی گرفت سے کوئی مجرم بھاگ نہیں سکتا۔

سابقہ متکبرین کا انجام

فرمایا هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ کیا تمہارے پاس ان لشکروں کی بات نہیں آئی جو بڑے عظیم طاقتور اور ساز و سامان سے لیس تھے۔ مثلاً فرعون ہی کو لے لیجئے۔ جب اُس نے موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کیا۔ تو اس کے ساتھ بارہ لاکھ کا مسلح لشکر تھا۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کہ وہ اس طرح ذلت کی موت مریں گے۔ فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ فرعون کے علاوہ قوم ثمود میں بڑے بڑے انجنیئر اور کاریگر تھے۔ تبوک سے لے کر وادی قریٰ تک ان کے سترہ سو بڑے بڑے شہر آباد تھے[1]۔ ان شہروں میں پتھروں کو تراش کر بڑی بڑی عمارتیں بنائی

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صہ ۲۴ پارہ ۳۰

گئی تھیں۔ ان کے کھنڈرات آج بھی لوگ تبوک میں جاکر دیکھتے ہیں۔ ہزاروں سال کے بعد بھی اُن عمارتوں کے نقش و نگار دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ اتنی عالیشان عمارتیں تھیں۔ زندگی کی تمام سہولتیں ان کو حاصل تھیں۔ مگر ان کا کیا حشر ہوا۔ جب زلزلہ آیا تو جیسا کہ سورۃ اعراف میں مذکور ہے۔ "فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ" تو وہ اوندھے مُنہ گھٹنے زمین پر ٹیک کر ذلیل ہو کر ہلاک ہو گئے۔

کفار مکہ کے لیے وعید

فرمایا بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا جو لوگ کفر کرنے والے ہیں اہل مکہ میں سے ابوجہل اور اسکی پارٹی انہیں لوگوں میں شامل تھی۔ ان کے متعلق فرمایا فِیْ تَكْذِیْبٍ وہ تکذیب میں لگے ہوئے ہیں، خدا کی وحدانیت، جزائے عمل اور قیامت کو جھٹلاتے ہیں۔ پہلے کفار کا بھی یہی شیوہ تھا اور آج بھی یہ اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ مگر یاد رکھو وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِیْطٌ اللہ تعالےٰ پیچھے سے گھیرنے والا ہے۔ ہر طرف سے احاطہ کرنے والا ہے۔ یہ بچ کر کہاں جائیں گے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حکمت کے ساتھ مہلت دے رکھی ہے۔ مگر "اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ" اللہ ہر چیز کو گھیرنے والا ہے۔ ہر شخص اللہ کے احاطہ میں پھنسا ہوا ہے کوئی مجرم بھاگ کر نہیں جا سکتا۔

حفاظت قرآن

منجملہ دیگر اشیاء کے کفار قرآن پاک کو بھی جھٹلاتے ہیں۔ بدبخت کہتے ہیں کہ یہ شاعری کہانت یا سحر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ایسا ہرگز نہیں بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ بلکہ یہ تو وہ قانون ہے جو سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ یہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ دوسری جگہ فرمایا کہ قرآن پاک کی حفاظت کا اللہ نے ایسا انتظام فرما دیا کہ اسے لوگوں کے سینوں میں محفوظ کر دیا ہے۔ اسے نہ آگ جلا سکتی ہے اور نہ پانی دھو سکتا ہے[۱]۔ بلکہ "فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ" اسے اللہ تعالیٰ نے سینوں میں محفوظ کر دیا ہے اور اس کی صفت مَّجِیْدٌ ہے بڑی بزرگی والی کتاب ہے۔ اس کے تمام قوانین انسانی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ یہ انسان کی بلندی اور پاکیزگی کا ضامن ہے۔ کیونکہ "فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ" اس کی ہر سورۃ پاکیزہ صحیفہ ہے۔ قرآن پاک ایک سو چودہ[۱۱۴] صحیفوں پر مشتمل ہے۔ اور ہر سورۃ ایک پاکیزہ صحیفہ ہے۔

---

[۱] مسلم صفحہ ۳۸۵ / ۲۶

اس کو لانے والے بزرگ فرشتے ہیں۔ لہذا اس کے حاملین کو بھی ایسا ہی پاکیزہ ہونا چاہیئے،
فرمایا اس قرآن پاک میں کسی قسم کا تغیر و تبدل بھی ممکن نہیں کیونکہ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ یہ لوح
محفوظ میں درج ہے۔ یہ وہیں سے آیا ہے۔ اس کی حفاظت کی گارنٹی بھی اللہ نے دی۔
"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ" ہم نے ہی اس کو اتارا اور ہمیں اس کی
حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اس میں کسی کمی بیشی کا امکان نہیں۔

سُورَةُ الطَّارِقِ

درس سورۃ طارق — (مکمل)

سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۃ طارق مکی ہے اور یہ سترہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ
﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ
خُلِقَ ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ﴿۶﴾ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ
وَالتَّرَآئِبِ ﴿۷﴾ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ﴿۸﴾ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ
﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴿۱۰﴾ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾
وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ
﴿۱۴﴾ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ
الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾ ع ۱۷ / ۱

ترجمہ:۔ قسم ہے آسمان کی اور رات کو (اندھیرے میں) آنے والے کی ﴿۱﴾ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ طارق کیا ہے ﴿۲﴾ وہ چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ ﴿۳﴾ کوئی نفس ایسا نہیں مگر اس پر محافظ (فرشتہ) مقرر ہے ﴿۴﴾ پس انسان کو غور کرنا چاہیئے کہ اس کی تخلیق کس چیز سے ہوئی ہے ﴿۵﴾ انسان اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے ﴿۶﴾ جو پشت اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے ﴿۷﴾ بے شک وہ (اللہ تعالیٰ) اس کے دوبارہ لوٹانے پر قادر ہے ﴿۸﴾ جس دن تمام راز ظاہر کر دیئے جائیں گے ﴿۹﴾ پس نہ ہو گی اس (انسان) کے لیے کوئی طاقت اور نہ اس کا کوئی مددگار ﴿۱۰﴾ اور قسم ہے (بارش کے ساتھ) بار بار گردش کرنے والے آسمان کی ﴿۱۱﴾ اور قسم ہے (بار بار) پھٹنے والی زمین

کی ⑫ بے شک یہ قرآن پاک فیصلہ کن بات ہے ⑬ اور یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے ⑭ بے شک وہ (کافر لوگ قرآن کے خلاف) طرح طرح تدبیر کر رہے ہیں ⑮ اور میں بھی طرح طرح سے تدبیر کرتا ہوں ⑯ پس آپ کافروں کو ڈھیل دے دیں اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دیں ⑰

نام اور کوائف — اس سورۃ کا نام سورۃ الطارق ہے۔ اس کی پہلی آیت میں طارق کا لفظ مذکور ہے جس سے سورۃ کا نام اخذ کیا گیا ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی سترہ ۱۷ آیتیں، اکسٹھ ۶۱ الفاظ اور دو سو انتالیس ۲۳۹ حروف ہیں۔

موضوع — پچھلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی میں پائی جانے والی بد امنی کے پیش نظر قیامت اور جزائے عمل کا مسئلہ سمجھایا تھا۔ اس سورۃ میں انسان کے جسم اور روح کے تعلق کی روشنی میں یہی مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔ ان منکرین کا رد ہے جو وقوع قیامت اور بعث بعد الموت کو تسلیم نہیں کرتے۔

طارق کیا ہے — ارشاد ہوتا ہے وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ قسم ہے آسمان کی اور رات کو اندھیرے میں آنے والے کی۔ پھر خود ہی اس کی تفصیل بیان فرمائی وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ اور آپ کو کیا علم کہ طارق کیا ہے۔ اس کا جواب بھی خود ہی ارشاد فرمایا اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ وہ چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ جو رات کے اندھیرے میں طلوع ہوتا ہے۔ گویا طارق سے مراد وہ ستارہ ہے جو رات کے وقت طلوع ہوتا ہے۔ اور اس کی روشنی بھی نظر آتی ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے آسمان اور رات کو آنے والے ستارے کی قسم اٹھا کر یہ بات سمجھائی ہے کہ انسان کے تمام اعمال محفوظ ہیں اور قیامت کا ایک دن آنے والا ہے جب ہر عمل کی جزا مل کر رہیگی۔

دیگر معانی — عربی زبان میں طارق رات کے اندھیرے میں آنے والے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ بعض اوقات مہمان پر بھی بولا جاتا ہے۔ عرب شاعر (سموأل بن عادیا) کے کلام میں ملتا ہے[۱]

وَمَآ اُخْمِدَتْ نَارٌ لَّنَا دُوْنَ طَارِقٍ   وَلَا ذَمَّنَا فِي النَّازِلِيْنَ نَزِيْلٌ

---

[۱] دیوان حماسہ صد ۱۴ مطبع قاسمی دیوبند۔

رات کو آنے والے مہمان کے ورے ہمارے چولہے کی آگ کبھی نہیں بجھی۔ بلکہ ہمیشہ جلتی رہتی ہے تاکہ مہمان جس وقت بھی آئے۔ اُس کی مہمانی کا سامان تیار ہو سکے۔ اور مہمانوں نے کبھی ہماری مذمت بھی نہیں کی۔ کہ ہماری خاطر تواضع میں کمی رہ گئی ہے۔ تو گویا طارق کا لفظ مہمان پر بھی بولا جاتا ہے۔

خواب و خیال بھی عام طور پہ رات کے وقت آتا ہے۔ لہٰذا بعض اوقات طارق کا اطلاق خواب و خیال پر بھی ہوتا ہے۔ اکثر شعراء اپنے محبوب کا تصور طارق سے یعنی رات کو آنے والے خیال سے باندھتے ہیں۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے طارق کی تفسیر خود بیان فرمادی کہ اس سے مراد وہ ستارہ ہے۔ جو رات کے اندھیرے میں طلوع ہوتا ہے۔

مَا اَدْرٰىكَ اور مَا يُدْرِيْكَ میں فرق

امام سفیان ثوریؒ، امام سفیان بن عینیہؒ، امام شعبیؒ اور امام شعبہؒ وغیرہ محدثین اور فقہاء میں سے ہیں۔

چنانچہ ابن عینیہؒ فرماتے ہیں[1] کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں جہاں مَا اَدْرٰىكَ کا لفظ لائے ہیں، اُس کا مطلب بھی خود ہی بتا دیا ہے۔ جیسے اس مقام پر خود واضح کر دیا کہ طارق سے مراد رات کو آنے والا ستارہ ہے البتہ جہاں مَا يُدْرِيْكَ کا لفظ آیا ہے۔ اُس کی تفصیل ظاہر نہیں کی۔ مثلاً "وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ" اور آپ کو کیا پتہ شاید کہ قیامت قریب ہے۔

رات کو آنے والے ستارے سے کونسا ستارہ مراد ہے۔ اس میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ اس سے سورج مراد ہے۔ کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے۔ تو روشنی آجاتی ہے اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔ بعض دوسرے مفسرینؒ[2] کہتے ہیں۔ کہ سورج نہیں بلکہ زحل یا کوئی اور ستارہ مراد ہے، جو رات کو نظر آتا ہے۔ رات کے وقت اُس کی روشنی بھی ہوتی ہے مگر طلوع آفتاب کے ساتھ ستارے کی روشنی ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ستاروں کی روشنی ختم نہیں ہوتی وہ تو اپنی جگہ قائم ہوتی ہے مگر سورج کی تیز روشنی کے سامنے وہ نظر نہیں آتی کسی بھی ستارے کی روشنی زائل نہیں ہوتی بلکہ محفوظ رہتی ہے۔ اور جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ تو پھر نظر آنے لگتی ہے۔

اعمال محفوظ رہتے ہیں

انسان دو چیزوں کا مرکب ہے یعنی جسم اور روح۔ جسم کا تعلق اس مادی زمین سے

---

[1] تفسیر کبیر صفحہ ۱۲۷ ج ۳۱ [2] روح المعانی صفحہ ۹۵ ج ۳۰ معالم التنزیل صفحہ ۲۲۵ ج ۴ مظہری صفحہ ۲۴۰ ج ۱۰

ہے۔ کہ جسم کا مادہ ارضی ہے۔ حتیٰ کہ نسمہ جو انسان کے ساتھ ابتداء سے ہوتا ہے۔ اس کا مادہ اور خوراک بھی اسی زمین سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسری چیز روح کا تعلق عالم بالا سے ہے۔ اسے روح الٰہی۔ روح سماوی اور قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّی[۱] بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عالم امر سے آتی ہے۔ حدیث شریف[۱] میں آتا ہے کہ تخلیق انسانی کے چوتھے چلے میں روح الٰہی انسانی جسم میں نسمے سے آکر مل جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے انسان میں عقل و شعور اور دیگر قوی پیدا ہوتے ہیں۔ روح ایک لطیف شے ہے، جس کی بدولت انسان میں کمال پیدا ہوتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور بعض دیگر بزرگ[۲] فرماتے ہیں کہ روح کے انیس[۱۹] مرکز ہوتے ہیں اور ہر مرکز دوسرے سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ یہ آپس میں مربوط ہوتے ہیں۔ ایک حجر البحت ہوتا ہے جس میں تجلی الٰہی کا نمونہ ہوتا ہے۔ تجلی اعظم کی کشش عالم بالا کی طرف ہوتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب روح جسم سے الگ ہوتی ہے۔ تو اس کی قوتیں اور اعمال ختم نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ محفوظ رہتے ہیں جس طرح ستارے کے غروب ہو جانے کے باوجود اس کی روشنی زائل نہیں ہوتی، بلکہ محفوظ رہتی ہے۔ اسی طرح جسم و روح کی علیحدگی کے باوجود انسان کے اعمال محفوظ رہتے ہیں۔ اور قیامت کے روز انہیں ظاہر کر دیا جائے گا۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے اس ستارے کو سامنے رکھ کر انسانی جسم و روح کے تعلق کو واضح کیا ہے۔ اور قیامت کے وقوع اور جزائے عمل کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔

حفاظت اعمال کے لیے طریق کار کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی اِنْ کُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ یعنی ہر نفس کے ساتھ محافظ قوتیں مقرر ہیں۔ اس مقام پر اِن کا لفظ مَا کے معنوں میں آیا ہے۔ اور اگر یہاں "ما" کا لفظ لگایا جائے تو جملہ یوں بنے گا۔ مَا کُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ بہرحال مطلب یہی ہے۔ کہ ہر نفس کے ساتھ محافظ طاقتیں موجود ہیں۔ جو اس کی حفاظت یا نگرانی کر رہی ہیں۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ موجود ہے۔ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ" فرمایا آگے پیچھے آنے والے ملائکہ اللہ کے حکم

---

[۱] بخاری ص $\frac{976}{ج2}$، مسلم ص $\frac{332}{ج2}$

[۲] الطاف القدس ص ۔ و تفہمات الٰہیہ ص $\frac{244}{ج1}$، حجۃ اللہ ص $\frac{11}{ج2}$، تفسیر عزیزی ص $\frac{226}{\text{پارہ } 29}$، قرآنی دستور انقلاب مولانا سندھی ص $\frac{145}{ج}$

سے انسانی جسم اور اس کے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں۔ جیسے فرمایا "وَاِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ" تمہارے اوپر بزرگ فرشتے مقرر ہیں۔ جو تمہارے اعمال کی حفاظت کر رہے ہیں۔ انسان کا عقیدہ، عمل، اخلاق نیز تمام باطنی قوتیں اور ان کا ذرہ ذرہ محفوظ ہے، ان چیزوں کو ملائکہ نے اپنے رجسٹروں میں درج کر کے محفوظ کر لیا ہے۔ لوحِ محفوظ میں بھی درج ہیں اور علمِ الٰہی میں بھی محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے اپنے حافظے میں بہت سی چیزیں محفوظ رہتی ہیں۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعمال کی حفاظت کا مکمل بندوبست کر رکھا ہے۔ کوئی نفس ایسا نہیں جس پر نگران مقرر نہ ہو۔

بعض[۱] روایات میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ایک سو بیس[۲] فرشتے رکھے ہیں، جو اس کی حفاظت اور نگرانی کرتے ہیں۔ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ان کے علاوہ ہیں یہ بھی انسان کے اعمال کی حفاظت پر مامور ہیں لہٰذا انسان کی کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ بلکہ من وعن محفوظ رہتی ہے۔

تخلیق انسانی قیامت پر دلیل ہے

فرمایا کہ انسان قیامت کا انکار کسی صورت میں نہیں کر سکتا۔ اس کی اپنی تخلیق اس بات پر دلیل ہے۔ کہ قیامت ضرور برپا ہو گی۔ فَلۡیَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ انسان کو غور کرنا چاہیے کہ اس کی تخلیق کس چیز سے ہوئی ہے۔ پھر خود ہی فرمایا خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ انسان کو اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ دافق فاعل کا صیغہ ہے۔ اور اس کا معنیٰ ہے ذو دفق یعنی اچھلنے والا۔ اس فاعل کو مفعول کے معنی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مدفوق کا معنیٰ ہو گا۔ وہ پانی جو ڈالا گیا یا بہایا گیا۔ یعنی نوع انسانی کی پیدائش اس قطرۂ آب سے ممکن ہوئی۔ دوسری جگہ مزید وضاحت فرمائی۔ کہ تمہارے جد امجد کو اللہ نے مٹی سے پیدا فرمایا "اَلَمۡ نَخۡلُقۡکُّمۡ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِیۡنٍ" کیا ہم نے تمہیں حقیر قطرۂ آب سے پیدا نہیں کیا؟ جو بذاتہ ناپاک ہوتا ہے پھر اس سے ایسی زندہ اور شاندار ہستی کو پیدا کیا ہے۔

قطرۂ آب کی مزید تشریح فرمائی۔ یَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَیۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآئِبِ[۳]

ا

جو پشت اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ بعض[1] کہتے ہیں۔ یہاں باپ کی پشت اور ماں کے سینے کی ہڈیاں مراد ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ انسان کا اعصابی نظام پشت اور سینے کے درمیان ہے۔ صلب، اعصاب، حرام مغز۔ دماغ سب کا تعلق پشت اور سینے کے درمیانی حصے سے ہے۔ اطباء کہتے ہیں۔ کہ انسانی غذا ہضم ہو کر جب چوتھے درجے میں پہنچتی ہے۔ تو مادہ تخلیق پیدا ہوتا ہے۔ وہاں سے نکل کر رحم میں جاتا ہے۔ اُدھر عورت کے جسم میں بھی اللہ نے ایسے مواد پیدا کیے ہیں۔ جو مرد کے مادہ سے مل کر انسان کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک حقیر قطرۂ آب سے انسان کو پیدا کر دیا ہے۔ اسی طرح اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ وہ اس کے دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ پھر عجیب بات ہے کہ انسان اپنی پیدائش کو تو تسلیم کرتا ہے۔ کہ اس کی تخلیق کس طرح ہوئی، مگر دوبارہ پیدا ہونے کا قائل نہیں ہوتا۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو خداوند کریم انسان کو پہلی مرتبہ پیدا کرنے پر قادر ہے وہی اس کو جب چاہے گا۔ دوبارہ کھڑا کر دے گا۔ مگر یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ اُس دن تمام راز کھول دیے جائیں گے۔

اعمال تبدیل نہیں کیے جا سکیں گے

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔ کہ راز کھول دیے جانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ تبدیل نہیں ہو سکیں گے۔ پھر بعض راز انسان کے لیے زینت کا باعث بنیں گے اُسے خوشی ہو گی۔ اور بعض راز ایسے ہوں گے کہ ان کا اظہار انسان کے لیے باعث شرم و ندامت ہو گا۔ بڑی رسوائی ہو گی۔ مگر انسان خواہش کے باوجود انہیں تبدیل کرنے پر قادر نہیں ہو گا۔ دنیا میں بعض اوقات چیزیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ تحریریں اور تقریریں تبدیل کر لی جاتی ہیں۔ مگر وہاں پر انسان کے بس میں نہیں ہو گا۔ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ نہ انسان خود ایسی کسی طاقت کا مالک ہو گا۔ اور نہ ہی اس سلسلے میں اس کا کوئی مددگار ہو گا۔ کہ اس کو چھڑا سکے۔ یا کسی راز کو تبدیل کر سکے۔ جو کچھ انسان اس دنیا میں عمل کر رہا ہے۔ اس کا ذرہ ذرہ محفوظ ہے۔ اور انسان اس کی جزا سے ضرور دوچار ہو گا۔

---

[1] تفسیر کبیر ص ۱۳۲ ج ۳۱، معالم التنزیل ص ۲۲۷ ج ۴، مظہری ص ۲۴۱ ج ۱۰

ہدایت کے لیے انسانی استعداد

فرمایا وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ قسم ہے بار بار رجوع کرنے والے آسمان کی جیسا آسمان سے بار بار بارش برستی ہے۔ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اور قسم ہے بار بار پھٹنے والی زمین کی۔ گویا آسمان اور زمین کی شہادت پیش کی جا رہی ہے۔ کہ تمہارے مشاہدے کی بات ہے۔ کہ آسمان سے بار بار مینہ برستا ہے۔ اور پھر زمین بار بار پھٹتی ہے۔ تاکہ اس میں سے اناج، سبزیاں اور پھل وغیرہ پیدا ہوں۔ تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کی آبادی کا یہ سامان پیدا کر رکھا ہے۔ اسی طرح وہ وحی الٰہی بھی اوپر سے نازل فرماتا ہے۔ آسمان سے کتاب الٰہی زمین پر نازل ہوتی ہے اور انسان اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ جس طرح بعض اچھی قسم کی زمین بارش سے سیراب ہو کر زیادہ پیداوار دیتی ہے۔ اسی طرح بعض انسانوں کے قلوب کی استعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اور وہ وحی الٰہی سے زیادہ ہدایت حاصل کر لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے زمین کے بعض حصے بنجر ہوتے ہیں۔ اُن پر بارش کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ کوئی پیداوار نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا "وہاں سوائے گھاس پھوس کے کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض قلوب انسانی استعداد سے خالی ہوتے ہیں۔ اور وہ وحیِ الٰہی سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

قرآن قول فیصل ہے

زمین و آسمان اور اس کی مذکورہ کیفیات کو گواہ بنا کر فرمایا اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ یہ قرآن پاک فیصلہ کن بات ہے۔ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ اور یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے۔ یہ حقیقت کو بیان کر رہا ہے۔ کہ بعث بعد الموت قطعی طور پر واقع ہوگی۔ اس میں شک و شبہ والی کوئی بات نہیں۔ مگر یہ لوگ قرآن پاک کی تعلیمات کو غلط ثابت کرنے کے لیے اِنَّهُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا بڑے بڑے داؤپیچ آزما رہے ہیں۔ کہ کسی طرح قرآن پاک کے پروگرام کو مٹا دیں مگر وَّاَکِیْدُ کَیْدًا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں بھی تدبیر کرتا ہوں۔ قرآن پاک میرا نازل کردہ ہے۔ اس کی اشاعت کا ذمہ دار میں ہوں۔ اس کے خلاف تمام شکوک و شبہات کو دور کرتا ہوں۔ اور اس طرح انسانوں پر حجت تمام کرتا ہوں۔ تاکہ کل کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ" ہمارے پاس کوئی سمجھانے سمجھانے والا نہیں آیا۔ بلکہ" قَدْ جَآءَكُمْ بَشِیْرٌ وَّنَذِیْرٌ" تمہارے پاس خوشخبری دینے اور ڈرانے والے آچکے ہیں۔ حجت تمام

ہو چکی ہے۔ نوعِ انسانی کی ہدایت کا سامان مکمل کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اے نبی کریم فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ آپ کافروں کو ذرا ڈھیل دے دیں۔ ان سے زیادہ تعرض نہ کریں۔ بلکہ ٹھیک طرح سے بات سمجھا دیں۔ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا انہیں تھوڑی سی مہلت دے دیں۔ تھوڑا وقت گذر نے دیں انہیں عنقریب پتہ چل جائے گا۔ کہ تدبیر کس کی کارگر ہوئی۔ اور یہ کہ قرآن کا بتایا ہوا سارا پروگرام درست ہے اور جزائے عمل قطعی اور یقینی ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سورة الأعلى

الاعلیٰ ۸۷ | عمّ ۳۰

(آیت ۱ تا ۱۳) | درس اوّل

سُوْرَةُ الْاَعْلٰى مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۃ اعلیٰ مکّی ہے اور یہ انیس ۱۹ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ① الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ② وَالَّذِيْ قَدَّرَ
فَهَدٰى ③ وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ④ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ⑤
سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ⑥ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى
⑦ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ⑧ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ⑨ سَيَذَّكَّرُ
مَنْ يَّخْشٰى ⑩ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ⑪ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ⑫
ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ⑬

ترجمہ:۔ اپنے رب کے نام کی تسبیح بیان کریں جو بہت بلند ہے (۱) وہ اللہ تعالیٰ جس نے
(ہر چیز کو) پیدا کیا پھر اس کو (کمال) اعتدال کے ساتھ برابر کیا (۲) اور وہ ذات جس نے (ہر چیز کا)
اندازہ ٹھہرایا پھر راہنمائی فرمائی (۳) اور وہ اللہ جس نے (زمین سے)
چارہ نکالا (۴) پھر کر دیا اس کو خشک سیاہی مائل (۵) عنقریب ہم آپ کو (اس طور پر) پڑھا دیں
گے پھر آپ بھولیں گے نہیں (۶) سوائے اس چیز کے کہ اللہ تعالیٰ خود اسے (بھلا دینا) چاہے بیشک
وہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ظاہر اور مخفی چیز کو (۷) اور ہم تدریج آپ کو آسانی تک پہنچا دینگے (۸)
آپ نصیحت کریں اگر نصیحت فائدہ کرے (۹) وہی شخص جلدی نصیحت قبول کرتا ہے جو ڈرتا ہے (۱۰)
اور اس نصیحت سے کنارہ کش رہے گا وہ جو بڑا بدبخت ہے (۱۱) وہ بدبخت جو بڑی آگ
میں داخل ہوگا (۱۲) پھر وہ نہ مرے گا اس (آتش دوزخ) میں اور نہ ہی وہ زندہ رہے
گا۔ (۱۳)

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ الاعلیٰ ہے۔ اس کی پہلی آیت میں لفظ اعلیٰ مذکور ہے۔ اور اسی سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی انیس ۱۹ آیتیں ہیں۔ یہ سورۃ بہتر الفاظ اور دو سو چوراسی ۲۸۴ حروف پر مشتمل ہے۔

فضیلت

مسند احمد[1] کی روایت میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ نبی علیہ السلام اس سورۃ مبارکہ کو بہت محبوب جانتے تھے۔ صحیح روایتوں[2] میں آتا ہے۔ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سورۃ اور اس کے بعد والی سورۃ غاشیہ الجمعہ اور عیدین کی نمازمیں بکثرت تلاوت فرماتے تھے۔

حضرت براءؓ بن عازبؓ باپ بیٹا دونوں صحابی ہیں حضرت براءؓ فرماتے ہیں[3]۔ حضور علیہ السلام کی ہجرت سے پہلے حضرت مصعبؓ بن عمیر مدینہ میں آئے۔ آپ نے حضرت مصعبؓ کو مدینہ کے لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے بھیجا تھا۔ ان کے بعد حضرت عمارؓ، حضرت بلالؓ، عبداللہؓ ابن ام مکتوم۔ حضرت سعدؓ اور حضرت عمرؓ بھی حضور علیہ السلام کی ہجرت سے پہلے ہی ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آگئے۔ حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ جس دن حضور انور علیہ السلام مدینہ پاک میں تشریف لائے۔ اس دن اتنی خوشی ہوئی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ نیز یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی آمد سے پہلے میں نے سورۃ اعلیٰ اور ایسی ہی کئی سورتیں سیکھ لی تھیں۔ ان میں سے بعض سورتیں حضرت مصعبؓ سے اور بعض حضرت عبداللہؓ ابن ام مکتوم سے سیکھی تھیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[4] کہ بہت سے سلف صالحین اور بزرگان دین یہ سورۃ تہجد کی نماز میں پڑھتے ہیں۔ اور اس کے فیوض و برکات کے امیدوار ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ بڑی فضیلت والی اور بابرکت سورۃ ہے حضور علیہ السلام کثرت سے اس کو تلاوت فرماتے تھے اور اسے محبوب سمجھتے تھے۔

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط

پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر انسان کے نفس پر اللہ نے محافظ مقرر کر رکھے ہیں اور اس کے اعمال کی حفاظت ہو رہی ہے۔ لہٰذا ایک دن آئے گا، جب راز کھلیں گے

---

[1] مسند احمد صفحہ ۹۶ جلد ۱   [2] مسلم صفحہ ۲۸۸ جلد ۱، ترمذی صفحہ ۱۰۱

[3] بخاری صفحہ ۷۳۶ جلد ۲   [4] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۷۵ پارہ ۳۰

جب ایسا ہو گا۔ تو معاملہ بڑا خراب ہو گا۔ اُس دن انسان ندامت اور شرمندگی سے بچنا چاہیں گے اس کا طریقہ بھی اللہ نے اس سورۃ میں بتا دیا اور وہ یہ ہے جیساکہ آخری آیات میں آتا ہے۔ تزہید فی الدنیا اور ترغیب فی الآخرت یعنی دنیا کی طرف سے بے رغبتی اور آخرت کے معاملات کی طرف زیادہ توجہ ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا ہو گیا تو راز کھلنے کے دن انسان شرمندگی سے بچ جائے گا۔ ورنہ وہاں پہ بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اور رازوں کو کوئی تبدیل بھی نہیں کر سکتا۔ جس طرح دنیا میں مثلیں تبدیل کر دی جاتی ہیں۔ اس طرح آخرت میں یہ ممکن نہ ہو گا۔ ہر انسان کے اعمال محفوظ ہیں۔ وہ پیش ہوں گے۔ اور اُن کے مطابق جزائے عمل واقع ہو گی۔

تسبیح کا مفہوم

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَی اپنے رب کے نام کی تسبیح بیان کریں۔ جو سب سے بلند ہے۔ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اور تسبیح کا معنیٰ تنزیہہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو تمام ایسی چیزوں سے پاک سمجھا جائے جو اُس کی شان کے لائق نہیں۔ مثلاً عیب و نقص کی ہر چیز سے اللہ پاک ہے۔ اسی طرح تحمید کا معنیٰ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو کمال کی تمام صفات کے ساتھ موصوف سمجھے۔ اُس میں تمام صفات کمال پائی جائیں، مگر نقص و عیب قطعی نہ ہو، نہ خدا کی ذات میں کوئی شریک ہے اور نہ اُس کی صفات میں۔ نہ اُس کی عبادت میں کوئی شریک کیا جا سکتا ہے۔ اُس کے بیوی بچے بھی نہیں ہیں۔ یہ تو اس کی شان کے لائق نہیں۔ "فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ" خدا تعالیٰ کی ذات اُن تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے جن کو لوگ اپنی حماقت کی وجہ سے خدا کے ساتھ شریک بناتے ہیں۔ گویا تسبیح کا معنیٰ تنزیہہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان تمام چیزوں سے پاک سمجھنا، جو اس کی ذات کے لائق نہیں ہیں۔ اس کی ذات تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے پاک

بعض حضرات اسم کا معنیٰ ذات کرتے ہیں۔ کیونکہ اسم ذات کا عنوان ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے نام مذکور ہیں۔ صحیح حدیث[2] میں ننانوے اسمائے پاک کا ذکر ہے۔ اِنَّ لِلّٰہِ تَعَالٰی تِسْعَةً وَّ

---

[1] ... [2] مسلم ص ۳۴۲ ج ۲، بخاری ص ۹۴۹ ج ۲

تِسْعَۃً وَّ تِسْعِیْنَ اِسْمًا مِائَۃً اِلَّا وَاحِدًا مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں جس شخص نے ان کو یاد کیا، اور ان کا ورد کرتا رہا۔ ان پر ایمان رکھا، وہ بہشت میں داخل ہوگا۔ قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی دوسری جگہ فرمایا "وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی" اللہ تعالیٰ کے سارے نام ہی بھلے ہیں، ان میں سے جس نام کے ساتھ چاہو، اسے یاد کرو۔ اللہ، رحمان، رحیم، ستار، غفار وغیرہ وغیرہ سب اللہ کے نام ہیں۔

مفسرین کرام[1] فرماتے ہیں، نام سے مراد ذات ہے۔ جس طرح خدا کی ذات پاک ہے۔ اسی طرح اس کی صفات بھی پاک ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں[2]۔ اسم کو ظاہر پر ہی رکھو۔ اور اللہ کے نام کی تسبیح بھی کرو۔ اور وہ اس طرح کہ خدا کا جو بھی اسم ہے اس کا غلط مطلب نہ لو جیسا کہ قرآن پاک میں موجود ہے کہ جو لوگ اسمائے پاک میں الحاد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جانتا ہے اگر کسی نے معنیٰ غلط بیان کیا تو یہ تنزیہ کے خلاف ہوگا۔ اسم پاک کا وہی مطلب لینا چاہیئے جو اللہ کی مراد ہے۔ اگر مطلب غلط لیا تو الحاد ہو جائے گا۔ اور الحاد جس طرح ذات میں بُرا ہے اسی طرح اسم پاک میں بھی بُرا ہے۔ مقصد یہ کہ نام تو اللہ کا ذکر کیا، صفت تو اللہ کی کی مگر مطلب غلط لے لیا تو یہی الحاد ہے اور تنزیہ کے خلاف ہے۔

انسان کو اللہ کے نام سے بلانا گناہ ہے

بعض لوگ اللہ تعالےٰ کے اسم پاک کو غیر اللہ پر بولتے ہیں یہ درست نہیں۔ اس لیے فقہاء کرام[3] اور مفسرین کرام[4] فرماتے ہیں کہ اللہ کا نام لے کر کسی غیر کو بلانا الحاد میں داخل ہے اور گناہ ہے۔ مثلاً عبدالغنی کو صرف غنی کہہ دینا یا عبدالمجید کی بجائے مجید صاحب کہہ دینا درست نہیں ہے۔ غنی اور مجید تو اللہ تعالیٰ کے نام ہیں کسی انسان کو بلانا ہے تو پورا نام یعنی عبدالغنی یا عبدالمجید کہنا چاہیئے۔ نام کو مخفف کر کے بولنا انگریز کا طریقہ ہے۔ ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا۔ یہ بات سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی کے خلاف ہے اور مکروہ تحریمی کے درجے میں آتی ہے لہذا

---

[1] تفسیر کبیر صفحہ ۱۳۷/۳۱۶، روح المعانی صفحہ ۱۰۳/۳۰، تفسیر عزیزی صفحہ ۱۷۶/پارہ ۳۰ [2] تفسیر عزیزی صفحہ ۱۷۶/پارہ ۳۰

[3] فتاویٰ شامی صفحہ ۳۶۸/۵ [4] معارف القرآن صفحہ ۱۳۲/۴۲

اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ

الغرض یہاں یہ حکم ہوا ہے کہ اپنے رب کی تسبیح بیان کریں، وہ رب جو کہ اعلیٰ ہے۔ اعلیٰ خدا تعالیٰ کی صفت ہے۔ کہتے ہیں کہ اعلیٰ سے ذات مع جمیع الصفات مراد ہوتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو اپنی تمام تر صفات کمال کے ساتھ پکارنا مقصود ہو۔ تو صفت اعلیٰ کے ساتھ یاد کرنا کافی ہے۔

ان صفات میں سے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے صفت خلق کو بیان فرمایا ہے۔ الَّذِیْ خَلَقَ یعنی وہ خدا تعالیٰ جس کا ایک کمال، کمالِ تخلیق ہے۔ ہر چیز اسی کی پیدا کردہ ہے۔ کیونکہ "هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ" دنیا کی ہر چیز مخلوق ہے۔ اور خالق صرف وہی ہے "اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" نیز یہ بھی ارشاد ہے کہ پیدا کرنا صرف اسی کا کام ہے "اَلَا لَهُ الْخَلْقُ" توحید کا یہ درجہ ایسا ہے جس میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں۔ ہنود، یہود، مشرک وغیرہ سب اس بات کے قائل ہیں۔ کہ خالق خدا کے سوا اور کوئی نہیں۔

اس مقام پر دوسری صفت کمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ فَسَوّٰی اس کے تمام قویٰ ظاہرہ اور باطنہ کو کمال اعتدال کے ساتھ قائم کیا ہے۔ کہ اس کی کمال درجے کی صنعت اور کاریگری کی دلیل ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء اس کمال درجے پہ پیدا فرمائی ہیں۔ کہ اس سے بہتر ممکن ہی نہیں۔ نہ صرف انسان بلکہ ہر ہر چیز اللہ تعالیٰ کی کمال صنعت کا شاہکار ہے۔ انسان کی بہترین شکل وصورت، درخت کے پتے، پھل اور پھول ہر چیز اس کی صنعت تسویہ کا ثبوت ہے۔ فرمایا "هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ" اللہ کی ذات تو وہ ہے جو شکم مادر میں تمہاری بہترین شکل وصورت پیدا کرتا ہے۔ پھر اس کے تمام اعضاء کو ٹھیک ٹھاک بناتا ہے۔ یہ اس کی صفت تسویہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے پہلے وَالَّذِیْ قَدَّرَ اس نے اندازہ ٹھہرایا قبل از پیدائش اس کے لیے تمام چیزیں مقرر کر دیں کیونکہ ہر چیز اس کے علم ازلی میں موجود ہے۔

لے

اور پھر پیدا کرنے کے بعد یونہی نہیں چھوڑ دیا۔ کہ انسان کا جدھر دل چاہے چلا جائے۔ بلکہ فَهَدٰی ہی اُسے ہدایت بھی دی۔ اس کی سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کی۔ اور بتا دیا کہ اس تک پہنچنے کا یہ صحیح راستہ ہے۔ اس پہ چلو گے تو درجہ کمال تک پہنچ جاؤ گے۔ اگر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرو گے۔ تو گمراہی کے گڑھے میں جا گرو گے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پہ اپنے نام کی تسبیح بیان کرنے کا حکم دیا۔ اور اس کے ساتھ اپنی بعض صفات کاملہ کا ذکر کیا۔ کہ اسی ذات نے انسان کو پیدا کیا۔ پھر برابر کیا۔ تمام قویٰ ظاہرہ و باطنہ کو کمال اعتدال کے ساتھ رکھا۔ اپنے علم ازلی کے ذریعے اس کی تقدیر مقرر کی۔ اور پھر اس کی ہدایت کے لیے اسے راہ بھی دکھائی۔

انسان کے حواس ظاہرہ اور باطنہ

انسان کے حواس ظاہرہ اور باطنہ وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعے انسان علم حاصل کرتا ہے بعض ذرائع ایسے ہیں۔ جو انسان کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو انسان کو باہر سے حاصل ہوتے ہیں۔ اندرونی ذرائع حواس خمسہ یعنی سننے، دیکھنے، سونگنے، چکھنے اور ٹٹولنے جیسے ذرائع ہیں جن کے ساتھ انسان علم حاصل کرتا ہے۔ انسان کے اندر حس مشترک بھی ہے۔ اسی طرح خیال اور عقل وغیرہ ہیں۔ جن کے ذریعے انسان راہنمائی حاصل کرتا ہے۔

حصول علم کے خارجی ذرائع میں وحی اور الہام ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی معرفت اپنی وحی لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ جو اُن کی راہنمائی کرتی ہے۔

جانور انسانوں کی خدمت پہ مامور ہیں

صفت تخلیق کا پہلا درجہ انسان کا ہے۔ کہ یہ اشرف المخلوقات ہے۔ پھر دوسرا درجہ حیوانات کا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی خدمت کے لیے اور نوع انسانی کی مصلحت کو پورا کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ جیسا فرمایا "مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ" یہ چیزیں تمہارے اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لیے ہیں اور جانور تمہاری خدمت کے لیے پیدا کیے ہیں سورۃ نحل میں موجود ہے۔ کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو پیدا کر کے کس طرح تمہارے ماتحت کر دیا۔ یہ تمہارے بس میں نہ تھا۔ مگر اللہ نے انہیں تمہارے لیے مسخر کر دیا اسی لیے فرمایا[1] کہ

---

[1] ترمذی ص ۴۹۷، ابوداؤد ص ۳۵ / ۱۶، مسند احمد ص ۹۷ / ۱۶

گھوڑے یا اونٹ یا خچر وغیرہ کی پیٹھ پر بیٹھ کر یوں کہو "سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ" خدا کی ذات پاک ہے۔ جس نے ان کو ہمارے تابع کر دیا۔ ورنہ ایسے جانوروں کو کون مطیع کر سکتا ہے۔ کوئی بھی حیوان گھوڑا، ہاتھی اونٹ وغیرہ بگڑ جائے تو جان کی فکر پڑ جاتی ہے۔ مگر یہ وہی ذات ہے۔ جس نے اُسے اپنے سے کمزور تر ہستی کے تابع کر دیا۔

فرمایا وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی خدا کی ذات وہ ہے۔ جس نے زمین سے چارا نکالا جہاں پر جانور نظر آئیں سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس خطہ ارضی میں چراگاہ بھی پیدا کی ہے۔ جو ان جانوروں کی خوراک ہے۔ جانور خود تو اپنے لیے چارا پیدا نہیں کر سکتا، یہ تو وہی مالک الملک ہے جس نے ہر ذی روح کی روزی کا ذمہ لے رکھا ہے۔ جانوروں کی خوراک کے لیے چارا بھی زمین سے پیدا فرما دیا ہے۔ اور یہ چارا اسی وقت کارآمد ہے جب تک سرسبز ہے مگر کچھ عرصہ کے بعد یہ خشک ہو جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا فَجَعَلَہٗ غُثَآءً جب پیدا کیا تو یہ چارہ سرسبز وشاداب تھا۔ پھر کچھ وقت کے بعد اُسے خشک بنا دیا۔ اَحْوٰی پھر وہ سیاہی مائل ہو کر کوڑا کرکٹ بن گیا۔ پہلے تازہ تھا اور کارآمد تھا اب سڑ گیا اور کوڑے کا ڈھیر بن گیا۔

ہدایت کے خارجی ذرائع

جس طرح اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی زندگی کے لیے چارہ پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اُس نے انسان کی راہنمائی کے لیے خارجی ذرائع بھی پیدا کیے۔ منجملہ اُن کے وحی کا نزول اور آسمانی کتابیں ہیں۔ جو مختلف ادوار میں انسانوں کی راہنمائی کرتی رہی ہیں۔ اور پھر آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر علیہ السلام پر اپنی آخری کتاب قرآن پاک نازل فرما کر حجت تمام کر دی۔ آخری شریعت نازل فرما کر انسان کے طبعی تقاضوں کی تکمیل کا سامان مہیا کر دیا۔ تاکہ انسان اس سے راہنمائی حاصل کر کے طبعی طور پر ترقی کی منازل طے کر سکے۔ اور درجہ کمال تک پہنچ سکے۔

قرآن پاک کی تعلیم اللہ کے ذمہ ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب قرآن پاک نازل فرما کر حضور علیہ السلام کو تسلی دی کہ اس کتاب کو پڑھنے میں آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں بلکہ سَنُقْرِئُکَ ہم خود آپ کو اس طور پر پڑھا دیں گے فَلَا تَنْسٰٓی کہ آپ بھول لیں گے نہیں۔ آپ کو قرآن پاک کی ایسی تعلیم دیں گے، جو طبعی تقاضوں کو پورا کرے گی۔ اس کے اصول، ضوابط، شریعت، قانون ہر چیز آپ کو ذہن نشین کرا دیں گے۔ ایک دفعہ یاد کرا دینے کے بعد بھولنے کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰہُ سوائے اس چیز کے کہ اللہ تعالیٰ خود اسے بھلا دینا چاہے۔ اللہ تعالیٰ ایک حکم صادر کرتا ہے تو وہ اس کو واپس بھی لے سکتا ہے لہذا اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ کوئی حکم باقی نہ رہے۔ تو وہ خود بھلا دے گا۔ مگر اس کا قانون ہے "مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ" جب ہم کسی چیز کو منسوخ کر دیتے ہیں۔ تو اس سے بہتر چیز لے آتے ہیں۔ لہذا اس قانون کے تحت اگر خود اللہ تعالیٰ کسی چیز کی منسوخی چاہیں گے تو اُسے بھلا دیں گے، ورنہ قرآن پاک کی ہر ہر آیت کا پڑھانا اور یاد رکھوانا ہماری ذمہ داری ہے۔

اللہ عالم الغیب والشہادۃ ہے

فرمایا اِنَّہٗ یَعْلَمُ الْجَھْرَ وَمَا یَخْفٰی اللہ تعالیٰ جانتا ہے پکارنے کو اور مخفی چیز کو یعنی جو کام انسان کھلے طور پر کرتا ہے۔ اللہ اُسے بھی جانتا ہے۔ اور جو کام پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اللہ اُن سے بھی واقف ہے۔ وہ تو انسان کے دل کی نیت کو بھی جانتا ہے۔ ہر شخص کی استعداد اور صلاحیت تک سے واقف ہے۔

ہدایت کا طالب ہدایت پالیتا

اس کے بعد فرمایا وَنُیَسِّرُكَ لِلْیُسْرٰی ہم آسان کر دیں گے آپ کے لیے آسانی۔ یعنی آپ کے مشن کو بتدریج آسان بنا دیں گے۔ پیغمبر کا کام تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف بلانا ہے۔ لوگوں کے ہدایت پانے کے دو طریقے ہیں۔ یا تو وہ پیغمبر علیہ السلام کی تبلیغ کا اثر قبول کرتے ہیں یا خود بخود حق کے متلاشی بن کر ہدایت کو پا لیتے ہیں۔ جو لوگ اچھی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ نبی کی دعوت کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ ہر شخص کو نبی خود خطاب کرے، جو لوگ خود حق کے متلاشی ہوتے ہیں وہ ضرور اسے پا لیتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے "وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا" یعنی جو لوگ ہماری طرف آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم اُن کے لیے ہدایت کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں تک اگر نبی کا خطاب نہ بھی پہنچے تب بھی وہ ہدایت کو تلاش کر لیتے ہیں۔

تبلیغ میں سراسر نفع ہے۔

نبی علیہ السلام کو ارشاد فرمایا کہ آپ تبلیغ کرتے رہیں اور اس بات کی فکر نہ کریں کہ کوئی نصیحت پکڑتا ہے یا نہیں فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰی لفظی معنیٰ ہے آپ نصیحت کریں اگر نصیحت فائدہ کرے۔ عربی زبان والے جانتے ہیں کہ اس جملہ سے مراد یہ ہے

نَفَعَتْ اَوْ لَمْ تَنْفَعْ یعنی نفع دے یا نہ دے۔ آپ اپنا کام کرتے رہیں۔ تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ آپ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا۔ کہ آپ کے مخاطب نے تبلیغ کا فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔ بلکہ آپ سے صرف یہ سوال ہو گا۔ کہ آپ نے نصیحت کی یا نہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رح فرماتے ہیں[1]۔ کہ مبلغ کو یقین رکھنا چاہیئے کہ کوئی مانے یا نہ مانے اُسے تبلیغ حق کا اجر ضرور ملے گا۔ پھر اُن کو بھی یقیناً فائدہ پہنچے گا۔ جو اس دعوت کو قبول کر لیں گے۔ اگر کوئی نصیحت نہ پکڑے تو اُس کی اپنی بدبختی ہے۔ ورنہ مبلغ کو ضرور فائدہ ہو گا۔ اس لیے حضور علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے۔ کہ آپ نصیحت کرتے رہیں۔ کوئی اس سے فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔

خوف خدا کامیابی کا ذریعہ ہے

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى نصیحت وہ شخص پکڑے گا، جو ڈرتا ہے اور ڈرتا وہ ہے جسے خطرے کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ خطرے کے آنے سے پہلے ہی اُس سے بچاؤ کا انتظام کر لیتا ہے۔ ایسے شخص کو ہی عاقبت اندیش کہتے ہیں جو قبل از وقت خطرے کا احساس کرتا ہے نصیحت وہی پکڑے گا جسے ڈر ہے کہ ایک دن راز کھلیں گے جزائے عمل واقع ہو گی اور اس سے کوئی نہیں بچ سکے گا۔

شقی کا انجام

فرمایا وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى اور اس نصیحت سے الگ وہ رہے گا جو بدبخت ہے ناعاقبت اندیش ہے۔ اُس نے بروقت خطرے کا احساس ہی نہیں کیا۔ اور اس سے بچاؤ کی تیاری نہیں کی۔ وہ لذات اور شہوات میں منہمک رہا۔ اور نصیحت کی بات کو ٹھٹا مخول سمجھتا رہا۔ ایسا شخص کمال کی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا۔ برخلاف اس کے اَلَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى یہ بڑی آگ میں پہنچے گا۔ جو دوزخ کی آگ ہے اور دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ سخت ہے۔ اور اس بڑی آگ میں جا کر اُس کی حالت یہ ہو گی۔ کہ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا اُس آگ میں جل کر اُس کی موت بھی واقع نہیں ہو گی۔ تاکہ اُس کا خاتمہ ہو جائے، امام ابن جریر رح فرماتے ہیں[2]۔ دوزخی کی جان گلے تک آئے گی مگر نکلے گی نہیں اس طرح نہ اس کی موت واقع ہو گی۔ وَلَا يَحْيٰى اور نہ ہی وہ زندہ ہو گا۔ حقیقت میں اسے زندگی کا لطف، خوشی اور سرور حاصل نہیں ہو گا۔ اس کو آرام و راحت نہیں ملے گا۔ اس لیے دوزخ کی زندگی اس کے لیے

---

[1] تفسیر عزیزی ص ۱۸۰ (۱۸) پارہ ۳۰ [2] تفسیر طبری ج ۳۰ ص ۱۵۵

زندگی نہیں ہوگی، بلکہ مصائب و آلام کی کٹھن منزل ہوگی۔ ایسی حالت کو لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی کہہ سکتے ہیں جس میں نہ موت آئے کہ ختم ہو کر انسان اس عذاب سے چھوٹ جاتے اور نہ راحت ہو گی جسے زندگی کا نام دیا جا سکے۔ ایسے بدبخت کی یہ حالت ہوگی۔

عمّ ۳۰ — الاعلیٰ ۸۷

درس سوم — (آیت ۱۴ تا ۱۹)

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ⑭ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ⑮ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ
الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ⑯ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ⑰ اِنَّ هٰذَا لَفِى الصُّحُفِ
الْاُوْلٰى ⑱ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ⑲ ع ۱۹/۱۲

ترجمہ:۔ تحقیق کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے تزکیہ حاصل کر لیا ⑭ اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر اس نے نماز بھی پڑھی ⑮ بلکہ تم دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دیتے ہو ⑯ حالانکہ آخرت کی زندگی بہتر اور دیرپا ہے ⑰ بے شک یہ (قرآنی پروگرام) پہلے (آسمانی) صحیفوں میں بھی ہے ⑱ صحیفے ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے ⑲

گذشتہ سے پیوستہ

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کا ذکر ہوا، اور اُس کی صفات کمال کا بیان ہوا۔ اس کے بعد انسان کی طبعی ضرورت ہدایت اور اُس کے حصول کے ذرائع کا تذکرہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے مثال کے ذریعہ سمجھایا، کہ جس طرح جانوروں کے لیے اللہ نے چارے کا بندوبست کیا ہے۔ اُسی طرح نوعِ انسانی کے لیے ہدایت کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ اس کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہم آپ کو کتاب یعنی قرآنِ پاک اس طرح پڑھا دیں گے، کہ آپ بھولیں گے نہیں البتہ جو چیز اللہ تعالیٰ خود بھلا دینا چاہیں گے وہ آپ کی یادداشت سے خارج کر دی جائیگی اور آپ کو حکم ہوا، کہ آپ تبلیغ کا حق ادا کرتے رہیں۔ لوگوں کو نصیحت کرتے رہیں، خواہ یہ نصیحت فوری طور پر کسی کو فائدہ دے یا نہ دے۔ اس نصیحت سے وہی شخص مستفید ہو گا۔ جس کے دل میں خوفِ خدا ہو گا۔ وہ شخص عاقبت اندیش کہلانے کا مستحق ہو گا۔ اور ناعاقبت اندیش اور خوفِ خدا سے خالی انسان جہنم کی بڑی آگ میں داخل ہو گا۔ وہاں نہ تو اسے راحت نصیب ہو گی۔ کہ اُسے زندگی کا نام دے سکیں۔ اور نہ موت ہی اُسے آئے گی۔ جس سے اُس کا خاتمہ ہو کر عذاب سے خلاصی ہو جائے۔

فلاح کے تین اصول

انسان کی فلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے تین واضح اصول تبلائے ہیں۔ یہ ایسے اصول

ہیں جن کی بدولت ہدایت نصیب ہوتی ہے اور جو انسان کی طبعی ضروریات میں سے ہیں۔ فرمایا
قَدْ اَفْلَحَ تحقیق فلاح پا گیا، کامیاب ہو گیا، ہدایت پا گیا وہ شخص مَنْ تَزَکّٰی جس نے تزکیہ
حاصل کر لیا۔ ہدایت یافتگی کا یہ پہلا اصول ہے۔ کہ انسان پاکیزگی حاصل کر لے۔ دوسرا بنیادی اصول
یہ ہے وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ کہ جس نے اپنے رب کا ذکر کیا۔ اس کے نام کو یاد کیا۔ اور کامیابی
کا تیسرا اصول فرمایا فَصَلّٰی اُس نے نماز پڑھی۔ فلاح کے یہ تین اصول بیان فرما دیے اور وہ ہیں۔
تزکیہ، ذکر الٰہی اور نماز۔ جو شخص یہ تین چیزیں حاصل کر لے گا اللہ تعالیٰ نے اُسے کامیابی کی بشارت
دی ہے۔

شریعت کے چار بنیادی اصول

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ چار بنیادی اصول ایسے ہیں جو کسی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئے۔ یہ دائمی اصول۔ پہلی شریعتوں میں بھی موجود تھے اور شریعت محمدیہ میں بھی شامل ہیں۔ منجملہ اُن کے اوّل طہارت یعنی پاکیزگی ہے اور اس میں ظاہری، باطنی ہر قسم کی پاکیزگی شامل ہے۔ دوسرا اصول اخبات ہے، جسے خشوع یا اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار عاجزی کہتے ہیں۔ تیسرا اصول سماحت یعنی خود غرضی اور خبیث (اور خسیس) چیزوں سے بچنا ہے۔ شریعت کا چوتھا اصول عدالت جسے عدل وانصاف کہا جاتا ہے۔ ہر پیغمبر نے ان چار اصولوں کی تعلیم دی ہے۔ اور تمام آسمانی شریعتیں ان چار اصولوں کی تفصیل ہے۔

باطن کی پاکیزگی

طہارت یا پاکیزگی کے دو بڑے حصے ہیں۔ یعنی ظاہری اور باطنی پاکیزگی۔ سب سے پہلے باطنی طہارت کی ضرورت ہے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[2] کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی کا مطلب یہ ہے۔ کہ فلاح پا گیا وہ شخص جس نے تزکیہ حاصل کیا، یعنی اپنے باطن کو کفر، شرک، نفاق اور فاسد عقیدوں سے پاک کر لیا۔ یہ طہارت کی منزل ہے۔ جس شخص کے دل میں کوئی بھی فاسد عقیدہ کسی کونے میں موجود ہو، اُسے فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ جب تک کسی شخص کے اندر فاسد مواد موجود رہے، نہ اس کی عبادت مقبول ہے اور نہ اس پر خدا راضی ہو گا۔ کیونکہ باطن ناپاک ہے۔ اور پاکیزگی کامیابی کے لیے شرط اولین ہے۔ جو شخص ناپاک دل ۔۔۔اغ کے ساتھ اللہ کے حضور پیش

---

[1] ہمعات صہ ۸۹ حجۃ اللہ صہ ۵۳ ج ۱ [2] تفسیر عزیزی فارسی صہ ۱۸۴ پارہ ۳۰

ہو گا، اللہ تعالیٰ اُس کی کوئی عبادت قبول نہیں کرے گا۔ اُس نے منافقوں کے متعلق صاف فرما دیا "اِنَّھُمْ رِجْسٌ" یہ ناپاک ہیں "وَّمَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ" اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہی ہے اسی طرح مشرکوں کے متعلق فرمایا "اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ" یہ بھی ناپاک ہیں مطلب یہ کہ جب تک عقیدہ درست نہیں ہو گا باطنی طہارت نہیں ہو گی۔ کامیابی نہیں ہو گی۔ پھر عقیدے کی پاکیزگی کے ساتھ اخلاق کی پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اخلاق کا مرکز دل ہے بُرا ارادہ، کھوٹی نیّت، حسد، بغض، کینہ وغیرہ اخلاقی بیماریاں ہیں اور ان کا تعلق بھی باطن سے ہے۔ لہٰذا کامیابی کے حصول کے لیے ان چیزوں سے پاک ہونا بھی ضروری ہے۔

ظاہری پاکیزگی

ظاہری پاکیزگی میں جسم کی پاکیزگی کو اولیّت حاصل ہے، فقہ اور حدیث کی کتابوں میں آپ پڑھتے ہیں، خون، پیپ، بول و براز وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ جسم پر لگی ہوں، تو جسم ناپاک ہے۔ اس کی صفائی ضروری ہے۔ حدث یعنی ہوا خارج ہو جانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ نماز نہیں پڑھ سکتا۔ طہارت کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ جسم کی بہت بڑی ناپاکی جنابت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر کوئی گندگی نظر نہیں آتی مگر اس سے سارا جسم نجس ہو جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[۱] جنابت کا غسل اچھی طرح کیا کرو۔ کوئی ایک بال بھی خشک نہیں رہنا چاہیئے کیونکہ "تَحْتَ کُلِّ شَعْرَۃٍ جَنَابَۃٌ" ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے۔ اچھی طرح طہارت کرو "وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوْا" فَاطَّھَّرُوْا مبالغے کا صیغہ اللہ نے فرمایا کہ خوب اچھی طرح طہارت کرو۔ اسی طرح حیض و نفاس والی عورت کو بھی حکم ہے فَاِذَا تَطَھَّرْنَ وہ بھی پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے اچھے طریقے سے غسل کریں۔ جب تک وہ اس طریقے سے پاک نہ ہو جائیں۔ ان سے مقاربت جائز نہیں۔

جسم کی پاکیزگی کے علاوہ لباس کی پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ اگر لباس ناپاک ہو، تو بھی عبادت مقبول نہیں۔ سورۃ مدثر میں واضح حکم ہے "وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ" ہر قسم کی ظاہری، حسی نجاست سے پاکیزگی حاصل کرو۔ گویا ظاہری طہارت کے دو درجے ہو گئے درجہ اوّل جسم کی پاکیزگی

---

[۱] ترمذی صـ ۴۲، ابوداؤد صـ ۳۲/۱، ابن ماجہ صـ ۴۴

اور درجہ دوم لباس کی پاکیزگی کا ہے۔ تیسرے درجے میں انسانی جسم کے غیر ضروری بالوں کی صفائی ہے۔ جس میں بغل کے بال اور زیرِ ناف بال آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناخن کی صفائی ہے۔ اور اگر کہیں میل کچیل جم جائے تو اس کی صفائی بھی اسی درجے میں آتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے ہمارے لیے تحدید فرمائی کہ ہم غیر طبعی بالوں کو چالیس دن سے زیادہ نہ رہنے دیں۔[1] اگر بلا عذر چالیس[2] دن سے زیادہ ہو گئے تو وہ مکروہ تحریمی کی حالت میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا شخص گنہگار ہوگا۔ اور اس کی نماز بھی مکروہ ہوگی۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ گرم ممالک میں اس سے بھی جلد صفائی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ایسے مقامات پہ پسینہ آتا ہے اور میل کچیل جلدی جمع ہو جاتا ہے۔ بہرحال چالیس دن سے آگے لیجانا مکروہ تحریمی ہے[2]۔

مال کی پاکیزگی

طہارت کے ضمن میں مال کی پاکیزگی بھی ضروری ہے۔ مال کی پاکیزگی اس کے فرائض اور مستحبات ادا کرنے سے ہوتی ہے۔ زکوٰۃ ادا کرو، یہ فرض ہے۔ اس کے علاوہ صدقہ فطر اور قربانی ہے ان مدات میں خرچ کرو۔ ایسا کرو گے تو بقیہ مال پاک ہوگا، ورنہ نہیں۔ حضور علیہ الصلوۃ و السلام کا فرمان[3] ہے۔ جس مال میں زکوٰۃ کی ملاوٹ ہو وہ سارا مال ناپاک ہوتا ہے۔ اسی طرح ابوداؤد[4] شریف کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی تاکہ باقی ماندہ مال تمہارے لیے پاک ہو جائے۔ اگر ناپاک مال استعمال کیا جائے گا، تو جذبات بھی ناپاک پیدا ہونگے ناپاک خون پیدا ہوگا اور پھر عبادت بھی مقبول نہیں ہوگی۔ لہٰذا اپنے مال کو حرام کی آمیزش سے پاک کرنا چاہیئے۔ رشوت اور سود کی ملاوٹ سے اجتناب کرو۔ نیز ناپاک چیزوں کی تجارت سے اپنے سرمایہ کو ناپاک نہ بناؤ۔ حرام چیزوں میں مُردار یا اس کی چربی، شراب خنزیر وغیرہ ہیں۔ ان کی تجارت میں رقم نہ لگاؤ، ورنہ سارا مال ناپاک ہو جائے گا۔ یہ تمام چیزیں تزکیہ کے ضمن میں آتی ہیں۔ اس لیے کامیابی حاصل کرنے کے لیے تزکیہ کو اختیار کرو۔

---

[1] مسلم صـ ۱۲۹ ج ۱، [2] مرقات شرح مشکوٰۃ صـ ۲۹۱ ج ۸، حاشیہ طحطاوی صـ ۲۸۶۔
[3] مشکوٰۃ صـ ۱۵۷ بحوالہ حمیدی و بخاری فی التاریخ [4] ابوداؤد صـ ۲۳۴ ج ۱

نماز کی شرائط

شیخ الاسلامؒ اور دیگر مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں[1]، نماز کی کئی شرائط ہیں۔ جن میں جسم کی پاکیزگی، کپڑوں کی پاکیزگی، مکان کی پاکیزگی، تعین قبلہ اور تکبیر تحریمہ ہیں۔ ان شرائط کو پورا کیے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی مال کی پاکیزگی اور ظاہر و باطن کی پاکیزگی بھی تزکیہ کے حصے ہیں۔ لہٰذا عبادت کے لیے ہر قسم کی طہارت ضروری ہے۔ نماز میں داخل ہوتے وقت تکبیر تحریمہ یعنی اللہ اکبر کہنا بھی شرط ہے۔ اگر تکبیر تحریمہ نہیں کہی، ویسے ہی خاموش کھڑا ہو گیا، تو نماز بھی نہیں ہوگی، بعض فقہاء تکبیر تحریمہ کو نماز کا رکن کہتے ہیں۔ مگر امام ابوحنیفہؒ اس کو شرائط میں داخل کرتے ہیں[2]۔ اور شرط کے بغیر مشروط کی تکمیل نہیں ہوتی۔ لہٰذا تکبیر تحریمہ بھی نماز کے شرائط میں سے ہے۔

نماز تمام عبادات کی جڑ ہے

رب کا نام لینا۔ اللہ کا ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کی محبت کی نشانی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان کے تعلق اور لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے بندہ اپنے رب کا نام لیتا ہے اس کو یاد کرتا ہے۔ اور نماز پڑھتا ہے اور انہی چیزوں کی وجہ سے فرائض میں نماز سب سے اہم ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[3] کہ نماز ام العبادات المقربہ ہے۔ یعنی تمام عبادات کی جڑ ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد موجود ہے "فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ۔" اگر کفار و مشرکین کفر اور شرک سے توبہ کر لیں، نماز شروع کر دیں، زکوٰۃ ادا کرنے لگیں۔ تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ان کے ساتھ حالت جنگ ختم ہو گئی۔ گویا نماز اور زکوٰۃ جماعت المسلمین میں شمولیت کی نشانیاں ہیں۔ جو شخص ان عبادات پر کاربند ہے۔ اُسے اپنی ہی جماعت کا رکن سمجھو۔ اور جو نماز نہیں پڑھتا، زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، وہ مسلمانوں کی پارٹی کا ممبر نہیں ہے۔ مقصد یہ کہ زکوٰۃ اور نماز اتنی اعلیٰ درجے کی عبادات ہیں کہ جماعت میں شمولیت کے لیے بمنزلہ شرط کے ہیں۔

تو فرمایا وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے نماز ادا کی اور نماز کے مقصد کو سمجھ گیا" وَإِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ" یہ نماز بوجھل ہے۔ بڑا مشکل کام معلوم ہوتا ہے۔ مگر اُن لوگوں کے لیے بڑی آسان چیز ہے۔ جن کے دل میں خوفِ خدا آ گیا ہے۔ نماز ایک پُرسرور عبادت

---

[1] تفسیر عثمانی ص ۱۰۱۸ مطبوعہ تاج کمپنی [2] مظہری ص ۲۴۶ ج ۱۰ ہدایہ ص ۹۹ ج ۱ شرح وقایہ ص ۳۵ ج ۱ طبع بمبئی
[3] تفسیر عزیزی ص ۱۸۵ پارہ ۳۰۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۷۳ ج ۱ طبع مصر۔

ہے۔ جس میں خدا تعالیٰ کا ذکر ہے، اس کے سامنے عاجزی اور مناجات ہے۔ خدا کے قرب کا ذریعہ ہے۔ اس میں قیام، رکوع اور سجدہ ہے۔ قرآن پاک کی تلاوت ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کو اللہ سے قریب کرنے والی ہیں۔

برخلاف اس کے منافق کے لیے نماز بڑی ہی بوجھل عبادت ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[۱] دو نمازیں منافق پر بڑی بوجھل ہیں۔ یعنی فجر اور عشاء کی نمازیں۔ عشاء کا وقت سونے کا وقت یا گپ شپ لگانے کا وقت ہوتا ہے۔ اور اس وقت میں منافق کا نماز کے لیے اٹھنا بڑا مشکل ہوتا ہے اسی طرح فجر کا وقت ایسا ہوتا ہے جس میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور منافق نماز کی خاطر بیدار نہیں ہو سکتا۔

دنیا اور آخرت کی زندگی میں تقابل

کامیابی کے تین بنیادی اصول یعنی تزکیہ، ذکر الٰہی اور نماز کے بیان کے بعد فرمایا کہ لوگوں کی حالت یہ ہے بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا تم دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی پر ترجیح دیتے ہو۔ جو شخص ان تین اصولوں پہ کاربند نہیں، اُس کا رُخ حظیرۃ القدس کی طرف نہیں ہے۔ اُسے آخرت کی کوئی فکر نہیں۔ وہ دنیا کے لیے ہی کماتا ہے۔ اور اسی میں انہماک رکھتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی آخرت کی زندگی بہتر اور دیرپا ہے۔ اُس کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایک بہتر اور باقی رہنے والی چیز کو فانی دنیا کی خاطر چھوڑنا حد درجے کی حماقت اور بیوقوفی ہے۔ سورۃ دہر میں اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَیَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا "یہ لوگ دنیا کی زندگی کو محبوب رکھتے ہیں۔ اور بوجھل دن کی فکر ہی نہیں کرتے۔ مگر وہ دن تو آنے والا ہے۔ جب تمام اعمال سامنے آئیں گے۔ محاسبہ ہوگا اور پھر جزائے عمل واقع ہوگی۔

آسمانی صحیفے

آخری آیات میں یہ بات واضح کی گئی ہے۔ کہ اِنَّ هٰذَا یعنی اس سورۃ میں جو پروگرام نصیحت اور اصول بتائے گئے ہیں لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی یہ پہلے آسمانی صحیفوں میں بھی مذکور ہیں۔ وہی صحیفے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پہ نازل ہوئے۔

---

[۱] بخاری صفحہ ۹۰ ج ۱ مسلم صفحہ ۲۳۲ ج ۱

صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی امت محمدیہ کا ہر مؤمن اپنے آپ کو ملّتِ ابراہیمی سے منسلک کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام ملّتِ ابراہیمی کو پیش کرنے والے ہیں۔ آپ کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے اسی لیے حکم ہے " فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا " ان احکام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کی نشاندھی ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے بھی انہیں اصولوں کے حامل ہیں۔ آجکل کی بائیبل کے پہلے باب پیدائش کو ابراہیم علیہ السلام کا صحیفہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ باقی خروج تک چار باب موسیٰ علیہ السلام کی توراۃ کہلاتے ہیں۔ اگرچہ یہودیوں نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ مگر یہ وہی صحیفے ہیں جن کا ذکر قرآن پاک نے اس سورۃ مبارکہ میں کیا ہے۔ مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر تقریباً دس صحیفے نازل ہوئے۔ اور توراۃ کے علاوہ دس صحیفے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی نازل ہوئے۔ یہ سب تفسیری اور تاریخی روایتوں سے ماخوذ ہے۔[1]

الغرض نصیحت کی یہ تمام باتیں پہلے صحیفوں میں بھی مذکور ہیں۔ اور قرآن پاک بھی انہیں کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ وہی پرانا دین ہے۔ سارے نبی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا[2] کہ طہارت کا اصول تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا حصہ رہا ہے۔ یہ اصول کسی شریعت میں منسوخ نہیں ہوا۔ ہماری شریعت کا بھی ایک محکم اصول ہے۔ جس پر عمل کرنا ضروری ہے اور یہ فلاح و کامیابی کا ضامن ہے۔

---

[1] روح المعانی صفحہ ۱۱۱ جلد ۳۰ تفسیر کبیر صفحہ ۱۵۰ جلد ۳۱، [2] ہمعات صفحہ ۸۹ حجۃ اللہ صفحہ ۵۲ جلد ۱

سُورَةُ الغَاشِيَة

درس اوّل — (آیت ۱ تا ۱۶)

سُورَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّعِشْرُونَ اٰيَةً

سورۃ غاشیہ مکی ہے اور یہ چھبیس ۲۶ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ⑴ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ⑵
عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ⑶ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ⑷ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ
⑸ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ⑹ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ
جُوْعٍ ⑺ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ⑻ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ⑼ فِيْ
جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ⑽ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ⑾ فِيْهَا عَيْنٌ
جَارِيَةٌ ⑿ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ⒀ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ⒁ رکوع لازم
وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ⒂ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ⒃

ترجمہ:- کیا آپ کے پاس ڈھانپ لینے والی چیز (قیامت) کی بات نہیں پہنچی ⑴ اس دن بہت سے چہرے ذلیل ہوں گے ⑵ بڑی محنت (ریاضت) کرنے والے تھکے ہوئے ہوں گے ⑶ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے ⑷ انہیں کھولتے ہوئے چشمے سے پانی پلایا جائے گا ⑸ ان کے لیے کھانا نہیں ہوگا مگر کانٹے دار جھاڑ ⑹ نہ تو وہ جسم کو موٹا کرے گا اور نہ بھوک سے بچائے گا ⑺ بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے ⑻ وہ اپنی کوشش پر خوش ہوں گے ⑼ اونچے درجے کے بہشت میں ⑽ تم وہاں کسی قسم کی لغویات نہیں سنو گے ⑾ اس میں بہنے والے چشمے ہوں گے ⑿ اس میں اونچے تخت ہوں گے ⒀ اور آبخورے (قرینے سے) رکھے ہونگے ⒁ اور تکیے صف بہ صف لگے ہوں گے ⒂ اور نہایت عمدہ قسم کے قالین جگہ جگہ پھیلائے ہوں گے ⒃

نام اور کوائف — اس سورۃ کا نام سورۃ الغاشیۃ ہے۔ اس کی پہلی آیت میں غاشیہ کا لفظ مذکور ہے۔ اسی سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ بھی مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی چھبیس[۲۶] آیات ہیں۔ یہ سورۃ بانوے[۹۲] الفاظ اور تین سو اکیاسی[۳۸۱] حروف پر مشتمل ہے۔

موضوع — سابقہ سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی قیامت ہی کا ذکر ہے۔ گذشتہ سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دو گروہوں کا ذکر کیا تھا۔ ایک وہ گروہ جس کے دل میں خدا کا خوف موجود ہے۔ وہ تو قرآن کریم کی نصیحت کو حاصل کرے گا۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جو بدبخت ہے۔ وہ قرآن پاک کی نصیحت سے کنارہ کش رہے گا۔ ان دو گروہوں کے ذکر کے بعد اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے جزائے عمل کا ذکر فرمایا ہے اور ان دونوں کے آخرت کے حال کو بیان فرمایا ہے۔ اس کے بعد وقوع قیامت کے بارے میں دلائل ذکر فرمائے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر قیامت برپا ہونے کا یقین آتا ہے۔

فضائل سورۃ — حدیث شریف[۱] میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سورۃ مبارکہ کو جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی دوسری رکعت میں اکثر تلاوت فرماتے تھے۔ پہلی رکعت میں سورۃ اعلیٰ اور دوسری میں یہ سورۃ۔ حدیث میں یہ بھی مذکور ہے۔ کہ اگر جمعہ اور عید اکٹھے آجاتے، تو بھی حضور علیہ السلام یہی دو سورتیں تلاوت فرماتے، پہلی سورۃ کے متعلق مسند احمد[۲] کی حدیث گذر چکی ہے۔ کہ حضور علیہ السلام سورۃ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى کو بہت محبوب رکھتے تھے۔ اسی طرح یہ سورۃ بھی آپ کثرت سے تلاوت فرماتے تھے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ نے عشاء کی نماز میں سورۃ بقرۃ تلاوت کی[۳] تو ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا تم فتنہ پیدا کرنا چاہتے ہو۔ بقرہ جیسی لمبی سورۃ کی بجائے "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" اور اس جیسی دوسری سورتیں کیوں نہیں پڑھ لیتے۔ یہ کاروباری لوگ ہیں، کسان، کاشتکار، زمیندار ہیں۔ دن کے کام کاج سے تھکے ماندے آتے ہیں۔ انہیں لمبی سورتوں کے ذریعے مشقت میں نہ ڈالو۔

۱۔ مسلم ص ۲۸۸ ج ۱، ترمذی ص ۱۰۱ ۲۔ مسند احمد ص ۹۶ ج ۱ ۳۔ مسلم ص ۱۸۷ ج ۱

قیامت ایک عظیم انقلاب ہو گا

قیامت بہت بڑا انقلاب ہو گا۔ ایسا انقلاب جو اس دنیا کے انسانوں کے تصور میں آج نہیں آسکتا۔ اس انقلاب سے ہر چیز متاثر ہو گی۔ پہلی سورتوں میں ذکر آچکا ہے۔ کہ دنیا کی مختلف اشیاء پر اس کا اثر ــــــ کس طریقے سے ہو گا۔ زمین و آسمان اور خارجی دنیا پر اس کا اثر کیا ہو گا۔ بیان ہو چکا ہے۔ انسان کے باطن پر کیا اثر ہو گا۔ انسانوں کی برادری کے اعتبار سے اس عظیم انقلاب کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ "یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ" وغیرہ اس سورۃ کی ابتداء میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی الفاظ سے انقلاب قیامت کا ذکر کیا ہے۔ هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ "الغرض کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہو گی، جو اس انقلاب سے متاثر نہ ہو۔ جس طرح قیامت کے ذریعے اللہ انقلاب عظیم پیدا کرے گا۔ اسی طرح اس دنیا میں بھی خداوند کریم نے قرآن کریم کے ذریعے بنی نوع انسان میں عظیم انقلاب پیدا کیا ہے۔

قیامت ہر چیز پر چھا جائیگی

ارشاد ہوتا ہے هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ کیا آپ کے پاس ڈھانپ لینے والی چیز کی بات پہنچی ہے؟ غاشیہ سے مراد ڈھانپ لینے یا چھپا لینے والی چیز یعنی قیامت ہے۔ وہ ہر چیز پر چھا جائے گی، کوئی چیز اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گی۔ اسی چیز کو کہیں "طَآمَّةُ الْكُبْرٰى" (عظیم ہنگامہ) اور کہیں "اَلْقَارِعَةُ" (کھٹکھٹا دینے والی) کہا ہے۔ اس جگہ اَلْغَاشِیَةُ فرمایا یعنی یہ ہر چیز کو ڈھانپ لینے والی ہے۔ ہر چیز پر غالب آجائیگی۔

ابن ابی حاتم کی روایت[1] میں آتا ہے۔ اسے امام ابن کثیرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ حضور علیہ السلام کہیں سے گذر رہے تھے۔ کوئی مسلمان عورت "هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ" تلاوت کر رہی تھی۔ حضور علیہ السلام رک گئے اور فرمایا قَدْ جَآءَنِیْ ہاں میرے پاس اس کی خبر پہنچی ہے۔ یہ آپ نے آیت کے جواب میں فرمایا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وحی اور قرآن کریم کے ذریعے آپ کو قیامت کی آمد کی خبر دے دی تھی۔

ذلیل چہرے

وہ ڈھانپ لینے والی چیز جس کی خبر پہنچ چکی ہے اس کا اثر یہ ہو گا کہ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ اس دن بہت سے چہرے ذلیل ہوں گے۔ خَاشِعَةٌ کا معنیٰ دب جانا، پست

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص۵۰۲ ج۴ و روح المعانی ص۱۱۲ ج۳۰ بحوالہ ابن ابی حاتم

ہو جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں " وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ " اُس دن آوازیں پست ہو جائیں گی، کسی سے آواز بھی بلند نہیں ہو سکے گی۔ خشوع کا معنی عاجزی ہوتا ہے۔ یہاں مراد ذلیل ہونا ہے ________ بعض اوقات چہرے سے مراد سارا وجود ہوتا ہے۔ کبھی ایک عضو کا ذکر کر کے ذات مراد لی جاتی ہے۔ عربی زبان میں دائیاں ہاتھ بول کر سارا وجود مراد ہوتا ہے۔ جیسے " مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ " وہ غلام جن کے مالک تمہارے داہنے ہاتھ ہیں۔ چہرہ ایک ایسا عضو ہے۔ جس پر خوشی یا غم کے اثرات بہت زیادہ نمایاں ہوتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالےٰ نے مختلف مقامات پہ فرمایا بعض چہرے سیاہ ہوں گے بعض سفید ہوں گے اور ان پر خوشی چھائی ہوئی ہو گی۔ بعض مسکراتے والے چہرے ہوں گے۔ اسی طرح فرمایا۔ اس دن بہت سے چہرے خَاشِعَةٌ یعنی ذلیل ہوں گے۔

وہ چہرے عَامِلَةٌ محنت کرنے والے ہوں گے اور نَاصِبَةٌ تھکے ہوئے ہوں گے۔ نصب کا معنی تھک جانا ہے۔ جیسے کام کاج کر کے انسان تھک جاتا ہے۔ بہشت کے متعلق فرمایا، اس میں تھکاوٹ والی کوئی چیز نہیں ہو گی۔ اسی طرح وہاں پہنچنے والے انسانوں کو بھی کوئی تھکاوٹ نہیں ہو گی۔ وہ بالکل تر و تازہ رہیں گے۔ البتہ ان تھکے ماندے کام کرنے والے چہروں کی جزا کیا ہو گی تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ایسے لوگ بھڑکنے والی آگ میں داخل ہوں گے۔ حامیۃ بھڑکنے والی یا جوش مارنے والی کو کہتے ہیں۔

بعض عبادت گذار بھی جہنم میں جائیں گے

امام ابن کثیرؒ نے بیان کیا ہے[1]۔ کہ ابو عمران جونیؒ کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ شام کے سفر کے دوران ایک گرجے کے قریب سے گذرے۔ آپ نے اس گرجے کے پادری کو آواز دے کر باہر بلایا جب حضرت عمرؓ نے پادری کو دیکھا تو رونے لگے۔ لوگوں نے رونے کی وجہ پوچھی، تو انہوں نے فرمایا کہ اس پادری کو دیکھ کر مجھے قرآن پاک کی یہ آیات یاد آ گئیں۔ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۙ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً " یعنی اس دن بڑی محنت اور ریاضت کرنے والے تھکے ہوئے لوگ ہوں گے۔ مگر جہنم میں جائیں گے اُن کے چہروں سے ظاہر ہو گا۔ کہ بڑے عبادت گزار اور مرتاض۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۵۰۲ ج ۴ در منثور ص ۳۴۲ ج ۶ مستدرک حاکم ص ۵۲۲ ج ۲

(ریاضت کرنے والے) ہیں۔ بڑی چلہ کشی کرتے تھے۔ مگر فکر صحیح نہیں تھی۔ ایمان کی دولت سے محروم تھے۔ لہٰذا دوزخ میں جائیں گے۔ ان میں ہندوؤں کے بڑے بڑے جوگی عیسائیوں کے پادری، بدھ بھکشو، سکھ خالصہ کسی کی ریاضت کام نہیں آئے گی۔ سیدھے جہنم میں جائیں گے۔ پہلی سورۃ میں آچکا ہے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی" فلاح تو وہ پائیں گے جنہوں نے تزکیہ حاصل کر لیا۔ جنہوں نے اپنے باطن کو کفر و شرک سے پاک نہیں کیا۔ جن کا عقیدہ صحیح نہیں ہے۔ بڑی سے بڑی عبادت بھی ان کو جہنم میں لے جائے گی۔ عبادت بھی اس وقت ٹھکانے لگے گی۔ جب ایمان کی دولت نصیب ہوگی۔ کیونکہ پہلا نمبر ایمان کا ہے۔ "اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے بعد اعمال کا درجہ آتا ہے "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" اگر ایمان نہیں تو اعمال کس کام۔ سب ضائع جائیں گے۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ان کا مشروب کھولتا ہوا پانی ہوگا

الغرض حضرت عمرؓ اس پادری کو دیکھ کر اس لیے روئے۔ کہ اس قسم کے عبادت گذار بھی دوزخ میں جائیں گے۔ اور پھر اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ فرمایا تُسْقٰی مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَۃٍ انہیں پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی دیا جائے گا۔ ایسے پانی کو کون پی سکتا ہے، جو گرم ہو کر کھولنے لگے۔ دوسری جگہ سورۃ قتال میں فرمایا۔ کہ دوزخی لوگ پیاس کی شدت سے مجبور ہو کر اس پانی کا ایک گھونٹ پیئں گے، تو وہ آنتوں کو جلا دے گا۔ اور کاٹ کر پھینک دے گا۔ اس قدر سخت پانی ہوگا۔ جو اہل دوزخ کو پینا ہوگا۔

بدترین کھانا

پینے کا تو یہ حال ہوگا۔ کھانے کے متعلق فرمایا لَیْسَ لَھُمْ طَعَامٌ ان کے لیے کھانا نہیں ہوگا اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ مگر کانٹے دار جھاڑ، ضریع کو عربی زبان میں شبرق بھی بولتے ہیں۔ جب یہ سرسبز ہوتا ہے تو شبرق کہلاتا ہے۔ جب خشک ہو جاتا ہے تو ضریع کہلاتا ہے جب تازہ ہو تو اونٹ کھا لیتے ہیں۔ مگر جہنم کی ضریع بہت کڑوی اور تلخ ہوگی یہ کانٹے دار بوٹی دوزخیوں کو کھانے کے لیے دی جائے گی۔ کوئی انسان ایسا نہیں جو بھوک سے بے نیاز ہو۔ جب دوزخ والوں پہ بھوک کا غلبہ ہوگا تو انہیں یہ کھانا پیش کیا جائے گا۔

حدیث شریف[1] میں ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہم حضور علیہ السلام کی خدمت میں

---

[1] شمائل مع ترمذی ص۱۵۵، مسلم ص ۱۷۹ و ۱۸۰ / ۲ج

حاضر ہوا۔ اس وقت آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے اور یہ ٹیک مِنَ الْجُوْعِ بھوک کی وجہ سے تھی۔ آپ بھوک سے نڈھال ہو رہے تھے۔ اتنے میں کوئی شخص کھجوریں لے کر حاضر ہوا، اور آپ کو پیش کیں۔ آپ نے وہ کھجوریں تناول فرمائیں۔

پیٹ پر پتھر باندھنے کے کئی واقعات احادیث[1] میں ملتے ہیں۔ جب صحابہ کرامؓ بھوک سے نڈھال ہو جاتے تھے۔ اتنی کمزوری واقع ہو جاتی تھی کہ کھڑا ہونا محال ہو جاتا تھا۔ اس وقت توازن قائم کرنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھنا پڑھتا تھا۔ اس واقعہ میں بھی حضور علیہ السلام کی یہی حالت تھی۔ ترمذی شریف[2] کی روایت میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کسی آدم کے بیٹے کے لیے چند لقمے ہی کافی ہیں۔ جو اس کی پشت کو سیدھا رکھ سکیں۔ بہت زیادہ کھانا بھی مناسب نہیں مناسب یہ ہے۔ کہ اتنا ہی کھایا جائے، جتنا جسم در روح کے تعلق کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ تاکہ اپنے رب کی عبادت کر سکے۔

اب کھانا دو مقصد کے لیے کھایا جاتا ہے۔ پہلا مقصد تو بھوک سے نجات حاصل کرنا ہے۔ اور دوسرا مقصد جسم کو موٹا تازہ کرنا ہے۔ اچھے اچھے کھانے کھا کر جسم میں تر و تازگی پیدا کرنا ہے۔ مگر فرمایا دوزخیوں کا کھانا یہ دونوں مقصد پورے نہیں کر سکے گا۔ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ نہ تو وہ جسم کی پرورش کرے گا اور نہ ہی بھوک سے نجات دلائے گا۔ وہاں تو کھانا بھی عذاب ہوگا۔ "إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ" "طَعَامُ الْأَثِيمِ" دوزخیوں کا کھانا تھوہر کا درخت ہوگا جس کا مزہ اس قدر کڑوا اور بدبودار ہوگا کہ اگر اس کا ایک ڈول بھر کر دنیا میں پھینک دیا جائے تو دنیا کی کوئی چیز کھانے پینے کے قابل نہ رہے[3]۔ اس مقام پر جو ضریع کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی اسی قسم کی چیز ہوگی، جو نہ بھوک کو مٹائے گی اور نہ جسم کو مفید ہوگی۔ یہ ان لوگوں کا حال ہوگا جنہوں نے ایمان قبول نہیں کیا اور اپنی فکر کو پاک نہیں کیا۔

تر و تازہ چہرے

ذلیل چہروں کے مقابلہ میں اگلی آیت میں تر و تازہ چہروں کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ ناعمہ کے معنی بارونق

---

[1] بخاری صفحہ ۵۸۸/۲ مسلم صفحہ ۱۷۹/۲ وغیرہ [2] ترمذی صفحہ ۳۴۳ [3] ترمذی صفحہ ۲۷

تروتازہ لِسَعْیِهَا رَاضِيَةٌ وہ اپنی کوشش پر خوش ہوں گے۔ وہ کتنے سعادتمند ہوں گے۔ کہ اُن کی دنیا میں کی گئی کوشش ٹھکانے لگی۔ کیونکہ انہوں نے ایمان کی شرط کو قبول کیا اور عقیدے کی صحت کے ساتھ اعمال صالحہ انجام دیے۔ جب یہ شرط پوری کر دی تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے "اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ" جو صحیح طریقے پہ کام کرے گا۔ اللہ اس کے کام کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ اس کا عمل ٹھکانے لگے گا۔

ابو درداؓ کی روایت[1] میں آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کاش مجھے معلوم ہو جائے۔ کہ میری یہ دو رکعت نماز اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو چکی ہے۔ تو یہ چیز میرے لیے دنیا وما فیہا سے بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ" یعنی اللہ تعالیٰ متقیوں کے اعمال کو قبول فرماتا ہے۔ اور متقی کا پہلا درجہ یہ ہے۔ کہ کفر، شرک اور فاسد عقیدے سے بچے۔ پھر معصیت اور برائیوں سے پرہیز کرے۔ جس شخص میں تقویٰ نہیں ہے۔ کفر و شرک سے پرہیز نہیں کرتا، اس کا عقیدہ بھی گندا ہے۔ تو اس کے اعمال کیسے مقبول ہوں گے۔ کامیاب لوگ وہی ہوں گے، جن کے چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے اور وہ اپنی کوشش پہ خوش ہوں گے۔ کہ انہیں ان کی محنت کا پھل مل گیا۔

فرمایا ایسے لوگوں کو صلہ یہ ملے گا۔ فِیْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ کہ اونچے درجے کے بہشتوں میں مقام ملے گا۔ بہشت تو ویسے ہی اونچی ہے۔ جنت کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ بھی ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے۔ اور سب سے اوپر جنت الفردوس ہے۔ اور اس کے اوپر عرش الٰہی کا سایہ ہے۔ مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ بہشت کے سو درجے ہیں۔ اور ہر درجہ دوسرے درجے سے اتنا بلند ہے، جتنا زمین سے آسمان۔ اسی لیے جنت کے مِائَةُ دَرَجَتٍ سو درجے ہوں گے۔ اور جنت ایسی پاکیزہ جگہ ہے لَا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً تم وہاں کسی قسم کی لغو اور بیہودہ بات نہیں سنو گے "لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ" وہاں نہ کوئی گناہ کی بات ہوگی، نہ گالی، گلوچ، نہ بکواس اور نہ کوئی اذیت دینے والی چیز۔ وہاں پہ پاکیزہ

ان کے لیے جنت کے اعلیٰ مقام ہوں گے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص۴۳ بحوالہ ابن ابی حاتم [2] ترمذی ص۳۶۲

باتیں اور پاکیزہ چیزیں ہوں گے۔ اس کے علاوہ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ اس میں بہنے والے چشمے ہوں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں[1] کہ وہ چشمے اس قسم کے ہوں گے کہ جنتی جس طرف چاہے گا اسی طرف بہنے لگیں گے۔ مگر آپس میں خلط ملط نہیں ہوں گے۔ اس دنیا میں تو پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔ نچلی طرف بہ نکلتا ہے۔ مگر جنت میں ایسا کوئی قانون نہیں ہوگا۔ جنتی جس طرف اشارہ کرے گا، چشمہ جاری ہو جائے گا۔

جنت میں اور کیا ہوگا فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ اس میں اونچے درجے کے تخت ہونگے جن پر جنتی لوگ آرام کریں گے وَّأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ آبخورے یا گلاس سامنے رکھے ہونگے اکواب، کوب کی جمع ہے۔ جسے کپ کہتے ہیں۔ جو گول ہو اور اس کے ساتھ ٹونٹی نہ ہو۔ پینے کے لیے ایسے اکواب موجود ہوں گے۔ جن میں وہ لوگ شراب طہور پئیں گے۔ اور پانی پئیں گے۔

وہاں اور کیا ہوگا وَّنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ صف بہ صف رکھے ہوئے تکیے ہوں گے نہایت عالیشان تکیے ہوں گے۔ جنتی جہاں جی چاہے بیٹھ سکے گا۔ ایسے آرام دہ تکیے ہر جگہ موجود ہوں گے۔ کہیں اٹھا کر لیجانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ اور نہایت عمدہ قسم کے قالین ہوں گے جگہ جگہ پھیلائے ہوئے۔ جس جگہ کوئی آرام کرنا چاہے گا، وہیں پر قالین موجود ہوں گے۔ اٹھا کر کسی دوسری جگہ لیجانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ زرابی، زربی کی جمع ہے۔ جسے آجکل کی زبان میں قالین کہہ سکتے ہیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کے انعامات کا تھوڑا سا نمونہ بیان فرمایا ہے۔ دوسرے مقامات پر اور بہت سی چیزوں کا ذکر ہے۔ کہیں فرمایا وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ" کہیں اعلیٰ و فاخرہ لباس کا بیان ہے۔ اور کہیں فرمایا جنت میں جانے والا ہر شخص بادشاہ ہوگا ایسا بادشاہ کہ اس دنیا کے بادشاہ اس کے ہزارویں حصے تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ حالانکہ انہیں ہر چیز میسر ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[2] جنت میں پہنچنے والا ادنیٰ سے ادنیٰ انسان بھی ایسا ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ اسے اس دنیا سے دس گناہ وسیع رقبہ

---

[1] معالم التنزیل ص ۲۰۴ ج ۴ [2] ترمذی ص ۳۵۳

عطا کرے گا۔ ہر نعمت اس کو وہاں میسر ہوگی۔ یہ اللہ کا فرمان ہے "فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ" جو آگ سے بچا لیا گیا "وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ" اور جنت میں داخل کر دیا گیا "فَقَدْ فَازَ" وہ کامیاب ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1]۔ "إِنَّ سِلْعَةَ اللَّهِ غَالِيَةٌ" اللہ کا سودا بڑا مہنگا ہے اس میں نفس کو پاک کرنا پڑتا ہے۔ اعمال صالحہ کرنا پڑتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں پائی جائیں گی، تو اللہ تعالیٰ بہشت عطا کرے گا۔ اور پھر وہاں انعام و اکرام کی بارش ہوگی۔

---

[1] ترمذی صـ ۲۵۳

درسِ دوم (آیت ۱۷ تا ۲۶)

اَفَلَا یَنظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾
وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾ فَذَکِّرْ
اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ﴿۲۲﴾ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی
وَکَفَرَ ﴿۲۳﴾ فَیُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَکْبَرَ ﴿۲۴﴾ اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَهُمْ ﴿۲۵﴾
ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾ ع ۱۳

ترجمہ:۔ کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیے گئے ہیں ﴿۱۷﴾ اور آسمان کی طرف کہ وہ کیسا بلند کیا گیا ہے ﴿۱۸﴾ اور پہاڑوں کی طرف کہ انہیں کس طرح نصب کیا گیا ہے ﴿۱۹﴾ اور زمین کی طرف کہ اسے کس طرح بچھایا گیا ہے ﴿۲۰﴾ پس آپ ان کو نصیحت کریں بے شک آپ نصیحت کرنے والے ہیں ﴿۲۱﴾ آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں ﴿۲۲﴾ مگر جس نے روگردانی کی اور کفر کا راستہ اختیار کیا ﴿۲۳﴾ پس اللہ تعالیٰ اس کو بڑی سزا دے گا ﴿۲۴﴾ بے شک ان لوگوں نے ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے ﴿۲۵﴾ پھر ان لوگوں کا حساب کتاب لینا بھی ہمارے ذمّے ہے ﴿۲۶﴾

گذشتہ سے پیوستہ

ابتدائی آیات میں دو گروہوں کا ذکر بیان ہوا۔ ایک وہ گروہ جو ایمان والا ہے۔ اور دوسرا وہ جو کفر کرنے والا ہے۔ پھر ان حالات کا ذکر ہوا جو ان دو گروہوں کو آخرت میں پیش آنے والے ہیں۔ ان حالات میں کفار کو پیش آنے والے عذاب کا بھی ذکر ہے۔ اور اہل ایمان کو حاصل ہونے والے اعزاز و اکرام کا بیان ہے۔

دلائل قدرت

اب ان آیات میں قدرت کے چند دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ کہ اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو قیامت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح مالک الملک نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں۔ اسی طرح وہ اس بات پر قادر ہے کہ انسان کو دوبارہ پیدا کر کے اس سے حساب کتاب لے۔ جب انسان ان اشیاء پر کوئی تعجب نہیں کرتا تو پھر وہ وقوع قیامت اور بعث بعد الموت پر کیوں متعجب ہے۔ ان آیات میں اللہ نے اُن چار چیزوں کو بطور

دلیل پیش کیا ہے۔ جن سے قرآن پاک کے اولین مخاطبین قوم عرب بخوبی واقف تھے۔ دوسرے مقامات پر اور بھی بہت سے دلائل قدرت مذکور ہیں، مگر اس مقام پر پیش آمدہ صرف چار کا ذکر ہے۔

اونٹ اور اس کی خصوصیات

عربوں کا اونٹوں کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس پر سواری کرتے تھے۔ اس کی اون کے کپڑے پہنتے تھے۔ اور اس کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ خاص طور پر دور دراز کے سفر میں اونٹ ہی سواری کا کام دیتے تھے۔ عرب کے لق و دق صحرا میں اونٹ وہی کام دیتا تھا جو سمندر میں کشتی۔ اللہ تعالیٰ نے اونٹ کو عجیب و غریب خصوصیات کا حامل پیدا کیا ہے۔ جسم کے لحاظ سے بہت بڑا جانور ہے، مگر ہاتھی اس سے بھی بڑا ہے۔ بڑا طاقتور ہے۔ مگر گینڈا اس سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اونٹ کا ذکر اس لیے فرمایا کہ عرب میں صرف اونٹ ہی پایا جاتا ہے۔ ہاتھی، گینڈا وغیرہ وہاں نہیں ہوتا۔ تاہم اونٹ میں اللہ تعالیٰ نے کمال صفات پیدا فرمائی ہیں۔ یہ قدیم زمانے سے انسان کا خدمت گذار ہے۔ بیحد محنتی اور ثابت قدم ہے۔ خلقت کے اعتبار سے عجیب و غریب ہے۔ لمبی ٹانگیں، لمبی گردن، دراز جسم، کلانی غرض ہر چیز حیرت انگیز ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ پہلی آیت "فِیْ جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ" یعنی جنتی لوگ اونچے باغوں میں ہوں گے۔ اور اونچے تختوں پر بیٹھیں گے اور اونچی جگہ پر چڑھنا دشوار ہوتا ہے۔ قرآن آیات کی مناسبت اونٹ سے ہے۔ کہ جس طرح وہ بلند مقامات ہیں، اسی طرح اونٹ بھی بلند قامت جانور ہے، اس لیے فرمایا اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کیا تم اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کتنا اونچا جانور پیدا کیا ہے۔ اس پر سواری کرنا کتنا مشکل تھا، مگر اس میں اللہ تعالیٰ نے ایسی خاصیت رکھی ہے۔ کہ سواری کے لیے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ جاتا ہے۔ تاکہ سوار اس پر سوار ہو سکے، اس پر سامان لادا جا سکے اس کے بعد وہ اٹھ کر منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، اگر اس میں بوقت ضرورت بیٹھنے کی صلاحیت نہ ہوتی۔ تو سیڑھی کے بغیر سواری ممکن نہ تھی۔ تو فرمایا جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اونٹ پر سوار ہونا آسان کر دیا، اسی طرح وہ جنت کے اونچے تختوں پر بیٹھنا بھی آسان فرما دے گا۔ اسی لیے فرمایا کیا یہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے

---

[1] معالم التنزیل ص ۲۲۹ ج ۴

کَیفَ خُلِقَت کیسا جانور پیدا کیا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اونٹ میں سات خصوصیات رکھی ہیں۔ جسم کے لحاظ سے بڑا اور حیرت انگیز ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ جانور بڑا صابر جانور ہے بھوک اور پیاس کافی عرصہ تک برداشت کر سکتا ہے۔ پانی نہ ملے تو دس دن تک پروا نہیں کرتا۔ بڑا لمبا سفر کر سکتا ہے۔ بوجھ بہت زیادہ اٹھا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں جب اس علاقے میں جیپ نہیں چلتی تھی، تو بارہ من بوجھ لاد کر بالاکوٹ سے بیس۲۰ دن میں گلگت پہنچ جاتے تھے۔ اتنا محنتی اور جفاکش جانور ہے۔ عرب میں بڑے بڑے ریگستان ہیں۔ وادی دہنا میں آٹھ آٹھ سو نو نو سو میل تک ریگستان پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ پہاڑ ہیں اور راستے دشوار گذار ہیں۔ مگر یہ اونٹ ہے۔ جو ان راستوں کو عبور کر جاتا ہے۔

وفادار اس قدر ہے۔ کہ چھوٹا سا بچہ بھی نکیل پکڑ کر جدھر چاہے لے جائے۔ کہتے ہیں۔ یہ بڑا باغیرت جانور ہے۔ حتی الامکان اپنے ارادے سے اپنی ماں یا بہن کے ساتھ جفت نہیں ہوتا۔ اور چلتے وقت اپنا رخ اکثر قبلہ کی طرف رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں عجیب خصوصیات رکھی ہیں۔ خوراک کے معاملے میں بالکل سادہ ہے۔ ہر قسم کا کانٹے دار جھاڑ کھا لیتا ہے۔ دوسرے جانور کڑوا یا کانٹے دار جھاڑ نہیں کھاتے، مگر یہ بلا چون وچرا پیٹ بھر لیتا ہے پچھلی آیت میں جس ضریع یعنی کانٹے دار کڑوی جھاڑی کا ذکر آیا ہے، وہ بھی کھا لیتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے یہ بھی لکھا ہے[2]۔ کہ اگر اونٹ کا شانہ نکال کر کسی عاشق کے ہاتھ پر باندھ دیا جائے تو اس کا عشق زائل ہو جاتا ہے۔ یہ اس جانور کی مختلف خصوصیات ہیں۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اونٹ کا حال بیان فرمایا۔ کیا یہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے۔ خدا کی کیسی قدرت کاملہ ہے۔ کیسا عجیب وغریب، وفادار، محنتی، جفاکش، صابر اور خدمتگار جانور ہے۔ اس کی رفتار بھی بڑی تیز ہے۔ جب حدی پڑھی جاتی ہے تو اس کی رفتار میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ لکھا[3] ابر رواں کی طرح چلتا جاتا ہے بزرگانِ دین فرماتے ہیں

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۹۵ تا ۱۹۷، پارہ ۳۰، [2] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۹۶ پارہ ۳۰، [3] تفسیر حسینی فارسی صفحہ ۹۴۸ بحوالہ مولانا رومیؒ،

کسی نے محنت، جفاکشی اور سادگی سیکھنی ہو۔ تو اونٹ سے سیکھے ؎

بر عوال اَفَلَا یَنظُرُ تا قدرت ما بینی	یک رہ بشتر بنگر تا صنع خدا بینی

در خار خوری قانع در بار کشی راضی	ایں وصف اگر جوئی در اہل صفا بینی

یہ ایسا جانور ہے۔ کہ کانٹے کھا کر راضی ہو جاتا ہے۔ بوجھ جتنا بھی ڈالو اٹھا کر لے جاتا ہے بھوک پیاس برداشت کر کے لمبا سفر طے کر لیتا ہے۔ فرمایا اہل صفا بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو ریاضت کرتے ہیں۔ اور مشقت برداشت کرتے ہیں۔

فرمایا اَفَلَا یَنظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ کیا ان لوگوں نے اونٹ کی طرف نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی ہیئت اور خاصیت دیگر جانوروں کی نسبت عجیب و غریب ہے۔

آسمان، پہاڑ اور زمین

دوسری دلیل یہ فرمائی وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ کیا ان لوگوں نے کبھی آسمان کی طرف غور نہیں کیا۔ کہ اللہ نے اُسے کیسا بلند کیا۔ اتنی بڑی وضع اور ہیئت کے آسمان کو بغیر ستون کے کھڑا کیا۔ اور جب تک خدا کو یہ نظام قائم رکھنا منظور ہے۔ اس وقت تک قائم رہے گا۔ نہ اس کی چھت کا پلستر کبھی خراب ہوتا ہے اور نہ رنگ زائل ہوتا ہے۔ اُسے کسی دوسری چیز کا سہارا بھی میسر نہیں۔ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا" اسے تم بغیر ستون کے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ اور اس کی بلندی کی یہ کیفیت ہے۔ کہ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا" اس کے درمیان اللہ نے عجیب و غریب قسم کا نظام قائم کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بھی بطور دلیل پیش کیا۔

پھر فرمایا وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ کیا انہوں نے کبھی پہاڑوں کی طرف نہیں دیکھا۔ کہ انہیں زمین میں کس طرح نصب کر دیا۔ کہ ان میں جنبش تک نہیں ہوتی، مگر جب اللہ تعالیٰ چاہے تو زلزلہ کی صورت میں انہیں جھنجوڑتا ہے۔ پہاڑوں میں اللہ تعالیٰ نے انواع و اقسام کی چیزیں پیدا کیں ہیں۔ جن سے انسان اور جانور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عرب لوگ پہاڑوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ صبح و شام ان سے واسطہ تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو تیسری دلیل کے طور پر پیش کیا۔ کہ یہ لوگ اگر پہاڑوں کی مضبوطی اور ان سے وابستہ طرح طرح کے فوائد کو ہی دیکھ لیں تو بعث بعد الموت کا انکار نہ کریں۔

چوتھی دلیل یہ فرمائی وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ یہ لوگ زمین کو ہی دیکھ لیں کہ اللہ نے کس طرح بچھا دیا ہے۔ انسان کی تمام تر ضروریات زمین سے پیدا ہوتی ہیں، خوراک، لباس، مکان، سڑکیں، راستے، ان پر چلنا پھرنا سب زمین سے متعلق ہیں۔ زمین ویسے تو گول کروی شکل کی ہے مگر جسم بڑا ہونے کی وجہ سے کرویت محسوس نہیں ہوتی، بلکہ ہموار سطح محسوس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کی ہیئت ہی اس طرح بنائی ہے۔ کہ اس کے متعلقہ تمام کام آسان کر دیے گئے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہ خدا کی قدرت کی نشانی ہے کہ وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے۔ جس کا انکار منکرین قیامت نہیں کر سکتے۔ وہ خدا جو اتنی وسیع، مضبوط اور کارآمد چیزیں پیدا کر سکتا ہے۔ کیا وہ انسان کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا۔ یا حساب کتاب نہیں لے سکتا؟ کیوں نہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ان دلائل پر غور کرنے کے بعد ایک صاحب عقل شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ جس نے ایسی عجیب و غریب چیزیں پیدا کی ہیں، وہ بلاشبہ بعث بعد الموت پر بھی قادر ہے۔ یہ تو ایک عام فہم و ادراک کی بات ہے۔ مگر ایک دوسرے لحاظ سے یہ اشیاء انسان کے لیے نہایت سبق آموز ہیں۔ اے لوگو! اگر کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو اونٹ کی طرح سادگی اختیار کرو، اُس جیسی محنت کرو اور اپنے اندر جفاکشی پیدا کرو۔ سبق آموز دلائل

آسمان کی بلندی پر غور کرو، تو تم بھی اپنا مقصد بلند رکھو۔ خفیف چیزوں میں نہ پڑو اپنے اندر استقلال اور مضبوطی پیدا کرنا چاہتے ہو تو پہاڑوں کی مثال سامنے رکھو کہ وہ کتنے مضبوط ہیں۔ تمہیں بھی اسی طرح اپنے پاکیزہ عقیدے اور اچھے اعمال پر ثابت قدم رہنا چاہیئے۔ عرب کہتے ہیں۔

تَزُوْلُ الْجِبَالُ الرَّاسِيَاتُ وَقَلْبُنَا عَلَى الْعَهْدِ لَا يَلْوِيْ وَلَا يَتَغَيَّرُ

پہاڑ اتنے مضبوط ہونے کے باوجود اپنی جگہ سے ٹل سکتے ہیں۔ مگر ہمارے عہد و پیمان کبھی نہیں ٹوٹ سکتے۔ کیونکہ یہ پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط ہیں۔ لہذا پہاڑوں کی طرح

لہ تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲ پارہ ۳۰

راسخ ہونا چاہیئے۔ علامہ اقبال مرحوم کہتے ہیں[1]۔

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی   چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

پہاڑ کی طرح مستقل مزاج بن کر زندگی گذار، نہ تنکے کی طرح کمزور جسے تیز ہوا اڑا لے جائے یا شعلہ جلا ڈالے۔ اگر مضبوط اور مستقل مزاج رہو گے اپنے ایمان اور نیکی پر قائم رہو گے، تو کامیابی حاصل ہو گی۔ ورنہ ڈانواں ڈول انسان کی کوئی حیثیت نہیں۔ جو دن میں تین تین عقیدے بدلتا ہے۔ یہ پہاڑ تمہارے لیے مستقل مزاجی کی علامت ہیں۔

زمین کے متعلق فرمایا کہ دیکھو! ہم نے کس طرح اسے پھیلا دیا۔ زمین اس قدر عاجز ہے کہ لوگ اسے ٹھوکریں مارتے ہیں، اس کو کھودتے ہیں۔ اس پر چلتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں۔ مگر اس میں اسقدر انکسار ہے۔ کہ ہر زحمت برداشت کرتی ہے۔ مگر کبھی کسی کے خلاف شکایت تک نہیں کرتی۔ اتنی جسیم ہونے کے باوجود اس قدر منکسر المزاج ہے۔ لہذا اگر عاجزی اور انکساری سیکھنا ہو تو زمین سے سیکھنا چاہیئے۔

الغرض قدرت کے یہ دلائل ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے بھی نہایت اہم ہیں۔ کہ انسان کو دنیا کی زندگی میں ان سے کیا سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ سادگی، بلند مقصدی، مستقل مزاجی اور انکساری وہ زریں اصول زندگی ہیں جو ہمیں ان دلائل قدرت سے حاصل ہوتے ہیں۔

پچھلی سورۃ میں بیان ہو چکا ہے "قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ" تزکیہ کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان کا عقیدہ پاک ہو۔ کفر و شرک کی آمیزش سے بری ہو۔ خوش اخلاق ہو۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق درست ہو۔ "وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ" کے مطابق انسان اپنے رب کے نام کو ورد زبان بنالے۔ جو خدا کو یاد کرتا ہے۔ اس کی توجہ حظیرۃ القدس کی طرف رہتی ہے اور جب کوئی آدمی زبان سے سبحان اللہ کہتا ہے۔ تو اس کا تصور خاص ہو جاتا ہے۔ جب یہ چیزیں ہوں گی، تو دنیا میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گا۔ دنیا میں اسلامی معاشرہ قائم ہو گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جمعہ کے خطبہ میں اس آیت کو شامل کر لیا تھا[2] "إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ

---

[1] پیام مشرق ص ۱۰۸ [2] المقام المحمود تفسیر مولانا سندھیؒ ص ۲۳ پارہ ۳۰

وَاِلْاِحسان" ان سورتوں میں مختصر طور پر یہ پروگرام آگیا ہے۔ اگلی سورتوں میں بھی آرہا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اور بنی نوع انسان کے تعلق کی درستگی فلاح کی ضامن ہے۔ تزکیہ اختیار کرنے کی تلقین سورۃ مدثر میں بھی کی گئی۔ گندگی سے پرہیز کی تعلیم "وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ" میں دی گئی۔ فرمایا ہر قسم کی گندگی ظاہری، باطنی، جسمانی، روحانی سب سے بچتے رہو۔

خدمتِ انسانی کا جو پروگرام قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ اس کو کہاں تلاش کریں۔ نہ انفرادی طور پر ملتا ہے۔ اور نہ اجتماعی طور پر۔ انسانیت کی خدمت کا فرض سب سے زیادہ حکومت پر عائد ہوتا ہے۔ مگر حکومتیں کیا کرتی ہیں۔ ان کے سامنے قرآن پاک کے بلند مقصد والا پروگرام کہاں ہے۔ ان کی توجہ تو سامانِ تعیش۔ سامانِ خورد و نوش، کوٹھی اور بنگلے کی طرف رہتی ہے۔ قرآن پاک کا پروگرام کس کے پاس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دلائل قدرت کے ساتھ سمجھایا ہے کہ تمہارے سامنے سادگی، مستقل مزاجی، بلند ہمتی اور عاجزی و انکساری کی مثالیں موجود ہیں انہیں دیکھ کر نصیحت پکڑو کہ انسان اور مومن کو کس قسم کا طرزِ زندگی اختیار کرنا چاہیئے۔

افکار کی پاکیزگی

اللہ تعالیٰ نے ہمیں پاکیزگی کی تعلیم دی ہے۔ افکار کی پاکیزگی اس کا ایک اہم جزو ہے آج دنیا گندے افکار سے بھری ہوئی ہے۔ دہریت، فحاشی، عریانی، اشتراکیت، امریکیت اور مادیت سب گندے افکار ہیں۔ جو انسان کی روحانیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اسے اس بلندی سے گرانا چاہتے ہیں۔ جس پر قرآن انہیں پہنچانا چاہتا ہے۔ کیا سینما دیکھ کر اخلاق سے گرے ہوئے اخبار پڑھ کر، برہنہ تصویروں والے رسالے دیکھ کر، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر گانے سن کر اور گانے والیاں دیکھ کر کسی کے افکار پاک رہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں یہ سب گندگی اور نجاست ہے۔ اخلاقی اور روحانی نجاست ہے۔

عقیدے کی پاکیزگی

دوسری طرف عقیدے کے معاملے میں دیکھ لیں۔ ہر طرف شرک، بدعت، قبر پرستی اور رسوم باطلہ کا دور دورا ہے۔ یہ سب گندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ" بت پرستی کی غلاظت سے بچو۔ یہ بت پرستی معنوی گندگی اور نجاست ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ بزرگوں کی تعظیم کر رہے ہو۔ تم تو گندگی میں پھنستے ہوئے ہو۔ مزاروں پر چادریں چڑھاتے ہو، قبروں کو چومتے ہو ان سے مرادیں مانگتے ہو۔ یہ شرک کی نجاست ہے۔

پاکیزگی کے سراسر خلاف ہے۔ قبروں پر میلے لگانا، انہیں عرس کا نام دینا، جھنڈیاں لگانا، نعرے بازی کرنا کیا یہی حضور علیہ السلام کی تعظیم ہے جو تم کر رہے ہو۔ تم تو شب و روز نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کر رہے ہو، ہر بات میں سنت کی مخالفت کرتے ہو۔ حلال و حرام کی تمیز سے بے نیاز ہو گئے ہو۔ سود اور رشوت کھاتے ہو۔ تجارت میں حرام کی کمائی کرتے ہو۔ تمہارے اندر پاکیزگی کیسے آئے گی۔ اگر پاکیزگی اختیار کرنا چاہتے ہو تو ظاہر و باطن کو پاک کرو۔ مال کو پاک کرو۔ دل کو پاک رکھو اور افکار میں پاکیزگی اختیار کرو۔

ڈیوٹی کی پابندی

ڈیوٹی میں کوتاہی آج کل کا معمول بن چکا ہے۔ کسی طرف دیکھ لیں۔ ہر شعبۂ زندگی میں اپنے فرائض سے اغماض پایا جاتا ہے۔ کوئی شخص اپنی ڈیوٹی پابندی کے ساتھ ادا کرنے پر تیار نہیں پولیس والے ہوں یا فوج والے یا کوئی دوسرے ملازمین، فرائض سے غافل ہیں۔ ان حالات میں پاکیزگی اور استقلال کہاں سے آئے گا۔ اللہ کے کوئی خاص بندے ہی ہیں۔ جنہیں اس زمانے میں ڈیوٹی کا پاس ہو۔ ہمارے شیخ حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ جنہوں نے پینتالیس برس تک دار العلوم دیوبند میں تعلیم دی، اُن کی بیوی فوت ہو گئی۔ عصر کے وقت دفن کر آئے مولانا مغرب کے بعد شمائل شریف کا درس دیتے تھے۔ کتاب بغل میں لی اور درس گاہ میں پہنچ گئے۔ لوگوں نے کافی کہا سنا حتیٰ کہ منت خوشامد بھی کی، مگر آپ نے فرمایا کہ میں تو اپنی ڈیوٹی ادا کروں گا۔ حدیث کی تعلیم سے زیادہ بڑھکر کون سا کام ہو سکتا ہے۔

حضور علیہ السلام نصیحت کرنیوالے ہیں

سورۃ کے آخری حصے میں ارشاد ہوتا ہے۔ کہ اے نبی علیہ السلام فَذَكِّرْ آپ ان لوگوں کو نصیحت کریں کیونکہ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ آپ نصیحت کرنے والے ہیں اور لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ آپ ان کافروں پر داروغہ نہیں ہیں۔ کہ انہیں پکڑ لائیں اور مسلمان بنالیں۔ آپ کا یہ کام نہیں ہے "اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ" آپ کا کام تو اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ جو روگردانی کرے گا۔ اور کفر کا راستہ اختیار کرے گا۔ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ اللہ اس کو بڑی سزا دے گا۔ اور وہ بڑی سزا کیا ہے۔ اللہ نے پہلی سورۃ میں بتا دیا يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى جو نصیحت سے اعراض کرے گا۔ وہ دوزخ کی بڑی آگ میں داخل ہو گا، ایسی آگ جو اس دنیا کی آگ سے

انہتر ۶۹ گنا تیز ہوگی[۱]۔ آپ کا کام نہ سزا دینا ہے۔ نہ کسی پر زجر کرنا ہے۔ آپ مذکّر ہیں۔ انہیں سمجھا دیں کہ کوتاہی نہ کریں۔ کیونکہ اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَھُمْ ان لوگوں نے ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا "وَاِلَى اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ" ہر چیز اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانے والی ہے۔ انسان کو بھی وہیں جانا ہے۔ پھر جب وہاں پہنچ جائے گا۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَھُمْ ان لوگوں کا حساب کتاب لینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔ ہم خود ان سے پوچھ لیں گے کہ دنیا میں کیا کچھ کر کے آئے ہو۔

اس آیت کی تلاوت پر حضور علیہ السلام نے یہ دعا سکھائی[۲] اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔ اے اللہ ہم سے آسان حساب لے۔ آسان حساب کی تفسیر پہلے آچکی ہے۔ کہ حساب صرف پیش کر دیا جائے۔ حضور علیہ السلام نے خود فرمایا[۳] کہ آسان حساب عرض ہے۔ جس کے ساتھ مناقشہ کیا گیا اور جس سے یہ پوچھ لیا گیا۔ کہ تم نے یہ کام کیوں کیا۔ بس وہ ہلاک ہوگیا۔ وہ بچ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ تم نے فلاں وقت یہ کام کیا، بندہ اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا۔ جاؤ یہ آسان حساب ہے۔

سورۃ اعلیٰ کی تلاوت میں اگر "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی" پڑھ کر وقف کیا جائے تو سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہنا چاہیئے۔ خواہ نماز پڑھ رہا ہو یا نماز سے باہر ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں[۴]۔ کہ نماز میں یہ تسبیح آہستہ کہنی چاہیئے۔ اور اگر وقف نہیں کیا مسلسل پڑھ لیا تو یہ تسبیح پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اس سورۃ مبارکہ میں جب اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَھُمْ تلاوت کیا جائے خواہ نماز میں ہو یا باہر ہو اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا آہستہ آواز میں کہنا چاہیئے۔

---

[۱] ترمذی صفحہ ۳۷۱، مسند احمد صفحہ ۴۷۸ ج ۲ [۲]

[۳] مسلم صفحہ ۳۸۷ ج ۲، بخاری صفحہ ۹۶۸ ج ۲، مستدرک حاکم صفحہ ۵۷ ج ۱ [۴] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۵۶ پارہ ۲۹

سُورَةُ الفَجْرِ

عم ۳۰ — الفجر ۸۹

درس اوّل — (آیت ۱ تا ۱۴)

سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً

سورۃ فجر مکی ہے اور یہ تیس ۳۰ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ
﴿۴﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿۵﴾ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴿۶﴾
اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿۷﴾ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ﴿۸﴾
وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿۹﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ﴿۱۰﴾
الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ
رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: قسم ہے فجر کی ﴿۱﴾ اور قسم ہے دس راتوں کی ﴿۲﴾ اور قسم ہے جفت اور طاق کی ﴿۳﴾ اور قسم ہے رات کی جب وہ چلتی ہے ﴿۴﴾ کیا اس میں قسم ہے عقلمندوں کیلیے ﴿۵﴾ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے کیا سلوک کیا قوم عاد کے ساتھ ﴿۶﴾ عاد ارم جو (لمبے لمبے) ستونوں والے تھے ﴿۷﴾ وہ کہ نہیں پیدا کیا گیا ان کی مثل شہروں میں ﴿۸﴾ اور کیا تم نے قوم ثمود کو نہیں دیکھا جنہوں نے وادی قریٰ میں پتھروں کو تراش تراش کر عمارتیں بنائیں ﴿۹﴾ اور کیا آپ نے میخوں والے فرعون کو نہیں دیکھا ﴿۱۰﴾ (یہ سب) جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی ﴿۱۱﴾ اور ان میں بہت زیادہ فساد برپا کیا ﴿۱۲﴾ تیرے رب نے ان پہ عذاب کا کوڑا برسایا ﴿۱۳﴾ پس تیرا رب گھات میں لگا ہوا ہے ﴿۱۴﴾

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سُوْرَةُ الْفَجْرِ ہے۔ اس کی پہلی آیت میں فجر کا لفظ مذکور ہے۔ اسی لفظ سے اس سورۃ کا نام فجر ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی تیس ۳۰ آیتیں ہیں

اور یہ ایک سو سنتیس [۱۳۷] الفاظ اور پانچسو ستانوے [۵۹۷] حروف پر مشتمل ہے۔

حدیث شریف [۱] میں آتا ہے۔ کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے نماز پڑھائی، اس میں قرأت زیادہ لمبی کر دی۔ لوگوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس شکایت کی۔ عشاء کی نماز کا واقعہ تھا۔ آپ نے فرمایا اتنی لمبی سورتیں کیوں پڑھتے ہو جس سے لوگوں کو شکایت پیدا ہوتی ہے اس کی بجائے "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" "هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ" "وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا" "وَالْفَجْرِ" وغیرہ سورتیں پڑھ لیا کرو۔ جو نسبتاً چھوٹی ہیں۔ تاکہ لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔

موضوع

گذشتہ سورتوں کی طرح اس سورۃ کے آخری حصے میں قیامت کے محاسبے کا ذکر ہے۔ درمیانی حصے میں اللہ تعالیٰ نے اُن اسباب کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جن کی وجہ سے انسان رُسوا ہوتے ہیں۔ ساتھ میں کامیابی کے اصول بھی بیان فرما دیئے ہیں۔ سورۃ کے ابتدائی حصے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے چند چیزوں کی تاکیدی قسمیں کھا کر اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ کس طرح انسانوں کی نگرانی کرتا ہے، اور پھر مجرموں کو سزا دیتا ہے۔

فجر اور دس راتیں

ارشاد ہوتا ہے وَالْفَجْرِ قسم ہے فجر کی وَلَيَالٍ عَشْرٍ اور قسم ہے دس راتوں کی۔ فجر اور دس راتوں سے کون سی فجر اور کون سی دس راتیں مراد ہیں اس میں مفسرین کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض [۲] فرماتے ہیں۔ کہ فجر سے مطلق فجر مراد ہے۔ جو ہر روز طلوع ہوتی ہے۔ اور دس راتوں سے مراد رمضان المبارک کی آخری دس راتیں ہیں۔ جن میں لیلۃ القدر جیسی عظیم اور بابرکت رات آتی ہے۔ اور جس میں عبادت کا اجر و ثواب ایک ہزار مہینے سے زیادہ ہوتا ہے۔ ان راتوں میں اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی شامل حال ہوتی ہے۔ دنیا میں عظیم انقلاب برپا کرنے والی کتاب قرآن پاک کے نزول کی ابتداء بھی اسی رات میں ہوئی۔

بعض [۳] فرماتے ہیں۔ کہ فجر سے مراد عید الاضحیٰ کی فجر ہے۔ جو کہ یوم النحر یعنی قربانی کا دن

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ص ۵۰۵ ج ۴ بحوالہ نسائی   [۲] روح المعانی ص ۱۱۹، ۱۲۰ ج ۳۰

[۳] تفسیر ابن کثیر ص ۵۰۵ ج ۴

ذی الحجہ کی دس راتیں ہیں ـــــــــــ مراد سے راتوں دس اور ۔ ہے
حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک[1] ہے کہ اللہ کے نزدیک عمل صالح جس قدر ان دنوں میں مقبول ہے ۔ کسی دوسرے دنوں میں نہیں ۔ بعض روایتوں[2] سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ ان دس راتوں کی عبادت لیلۃ القدر جیسی فضیلت رکھتی ہے ۔ ان ایام میں اللہ کا خاص تقرب حاصل کیا جاتا ہے

بعض[3] فرماتے ہیں کہ فجر سے مطلق فجر مراد ہے ۔ اور دس راتوں سے محرم الحرام کی دس راتیں مراد ہیں ۔ جن میں نبی علیہ السلام نے ہجرت کی تھی ۔ حضور علیہ السلام کی ہجرت مبارکہ دنیا میں بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ۔ اسلام کی اولین سلطنت اسی ہجرت کے نتیجہ میں قائم ہوئی ۔ اور پھر ہجرت مدینہ کے بعد اسی مقام سے دین اسلام کی روشنی پوری دنیا میں پھیلی ۔

جفت اور طاق

اس کے بعد فرمایا وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ قسم ہے جفت اور طاق کی ۔ بعض فرماتے ہیں[4] کہ جفت سے مراد ذی الحج کے دس دن ہیں ۔ اور طاق سے مراد دسویں تاریخ کے علاوہ پہلے نو دن ہیں نو کا عدد طاق ہے ۔ اور جب دسویں تاریخ آگئی تو جفت ہوگیا ۔ ذی الحج کی نویں تاریخ عرفہ کا دن ہوتا ہے ۔ اور یہ بڑا عظیم دن ہے ۔ یہ دن حج کا رکن اعلیٰ ہے ۔ اس دن دنیا کے کونے کونے سے لوگ آکر عرفات کے میدان میں اکٹھے ہوتے ہیں ۔ اور نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں دعائیں کرتے ہیں ۔ اسی دن اللہ تعالےٰ آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے ۔ اور فرشتوں کے سامنے ان حاجیوں پر فخر کرتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ اس دن جتنے بندوں کو آگ سے آزاد کرتا ہے کسی اور دن نہیں کرتا ۔ اللہ تعالےٰ اُن کی دعائیں قبول کرتا ہے ۔

بعض فرماتے ہیں[5] جفت اور طاق سے مراد نماز ہے ۔ کیونکہ نماز کی بعض رکعتیں جفت یعنی دو یا چار ہوتی ہیں ۔ اور بعض کی طاق جیسے نماز مغرب اور وتر ۔ بعض[6] مفسرین فرماتے ہیں کہ جفت اور طاق سے مراد مخلوق اور خالق ہے ۔ ساری مخلوق نر اور مادہ کی حیثیت سے جفت ہے

---

۱ مسند احمد ص ۲۲۴ ج ۳ ، ۲ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۰۵ پارہ ۳۰ ، ۳

۴ ۵ ۶

اور خالق صرف ایک اللہ ہے۔ کیونکہ وہ "لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ" ہے۔ اگر یہ معنی کیا جائے تو وَالشَّفۡعِ وَالۡوَتۡرِ کا معنی یہ ہوگا، قسم ہے مخلوق اور خالق کی۔

شب رواں

اس کے بعد ارشاد ہے وَالَّیۡلِ اِذَا یَسۡرِ قسم ہے رات کی، جب وہ رات میں چلے اگر یہ معنی کیا جائے تو اس سے مراد معراج کی رات ہے۔ جس رات حضور علیہ السلام مکہ معظمہ سے بیت المقدس اور پھر وہاں سے عالم بالا کی سیر پہ تشریف لے گئے۔ اور یہ بڑا عظمت والا اور فضیلت والا واقعہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو ساتوں آسمانوں کی سیر کرائی۔ اور اپنی عجیب وغریب نشانیاں دکھائیں۔

دوسرا معنی یہ بھی ہے۔ کہ قسم ہے اس رات کی جس رات حضور علیہ السلام نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے لیے ہجرت کا آغاز کیا تھا۔ حضور علیہ السلام مکہ سے چل کر غار ثور میں رات کے وقت ہی قیام پذیر ہوئے تھے اور وہاں سے نکل کر جب آپ اگلے سفر پہ روانہ ہوئے تھے، تو وہ بھی رات کا وقت ہی تھا۔

بعض[1] فرماتے ہیں۔ کہ رات سے مراد ہر رات ہے، جب چلتی ہے۔ پہلے فرمایا تھا وَالۡفَجۡرِ قسم ہے فجر کی۔ اب اس کے مقابلہ میں وَالَّیۡلِ کہا یعنی قسم ہے رات کی۔ فجر اور رات کو اسلام کے نور ہدایت اور کفر اور شرک کی تاریکی سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ اس قسم کا مضمون پہلے بھی گذر چکا ہے "وَالَّیۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ" اور قسم ہے رات کی جب پشت پھیر گئی۔ کفر وشرک رات کی تاریکی کی مثال ہے۔ "وَالصُّبۡحِ اِذَا اَسۡفَرَ" اور قسم ہے صبح کی جب روشن ہو گئی۔ اسلام صبح کی مثال رکھتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ یہ سب باتیں اس لیے ذکر کی گئی ہیں۔ تاکہ ان کی عظمت انسان پہ واضح ہو اور وہ حقیقت کو سمجھ سکیں۔ الغرض صبح سے مراد اسلام کی روشنی ہو یا مطلق صبح ہو، جب رات کی تاریکی آتی ہے۔ تو اس میں کئی واقعات وابستہ ہوتے ہیں۔ جو صبح کے وقت ظاہر ہوتے ہیں۔ ہر رات کے بعد صبح کا انقلاب آتا ہے۔ اور نئے نئے واقعات پیش آتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا قسم ہے رات کی جب

---

[1] معالم التنزیل صفحہ ۲۳۰ ج ۴، مظہری صفحہ ۲۵۴ ج ۱۰

یہ چلتی ہے۔

عقلمندوں کے لیے لمحہ فکریہ

ان تمام چیزوں کی قسم کھا کر جو چیز پیش کی جارہی ہے۔ وہ تو آگے آئیگی۔ درمیان میں فرمایا هَلۡ فِیۡ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیۡ حِجۡرٍ کیا اس میں قسم ہے عقلمندوں کے لیے یعنی عقلمند ان باتوں کو سامنے رکھ کر سوچ سکتے ہیں۔ اور کسی نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ کہ متکبرین کو ضرور سزا دی جائے گی۔ حجر کے دو معنی آتے ہیں۔ حجر عقل کو بھی کہتے ہیں اور منع کرنے کو بھی۔ عقل بھی انسان کو قبیح امور سے روکتی ہے۔ لہذا اسے حجر کہتے ہیں۔ اور ذی حجر کا معنی اصاحب عقل ہوگا۔ قرآن پاک میں حجر کا ہم معنی لفظ نُهٰی بھی آیا ہے۔ جیسے "اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی"۔ اسمیں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ یہ تمام چیزیں صاحب عقل لوگوں کے لیے بطور گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ منکرین سے ضرور باز پرس کرے گا۔ اور انہیں یونہی نہیں چھوڑ دیا جائے گا۔

قوم عاد و ثمود

اب وہ اصل بات آرہی ہے جس کے لیے مذکورہ چیزوں کی گواہی پیش کی گئی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَمۡ تَرَ كَیۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ کیا تم نے غور نہیں کیا۔ کہ تیرے رب نے قوم عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یعنی ان نافرمانوں کو کیسی عبرتناک سزا دی۔ اور وہ عاد کون تھے۔ اِرَمَ ذَاتِ الۡعِمَادِ بڑے لمبے لمبے ستونوں والے ارم۔ الَّتِیۡ لَمۡ یُخۡلَقۡ مِثۡلُهَا فِی الۡبِلَادِ کہ جن کی مثل شہروں میں پیدا ہی نہیں کی گئی۔ یہ اتنے متکبر لوگ تھے کہ ان کی مثال نہیں ملتی۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ موجود ہے" فَاَمَّا عَادٌ فَاسۡتَكۡبَرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ" قوم عاد نے زمین میں غرور و تکبر کیا۔

ارم در اصل ایک ایسا نام ہے جو قوم عاد اور ثمود دونوں اقوام پہ بولا جاتا ہے اس مقام پہ ارم سے مراد عادِ اولی ہے اور حضرت نوح علیہ السلام تک ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ عاد بن ارم بن عوص بن سام بن نوح۔ یہ عاد اولی ہیں۔ اور قوم ثمود عادِ ثانیہ کہلاتے ہیں۔ ارم کا لفظ ان پر بھی بولا جاتا ہے اور یہ لوگ عادِ اولی سے دو سو سال بعد گزرے ہیں۔ قوم عادیمن کی وادی دہنا میں آباد تھی۔

ل تفسیر ابن کثیر ص ۲۵۹ ج ۴ و ص ۵۰۷ ج ۴

ذات العماد بھی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ اس کا ایک معنی تو یہ ہے ۔ کہ یہ لوگ ستونوں جیسے قدآور تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے جس مقام پہ اُن کی ہلاکت کا ذکر کیا ہے ، وہاں فرمایا کہ وہ زمین پر ایسے پڑے تھے جیسے کھجور کے اکھاڑے ہوئے تنے ہوں ، اتنے بڑے قدآور تھے ۔ ان کی مثال پوری تاریخ میں نہیں ملتی ۔ ذات العماد کا دوسرا معنیٰ یہ ہے ۔ کہ یہ لوگ بڑی بڑی عمارتیں بناتے تھے ۔ مینار اور گنبد بناتے تھے ۔ اور ان پہ بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے ۔ اونچے اونچے مینار محض اس لیے بناڈالتے تھے کہ اوپر چڑھ کر گردو پیش کا نظارہ کر سکیں اور جب مزید رقم کی ضرورت ہوتی تھی ۔ تو پھر دوسروں کو لوٹتے تھے ۔ ان کی تیار کردہ بڑی عمارتوں کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں ۔ انہوں نے غمدان جیسی بلند عمارت بنائی جس کی اسی[1] منزلیں تھیں اور ہر منزل کا درمیانی فاصلہ چالیس فٹ تھا[2]

فضول خرچی

سورۃ شعراء میں قوم عاد اور ثمود کا حال تفصیل سے موجود ہے ۔ کہ یہ لوگ کس قدر فضول خرچ تھے ۔ پہاڑوں کو تراش کر بڑے نقش و نگار والی عمارتیں بناتے تھے ۔ بڑے صناع اور کاریگر تھے ۔ عمارتوں کے بیحد دلدادہ تھے ۔ شہرت اور نمائش کے لیے روپیہ پانی کی طرح بہاتے تھے ، مگر رفاہِ عامہ کا کوئی کام کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے ۔ ان کے لیے تَعۡبَثُوۡنَ کا لفظ بھی آیا ہے ۔ یعنی یہ لوگ فضول کام کرتے تھے ۔ تبوک اور وادی قریٰ میں ان کی عمارتوں کے نشانات موجود ہیں ۔

اس قسم کے عبث کاموں کی مثالیں اس زمانے میں بھی موجود ہیں ۔ مینارِ پاکستان پہ تقریباً ستر لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہے ۔ یہ صرف اس بات کی نشاندھی ہے ۔ کہ اس مقام پہ مطالبہ پاکستان کا ریزولیشن پاس ہوا تھا ۔ مگر اتنی خطیر رقم خرچ کرنے کا فائدہ ؟ اسی طرح مسٹر جناح کی قبر پر تقریباً سات کروڑ روپیہ صرف ہوا ۔ بڑے بڑے قیمتی پتھر درآمد کیے گئے ۔ جن سے اس کی تزئین ہوئی ۔ یہ چیزیں تَعۡبَثُوۡنَ میں آتی ہیں ۔ کام تو ایسے ہونے چاہئیں ۔ جن سے عام لوگوں کو فائدہ پہنچے ۔ تعلیم کا انتظام ہو ۔ سائنس میں ترقی ہو ۔ غرباء ، مساکین اور محتاجوں

لے   ۲ے

کی پرورش ہو۔ ان کو اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے میں مدد دی جائے۔ تبلیغ دین کی مد میں خرچ کیا جائے۔ دنیا بھر کے محتاج لوگ اعانت کے مستحق ہیں۔

الغرض یہ لوگ فضول چیزوں پہ بڑا خرچ کرتے تھے۔ مگر رفاہِ عامہ کے کاموں کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے مکے والوں کو سمجھایا کہ دیکھو اتنے بڑے بڑے قدآور لوگ تھے۔ ساز و سامان کا کوئی شمار نہ تھا۔ بڑی بڑی عالیشان عمارتوں کے مالک تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے اتنی سخت سزا دے دی۔ تم تو اُن کے عشرِ عشیر بھی نہیں ہو۔ تم اللہ کی سزا سے کیسے بچ سکتے ہو۔

قوم عاد کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ اور کیا تم نے قوم ثمود کو نہیں دیکھا جنہوں نے وادی قریٰ میں پتھروں کو تراش کر عمارتیں بنائیں ان پر عجیب و غریب نقش و نگار بنائے۔ ان عمارتوں کے نمونے تبوک اور وادی قریٰ میں آج بھی موجود ہیں۔ ثمودی عمارتوں کے کھنڈرات پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ کمال درجے کے کاریگر تھے۔ بڑے بڑے انجنیئر اور صنّاع تھے۔ عمارتوں کے علاوہ بڑی بڑی مورتیاں بنانے میں بھی ماہر تھے۔

فرعون

فرمایا وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ کیا آپ نے میخوں والے فرعون کو نہیں دیکھا۔ کہ اُس کا کیا حشر ہوا۔ پہلے عاد اور ثمود کا ذکر آیا، اب فرعون کی مثال پیش کی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے کس طرح سزا دی۔ مفسرین کرام نے ذِي الْأَوْتَادِ کے دو معنی کئے ہیں[1]۔ ایک یہ کہ فرعون جب سزا دیتا تھا۔ تو ہاتھوں اور پاؤں میں میخیں ٹھونک دیتا تھا۔ اور اوپر بھاری وزن رکھ کر لوگوں کو ہلاک کرتا تھا۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے۔ کہ فرعون کے گھوڑوں کے نعل بھی سونے کے تھے۔ اور اس کے خیمے کے کیل بھی سونے کے تھے۔ اس لیے اُسے ذِي الْأَوْتَادِ یعنی میخوں والا کہا گیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر تین مثالیں بیان کی ہیں۔ یعنی قوم عاد، ثمود اور فرعون کی۔ مقصد یہ ہے۔ کہ ان لوگوں نے تکبر کیا۔ زمین میں فساد برپا کیا تو اللہ تعالیٰ

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۱۴ پارہ ۳۰، ابن کثیر صفحہ ۵۰۸ جلد ۴

نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔

تفسیری روایتوں[1] میں آتا ہے۔ کہ شداد قوم عاد کا بادشاہ تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے عجیب و غریب طریقے سے پرورش پائی۔ غیر معمولی طریقے سے دولت مند اور پھر بادشاہ بنا۔ اور پھر اس کی موت بھی عجیب طریقے پہ واقع ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک بے نظیر شہر آباد کیا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے نظروں سے غائب کر دیا۔ روایت[2] ہے کہ یہ شہر اپنی جگہ پہ موجود ہے۔ مگر خدا کی حکمت کہ نظروں سے اوجھل ہے۔ شداد

کہتے ہیں[3]۔ کہ ملک الموت نے بارگاہ رب العزت میں عرض کی کہ اے مولا کریم میں نے کروڑوں لوگوں کی جانیں قبض کی ہیں۔ مگر دو جانیں ایسی ہیں۔ کہ جنہیں قبض کرتے وقت مجھے بڑا ہی صدمہ ہوا۔ میں نے تیرے حکم کی تکمیل ضرور کی۔ مگر نہایت ہی دکھ کے ساتھ۔ یہ دونوں ماں بیٹا تھے۔ واقعہ یوں ہوا۔ کہ جہاز غرق ہو گیا۔ اور ایک عورت اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ ایک تختے کا سہارا لینے میں کامیاب ہو گئی۔ تختہ دریا میں بہ رہا تھا۔ اور ماں بیٹا اس پر سوار تھے۔ مولا کریم! اچانک تیرا حکم ہوا اور میں نے ماں کی جان اسی تختے پر نکال لی۔ میرے لیے پریشان کن بات یہ تھی کہ ماں مر چکی ہے۔ اب بچے کا کیا حشر ہو گا۔

بچہ ایک ٹوٹے ہوئے تختے پر سوار ہے۔ اور تختہ ہر آن پانی کی لہروں کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔ جو کسی وقت بھی کسی تیز لہر کی زد میں آکر الٹ سکتا ہے۔ بچے کے لیے نہ خوراک کا انتظام ہے، نہ کسی نگہداشت کا بندوبست۔ دریا کے کنارے دھوبی کپڑے دھو رہے تھے۔ اچانک کسی کی نظر پڑی تو تختے کو کھینچ لائے۔ بڑے حیران ہوئے کہ ماں مر چکی ہے۔ اور بچہ بے یار و مددگار تختے پہ زندہ سلامت موجود ہے۔ وہ لوگ اس بچے کو اپنے سردار کے پاس لے گئے۔ سردار بیچارہ بے اولاد تھا۔ خوبصورت بچہ دیکھ کر اس کا دل آ گیا۔ اور اس نے بچے کو اپنی نگرانی میں لے کر اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔

یہ بچہ آٹھ نو سال کی عمر کا تھا کہ اپنے ساتھی بچوں کے ساتھ کہیں کھیل رہا تھا۔ اتنے

---

[1] تفسیر عزیزی پ ۳۰ ص ۲۰۹، [2] تفسیر عزیزی پ ۳۰ ص ۲۱، [3] تفسیر عزیزی پ ۳۰ ص ۲۱۱، حقانی ۸۶ ص ۱۲۶

میں بادشاہ وقت کی سواری کی آمد کا شور اٹھا۔ سب لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ مگر یہ بچہ اکیلا سڑک پہ کھڑا رہ گیا۔ بادشاہ کی سواری گذر گئی۔ اُس کے پیچھے اس کا عملہ پیدل آرہا تھا۔ ان میں سے ایک سپاہی کو راستے میں کہیں سُرمہ کی ایک پڑیا مل گئی۔ اتفاق سے اُس کی نظر کمزور تھی۔ اور سُرمہ کی اُسے ضرورت بھی تھی۔ لہٰذا اُس نے وہ سُرمہ بحفاظت اپنے پاس رکھ لیا۔ آنکھوں میں لگانے سے پہلے اُسے خیال آیا کہ یہ سُرمہ کوئی ضرر نہ پہنچائے، خود لگانے سے پہلے کسی دوسرے شخص پہ آزما لینا چاہیئے۔ قریب ہی وہ بچہ کھڑا تھا۔ اُس نے اُسی پہ آزمانا چاہا۔ بچے نے سُرمہ اپنی آنکھوں میں لگالیا۔ مگر جونہی اُس نے سُرمہ لگایا، اُسے زمین کی تہ میں موجود چیزیں بھی نظر آنے لگیں۔ اُس نے دیکھا کہ زمین کے اندر بہت سے خزانے پوشیدہ ہیں۔ بچہ ہوشیار تھا۔ اُس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ کہ سُرمہ لگانے کی وجہ سے اُس کی آنکھوں میں سخت تکلیف پیدا ہو گئی ہے جب سپاہیوں نے یہ صورت حال دیکھی تو سُرمہ وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔

بچہ سُرمہ کی پڑیا لے کر گھر پہنچا اور خوشی خوشی باپ کو سارا واقعہ بتا دیا۔ سردار بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا ہمارے پاس آدمی بھی ہیں۔ گدھے بھی ہیں۔ تم سُرمہ لگاؤ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ جہاں کہیں خزانہ پاؤ۔ ہمیں بتاؤ ہم نکال لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بچے کے بتانے پہ وہ لوگ خزانے نکالنے لگے۔ اور تھوڑے عرصہ میں وہ امیر آدمی بن گیا۔

بچہ جوان ہوا تو اُس نے پَر پُرزے نکالنے شروع کئے۔ دولت کی فراوانی تھی۔ زمین کے تمام خزانے اس کی نظروں میں تھے۔ اُس نے آہستہ آہستہ بہت سے آدمی اپنے ساتھ ملائے اُس کے بعد تمام سرداروں کو اِدھر اُدھر کر دیا اور خود سردار بن گیا۔ آخر نوبت یہاں تک آئی کہ اُس نے بادشاہ کے ساتھ بھی ٹکر لے لی۔ اُسے مغلوب کر کے خود بادشاہ بن گیا۔

اس بچے کا نام شداد تھا۔ اور یہ وہی بچہ تھا جس کی ماں "تختے" پہ ہی مر گئی تھی۔ اور یہ اکیلا دریا کی لہروں کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ جب یہ برسرِ اقتدار آیا۔ تو اُس نے حکم دیا۔ کہ ایک ایسا کمال درجے کا شہر آباد کیا جائے جس کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی ہو۔ اس میں ایک عالی شان باغ ہو۔ جس میں دنیا کی ہر چیز میسر ہو۔ جب وہ

باغ ہر لحاظ سے مکمل ہوگیا۔ تو شداد نے ارادہ کیا۔ کہ جاکر اس کا نظارہ کرے۔ مگر ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچا تھا۔ کہ ملک الموت کو حکم ہوا۔ اور اس نے وہیں اس کی جان قبض کرلی اُسے اتنا موقع بھی نہ دیا۔ کہ اپنے بے مثال باغ کو ایک نظر دیکھ سکتا۔ ملک الموت نے کہا۔ کہ اے مولاکریم۔ اس شخص کی روح قبض کرتے وقت بھی مجھے نہایت صدمہ پہنچا۔ کہ وہ شخص ہر چیز تیار کرکے اُسے دیکھ بھی نہ سکا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ وہی بچہ ہے جس کی ماں تختے پر مرگئی تھی۔ اور تجھے اُس پر ترس آیا تھا۔ اُس بچے نے بڑے ہوکر نافرمانی کی۔ خدا کے حکم سے بغاوت کی، سرکشی اختیار کی۔ مگر ہم نے اُسے خود ساختہ جنت میں قدم رکھنے کی بھی مہلت نہ دی۔ اور اُسے باہر ہی ہلاک کردیا۔ اسی باغ کے متعلق مشہور ہے۔ کہ وہ دنیا میں موجود ہے۔ مگر انسانی نظروں سے اوجھل ہے۔ امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ایک صحابی کا اونٹ گم ہوگیا تھا۔ وہ اونٹ کی تلاش میں کہیں اُس علاقے میں جانکلا، تو اللہ تعالیٰ نے اُسے وہ سب کچھ دکھا دیا تھا۔ وہ صحابی وہاں کی کوئی نشانی بھی ساتھ لایا تھا۔ اُس نے یہ واقعہ حضرت امیر معاویہؓ کے پاس بیان کیا۔ انہوں نے کافی تلاش کرایا مگر کسی کو نہیں ملا۔ اللہ تعالیٰ نے غائب کردیا۔

سزا کا کوڑا

بہر حال اللہ تعالیٰ نے مغرور اور سرکش لوگوں کی تین مثالیں بیان فرمائیں ان میں ایک قوم عاد ہے، جو یمن میں آباد تھی۔ دوسری قوم ثمود جو عرب کے شمال میں آباد تھی۔ اور تیسرا فرعون جو مصر میں مقیم تھا۔ اللہ تعالےٰ کا قانون پوری کائنات پر حاوی ہے۔ یہ کسی خاص علاقے یا خاص وقت میں محدود نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے دنیا کے مختلف علاقوں کی تین مثالیں بیان کرکے اس بات کی طرف توجہ دلائی۔ کہ ان لوگوں نے خدا کے قانون کے ساتھ بغاوت کی۔ خود سری اختیار کی۔ اور یہ وہی لوگ ہیں اَلَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی فَاَکْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ اور اس میں بہت زیادہ فساد برپا کیا۔ لوگوں پر ظلم و زیادتی کرتے رہے۔ غرور اور تکبر میں مست رہے۔ ان کو سب سے بڑی بیماری جو لاحق تھی۔ وہ شرک کی بیماری تھی۔ جو ان کے رگ وریشہ میں سرایت کرچکی تھی۔

ان تمام خرابیوں کا نتیجہ یہ ہوا فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ اور سب کو ٹھکانے لگا دیا۔ کسی ایک کو بھی باقی نہ چھوڑا۔

اِنَّ رَبَّکَ لَبِالۡمِرۡصَادِ تیرا رب گھات میں لگا ہوا ہے۔ وہ گھات جہاں سے ہر ایک کی نگرانی ہوتی ہے۔ اور جسے حظیرۃ القدس کہا جاتا ہے، جس طرح شکاری گھات میں لگا ہوتا ہے۔ جونہی شکار کو غافل پاتا ہے، فوراً حملہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی نگرانی کرتے ہیں۔ جب کوئی شر و فساد میں حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ تو اللہ کے حکم سے سزا کا کوڑا برستا ہے اور تمام فسادی ہلاک ہو جاتے ہیں۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسم کھا کر یہی ارشاد فرمایا کہ تیرا رب مغرور لوگوں کو ضرور سزا دے گا۔ اور اس ضمن میں دنیا کے مختلف خطوں سے تین نمونے بھی دکھا دیے۔

درس دوم (آیت ۱۵ تا ۲۰)

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ
ؕ ⑮ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ
ۚ ⑯ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ⑰ ۙ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ
ۙ ⑱ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ⑲ ۙ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ⑳ ؕ

ترجمہ: بہرحال انسان کہ جب اس کا رب اسے آزماتا ہے اور اس کو عزت دیتا ہے اور اس کو نعمت بخشتا ہے۔ تو وہ کہتا ہے میرے رب نے میری عزت کی (۱۵) اور بہرحال انسان کہ جب اس کا رب اُسے آزماتا ہے اور اس پر اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا (۱۶) ایسا ہرگز نہیں! بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے (۱۷) اور مسکین کے لیے کھانا مہیا کرنے کی طرف کسی کو ترغیب نہیں دلاتے (۱۸) اور تم وراثت کو سمیٹ سمیٹ کر کھاتے ہو (۱۹) اور تم مال سے جی بھر کر محبت کرتے ہو (۲۰)

گذشتہ سے پیوستہ

ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کی قسم اٹھا کر یہ بات سمجھائی۔ کہ دنیا میں تکبر کرنے والوں کو آخرت میں ضرور سزا ملے گی۔ پھر مثال کے طور پر عاد، ثمود اور فرعون کا ذکر فرمایا۔ "کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ" یہ تمام لوگ وہ تھے۔ جنہوں نے شہروں میں سرکشی اختیار کی، فساد برپا کیا، تو تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ کیونکہ تیرا پروردگار نگرانی کر رہا ہے۔ وہ گھات میں ہے۔ اور دیکھ رہا ہے۔ یہ لوگ خود بادشاہ تھے یا بادشاہ پرست تھے۔

انسانوں کی چار قسمیں

کل چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ جن میں سے تین قسم کے لوگ ناکام ہوتے ہیں۔ اور چوتھا گروہ کامیاب ہوتا ہے۔ قرآن پاک کے اس مقام پر صرف دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے جن کی مثال عاد ثمود یا فرعون سے دی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو یا تو خود بادشاہ تھے۔ یا بادشاہ پرست تھے۔ بادشاہ پرست وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ خواہ بادشاہ کی رائے صحیح ہو یا غلط۔ اور یہ دونوں طبقے ہلاک ہوتے

ہیں، تیسرا طبقہ زر پرست ہے۔ جسے سرمایہ پرست یا سرمایہ دار بھی کہتے ہیں۔ آیات زیر درس میں اس گروہ کا حال بیان ہو رہا ہے، اور پھر سورۃ کے آخر میں چوتھے گروہ کا حال آئے گا۔ جو کامیاب و کامران ہے۔ اور جس کو فلاح نصیب ہوگی۔ یہ وہ طبقہ ہے۔ جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہے، اور جس کے دل میں بنی نوع انسان کی ہمدردی موجزن ہے۔

زر پرست طبقہ

ارشاد ہوتا ہے۔ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ بہر حال انسان جب اُس کا رب اُسے آزماتا ہے۔ فَاَكْرَمَهٗ اُس کو عزت دیتا ہے۔ وَنَعَّمَهٗ اور اس کو نعمت بخشتا ہے فَيَقُوْلُ پس وہ انسان کہتا ہے۔ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ میرے رب نے میری عزت کی۔ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ اور بہر حال انسان کہ جب اُس کا رب اس کو آزماتا ہے۔ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ اور اُس پر روزی تنگ کر دیتا ہے۔ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ہے۔ یہی وہ تیسرا طبقہ ہے۔ کہ جسے جب نعمت ملتی ہے۔ تو خوش ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میری بڑی عزت افزائی ہوئی میں اسی چیز کا حقدار تھا۔ وہ سمجھتا ہے۔ کہ اُسے جو نعمت حاصل ہوئی ہے۔ وہ اُسے اپنے ذاتی کمال اور ہنر کی وجہ سے ملی ہے۔ قارون کے واقعہ میں موجود ہے۔ جب اُسے یاد دلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال میں اللہ کا حق بھی ادا کرو۔ تو کہنے لگا۔ اللہ نے مجھے مال و دولت کہاں دیا ہے" اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ" بلکہ یہ تو مجھے میرے علم و ہنر کی بنا پر ملا ہے، مجھ پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے۔ میں نے اپنی محنت سے مال اکٹھا کیا ہے۔ میں اس میں سے زکوٰۃ وغیرہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آج بھی اکثر لوگوں کی یہی ذہنیت ہے۔ دولت آتی ہے۔ تو سمجھتے ہیں کہ ہم نے سائنس، ٹیکنالوجی صنعت و حرفت یا تجارت کے ذریعے کمائی ہے، وہ اسے اللہ تعالیٰ کا فضل یا اُس کی مہربانی نہیں سمجھتے۔ قرآن پاک نے مشرکین کا حال بھی اسی طرح کا بیان کیا ہے، وہ بھی کہتے تھے نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ "ہمارے پاس مال اور اولاد کی فراوانی ہے۔ ہمیں سزا نہیں مل سکتی۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہمیں دولت اس لیے ملی ہے کہ ہم اس کے اہل ہیں۔ کم عقل یہ نہیں سمجھتے کہ دولت کا میسر آنا یا اس کا نہ ملنا آزمائش کے طور پر ہوتا ہے خدا تعالیٰ مال و زر عطا کر کے آزماتا ہے۔ کہ یہ میرا شکریہ ادا کرتا ہے۔ یا کفرانِ نعمت کرتا ہے۔ میرے حقوق ادا کرتا ہے۔ یا غصب کرتا

ہے۔ اسی طرح بعض اوقات انسان کو مال سے محروم کر کے آزماتا ہے۔ کہ اس حالت میں انسان کون سا رویہ اختیار کرتا ہے۔

خدا سے شکوہ

فرمایا کہ جب کسی کے پاس مال کی قلت ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ روزی تنگ کر دیتا ہے۔ تو پھر وہ خدا تعالیٰ کا شکوہ کرتا ہے۔ کہ اُس نے مجھے ذلیل کر دیا۔ وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ پاتا کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہے۔ وہ مجھے جانچنا چاہتا ہے۔ کہ ایسی حالت میں میں کہاں تک صبر و شکر کا دامن تھام سکتا ہوں۔ اس کے برخلاف وہ خدا پر الزام تراشی کرنے لگتا ہے کہ اُس نے اُسے ذلیل و رسوا کر دیا۔ اس قسم کے زرپرست لوگ دولت میسّر آجانے پر اپنے آپ کو خدا کا محبوب سمجھنے لگتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ہم خدا کے لاڈلے ہیں، جبھی تو ہمیں مال و دولت حاصل ہوئی۔ مشرکین مکہ بھی کہتے تھے کہ خدا ہم پر راضی ہے۔ وہ بھی اس وہم میں مبتلا تھے۔ حالانکہ مال و دولت کی فراوانی خدا کے محبوب ہونے کی دلیل نہیں بلکہ یہ تو حکمت خداوندی کی بنا پر ملتی ہے۔ "وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ" اگر اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے لیے رزق کے یکساں دروازے کشادہ کر دیتا ہے، تو وہ سرکشی میں مبتلا ہو جاتے۔ "وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ" مگر رزق تو اللہ تعالیٰ اپنے خاص اندازے کے مطابق نازل فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ مصلحت کو بہتر جانتا ہے۔ انسان نہیں سمجھ سکتا۔ بعض اوقات خدا تعالیٰ نیکوکار لوگوں کو تنگی میں مبتلا کرتا ہے۔ ان کے درجات بلند کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ اپنے نافرمان بندوں کو آسودگی عطا کر کے ان کی آزمائش کرتا ہے۔

محض مال کی فراوانی محبوب ہونے کی نشانی نہیں۔ بلکہ کامیابی کا مدار تو نیکی اور اعمال صالحہ پر ہے۔ عربی کا محاورہ ہے عِزَّةُ الدُّنْيَا بِالْمَالِ وَعِزَّةُ الْاٰخِرَةِ بِالْاَعْمَالِ یعنی دنیا کی عزت عام طور پر مال کے ذریعے حاصل ہوتی ہے، اور آخرت کی سرخروئی نیک اعمال کی بدولت ملتی ہے، مگر مال و دولت کی فراوانی کامیابی کی دلیل نہیں ہے۔ مال تو فرعون کو بھی اللہ نے بہت دیا مگر وہ خدا کا محبوب نہیں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مالی لحاظ سے کوئی وقعت نہیں تھی، مگر خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ فراخی اور تنگی اللہ تعالیٰ کی حکمت کی بنا پر آتی ہے۔

تاکہ وہ تمہیں آزمائے۔ اور یہ جانچ سکے۔ کہ تم اُس کے مقرر کردہ ضابطے پر عمل کرتے ہو یا اُس کے خلاف چلتے ہو۔

یتیم اور مسکین پرورری

فرمایا کہ تمہارے رزق میں تنگی اللہ تعالیٰ ذاتی عناد کی بنا پر نہیں کرتا کَلَّا ایسا ہرگز نہیں جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ بلکہ تنگی رزق کی وجہ یہ ہے۔ کہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ تم پر ناراض ہو کر تمہیں ذلیل کرتا ہے۔ یتیم کی عزت سے ہاتھ کھینچ کر تم جرم کے مرتکب ہو رہے ہو۔ بیٹے اور بیٹی کی عزت تو کرتے ہو۔ مگر ایک بے کس اور بے سہارا یتیم کی خبر گیری نہیں کرتے۔ اسی طرح نوع انسانی کے کمزور طبقوں مساکین وغیرہ کی اعانت کا کوئی انتظام نہیں کرتے۔ اپنی خوشحالی کا ہر آن فکر رہتا ہے۔ مگر معاشرے کے نادار افراد کی ضروریات کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ مسکین کے لیے کھانا مہیا کرنے کی طرف کسی کی توجہ نہیں دلاتے۔ کسی کو اس بات پر برانگیختہ نہیں کرتے کہ وہ مساکین کے معاش کا بندوبست کرے۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ رزق تنگ کر دیتا ہے۔ اور انسان کہتا ہے کہ اللہ نے اُسے ذلیل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ تو چاہتا ہے۔ کہ یتیم اور مسکین کی پرورش کی جائے۔ مگر ادھر زر پرست لوگوں کا حال یہ ہے۔ کہ وہ یتیموں اور مسکینوں کا حق بھی لوٹ کھسوٹ کے ذریعے کھا جاتے ہیں۔ حدیث پاک[1] میں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ خَيْرُ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِيْنَ فِيْهِ يَتِيْمٌ يُحْسَنُ إِلَيْهِ مسلمانوں کا بہترین گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو اور اس کے ساتھ احسان کیا جا رہا ہو۔ اسی طرح فرمایا وَشَرُّ بَيْتٍ فِي الْمُسْلِمِيْنَ يُسَاءُ إِلَيْهِ بدترین گھرانا وہ ہے۔ جس میں یتیم موجود ہو اور اُس سے بدسلوکی کی جا رہی ہو۔ یتامیٰ اور مساکین کی پرورش کے لیے قرآن پاک میں بہت کچھ آیا ہے بڑی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اسی طرح طبقے کے اس محروم گروہ کی حق تلفی پر بھی سخت وعید آئی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا جو لوگ یتیم کا ناحق مال

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۵۰۹ و ابن ماجہ صفحہ ۲۶۲

کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ ڈال رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ کا فرمان ہے کہ معاشرے کے کمزور لوگوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ جو سوسائٹی اپنے کمزور طبقوں کا خیال نہیں رکھتی۔ وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ کہ انسان اپنے عیش و آرام میں محو رہے دولت کی فراوانی سے کھیلتا رہے۔ لہو و لعب پر بے دریغ خرچ کرتا رہے۔ مگر یتیم و مسکین کی طرف سے آنکھیں پھیر لے۔ اُسے معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالیٰ اُسے مال و دولت دے کر آزما رہا ہے۔ کہ وہ اپنے جیسے ہی بھائی بندوں کی کیا خدمت کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان[1] ہے اَنَا وَ کَافِلُ الْیَتِیْمِ کَھَاتَیْنِ یعنی میں اور یتیم کا پرورش کرنے والا قیامت کے روز ساتھ ساتھ ہوں گے۔ آپ نے تو یتیم پروری کی اس حد تک ترغیب دلائی۔ مگر یہ زرپرست اس طرف سے بالکل غافل ہو گیا ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا۔ حضور! میرے دل میں کچھ سختی پیدا ہو گئی ہے۔ میں اپنے آپ میں سنگدلی پاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا[2] یتیم کے سر پہ ہاتھ رکھو خدا تمہاری سنگدلی دور کر دے گا۔

الغرض فرمایا کہ ذلت کے یہ دو اسباب ہیں۔ کہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور مسکین کے معاش کا انتظام نہیں کرتے۔ اگر خود یہ کام نہیں کر سکتے۔ تو اس سے ادنیٰ درجے کا کام یہ ہے کہ کسی دوسرے کو ہی اس کام پر آمادہ کر دو۔ کہ وہ یتیم کے ساتھ احسان کرے۔

وراثت میں حق تلفی

ذلت کا تیسرا سبب اللہ تعالےٰ نے یہ بیان فرمایا وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا یعنی تم وراثت کو سمیٹ سمیٹ کر کھاتے ہو۔ مطلب یہ کہ حلال و حرام کی تمیز روا نہیں رکھتے۔ اپنا حصہ بھی کھا گئے اور دوسروں کا حصہ بھی۔ بہنوں کے حصے کی وراثت بھی خود ہی ہضم کر گئے اس بات کا خیال ہی نہیں کیا۔ کہ حرام کھا رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے والد شیخ اسد علیؒ نے وراثت میں اپنی بہنوں کا حق ادا نہیں کیا تھا۔ ساری زمین اپنے پاس رکھ لی۔ جب مولانا تعلیم حاصل کرنے کے بعد گھر آئے تو اس معاملہ میں والد صاحب سے اختلاف پیدا ہو گیا۔ آپ نے سمجھانے کی کوشش

---

[1] مسند احمد ص ۵۲۷ ج ۳، مسلم ص ۴۱۱ ج ۲، بخاری ص ۸۸۸ ج ۲، ترمذی ص ۲۸۵، [2] مسند احمد ص ۳۸۷ ج ۲

کی کہ بہنوں کا حق ادا کرنا چاہیئے۔ جب والد صاحب اس پر رضامند نہ ہوئے، تو مولانا نے علیحدگی اختیار کر لی۔ گھر سے کھانا کھانا ترک کر دیا۔ کیونکہ اس میں دوسروں کا حق ملا ہوا تھا آہستہ آہستہ باپ کو سمجھ آگئی اور اُس نے بہنوں کا حق ادا کیا۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے گھر سے کھانا کھانا شروع کر دیا۔[1]

اس قسم کی بے شمار مثالیں آج بھی موجود ہیں۔ کہ طاقتور کمزور کا حق کھا گئے۔ ایک بھائی آٹھ بہنیں ہیں۔ مگر بھائی اکیلا ہی سارا مال کھا گیا۔ کسی کو کچھ نہیں دیا۔ حالانکہ یہ قطعی حرام ہے مگر آج کون تمیز کرتا ہے۔ سمیٹ سمیٹ کر کھانے کا مطلب یہی ہے۔ کہ حلال وحرام کا امتیاز اٹھ جائے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ ایسا کرنا ہلاکت اور تباہی کو دعوت دینا ہے دنیا میں بھی ذلت اٹھائے گا۔ اور آخرت میں بھی خدا کے غضب کا نشانہ بنے گا۔ کہ حقوق العباد میں کوتاہی کی ہے۔ بیگانہ مال کھانا کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ اللہ تعالےٰ کا واضح ارشاد ہے "وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔ یہ حرام ہے۔

مال کی محبت

ذلت کا چوتھا سبب یہ فرمایا وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا تم مال سے جی بھر کر محبت کرتے ہو۔ یعنی مال کی محبت میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہو۔ کہ جائز اور ناجائز کا فرق ختم ہو جاتا ہے مال کی محبت ایک فطری امر ہے۔ بشرطیکہ جائز حد تک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا "وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ" بے شک مال کی محبت میں انسان پکا ہے۔ مگر یہ محبت اتنی غالب نہیں آجانی چاہیئے۔ جس سے صحیح اور غلط، حلال وحرام، جائز اور ناجائز کا امتیاز باقی نہ رہے۔ یہ مال فرائض سے غافل نہ کر دے ہر وقت مال سمیٹنے کی فکر ہے، نہ نماز کی پرواہ ہے۔ اور نہ زکوٰۃ ادا کرنے کی فرصت ہے۔ یتیم اور مسکین کی طرف محبت بھری نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا حج فرض ہو چکا ہے۔ مگر اسے اپنے کاروبار سے فرصت نہیں۔ یہ چیز مذموم ہے۔ اس پر ضرور مؤاخذہ ہو گا۔ اور یہی چیز ہے جسے اللہ نے ذلت کا چوتھا سبب قرار دیا ہے۔

---

[1]

مسلم[1] شریف کی روایت میں ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ مال خدا کی نعمت ہے اگر یہ جائز طریقے سے حاصل ہو۔ تو اچھا ساتھی ہے۔ اس مومن کا لِمَنْ اَدّٰی حَقَّ اللّٰہِ جو مال میں سے اللہ کا حق ادا کرتا ہے۔ اُس کے حق میں مال بہتر ہے۔ اور جو شخص حق ادا نہیں کرتا۔ مال کی محبت میں منہمک ہے۔ نہ اللہ کا حق ادا کرتا ہے اور نہ اُس کے بندوں کا، نہ فرائض کا فکر ہے۔ نہ نوافل کا تو ایسے شخص کے لیے یہی مال وبال جان ہے۔ اور ذلّت کی وجہ ہے۔

الغرض فرمایا پہلے تینوں گروہ یعنی بادشاہ، بادشاہ پرست اور زر پرست یہ سب ناکام ہیں۔ اس دنیا میں بھی انہیں ذلت ورسوائی حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ان کا محاسبہ ہوگا۔ اگلی آیات میں اُس چوتھے گروہ کا حال آئے گا۔ جو دنیا اور آخرت دونوں جگہ کامیاب ہے۔ یہ وہی گروہ ہے۔ جو ایمان کے نور سے منور ہوا۔ اور خدمتِ انسانی کا جذبہ اپنے اندر پیدا کیا۔

---

[1] مسلم صـ۲۳۶/ج۱

عــمّ ۳۰   الفجر ۸۹

درس سوم   (آیات ۲۱ تا ۳۰)

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾
وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ۬ یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى
﴿۲۳﴾ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ ﴿۲۴﴾ فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ
اَحَدٌ ﴿۲۵﴾ وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ
﴿۲۷﴾ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴿۲۸﴾ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ
﴿۲۹﴾ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﴿۳۰﴾   ع ۱ / ۳۰

ترجمہ:۔ خبردار! جب زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا ﴿۲۱﴾ اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے ﴿۲۲﴾ اور اس دن جہنم کو لایا جائے گا اس دن انسان یاد کرے گا اور کہاں فائدہ دے گا اس کو یاد کرنا ﴿۲۳﴾ کہے گا انسان کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے آگے کچھ بھیجا ہوتا ﴿۲۴﴾ پس اس دن نہیں سزا دے گا اس جیسی سزا کوئی ﴿۲۵﴾ اور نہیں جکڑے گا اس جیسا جکڑنا کوئی ﴿۲۶﴾ (ارشاد ہوگا) اے اطمینان والے نفس ﴿۲۷﴾ اپنے رب کی طرف لوٹ جاؤ اس حالت میں کہ تم خود بھی خوش ہو گے اور خوش کیے ہوئے ﴿۲۸﴾ پس میرے بندوں میں شامل ہو جاؤ ﴿۲۹﴾ اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ ﴿۳۰﴾

گذشتہ سے پیوستہ

سورۃ کے ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم اٹھائی "وَالْفَجْرِ وَلَیَالٍ عَشْرٍ" دس راتوں سے بالعموم رمضان المبارک کی آخری دس راتیں مراد لی جاتی ہیں۔ کیونکہ اسی آخری دہاکے میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ جو کہ نوع انسانی کے لیے چشمۂ ہدایت ہے۔ اس کے بعد جفت اور طاق یعنی ذی الحجہ کی نویں اور دسویں تاریخ کی قسم کھائی ہے جب لوگ حج کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اور سنت ابراہیمی کے اتباع میں قربانی کرتے ہیں۔ قرآن پاک لوگوں کے سامنے صحیح پروگرام پیش کرتا ہے جس پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ جو کہ کسی

انسان کا منتہائے مقصود ہو سکتا ہے قربانی کا مقصد بھی یہی ہے۔ کہ اللہ کی محبت سے سرشار ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے حکم الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اس کی محبت کے حصول کے لیے قربانی پیش کی تھی، اور قرآن پاک کا پروگرام انسان میں یہی جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔

اس مقام پر عقل کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ کیا ان باتوں میں عقلمندوں کے لیے مقام غور و فکر نہیں ہے۔ کہ انسان اپنی عقل کے مطابق قرآن کریم کے بتلائے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہو تاکہ اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو، اور وہ ترقی کی منازل طے کرتا چلا جائے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی محبت کی کشش ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربان گاہ پر لے گئی۔ اور انہوں نے اپنی طرف سے قربانی پیش کر دی۔ اگر ایسی محبت خداوندی پیدا ہو جائے۔ تو پھر قوم کی وہ حالت نہیں ہو گی، جو قوم عاد اور ثمود کی ہوئی۔ پھر نہ کوئی بادشاہ اپنی بادشاہت پر غرور کرے گا اور نہ کوئی بادشاہ پرست جھوٹی خوشامد کرے گا۔ اسی طرح کوئی زر پرست مال و دولت کو ہی اول و آخر نہیں سمجھ بیٹھے گا۔ بلکہ مستحقین کے حقوق ادا کر کے اپنے مال کا تزکیہ کر لے گا۔

محاسبہ لازمی ہے

مال کے پجاری اور دولت کے پرستار سمجھتے ہیں۔ کہ ان کی عیش و عشرت اسی طرح قائم رہے گی۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ایسے لوگ سخت غفلت میں مبتلا ہیں۔ اس غفلت و نادانی کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کَلَّا ہرگز نہیں۔ یعنی ان لوگوں کا خیال باطل ہے کہ ان کا محاسبہ نہیں ہو گا۔ فرمایا ایک وقت آنے والا ہے جب ہر شخص کے اعمال سامنے آئیں گے۔ اس سے باز پرس ہو گی۔ اگر اس کے دل میں خدا کی محبت موجود ہے۔ وہ فرائض ادا کرتا رہا ہے۔ تو ترقی کی منزل پر پہنچے گا۔ اور اگر اس نے اپنی زندگی غفلت میں گذار دی ہے خدا کے حکم کی نافرمانی کرتا رہا ہے۔ تو خدا کی گرفت سے بچ نہیں سکے گا۔ اسی لیے زجر کا لفظ فرمایا کَلَّا خبردار! ایسا نہیں ہو گا۔ بلکہ محاسبے کی منزل آگے آنے والی ہے۔

زمین کوٹ دی جائیگی

وہ منزل کب آئے گی اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا جب زمین کو کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ جیسے فرمایا يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا "پہاڑ گرد بن جائیں گے۔ وہ منزل اس

وقت آئے گی۔ کائنات کا یہ موجودہ نظام ختم ہو جائے گا۔ زمین کو ملیا میٹ کر دیا جائیگا۔ یہ آلات تبدیل کر دیے جائیں گے۔ یہاں پہ زمین کی طرف اشارہ کر کے بات سمجھا دی۔ باقی باتیں پہلے گذر چکی ہیں۔ کہ آسمان پھٹ جائیں گے۔ فرشتے بھاگ کر کنارے پہ پہنچ جائیں گے۔ ستارے ٹوٹ جائیں گے اور سمندر خشک ہو جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا وہ محاسبے کی منزل اس وقت آئے گی جب یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے

جب یہ وقت آئے گا۔ تو پھر وَجَاءَ رَبُّكَ تیرا رب آئے گا یعنی اُس کا نزول قہری تجلی سے ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی قہری تجلی کے ساتھ اُس دن ظاہر ہو گا۔ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا اور اُس دن فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ نہایت عاجزی کے ساتھ قطار در قطار موجود ہوں گے۔ سب سے آگے اللہ کے مقرب ترین فرشتے یعنی حاملین عرش ہوں گے۔ پھر حول العرش والے۔ یعنی عرش کے قرب و جوار والے۔ اس کے بعد آسمان والے پھر زمین والے۔ سب درجہ بدرجہ صفیں باندھے کھڑے ہوں گے۔

جہنم قریب کر دی جائیگی

میدان محشر برپا ہو گا وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ اور اس دن جہنم کو اُس میدان کے قریب کر دیا جائے گا۔ تمام لوگ جمع ہوں گے۔ خدا تعالیٰ اپنی قہری تجلی کے ساتھ نزول فرمائے گا اور قریب دوزخ ہو گی۔ جسے دیکھ کر لوگ دہشت زدہ ہو جائیں گے۔ مسلم شریف[1] کی حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے۔ کہ میدان حشر میں جہنم کو لائے جانے کی کیفیت یہ ہو گی کہ اللہ کے فرشتے دوزخ کو ستر ہزار زنجیروں کے ذریعے کھینچ کر لائیں گے۔ ہر زنجیر کو کھینچنے کے لیے ستر ہزار فرشتے مقرر ہوں گے، جو اُسے اس طرح کھینچ کر میدان حشر کے قریب لائیں گے جس طرح کسی بڑی کشتی یا جہاز کو کھینچ کر لایا جاتا ہے۔ دوسری روایت[2] میں آتا ہے۔ کہ دو سو سال کی مسافت سے جہنم کا جوش و غضب نظر آنے لگے گا۔ اور دہشت کے مارے لوگ نَفْسِي نَفْسِي پکاریں گے۔ یہ حالات ابتدائے محشر میں ہوں گے۔ اس کے بعد جب قدرے سکون ہو گا، تو درجہ بدرجہ محاسبے کا عمل شروع ہو جائے گا۔

---

۱ مسلم صفحہ ۳۸۱/۲   ۲ تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۱۰۱ پارہ ۲۹

اس دن کی نصیحت بے سود ہوگی

فرمایا جب انسان یہ حالات دیکھے گا تو یَوۡمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الۡاِنۡسَانُ تو اس دن انسان یاد کرے گا، ہائے میں نے قرآن پاک کا پروگرام سنا ہی نہیں تھا۔ میں اللہ کی محبت سکھانے والے لوگوں کے قریب تک نہ گیا۔ میں نے اللہ کے نبیوں کی بات بھی ٹھکرا دی تھی۔ اس دن اس کو نصیحت یاد آئے گی۔ اور وہ اپنے کیے پر افسوس کا اظہار کرے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاَنّٰی لَہُ الذِّکۡرٰی آج اسے نصیحت کہاں فائدہ دے گی۔ نصیحت پکڑنے کا وقت ضائع کر چکا ہے۔ آج اس کا کفِ افسوس ملنا کسی کام نہ آئے گا۔ ایک روایت[1] میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام کے صحابی محمد بن عمرہؓ فرماتے ہیں کہ اس دن یہ کیفیت ہوگی۔ کہ اگر انسان پیدا ہوتے ہی سجدہ ریز ہو جاتا۔ اور عمر بھر خدا کی عبادت میں مصروف رہتا۔ تو وہ دن ایسا ہوگا کہ وہ انسان پھر بھی افسوس کرے گا۔ کہ مولیٰ کریم میں تیری بندگی کا حق ادا نہ کر سکا۔

اس دن نیکوکار بھی افسوس کریں گے، کاش کہ کچھ اور نیکی کر لیتے تو آج کام آتی بدکار تو سخت افسوس کریں گے۔ کہ انہوں نے تو زندگی ہی برباد کر دی۔ کہیں گے اللہ نے ہمیں زندگی دی مہلت دی مگر ہم نے کچھ نہ کیا۔ ساری عمر ضائع کر دی۔ اس دن انسان کہے گا یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِیۡ قَدَّمۡتُ لِحَیَاتِیۡ کاش میں نے اس زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا۔ کوئی اچھا کام کیا ہوتا۔ جو آج کام آتا۔ خدا کی محبت حاصل کی ہوتی کہ آج کسی کام آتی۔

خدا کی سزا بڑی سخت ہوگی۔

فَیَوۡمَئِذٍ پس اس دن اللہ تعالیٰ اتنی سخت سزا دے گا لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَہٗۤ اَحَدٌ کہ اتنی سخت سزا کوئی نہیں دے گا، اللہ کی سزا آج انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے[2] ہیں۔ کہ دنیا کی سزائیں جسمانی سزائیں ہیں۔ کسی کو مارا پیٹا یا جیل میں ڈال دیا۔ یہ سزائیں انسان برداشت کر سکتا ہے۔ کیونکہ ان سزاؤں کا اثر انسان کے دماغ پر نہیں ہوتا۔ مگر اللہ تعالیٰ آخرت میں ایسی سزا دے گا، کہ مجرمین کے خیال اور دماغ کو بھی سزائیں پابند کر دے گا۔ کسی دوسری طرف لگنے ہی نہیں دے گا۔ یہ ذہنی سزا ہوگی۔ جس میں بے حد کوفت ہوگی۔ اس کا تصور اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ اس سزا

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۵۱۰ ج ۴

[2] تفسیر عزیزی صفحہ ۲۲۲ پارہ ۳۰

میں ایسا جکڑے گا وَلَا یُوثِقُ وَثَاقَہٗ اَحَدٌ کہ ایسا جکڑنے والا اور کوئی نہیں۔ خدا تعالیٰ کی گرفت اتنی سخت ہوگی۔ سورۃ ھُمَزَۃ میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے " اِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ" مجرموں کو جہنم کے ستونوں میں بند کرکے اوپر ڈھکنے لگا دیئے جائیں گے اور وہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ یہ اس لیے ہوگا۔ کہ انہوں نے قرآن پاک کے پروگرام کو نہیں اپنایا۔ اللہ کی محبت حاصل نہیں کی۔ کفر و شرک میں غرق رہے توحید سے منہ موڑا ظلم و زیادتی کے مرتکب ہوئے۔ مال و دولت سے محبت کی۔ انسان پرستی میں مبتلا ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

نفس مطمئنہ کے لیے انعامات

اس سے پہلے بادشا۔ یا بادشاہ پرست اور زر پرست تینوں گروہوں کی ناکامی کا تذکرہ ہوچکا ہے۔ اب اس چوتھے گروہ کا بیان ہے۔ جو صاحب ایمان اور بنی نوع انسان کا ہمدرد ہے اس کے دل میں اللہ کی محبت جاگزیں ہے۔ اور وہ اللہ کی اطاعت کرنے والا ہے۔ اس گروہ کو خطاب ہو رہا ہے یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ اے اطمینان والے نفس، جسے دنیا میں اللہ کے احکام پر اطمینان حاصل تھا۔ اُسے یقین تھا کہ نیکی یہی ہے اور اسی میں فلاح ہے اُسے اللہ تعالیٰ کے احکام کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں تھا۔ اُسے روحانیت اور اطمینان قلب حاصل تھا۔ کیونکہ اطمینانِ قلب اللہ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے " اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" ایسے ہی لوگوں کو کہا جائے گا۔ کہ نفس مطمئنہ! اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ اپنے رب کی طرف لوٹ جاؤ۔ اس حالت میں کہ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً " تم خود بھی خوش ہوگے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں انعام واکرام سے نوازا ہے اور خدا کی جانب سے بھی تمہیں خوش کیا جائے گا۔ یعنی تم راضی اور مرضی دونوں صفات کے حامل ہوگے جیسا فرمایا " رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ" یعنی اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے۔ اس لیے کہ وہ لوگ اللہ کے ہر حکم پر راضی برضا تھے۔ اُن کے دلوں میں انشراح تھا۔ اللہ نے انعام دے کر ان کو راضی کر لیا۔ اور وہ خود بھی راضی ہوئے۔

عباد اللہ میں شمولیت

اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوجانے کے بعد انہیں دوسرا انعام یہ دیا جائے گا۔ کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے خاص بندوں کی جماعت میں شامل فرمالیں گے۔ حکم ہوگا فَادْخُلِي فِي عِبَادِي

میرے بندوں میں داخل ہو جاؤ۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ خطاب عالم آخرت کا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کامیاب ہونے والوں کو اپنی خاص جماعت میں شمولیت کا حکم دیں گے۔ مگر موت کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو یہی خوشخبری دی جاتی ہے۔ موت کے فرشتے بندۂ مومن کی روح کو کہتے ہیں۔ کہ خدا کی رحمت اور اس کی رضامندی کی طرف نکلو۔ برخلاف اس کے کافروں اور مشرکوں کو کہا جاتا ہے کہ خدا کے غضب اور ناراضگی کی طرف نکلو۔ اب تم پہ اللہ کا قہر نازل ہو گا۔[1]

الغرض حکم ہو گا۔ کہ میرے ان بندوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤ۔ جو دنیا میں میرے غلام تھے۔ مجھ سے محبت رکھتے تھے۔ میری توحید کے قائل تھے۔ اور فرمانبرداری کرنے والے تھے۔ میری اس پاک سوسائٹی کے ممبر بن جاؤ۔ دنیا میں بھی یہی حال ہے۔ جو اچھی سوسائٹی حاصل کرے گا، کامیاب زندگی گذارے گا۔ اور جسے بری مجلس میسّر آئی وہ دنیا میں بھی ناکام ہو گا۔ اور آخرت میں بھی۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقام کی آرزو ہے۔ تو اچھی سوسائٹی اختیار کرو۔ آخرت میں عباد اللہ کی جماعت میں شمولیت حاصل ہو گی۔

راضی برضا

حضرت عبداللہ بن عباسؓ مفسر قرآن ہیں۔ اسلامی حکومت میں گورنری کے عہدے پہ فائز رہے۔ مگر آخری عمر میں سب کچھ چھوڑ کر تبلیغ دین میں مصروف ہو گئے۔ ساری عمر قرآن پاک ہی پڑھاتے رہے۔ امام ابن کثیرؒ نے لکھا ہے[2] کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ طائف میں رہائش پذیر ہو گئے۔ جب آپ کی وفات ہوئی آپ کی میت رکھی گئی۔ تو لوگوں نے دیکھا ایک عجیب و غریب پرندہ ظاہر ہوا جو پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ پرندہ اس جگہ میں داخل ہو گیا۔ جہاں آپ کی نعش رکھی تھی۔ مگر کسی شخص نے پرندے کو باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سخت تعجب ہوا، تاہم جب انہیں قبر مبارک میں دفن کر دیا گیا تو آواز آئی "يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً" یہ آواز ضرور آئی۔ مگر آواز دینے والا نظر نہیں آیا۔ غرضیکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنی محبت میں سرشار ایمان والوں کے ساتھ ایسا بھی سلوک

---

[1] مسند احمد ص ۲۸۸ ج ۴، نسائی ص ۲۶۰ ج ۱ [2] تفسیر ابن کثیر ص ۵۱۱ ج ۴

کرتا ہے۔ یہ اُس کی خاص رحمت ہے جسے حاصل ہو جائے۔

حضرت خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ محدث، فقیہ اور امام تھے شیخ الاسلام کے لقب سے ملقب تھے۔ بڑے حق پرست تھے۔ بادشاہ بھی اُن سے خوف کھاتے تھے۔ آپ نے لمبی عمر پائی۔ بیمار ہوئے تو بیٹا خدمت کرتا تھا۔ ظہر کی نماز ادا کر کے اپنے کمرے میں تشریف لے گئے۔ ایک بالکل اجنبی عجیب وضع قطع کا آدمی باہر سے آیا اور خواجہ صاحبؒ کا پوچھا کہ اُن سے ملاقات کا خواہشمند ہے۔ بیٹے نے ملاقات کی وجہ دریافت کی۔ تو کہنے لگا۔ یہ خط ابھی خواجہ صاحب کو دے دو۔ بیٹا خط لے کر اندر گیا۔ کھولا تو اس میں لکھا تھا "یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً" بیٹا فوراً باہر آیا تاکہ مہمان کو دیکھے، مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔ اُسی لمحہ واپس اندر گئے تو خواجہ صاحب واصل بحق ہو چکے تھے[1]

اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ کرامت ظاہر کر دی اور بتلا دیا کہ اُس نے حضرت ملتانیؒ کو اپنے بندوں میں شامل کر لیا ہے۔ آخرت میں ہر کامل الایمان شخص کو اللہ تعالیٰ ایسا ہی خطاب فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو راضی اور مرضی کا خطاب دیا۔ پھر اپنے خاص بندوں کی جماعت میں شمولیت کی خوشخبری دی اور آخری انعام یہ دیا کہ "وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ" یعنی اے میرے بندے میری جنت میں داخل ہو جا۔ کہ رحمت کا مقام یہی ہے۔ یہ تینوں انعامات اللہ تعالےٰ نے ترتیب کے ساتھ بیان فرما دیے۔

پہلے اُن تین گروہوں کا ذکر آیا، جو ناکام ہوئے۔ اب آخر میں چوتھے گروہ یعنی کامیاب گروہ کا حال بھی بیان کر دیا۔ اور واضح کر دیا کہ فلاح صرف اسی پروگرام میں ملے گی۔ جو پروگرام قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ وہ قرآن پاک جو رمضان المبارک کی آخری دس راتوں میں نازل ہوا۔ اس کا عروج محبت الٰہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام کو یہی محبت کھینچ کر کے لے گئی اور وہ باپ بیٹا قربانی کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ وہی پروگرام ہے۔ جو فلاح و کامیابی کا ضامن ہے۔

---

[1] تذکرہ خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانی ص ۳۰۱

سُورَةُ البَلَدِ

درس اول — (آیت ۱ تا ۱۰)

سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ عِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۃ بلد مکی ہے۔ اور یہ بیس ۲۰ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ① وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ② وَوَالِدٍ
وَّمَا وَلَدَ ③ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ④ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ
يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ⑤ يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ⑥ اَيَحْسَبُ (وقف لازم)
اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ⑦ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ⑧ وَلِسَانًا
وَّشَفَتَيْنِ ⑨ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ⑩

ترجمہ:- میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی ① اور آپ اس شہر میں اترے ہوئے ہیں ② قسم ہے والد اور مولود کی ③ بے شک ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے ④ کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اس پر ہرگز کوئی قادر نہیں ⑤ کہتا ہے۔ میں نے بہت سا مال ہلاک (خرچ) کر ڈالا ⑥ کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا ⑦ کیا ہم نے انسان کو دیکھنے کے لیے دو آنکھیں نہیں دیں ⑧ اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے ⑨ اور ہم نے انسان کو دو گھاٹیاں بھی بتا دیں ⑩

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سُوْرَةُ الْبَلَدِ ہے۔ اس کی پہلی آیت میں بلد کا لفظ مذکور ہے جس سے سورۃ کا نام اخذ کیا گیا ہے۔ بلد شہر کو کہتے ہیں اور جس شہر کا اس سورۃ میں ذکر خیر آیا ہے وہ مکہ مکرمہ[1] کا شہر ہے۔ یہ مکی سورۃ ہے۔ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی بیس ۲۰ آیات، بیاسی ۸۲ الفاظ اور تین سو اکتیس ۳۳۱ حروف ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۵۱۱ ج ۴، روح المعانی ص ۱۳۳ ج ۳۰، تفسیر کبیر ص ۱۸۰ ج ۳۱

پچھلی سورۃ کے ساتھ ربط

مکی سورتوں میں عام طور پر بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔ پہلی سورۃ میں اللہ نے چار قسم کے لوگوں کا حال بیان فرمایا ہے۔ ان میں سے تین قسم کے لوگ ناکام ہیں۔ اور چوتھی قسم کے لوگ کامیاب ہیں۔ جو اہل ایمان ہیں۔ اور ان کا نفس دنیا میں نیکی اور ذکرِ الٰہی کے ساتھ اطمینان حاصل کرتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے کامیابی کی بشارت دی گئی ہے۔ اس سورۃ میں انسان کی بعض اخلاقی بیماریوں کا بھی ذکر ہے۔ جن کا علاج اس سورۃ میں پیش کیا گیا ہے۔

موضوع

اس سورۃ کا موضوع انسان کا مکلف ہونا ہے۔ نوعِ انسانی کے وجود کا تقاضا ہے کہ وہ مکلف ہو، یعنی قانون کی پابندی کرے۔ جب انسان کا مکلف ہونا ضروری ہو گیا۔ تو پھر اس کے ساتھ جزائے عمل بھی لازم ہے۔ لہٰذا اس سورۃ میں جزائے عمل کا ذکر بھی ہے تاہم بنیادی طور پہ اس سورۃ میں انسان کے مکلف ہونے کا ہی ذکر ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو مہمل پیدا نہیں کیا۔ بلکہ مکلف بنایا ہے۔ تاکہ وہ قانون کی پابندی اختیار کرے، جس کے نتیجے میں اُسے ترقی نصیب ہو گی۔

شہر مکہ

ابتدائے سورۃ میں دو چیزوں کی قسم کھا کر بات سمجھائی گئی ہے۔ پہلی قسم بلد یعنی شہر مکہ کی ہے۔ اور دوسری وَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ یعنی والد اور مولود کی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ یہاں لفظ لا تاکید کے لیے ہے۔ یعنی میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی وَاَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِ اور آپ اترے ہوئے ہیں اس شہر میں۔ حِل، حلول سے ہے۔ اور اس کا معنی اترنا ہے۔ مراد شہر مکہ مکرمہ ہے۔ جو کہ بلدہ طیبہ، بلد الحرام اور عزت والا شہر ہے۔ قرآن پاک میں بلدہ طیبہ کا ذکر کئی مقامات پہ آیا ہے۔ اس کی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ اس میں بیت اللہ شریف واقع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو مرکزِ ہدایت اور حرمت والا شہر قرار دیا ہے۔ اور اس کے خاص احکام ہیں۔ اس شہر پاک کا تذکرہ سورۃ تین میں "وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ" کے الفاظ میں آتا ہے۔ یعنی یہ امن والا شہر ہے۔ ایک دوسرے مقام پر آتا ہے۔ کہ اس شہر میں اللہ کا گھر ہے " وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا " جو اس میں داخل ہو گا اس کو امن نصیب ہو گا، دنیا میں اس کا خون محفوظ ہو جائے گا۔ اور اگر ایمان کے ساتھ داخل ہو گا۔ تو اسے دوزخ کی آگ سے امان حاصل ہو جائے گی۔ بہرحال یہ امن

والا شہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پاکیزہ شہر کی قسم اٹھائی ہے۔

عاشقانِ الٰہی کی بستی

یہ ایسا عزت اور برکت والا شہر ہے۔ کہ دنیا کے کونے کونے سے اللہ سے محبت رکھنے والے لوگ کھینچے چلے آتے ہیں دوسرے الفاظ میں یہ عاشقانِ الٰہی کی بستی ہے۔ جب حضور علیہ السلام ہجرت کے لیے مکہ مکرمہ کو خیر باد کہہ رہے تھے، تو زبان مبارک سے فرمارہے تھے[1] مَا اَطْيَبَكَ مِنْ بَلَدٍ۔ خدا کی قسم تم کتنے پاکیزہ شہر ہو۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ مجھ کو یہاں سے نہ نکالتے۔ مَا سَكَنْتُ فِيْ غَيْرِكَ تو میں تیرے سوا کسی اور شہر میں نہ ٹھہرتا۔ مگر مجبور ہوں۔ کہ کفار و مشرکین مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔ میری جان کے دشمن ہو چکے ہیں۔ اس لیے مجبوراً تیرا پڑوس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

فرمایا قسم ہے اس شہر کی۔ وَاَنْتَ حِلٌّ بِھٰذَا الْبَلَدِ حل کا ایک معنی تو یہ ہے کہ آپ اس میں اترے ہوئے ہیں۔ اور دوسرا معنی یہ[2] ہے۔ کہ یہاں پر آپ کے لیے لڑائی بھی حلال ہے یعنی آج تو آپ مجبوراً اس شہر کو چھوڑ رہے ہیں، مگر ایک وقت آئے گا۔ جب اس امن والے شہر میں آپ کے لیے لڑائی جائز ہو گی۔ اور آپ اس میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوں گے آپ کے سامنے کوئی سر اٹھا کر نہیں چل سکے گا۔ اور پھر فتح مکہ والے دن ایسا ہی ہوا۔ آپ نے فرمایا[3]۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے۔ یہ شہر حرمت والا ہے۔ یہاں پر لڑائی جائز نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے تھوڑی دیر کے واسطے صرف میرے لیے حلال قرار دی اس کے بعد قیامت تک وہی قانون نافذ ہے۔ کہ اس امن والے شہر میں لڑائی حلال نہیں ہے۔

انسان کسی وقت مشقت سے خالی نہیں

اللہ تعالیٰ نے پہلا گواہ شہر مکہ کو پیش کیا۔ اور دوسرے گواہ کے طور پر وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ کا نام لیا۔ یعنی قسم ہے والد اور مولود کی۔ یا آدم اور اولاد آدم کی۔ یہ دو قسمیں اٹھا کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا۔ خود یہ شہر گواہ ہے کہ اس شہر کو آباد کرنے میں کتنی مشقت اٹھانا پڑی؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ رض نے اس شہر کے بسانے میں کتنی تکلیفیں اٹھائیں۔ جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا

---

[1] ترمذی ص ۵۵۵ [2] ابن کثیر ج ۴ ص ۵۱۱، در منثور ج ۶ ص ۳۵۲ [3] مسلم ج ۱ ص ۴۳۷

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ط اور اس بات کو ذرا دھیان میں رکھو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بیت اللہ شریف کی دیواروں کو اونچا اٹھا رہے تھے۔ اور زبان سے یوں کہہ رہے تھے "رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ" اے خدا! ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے۔ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ گویا اتنی مشقت اٹھا کر ویں گھر کو آباد کیا اور پھر وہاں کی پوری آبادی کو کتنی محنت و مشقت میں سے گذرنا پڑا۔

اسی طرح والد اور مولود یا آدم اور اولادِ آدم بھی اس بات پر گواہ ہے۔ کہ انسان کی پیدائش کتنی مشقت طلب ہے۔ بچے کا جننا ایک عورت کے لیے کتنا مشکل کام ہے۔ بعض اوقات اسمیں جان بھی چلی جاتی ہے۔ قرآن میں یوں وضاحت ہے "حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا" یعنی ماں حمل کے دوران بھی مشقت اٹھاتی ہے۔ اور جنتے وقت بھی تکلیف برداشت کرتی ہے۔ اس کے بعد بچے کی تربیت بھی کتنا مشکل کام ہے۔ جب انسان بڑا ہو جاتا ہے۔ کوئی کاروبار کرتا ہے۔ مزدوری کرتا ہے یا ملازمت اختیار کرتا ہے؛ تو کوئی بھی کام مشقت سے خالی نہیں۔ یہاں یہی بات سمجھانا مقصود ہے۔

انسان مکلف ہے

جب انسان کو ہر قدم پر مشقت سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور اُسے تکلیف اٹھانا ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان مکلف ہے۔ اس کی فطرت اور بناوٹ کا تقاضا ہے۔ کہ وہ مکلف ہو۔ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے ملکیت اور بہیمیت دو قوتیں رکھی ہیں۔ جو کسی وقت بھی انسان سے جدا نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے۔ کہ انسان قوت ملکیت کو قوت بہیمیت پر غالب رکھے، تاکہ اُسے ترقی نصیب ہو۔ اگر ملکیت مغلوب ہوگئی تو انسان ناکام ہوگیا۔ یہ دونوں قوتیں آخرت میں بھی انسان کے ساتھ رہیں گی۔ گویا ان دونوں قوتوں کا تقاضا ہے۔ کہ انسان مہمل نہ ہو۔ بلکہ مکلف ہو۔ دوسری جگہ فرمایا "اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی" کیا انسان گمان کرتا ہے۔ کہ انسان کو مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ اور اس پر کوئی حکم جاری نہیں کیا جائے گا۔ اُسے کسی مشقت میں نہیں ڈالا جائے گا۔ کیا انسان یہ خیال کرتا ہے۔ نہیں نہیں۔ بلکہ انسان کی پیدائش ہی بتاتی ہے۔ کہ وہ مکلف ہے۔ ذرا غور کرو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اس شہر کو آباد کرتے وقت کتنی تکلیف برداشت

کی۔ وَاَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ اور اے خاتم النبیین! اب آپ اس شہر میں اترے ہوئے ہیں۔ اور کس قدر مصائب جھیل رہے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا کہ انسان خواہ کتنے بھی بلند مقام پر فائز ہو، وہ مشقت سے خالی نہیں۔ پچھلی سورۃ میں بھی گذر چکا ہے "یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ" اے انسان! بے شک تم مشقت برداشت کرنے والے ہو۔ اگر دنیا میں کوئی شخص مشقت سے خالی ہوتا تو حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے۔ کیونکہ آپ انسانیت کے تمام مراتب طے کر چکے ہیں۔ مگر آپ بھی مشقت برداشت کر رہے ہیں۔ تکلیف اٹھا رہے ہیں۔

انسان کی خام خیالی

تو فرمایا اَیَحۡسَبُ کیا انسان گمان کرتا ہے اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ اَحَدٌ کہ اس پر کوئی قادر نہیں۔ اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا۔ وہ جس طرح چاہے آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے۔ یَقُوۡلُ اَهۡلَکۡتُ مَالًا لُّبَدًا میں نے بہت سا مال ہلاک کیا ہے۔ یعنی اپنی مرضی سے خرچ کیا ہے۔ تاکہ آرام و سکون میسّر آسکے۔ اب مال خرچ کرنے کے بھی مختلف انداز ہیں۔ کوئی شراب نوشی اور بدکاری میں خرچ کرتا ہے۔ کوئی باطل رسومات ادا کرکے سکون کا متلاشی ہے۔ اور کسی کا مشغلہ دین اور رسول خدا کی مخالفت ہے۔ جس پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ عیسائیت اور یہودیت کے فروغ کے لیے کس قدر رقوم خرچ ہو رہی ہیں۔ ہندو ازم اور دیگر باطل مذاہب کی ترویج میں کیا کیا حربے استعمال ہو رہے ہیں۔ اربوں روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔ تاکہ مشن کامیاب ہو اور آرام و سکون کی دولت میسّر آسکے۔ دین اسلام کی مخالفت میں بے شمار دولت صرف کرکے اس پر فخر کیا جاتا ہے۔

تاریخ میں اعشیٰ شاعر کا واقعہ[1] ملتا ہے۔ وہ شخص حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ مگر مشرکین اس ملاقات سے خائف تھے۔ کہ اگر اعشیٰ نے اسلام سے متاثر ہو کر حضور (علیہ السلام) کی شان میں کوئی قصیدہ کہہ دیا۔ تو سارے عرب معتقد ہو جائیں گے۔ اور اس صورت میں اسلام کے آگے بند باندھنا ناممکن ہو جائے گا۔ وہ شخص اپنے زمانے کا اونچے درجے

---

[1] فی الادب الجاهلی ص ۲۹۱، ۲۹۵، ۲۵۹

کا شاعر تھا۔ جس طرح غالب یا میر تقی میر ہندوستان میں ہوئے ہیں۔ اس لیے عرب اس کی شعلہ بیانی کے معترف تھے۔

اسی اعشیٰ شاعر سے متعلق واقعہ[1] ہے۔ کہ کسی شخص کی کئی لڑکیاں تھیں، مگر غریب ہونیکی وجہ سے کوئی ان کا رشتہ لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اُسے کسی نے مشورہ دیا۔ کہ اعشیٰ کی دعوت کر ڈالو۔ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ شاعر ان دنوں میلے میں آیا ہوا تھا۔ اُس شخص نے اُسے گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ اور اس کی خوب خدمت تواضع کی۔ اعشیٰ نے خوش ہو کر اُس شخص کی تعریف میں قصیدہ کہہ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ بھی اس کی لڑکیوں کے لیے نکاح کے پیغام دینے لگے۔ چنانچہ مشرکین مکہ بھی سمجھتے تھے۔ کہ اگر اعشیٰ کی حضور (علیہ السلام) سے ملاقات ہو گئی۔ اور اُس نے حضور (علیہ السلام) کی شان میں قصیدہ کہہ دیا۔ تو سارا عرب متاثر ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے اُس شاعر کو حضور (علیہ السلام) کے پاس آنے ہی نہیں دیا۔

اگلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کہ یہ لوگ جن چیزوں میں آرام و سکون کے متلاشی ہیں۔ وہاں سے کچھ نہیں ملے گا۔ بلکہ آرام و سکون جن چیزوں میں ہے۔ وہ اور ہیں انسان سمجھتا ہے کہ اُس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ اُس پہ کوئی حاکم نہیں ہے۔ کوئی اس پہ قادر نہیں ہے۔ وہ جس طرح چاہے دولت خرچ کرے۔ فرمایا ایسا نہیں ہے بلکہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ وہ مکلف ہے۔ اور اس کے لیے قانون کی پابندی ضروری ہے۔ اگر ایسا ہے۔ تو پھر اُس کے ساتھ جزائے عمل بھی لازم ہے۔ ان تمام حقائق کے پیش نظر انسان کیسے سمجھتا ہے۔ کہ اُس سے کوئی پوچھنے والا نہیں یہ اس کی خام خیالی ہے۔

آنکھیں بڑی نعمت ہیں

فرمایا أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے۔ کہ اُسے کوئی نہیں دیکھتا۔ وہ جو چاہے کرے۔ اُس سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں۔ اگر وہ ایسا خیال کرتا ہے، تو غلط ہے، حالانکہ وہ نقیب اور حفیظ انسان کی نگرانی کر رہا ہے۔ بلکہ

---

[1] دیوان اعشیٰ الکبیر ص۲۱۶

"اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ" تیرا رب تو گھات میں ہے۔ دیکھ رہا ہے۔ کہ انسان کدھر جا رہا ہے۔ وہ جب چاہے گا شکنجے میں جکڑے گا۔ کیا انسان اس معاملے میں جاہل ہے یا وہ غافل ہے۔ مگر ہم نے تو انسان کو دیکھنے اور غور کرنے کے لیے اعضاء دیئے ہیں کیا وہ اُن کو بروئے کار نہیں لاتا؟ اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ کیا ہم نے انسان کو دیکھنے کے لیے دو آنکھیں نہیں دیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اُن آنکھوں کی قدر و قیمت اُن سے پوچھو۔ جو اس نعمت سے محروم ہیں۔ تمہیں یہ آنکھیں اس لیے دی ہیں۔ تاکہ ہر چیز کو غور سے دیکھ سکو۔ ان کے ذریعے کتاب کو پڑھ سکو، قرآن پاک پڑھ سکو، اللہ کے نافذ کردہ قوانین کا مطالعہ کر سکو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلیٰ نعمت عطا کی ہے۔ صحیح حدیث[1] میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اِذَا اَخَذْتُ كَرِيْمَتَيْ عَبْدِيْ جس کی دو عزت والی (آنکھیں) دنیا میں میں نے چھین لیں۔ اور اُس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ میں اُسے جنت کے اعلیٰ مقام تک پہنچائے بغیر راضی نہیں ہوں گا۔ شرط یہ ہے۔ کہ اس محرومی پر صبر کرے، اللہ تعالےٰ کا شکوہ نہ کرے۔ اسی لیے فرمایا کہ کیا ہم نے دو آنکھیں نہیں دیں۔ وَلِسَانًا اور زبان دی تاکہ اس سے بات چیت کر سکے۔ جس چیز کا علم نہ ہو، وہ پوچھ لے۔ قرآن پاک کا فرمان ہے۔ اگر کوئی بات معلوم نہیں ہے "فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ" تو جاننے والوں سے پوچھ لیا کرو۔ وہ تم کو بتلائیں گے کہ یہ بات درست ہے اور یہ چیز غلط ہے۔ زبان کی یہ افادیت ہے۔ نیز یہ بھی فرمایا وَشَفَتَيْنِ یعنی زبان کے علاوہ ہم نے دو ہونٹ بھی عنایت کیے۔ انہیں ذرا ہلاؤ اور بات پوچھ لو۔ یہ بھی تمہارے لیے ایک نعمت ہیں۔ تو گویا اللہ تعالےٰ نے انسان کو زبان دی اور ہونٹ دیئے تاکہ ان سے کام لے اور انجانی بات کو دریافت کر لے۔ تاکہ ترقی کی منازل طے کر سکے۔

دو راستے

فرمایا مذکورہ نعمتوں کے علاوہ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ہم نے انسان کو دو گھاٹیاں بھی بتا دیں۔ یہ ایمان اور نیکی کی گھاٹی ہے۔ اور یہ کفر و شرک اور معصیت کی گھاٹی ہے۔ جسے

---

[1] ترمذی ص ۳۴۶

چاہو قبول کر لو۔ اگر ایمان کی گھاٹی پر چڑھو گے تو کامیابی سے ہمکنار ہو گے۔ اور اگر کفر کی گھاٹی پر چڑھو گے، تو ہلاکت کے گڑھے میں گرو گے۔ خیر و شر کے یہ دونوں راستے ہم نے انسان کو دکھا دیئے ہیں۔ جسے چاہے اختیار کر لے۔ غرضیکہ انسان مشقت میں پیدا کیا گیا ہے اور وہ مکلف ہے، اُسے مہمل نہیں چھوڑا جائے گا۔ اگلی آیات میں زر پرستی جیسی بیماری کا علاج تجویز کیا گیا ہے جو انسان میں پیدا ہو جاتی ہے۔

عـمّ ۳۰ — البلد ۹۰

درس دوم — (آیت ۱۱ تا ۲۰)

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ
﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾
اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ
وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِيْنَ
ع ۱ ۲۰ ۱۵ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿۱۹﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾

ترجمہ:۔ پس انسان اونچی گھاٹی پہ کیوں نہیں چڑھتا ﴿۱۱﴾ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ وہ اونچی گھاٹی کیا ہے ﴿۱۲﴾ گردن کو آزاد کرنا ہے ﴿۱۳﴾ یا کسی بھوک والے دن کھانے کا انتظام کرنا ہے ﴿۱۴﴾ قرابت دار یتیم کے لیے ﴿۱۵﴾ یا مٹی میں ملے ہوئے مسکین کے لیے ﴿۱۶﴾ پھر ہو بھی یہ ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور وہ ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے ہیں اور رحم کی وصیت کرتے ہیں ﴿۱۷﴾ یہی لوگ دائیں ہاتھ والے ہیں ﴿۱۸﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہ لوگ بائیں ہاتھ والے ہیں ﴿۱۹﴾ ان پہ بند کی ہوئی آگ مسلط ہو گی ﴿۲۰﴾

گذشتہ سے پیوستہ

ابتدائی آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کی قسم اٹھا کر بیان فرمایا ہے۔ کہ انسان مشقت میں پیدا کیا گیا ہے۔ اور انسان کے مکلف ہونے کے لیے مشقت کا ہونا ضروری ہے انسان خیال کرتا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ آزاد رہے گا۔ اور اس پہ کوئی پابندی عاید نہیں ہو گی۔ وہ اپنی مرضی سے فضول باتوں پہ مال خرچ کرتا ہے۔ اور پھر توقع یہ رکھتا ہے کہ آرام و چین نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ بات بالکل غلط ہے۔ اللہ قادر مطلق ہے۔ اُس نے انسان کو مشقت کی حالت میں پیدا کیا ہے۔ دنیا میں کوئی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ انبیاء علیہم السلام کی جماعت انسانیت کے درجہ کمال پر ہوتی ہے۔ مگر انہوں نے بھی کس قدر تکالیف برداشت کیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو افضل ترین ہستی ہیں۔ آپ نے مکی اور مدنی زندگی میں کس قسم کے مصائب برداشت کیے۔ لہٰذا کوئی بھی انسان تکلیف سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

اگر انسان کو سمجھ نہیں ہے تو ہم نے اُسے آنکھیں دی ہیں۔ تاکہ دیکھ لے۔ زبان اور ہونٹ دیے ہیں تاکہ کسی سے پوچھ لے۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کے دو راستے بھی انسان کو بتلا دیے۔ ان سے گھاٹی سے تعبیر کیا ہے۔ نجد کا معنیٰ اونچی جگہ ہے۔ عرب میں نسبتاً بلند علاقے کو نجد اور پست علاقے کو غور کہتے ہیں نجدین سے مراد دو گھاٹیاں یا دو راستے ہیں۔

حصول سکون کے ذرائع

بعض مفسرین کرام[1] فرماتے ہیں۔ کہ دو اونچی گھاٹیوں سے مراد دو اونچی قسم کی باتیں ہیں۔ یعنی اول تمام جہان کی اصلاح اور دوم اپنی روحانی ترقی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ ہم نے ان دو اونچے درجے کی باتوں کی طرف انسان کی راہنمائی کر دی ہے۔ کہ انسان کس طریقے سے انہیں انجام دے سکتا ہے۔ پہلی آیت میں گذر چکا ہے۔ "یَقُوۡلُ اَهۡلَكۡتُ مَالًا لُّبَدًا" کہتا ہے کہ میں نے بڑا مال خرچ کیا مگر کن امور میں؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں یا اللہ کا مقابلہ کرنے میں جیسا کہ ہر زمانے کے کفار کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنا آرام و سکون حاصل کرنا مقصود ہے اپنے ذہن کو تسلی دینے کے لیے رسم و رواج میں خرچ کیا، شراب و کباب میں ضائع کیا۔ انسان فخریہ کہتا ہے۔ کہ میں نے اتنا مال خرچ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آرام و سکون کبھی حاصل نہیں ہو گا۔ بلکہ سکون و آرام کے ذرائع تو اور ہیں۔ فرمایا فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ انسان اونچی گھاٹی پر کیوں نہیں چڑھتا۔ تاکہ اُسے آرام و سکون حاصل ہو۔ ترقی اور کمال نصیب ہو۔ بظاہر لفظ تو عقبۃ استعمال کیا ہے۔ جس کا معنیٰ اونچی گھاٹی یا ٹیلہ ہے۔ مگر اس کے تحت جو باتیں سمجھائی ہیں۔ وہ اعلیٰ درجے کی ہیں۔ محض کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ جانا مقصود نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ اگر انسان دو مشکل کام انجام دے لے، تو گویا وہ اُونچی گھاٹی پر چڑھ گیا۔ اسی لیے فرمایا ہے کہ انسان اونچی گھاٹی پہ کیوں نہیں چڑھتا آگے عقبۃ کی تشریح فرمائی۔ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ اور کس نے بتلایا کہ وہ اونچی گھاٹی کیا ہے۔ قرآنِ پاک میں جہاں بھی مَاۤ اَدۡرٰىكَ کا لفظ آیا ہے وہاں اللہ تعالیٰ نے خود تشریح فرما دی ہے۔ اور جہاں کہیں يُدۡرِيۡكَ کا لفظ آیا ہے۔ وہاں بات کو واضح نہیں کیا۔ جیسے "وَمَا يُدۡرِيۡكَ

---

[1] المقام المحمود تفسیر حضرت مولانا سندھیؒ ص ۹۷ پ ۳۰

لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا" آپ کو کیا معلوم کہ شاید قیامت قریب ہی ہو۔

اونچی گھاٹی بلند ذہنیت

اونچی گھاٹی کا ایک دوسرا مفہوم یہ ہے۔ کہ انسان اپنی ذہنیت کو اونچا رکھے اگر ایسا کرے گا۔ تو کمال نصیب ہو گا۔ اور اگر ذہنیت پست رکھے گا، تو کمال نصیب نہیں ہو گا۔ لہذا خود غرضی والی پست ذہنیت سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ جس طرح پہاڑی جیسے بلند مقام پر پہنچ کر راستے بالکل صاف نظر آتے ہیں۔ دور دور تک سڑکیں اور دیگر اشیاء واضح نظر آتی ہیں۔ اسی طرح ذہنیت کی بلندی سے خیر و شر کے دونوں راستے صاف نظر آئیں گے۔ ایسے انسان کو دنیا کی اصلاح کا راستہ بھی نظر آئے گا۔ اور اپنی روحانی ترقی کا راستہ بھی بالکل واضح نظر آئے گا۔ اس کے برخلاف اگر ذہنیت کو پست رکھا۔ تو کچھ نظر نہیں آئے گا۔

ظاہر ہے کہ گھاٹی پر چڑھنا مشقت طلب کام ہے۔ اور یہ صبر سے طے کیا جا سکتا ہے۔ آگے صبر کا ذکر ہے۔ اور وہ اصول بھی بیان کر دیئے ہیں۔ جن کی بدولت انسان کو حقیقی سکون اور چین نصیب ہو سکتا ہے۔ اگر انسان خسیس چیزوں میں مبتلا ہو گا، تو وہ حیوانیت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کیونکہ محض کھانا پینا، جفتی کرنا، دوسروں کا استحصال کرنا، دھوکے فریب سے دوسروں کا مال کھانا، دوسروں کو تکلیف پہنچانا، یہ تو حیوانی کام ہیں۔ انسان میں انسانیت اس وقت پیدا ہو گی، جب وہ ذہنیت کو بلند کرے گا۔ انسان کا ذہن بلند ہو گا۔ تو یہی گھاٹی پہ چڑھنا ہے یہیں سے اُسے راستہ صاف نظر آئے گا۔ جب تک خود غرضی، حرص، لالچ اور ظلم میں مبتلا ہے۔ انسانیت سے دُور ہے اور اُسے خیر و شر کی تمیز نہیں ہو سکے گی۔

غلامی سے آزادی دلانا

فرمایا آپ کو کس نے بتلایا کہ اونچی گھاٹی کیا ہے۔ پھر خود ہی جواب میں فرمایا فَكُّ رَقَبَةٍ گردن کو آزاد کرنا۔ جب قرآن پاک کے نزول کی ابتداء ہوئی۔ تو اس زمانے میں ساری دنیا میں غلامی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا عام رواج تھا۔ اسلام نے اصلاح شروع کی اور بتایا کہ غلامی اچھی چیز نہیں ہے۔ یہ خلاف فطرت چیز ہے۔ ہر انسان کو آزادی کا حق حاصل ہے۔ غلام اور آزاد برابر نہیں ہو سکتے، غلام کی ذہنیت پست ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن پاک نے آزادی کے راستے کی طرف راہنمائی کی اور مختلف طریقوں سے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ مختلف

جرائم کا کفارہ غلام کی آزادی قرار دیا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قسم کا کفارہ غلام کی آزادی ہے۔ اگر کوئی شخص ظہار کا مرتکب ہوا ہے۔ یعنی غلطی سے بیوی کو ماں بہن کہہ دیا ہے تو کفارہ میں پہلا نمبر فَكُّ رَقَبَةٍ یعنی غلام کی آزادی ہے۔ اگر کسی نے غلطی سے قتل کر دیا ہے تو حکم ہے کہ مومن غلام آزاد کرو۔ فی الفور اور بلا معاوضہ آزادی کے علاوہ ایک اور طریقہ بھی بتایا کہ " فَكَاتِبُوهُمْ " غلاموں کو مکاتب بنالو۔ یعنی ان کے ساتھ طے کر لو کہ اتنی رقم ادا کر دیں تو آزاد ہیں۔ کاروبار کے لیے آزادی دے دو اور جب وہ مقررہ رقم ادا کر دیں تو مکمل آزادی دے دو۔ پھر مکاتب کی امداد کی ترغیب دی۔ کہ اگر اللہ نے تمہیں مال دیا ہے۔ تو مکاتب کی مدد کرو۔ تاکہ وہ آزادی حاصل کر سکیں۔ چنانچہ صحابہ رضا ایسے کرتے رہے ہیں۔

حضرت عبدالرحمٰن رض بن عوف جلیل القدر صحابی ہیں۔ مکے میں تجارت کرتے تھے۔ اور بڑے مالدار تھے۔ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو خالی ہاتھ تھے۔ مال و دولت، جائیداد ہر چیز مکے میں چھوڑ گئے۔ اور فقیر کی حیثیت میں مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے۔ انصار نے مدد کرنا چاہی، تو انہوں نے فرمایا کہ مجھے بازار کا راستہ بتا دو، میں اللہ کا فضل خود تلاش کروں گا۔ چنانچہ پہلے ہی روز جو تھوڑا بہت کام کیا۔ اس سے اپنے لیے کھانے پینے کا سامان خرید لائے[1] اللہ تعالیٰ نے کاروبار میں بڑی برکت عطا کی۔ خوب مال و دولت کمایا، زمین اور باغات خریدے۔ پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے مال دیا، اسی طرح آپ نے خرچ بھی فراخدلی سے کیا۔ روایت[2] ہے کہ آپ نے تیس[3] ہزار غلام خرید کر آزاد کیے۔ امہات المومنین رض کے لیے ایک باغ وقف کر دیا جس کی مالیت چار لاکھ تھی[3]۔ اس زمانے میں غلام بڑی قیمت پاتے تھے۔ کہتے ہیں[4] کہ امام زین العابدین رح کے پاس ایک غلام تھا۔ جس کی قیمت دس ہزار درہم یا ایک ہزار دینار تھی۔ اتنا قابل غلام تھا لوگوں نے خریدنا چاہا۔ تو آپ نے انکار کر دیا۔ فرمانے لگے میں نے یہ اللہ کے راستے میں آزاد کر دیا ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رض نے بھی خوب دولت کمائی اور ایک ہزار غلام آزاد کیا[5]

---

[1] بخاری ص ۷۵۹ ج ۲، ترمذی ص ۲۸۶ [2] حلیۃ الاولیا ص ۹۹ ج ۱، تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۳۲، [3] ترمذی ص ۵۳۷
[4] مسلم ص ۴۹۵ ج ۱ [5] تہذیب التہذیب ص ۳۳۰ ج ۵ واکمال علی المشکوٰۃ ص ۶۰۵

فَكُّ رَقَبَةٍ وسیع تر معنوں میں

یہ ہے فَكُّ رَقَبَةٍ گردن آزاد کرنا۔ اور اسی کو اونچی گھاٹی پر چڑھنے سے تعبیر کیا گیا ہے
مفسرین کرام[1] فرماتے ہیں۔ کہ فَكُّ رَقَبَةٍ سے مراد محض غلامی سے آزادی ہی نہیں بلکہ اگر کوئی جائز کام کی وجہ سے مقروض ہو گیا ہے۔ تو اُسے قرض سے نجات دلا دینا بھی فک رقبہ ہی ہے۔ اسی طرح جہالت سے نجات دلانا بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ علم کی ترویج کے لیے دولت خرچ کرو، تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کرو۔ کفر و شرک کے اندھیروں میں علم کی شمع روشن کرو۔ تاکہ تمہیں سکون نصیب ہو، تم شراب و کباب میں دولت صرف کر رہے ہو، کھیل تماشے اور شادی بیاہ کی رسومات پر روپیہ صرف کر رہے ہو۔ عالیشان عمارات میں روپیہ غرق کر رہے ہو سکون نصیب نہیں ہوگا۔ اگر حقیقی سکون چاہتے ہو تو اس اونچی گھاٹی پر چڑھو۔ جس کا حکم اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں۔

دنیا کے کروڑوں انسان کفر و شرک میں مبتلا ہیں۔ انہیں اس لعنت سے چھڑانے کے لیے کون دولت خرچ کرتا ہے۔ حالانکہ کفار اپنے پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کھربوں روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ یہ عیسائی مشنریاں جو اہل اسلام کا ایمان سلب کرنے پر کمربستہ ہیں۔ یہ حکومتوں کی امداد پر چل رہی ہیں۔ پاکستان سے متعلق ان کی رپورٹیں پڑھ لیں ہر سال عیائیوں میں کس قدر اضافہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے لے کر آج تک کے کوائف جمع کر لیں کہ کتنے لوگ عیسائی ہوئے ہیں۔ وہ لوگ محنت کرتے ہیں۔ ہسپتال اور سکول قائم کر کے لوگوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ مگر ادھر مسلمان ہیں کہ مال و دولت ہونے کے باوجود اسلام کی تبلیغ پر خرچ نہیں کرتے۔ تاکہ لوگ کفر و الحاد کی غلامی سے آزاد ہو سکیں۔ اسی لیے فرمایا کہ کرنے والے یہ کام ہیں۔ اس اونچی گھاٹی پر چڑھو۔ فَكُّ رَقَبَةٍ کا یہ معنی ہے۔

بیرونی ممالک کا دورہ کرنے والے لوگ بتاتے ہیں۔ کہ ان ممالک میں حصول حق کی تڑپ موجود ہے مگر اس پیاس کو بجھانے والا کوئی نہیں۔ اس معاملے میں جاپان کا ذکر خاص طور

---

[1] تفسیر عزیزی ص ۲۳۱ پ ۳۰

پر آرہا ہے۔ کوئی محنت کرے۔ وقت دے۔ روپیہ صرف کرے، تو بہت سے غیر مسلم اسلام کی دولت سے مالا مال ہو سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے۔ کہ کون قربانی کرتا ہے یہ ساری منزلیں محنت اور صبر سے ہی طے ہو سکتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا آرام و سکون اُس شخص کو نصیب ہوگا، جو اس گھاٹی پر چڑھے گا۔ مگر ہمارے ہاں دولت کے دروازے فحاشی اور عیاشی، رسم و رواج شرک و بدعات کے لیے تو کھلے ہیں، مگر صحیح تعلیم کے لیے نہ ہونے کے برابر۔ الغرض اونچی گھاٹی پر چڑھنے کا مطلب پہلے نمبر پر گردن آزاد کرنا ہے۔

یتیم اور مسکین کی مدد یا سوشل ورک

فرمایا اگر گردن آزاد نہ کر سکو، تو پھر سوشل ورک (اجتماعی کام) کی طرف توجہ دو وہ کیا ہے اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَۃٍ کسی بھوک والے دن کھانے کا انتظام کرنا۔ خاص طور پر راشننگ کے زمانے میں جب اناج کی قلت ہو تو یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَۃٍ یتیم قرابت دار کے لیے کھانے کا انتظام کرنا یا اُس کے معاش کا بندوبست کرنا۔ یہ بھی اونچی گھاٹی پر چڑھنے کے مترادف ہے فرمایا اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَۃٍ یا مٹی میں ملے ہوئے مسکین کے لیے کھانے کا بندوبست کرنا یہ بھی اونچی گھاٹی پر چڑھنا ہے۔

الغرض اونچی گھاٹی پر چڑھنا دو طریقوں سے ثابت ہوا۔ پہلا یہ کہ گردن کو آزاد کیا جائے۔ کسی کو غلامی کی لعنت سے نجات دلائی جائے۔ اور دوسرا یہ کہ قریبی یتیم یا مسکین خاکسار کے کھانے اور اس کے معاش کا بندوبست کیا جائے۔ ایسا یتیم و مسکین، جس کا کفیل کوئی نہ ہو، یا جس کا پرسانِ حال کوئی نہ ہو، ایسے شخص کے لیے نہ صرف وقتی طور پر کھانا کھلانا ضروری ہے۔ بلکہ اس کے لیے ذریعہ معاش مہیا کرنا بھی لازم ہے۔ ______ ______ تاکہ وہ ہمیشہ کے لیے خود کفیل اور دوسرے کا دستِ نگر نہ رہے۔

کسی نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا اَیُّ خِصَالِ الْاِسْلَامِ خَیْرٌ۔ اسلام کی خصلتوں میں سے کون سی باتیں بہتر ہیں۔ تو آپ نے جواب میں فرمایا[1] اَنْ تُطْعِمَ الطَّعَامَ

---

[1] بخاری ص۶ ج۱ مسلم ص۴۸ ج۱

یعنی محتاجوں کو کھانا کھلانا بہترین خصلت ہے۔ اس پر مال خرچ کرو۔ تم کہتے ہو "اَھْلَکْتُ مَالًا لُّبَدًا" میں نے منگنی بیاہ میں اتنا مال خرچ کر دیا۔ بلڈنگ پر اتنی دولت لگادی۔ کھیل تماشے پر اتنا روپیہ صرف کر دیا۔ بلکہ خرچ کرنا ہے تو غربا، پروری پر خرچ کرو۔ یتامیٰ اور مساکین کے سر پر دستِ شفقت رکھو۔ محتاجوں کا بھلا کرو اور لوگوں کو غلامی کے پھندے سے آزاد کرو۔ قرض داروں کا قرض ادا کرو۔ جہالت کی تاریکی میں علم کی شمع روشن کرو۔ کفر و شرک کی غلاظت سے لوگوں کو پاک کرو۔ ان کاموں کے کرنے سے تمہیں اطمینان قلب حاصل ہوگا اونچی گھاٹی پر چڑھنا اسی کا نام ہے۔

ایمان شرط اوّل ہے

فرمایا بے شک گردنوں کی آزادی اور محتاجوں کو کھانا کھلانا اونچی گھاٹی پر چڑھنا ہے مگر اس کے ساتھ ایمان کا ہونا شرط اوّل ہے ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بغیر ایمان کے سوشل ورک کسی کام نہیں آئے گا۔ رفاہِ عامہ کے کام تو غیر مسلم بھی کرتے ہیں پہلے بھی کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ مگر وہ ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں داخل نہیں ہیں۔ لہٰذا انہیں اس کام کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ انہیں انسانیت میں کمال نصیب نہیں ہوگا۔ وہ حظیرۃ القدس کے ممبر نہیں بن سکیں گے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوگا۔ حقیقی چین و آرام ایمان والوں کو ہی نصیب ہوگا۔

صبر اور رحم کی تلقین

فرمایا اونچی گھاٹی پر چڑھنے والے ایمان داروں کی صفت یہ بھی ہے۔ کہ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ وہ صبر اور رحم کی وصیت کرتے ہیں۔ ملتِ ابراہیم یا ملتِ اسلام میں صبر، شکر، ذکر، تعظیم شعائر اللہ اور نماز اہم ترین اصول ہیں۔ اللہ کے راستے میں مصیبت آئے تو صبر کرنا، دین کی بات پر صبر کرنا، خدا کی نعمتوں پر شکر کرنا، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا۔ اس کے شعائر کی تعظیم اور نماز کی ادائیگی۔ مخلوق پر شفقت اور رحم کرنا بہترین اصول ہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[1] اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ تم زمین والوں پر رحم کرو۔ یَرْحَمْکُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ[2] تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔ یہ بھی فرمایا[3] لَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مَنْ

1۔ ترمذی ص۲۶۸ 2۔ ترمذی ص۲۶۸ 3۔ مسلم ص۲۶۸

لَا یَرْحَمُ النَّاسَ جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔ تم لوگوں پر رحم و شفقت کرو تاکہ خدا تعالےٰ تم پر مہربانی فرمائے، فرمایا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ایسے ہی لوگ دائیں ہاتھ والے ہیں۔ قیامت کے روز ان لوگوں کو نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا۔ یُمن کے معنی برکت بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہی لوگ برکت والے ہیں۔ جو ایمان لائے ہیں اور پھر صبر اور رحم کی وصیت کرتے ہیں۔

کفار کے لیے وعید

اس کے بعد فرمایا وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا جو لوگ صحیح پروگرام کا انکار کرتے ہیں هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ یہ لوگ نحوست والے ہیں، کم بختی والے ہیں۔ مشئمۃ کا معنی شامت، نحوست اور بدبختی ہے یہ بائیں ہاتھ والے ہیں انہیں حقیقی سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ یہ بند کی ہوئی آگ میں رہیں گے۔ دوزخ میں آگ کے بڑے بڑے ستون ہوں گے۔ کافر لوگ ان بند ستونوں میں جلتے رہیں گے۔ اُن کے فرار کی کوئی راہ نہیں ہوگی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ انہیں کسی وقت بھی چین نہیں ملے گا۔ نہ دنیا میں اطمینان قلب حاصل ہوگا۔ نہ آخرت میں سکون کی زندگی میسّر ہوگی۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کی ذہنیت گندی تھی۔ شرک میں مبتلا تھے، خودغرضی، زرپرستی ان کے رگ و ریشہ میں سما چکی تھی۔ یہ صبر اور رحم کے مادہ سے بے بہرہ تھے۔ خدا کا نام کبھی نہیں لیا تھا۔ دولت فضول کاموں میں اڑائی اب آخرت میں کہاں آرام نصیب ہوگا۔ وہ تو ہمیشہ کے لیے بے چین رہیں گے۔

سورة الشمس

درس اول — (آیت ۱ تا ۱۰)

سُوْرَةُ الشَّمْسِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۃ شمس مکی ہے۔ اور یہ پندرہ ۱۵ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ﴿۱﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ﴿۲﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا
﴿۳﴾ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ﴿۴﴾ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ﴿۵﴾ وَالْاَرْضِ
وَمَا طَحٰهَا ﴿۶﴾ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ﴿۷﴾ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا
وَتَقْوٰهَا ﴿۸﴾ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ﴿۹﴾ وَقَدْ خَابَ مَنْ
دَسّٰهَا ﴿۱۰﴾

ترجمہ:۔ قسم ہے سورج کی اور اس وقت کی جب دھوپ چڑھ جاتی ہے ﴿۱﴾ اور قسم ہے چاند کی جب وہ سورج کے پیچھے آتا ہے ﴿۲﴾ اور قسم ہے دن کی جب وہ اس سورج کو روشن کرے ﴿۳﴾ اور قسم ہے رات کی جب وہ اس سورج کو ڈھانپ لیتی ہے ﴿۴﴾ اور قسم ہے آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اُسے بنایا ﴿۵﴾ اور قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے اُسے بچھایا ہے ﴿۶﴾ اور قسم ہے جان کی اور اس کی جس نے اُسے ٹھیک بنایا ﴿۷﴾ پس الہام کردیا اس نفس کو اس کی بدکاری اور پرہیزگاری ﴿۸﴾ تحقیق فلاح پاگیا وہ شخص جس نے نفس کو پاک کرلیا ﴿۹﴾ اور تحقیق ناکام ہوا وہ جس نے اس نفس کو مٹی میں ملا دیا ﴿۱۰﴾

نام کوائف اور فضیلت

اس سورۃ کا نام سُوْرَةُ الشَّمْس ہے۔ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی پندرہ ۱۵ آیتیں اور ایک رکوع ہے۔ یہ سورۃ چوّن ۵۴ الفاظ اور دو سو چھیالیس ۲۴۶ حروف پر مشتمل ہے۔

حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ کہ حضرت معاذ بن جبل نے لمبی سورۃ کے ساتھ نماز پڑھائی

---

[1] مسلم ص ۱۸۷/ج۱، بخاری ص ۹۸/ج۱

لوگوں نے حضور علیہ السلام کے پاس اس بات کی شکایت کی۔ کہ معاذؓ نماز میں لمبی سورتیں پڑھتے ہیں اور لوگ برداشت نہیں کر سکتے۔ تو حضور علیہ السلام نے حضرت معاذؓ سے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور تنبیہ کے لہجہ میں فرمایا۔ اے معاذ! کیا تم لوگوں کو فتنے میں ڈالنے والے ہو۔ اَفَتَّانٌ اَنْتَ هَلْ لَا صَلَّيْتَ " وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا " سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى " هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ " تم نماز میں یہ سورتیں کیوں نہیں پڑھ لیتے جو نسبتاً چھوٹی ہیں۔ یہ نماز عشاء کا واقعہ ہے جس میں حضور علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا۔

موضوع اور پہلی سورۃ کے ساتھ ربط

ان تمام سورتوں میں زیادہ تر بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔ مسائل کا ذکر کم ہے۔ مسائل کا ذکر زیادہ تر مدنی سورتوں میں ہے۔ اس سے پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا " وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ " ہم نے انسان کی دو گھاٹیوں کی طرف راہنمائی کی ہے۔ یہ دو گھاٹیاں خیر و شر کی گھاٹیاں ہیں۔ جو انسان کے سامنے بالکل واضح ہیں۔ اسی طرح اس سورۃ میں بھی یہ بات دوسرے عنوان کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ یعنی " قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا " گویا مرکزی مضمون اس سورۃ کا بھی تزکیہ نفس اور تذلیل نفس ہے۔ پہلے بھی ان دو قسم کے لوگوں کا ذکر تھا۔ یعنی اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ اور اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ برکت والے لوگ اور بدبختی والے لوگ۔ اور پھر ان کا انجام بھی بیان فرما دیا۔ اسی طرح اس سورۃ میں بھی اصحاب تزکیہ اور اصحاب تذلیل کا تذکرہ فرمایا ہے۔

چند قسمیں

ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا ہے۔ کہ وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے تزکیہ حاصل کر لیا۔ اور وہ ناکام ہو گیا جس نے نفس کو مٹی میں ملا دیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا قسم ہے سورج کی اور اس وقت کی جب دھوپ خوب چڑھ جاتی ہے۔ ضُحٰی خوب دھوپ چڑھ جانے کے وقت کو کہتے ہیں۔ اسی لیے صلوٰۃ الضحیٰ سے مراد چاشت یا اوابین کی نماز ہے۔ یعنی موسم گرما کا نو، دس بجے کا وقت ہے، جب گرمی کی خوب تپش ہو جاتی ہے تو گویا اللہ تعالیٰ نے پہلی قسم سورج اور وقت ضحیٰ کی کھائی ہے۔ پھر فرمایا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا اور قسم ہے چاند کی جب وہ سورج کے پیچھے چلتا ہے۔ سورج اور چاند اپنے اپنے سفر پر رواں ہیں۔ آگے آگے سورج چل رہا ہے۔ اور پیچھے پیچھے

چاند آ رہا ہے۔ بعض مرحلے ایسے بھی آتے ہیں کہ سورج کے سامنے سے چاند بالکل غائب ہو جاتا ہے اور اس کی روشنی نابود ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا اور قسم ہے دن کی جب وہ اس سورج کو روشن کر دے، دن خوب روشن ہوتا ہے۔ اور اس میں ہر چیز نظر آتی ہے اس دوران میں دن سے متعلقہ امور انجام دیئے جاتے ہیں۔ وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا اور قسم ہے رات کی جب وہ سورج کو ڈھانپ لیتی ہے۔ وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا اور قسم ہے آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اُسے بنایا۔ وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَاهَا اور قسم ہے زمین کی اور اس کی جس نے اُسے بچھایا ہے یا ہموار کیا ہے۔ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا اور قسم ہے جان کی اور جس نے اسے ٹھیک بنایا، برابر کیا، اور اس میں تمام قوتیں مناسب طریقے پر رکھیں، اس کا مزاج اعتدال کے ساتھ بنایا۔ حواس ظاہرہ و باطنہ، طبعی، نفسانی اور حیوانی قوتیں اس میں ودیعت کیں۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا پس الہام کر دیا نفس کو اس کی بدکاری اور پرہیزگاری اللہ تعالیٰ نے یہ تمام قسمیں کھائیں۔

بظاہر یہ بے ربط سی بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ ان اشیاء کی قسم کا نیکی اور بدی سے کیا تعلق۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو حکیمانہ طریقے سے یہ بات سمجھاتے ہیں۔ اگر انسان غور کرے تو یہ بڑی گہری باتیں ہوتی ہیں۔ جن کے دور رس مطلب برآمد ہوتے ہیں۔ یہ قرآن پاک کے رموز ہیں۔ کہ کبھی جذبات کے طریقے پر بات سمجھائی جاتی ہے اور کبھی دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ قیامت کا ذکر ہو یا جزائے عمل کا اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے انسان کے ذہن نشین کراتے ہیں تاکہ انسان معاملے کی تہ تک پہنچ جائے۔ نیکی کا کوئی کام بھی جو بنی نوع انسان کی ہمدردی سے تعلق رکھتا ہو اس کے لیے پہلے ایمان لانا ضروری ہے۔ کیونکہ انسان کا کمال ایمان باللہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایمان کے بعد اعمال صالحہ انجام دیے جائیں، تو آخرت میں نجات نصیب ہوگی اور خدا کا قرب حاصل ہوگا۔ دنیا میں بھی صحیح ترقی ہوگی۔

ارادہ انسانیت کا خلاصہ ہے

پہلی سورۃ میں برکت والے اور بدبختی والے لوگوں کا ذکر تھا۔ اب اس سورۃ میں اصحاب تزکیہ اور اصحاب تذلیل کا بیان ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ انسان میں جوہر انسانیت

والی بات اُس کے ارادے سے پیدا ہوتی ہے جسے عزم کہا جاتا ہے۔ یہی انسانیت کا خلاصہ ہے۔ ارادہ اچھا ہوگا تو انسان اصحاب تزکیہ کے گروہ میں شامل ہوگا، اور اگر ارادہ ہی بُرا ہے تو اصحاب تذلیل میں داخل ہوگا۔ اسی ارادے کی بنیاد پر انسان مختلف امور انجام دیتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان میں ارادہ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالےٰ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اصل بات یہ ہے۔ کہ انسان کے قلب پر چھوٹے چھوٹے خطرات آتے رہتے ہیں۔ مگر ان کی پیدائش کے اسباب انسان کے علم سے باہر ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ جس طرح بارش کے چھوٹے چھوٹے قطرے ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے دل پر چھوٹے چھوٹے خیالات اور کھٹکے وارد ہوتے رہتے ہیں۔ ان کو خطرات کہا جاتا ہے۔ یہ کس طرح آتے ہیں۔ خالق کائنات جانتا ہے۔ مگر اس کے موٹے موٹے اسباب یوں سمجھ لیں کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے۔ تو انسان کے دل میں خاص قسم کے خیالات یا کھٹکے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر روشنی، دھوپ اور گرمی کی وجہ سے اور قسم کے خیالات آتے ہیں اسی طرح جب سورج غروب ہو جاتا ہے۔ اور چاند چمکنے لگتا ہے۔ تو انسانی خیالات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ گویا لیل و نہار کی گردش انسانی قلب میں مختلف قسم کے خطرات کو جنم دیتی ہے۔ اسی طرح سے زمین کے تصور سے اور قسم کے خیالات آتے ہیں، اور آسمان کے تصور سے اور قسم کے کھٹکے پیدا ہوتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے ارضی و سماوی خیالات کو انسان نہیں سمجھ سکتا۔ کہ یہ کیسے آتے ہیں۔ اور کیسے وارد ہوتے ہیں۔ یہ اللہ تعالےٰ ہی جانتا ہے۔ تاہم یہ ہے۔ کہ جب یہ چھوٹے چھوٹے خیالات انسان کے دل میں جمع ہو جاتے ہیں۔ تو آہستہ آہستہ عقیدہ بن جاتا ہے۔ اور جب اعتقاد پختہ ہو جاتا ہے۔ تو انسان کے اندر ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی ارادہ انسانیت کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اگر انسانی ارادہ نیکی کے کاموں سے متعلق ہے۔ تو ایسا انسان درجہ کمال تک پہنچے گا۔ اور اگر ارادہ بُرا ہوگا۔ تو انسان اصحاب تذلیل میں شریک ہو جائے گا۔ یہی بات ہے جو آگے بیان کی جا رہی ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ ج۱ ص۲۸

آسمان اور شریعت میں مناسبت

اب ان تمام اشیاء یعنی چاند، سورج، رات، دن، تاریکی، روشنی، آسمان اور زمین پر ایک دوسرے طریقے سے غور کریں۔ اس کائنات میں شریعت کو وہی حیثیت حاصل ہے۔ جو آسمان کو ہے۔ آسمان میں بہت سی چیزیں ہیں جیسے ستارے، سورج سیارے وغیرہ جس طرح یہ انسان کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اسی طرح شریعت بھی انسان کے عقائد، اعمال، اور اخلاق میں انسان کی راہنمائی کرتی ہے۔ آسمان بلند ہے، تو شریعت بھی بلندی سے آتی ہے۔ عالم بالا سے وارد ہوتی ہے۔ جس طرح آسمان میں سورج کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح شریعت میں نبی علیہ السلام آفتاب ہدایت ہیں۔ جس طرح ستارے سورج سے روشنی مستعار لیتے ہیں۔ اسی طرح نبی آخر الزماں کے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ جن میں براہ راست آفتاب رسالت سے فیض حاصل ہوتا ہے۔ اور کائنات کے لیے روشنی کا سبب بنتے ہیں۔ جس طرح بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کی رحمت کا فیضان بھی عالم بالا سے آتا ہے۔

انسان کی انفرادی استعداد

جس طرح آسمان اور زمین میں مناسبت ہے۔ اسی طرح انسانی استعداد اور زمین میں مناسبت ہے۔ زمین بمنزلہ استعداد کے ہے۔ زمین اپنی استعداد کے مطابق بارش کا اثر قبول کرتی ہے اسی طرح انسان بھی اپنی انفرادی استعداد کے مطابق فیضان حاصل کرتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا[1] زمین تین قسم کی ہوتی ہے۔ جو مختلف انداز میں بارش سے استفادہ کرتی ہے۔ سخت قسم کی زمین چٹانیں ہوں، بارش ہوتی ہے۔ تو سارا پانی بہ جاتا ہے۔ اس قسم کی زمین بارش سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتی۔ بعض مقامات پر پہاڑوں کے اندر بڑے بڑے گڑھے ہوتے ہیں۔ جو بارش کا پانی ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ اگرچہ اس پانی سے وہ خود تو فائدہ نہیں اٹھاتے، مگر وہی پانی نیچے جا کر زرخیز زمین کو سیراب کرتا ہے۔ تو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ تیسری قسم کی زمین ایسی ہے، جو کھیتی اگانے کے لیے عمدہ قسم کی ہے۔ بارش ہوتی ہے۔ زمین پانی کو جذب کرتی ہے۔ اور اناج، پھل، پھول اور درخت پیدا ہوتے ہیں۔ گویا جس طرح زمین اپنی استعداد کے مطابق بارش سے مستفید ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی اپنی صلاحیت

---

[1] مسند احمد ص ۴۲۲ ج ۴

کے مطابق شریعت سے فیضان حاصل کرتا ہے، اگر استعداد اچھی ہے، تو انسانیت میں کمال حاصل کرے گا۔ اور اگر استعداد ناقص ہے۔ تو فیضان میں بھی نقصان ہو گا۔ تو اس طرح گویا آسمان کے بعد زمین کا بھی ذکر ہو گیا۔

انسان کی پیدائش فطرت سلیمہ پر ہوتی ہے

نفس انسانی اُس رُوح اور جان سے عبارت ہے۔ جس کے اندر ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بالکل ٹھیک ٹھاک بنایا ہے۔ اس میں تمام ظاہری اور باطنی قوتیں نہایت اعتدال کے ساتھ پیدا فرمائی ہیں۔ گویا پیدائشی طور پر انسان میں مکمل طور پر صلاحیت موجود ہے۔ حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے وہ سادہ کاغذ یا تختی کی مثال ہوتا ہے۔ کہ جو کچھ بھی اس پر تحریر کر دیا جائے وہ قبول کرے گا۔ یعنی جس طرح کا ماحول اُسے میسّر آئے گا۔ اس کے مطابق تربیت ہو گی۔ اگر والدین یہودی یا مجوسی ہیں۔ تو اُس ماحول میں رہ کر بچہ اسی قسم کی تعلیم حاصل کرے گا۔ مشرک ہیں تو وہ بھی شرک میں مبتلا ہو جائے گا اور اگر والدین مومن ہیں، تو وہ اُسے ایمان کی تعلیم دیں گے۔ بچہ ہر حالت میں اپنے ماحول کا اثر قبول کرے گا۔ اس کی تربیت جس قسم کی ہو گی، اُسی قسم کا مستقبل تعمیر ہو گا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں سوچنے سمجھنے اور عقل و شعور کی پوری صلاحیت اُسے ودیعت کی ہے۔

اور پھر اُسے خیر و شر کی دونوں گھاٹیاں بھی بتا دی ہیں۔ پچھلی سورۃ میں فرمایا وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ" یعنی ہم نے انسان کی راہنمائی خیر و شر کی دو گھاٹیوں کی طرف کر دی ہے اور اس مقام پر فرمایا فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا کہ ہم نے نفس انسانی کو نیکی اور بدی کا الہام کر دیا ہے اس کے نفس میں فیضان حاصل کرنے کی صلاحیت بھی رکھ دی ہے۔ اب یہ اس کا اپنا کام ہے کہ وہ اس خداداد استعداد کو کس طرح بروئے کار لاتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کی کتاب، شریعت انبیاء، اور اہل علم سے کس طرح فیضان حاصل کرتا ہے۔

تزکیہ نفس

حدیث شریف[2] میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کا تخم انسانوں کے قلوب میں نازل کیا ہے۔ اس کی تشریح کتاب و سنت سے معلوم ہوتی ہے۔ تو اس طریقے سے گویا نیکی اور

---

[1] مسلم ص۳۳۶ ج۲، بخاری ص۹۷۶ ج۲
[2] مسلم ص۸۲ ج۱

بدی انسان کو الہام کر دی ہے اب انسانیت کا خلاصہ ارادہ ہے ارادہ خطرات سے پیدا ہوتا ہے اور یہ انسان کے اعمال کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا تحقیق فلاح پا گیا وہ شخص جس نے نفس کو پاک کر لیا۔ اب تزکیہ نفس کی کون سی صورتیں ہیں۔ انسان اللہ کی اطاعت پر کمربستہ ہو جائے اور رذائل سے بچ جائے۔ بداخلاقی سے اجتناب کرے۔ سورۃ اعلیٰ کی تفسیر میں گذر چکا ہے کہ سب سے پہلے روح اور دل کا تزکیہ کرنا ہوگا۔ وہ اس طرح کہ شرک وکفر اور نفاق کی آلودگی سے پاک ہو۔ گناہ اور معصیت سے پاک ہو۔ بدنیتی اور بداخلاقی سے پاک ہو اگر باطن پاک نہیں ہے تو ظاہر کی پاکیزگی کا کچھ فائدہ نہیں۔ باطن کی پاکیزگی کے بعد ظاہر کی طہارت کی طرف توجہ دے۔ جسم، لباس اور خوراک پاک ہو۔ مکانوں گلیوں اور شہروں کی طہارت ہو۔ عام معاشرہ پاک ہو۔ تو طہارت مکمل ہوگی۔

مال کی پاکیزگی کی خاص اہمیت ہے۔ اگر کمائی رشوت، سود اور دھوکے کی ہے تو تزکیہ کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ رذائل سے کلی طور پر علیحدگی ہو اور فضائل پیدا ہو جائیں تو تزکیہ مکمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد اعمال کی باری آئے گی۔ اب نیکی کا ہر عمل مقبول ہوگا۔ لہٰذا وہ کامیاب ہو گیا جس نے تزکیہ حاصل کر لیا۔

فرمایا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا وہ ناکام ہوا جس نے نفس کو مٹی میں ملا دیا۔ اُس نے تزکیہ حاصل نہیں کیا۔ اُس نے نفس کو ضائع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے تو انسان نیکی اور بدی کا الہام کو کر دیا تھا۔ تمام ظاہری اور باطنی قویٰ بھی عطا کیے۔ تزکیہ کے حصول کے تمام ذرائع مہیا کیے مگر اُس نے ناقدری کی۔ اور نفس کو رذائل سے پاک نہ کیا۔ طہارت حاصل نہ کی۔ ایسا شخص ناکام ہو گیا۔ اُسے انسانیت میں کمال حاصل نہیں ہو سکتا، نہ اُس کو سکون اور چین حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ دُکھ میں مبتلا رہے گا۔

درس دوم (آیت ۱۱ تا ۱۵)

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوٰىهَآ ﴿١١﴾ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ﴿١٢﴾ فَقَالَ لَهُمْ
رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿١٣﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۥ فَدَمْدَمَ
ع ۱۵/۱۶ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿١٤﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿١٥﴾

ترجمہ:- قوم ثمود نے سرکشی کی وجہ سے جھٹلایا ﴿۱۱﴾ جب ان میں سے ایک بدبخت آدمی اٹھ کھڑا ہوا ﴿۱۲﴾ پس کہا ان کو اللہ تعالیٰ کے رسول (صالح علیہ السلام) نے چھوڑ دو اللہ کی اونٹنی کو اور اس کے پانی پینے کو ﴿۱۳﴾ پس انہوں نے اس نبی کی بات کو جھٹلایا اور اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیئے پس ان کے رب نے ان پر ان کے گناہ کی وجہ سے ہلاکت ڈال دی پھر اس سزا کو ان سب پر برابر کر دیا ﴿۱۴﴾ اور وہ اس کے انجام کی پرواہ نہیں کرتا۔ ﴿۱۵﴾

گذشتہ سے پیوستہ

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ وہ کامیاب ہو گیا جس نے تزکیہ حاصل کر لیا۔ اور وہ ناکام ہوا جس نے نفس کو مٹی میں ملا دیا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ اللہ نے جو مختلف چیزیں پیدا کی ہیں۔ ان کی وجہ سے انسان کے دل میں مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں انسانیت کا خلاصہ اور نچوڑ ارادہ ہے۔ جس کی بنا پر انسان عمل کرتا ہے۔ اگر ارادہ اچھا ہو تو اچھے کام انجام پاتے ہیں۔ اور اگر ارادہ اور نیت بری ہو، تو برے کام سرزد ہوتے ہیں۔ یہ ارادہ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اسباب پر کوئی حاوی نہیں ہو سکتا۔ صرف خدا تعالیٰ "خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ" ہی اس پر حاوی ہو سکتا ہے۔ یہ چاند، سورج، دن اور رات، آسمان اور زمین۔ انسان کا نفس اور نفس میں نیکی اور بدی کا الہام، یہ ساری چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا" گویا اس سورۃ کا مرکزی مضمون اصحاب تزکیہ کی تعریف اور اصحاب تذلیل کی مذمت ہے۔

جہاں تک تزکیہ کی تشریح کا تعلق ہے۔ پچھلی سورتوں میں بھی ہو چکی ہے۔ تزکیہ نفس سے مراد باطن کی پاکیزگی ہے۔ انسان کا دل و دماغ کفر، شرک اور نفاق جیسی نجاستوں

سے پاک ہو۔ پھر انسان کا جسم اور لباس پاک ہو اور خوراک پاک ہو، جو انسانی نشو و نما کا سبب ہے۔ پھر مکان اور ماحول کی پاکیزگی کی ضرورت ہے۔ مال پاک ہو۔ غرضیکہ تزکیہ میں ہر قسم کی پاکیزگی شامل ہے۔ جس نے تزکیہ حاصل نہ کیا۔ اس نے نفس انسانی جیسے قیمتی جوہر کو خراب کر دیا۔ اور وہ ناکام ہو گیا۔

قوم ثمود کا تعارف

اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی ایک شخص کی مثال بیان فرمائی ہے۔ قرآن کریم میں مثالیں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سمجھ جائیں۔ کہ اگر ہم نے بھی تزکیہ نہ کیا۔ تو ہمارا حشر بھی انہیں لوگوں جیسا ہو گا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَا قوم ثمود نے اپنی سرکشی اور شرارت کی وجہ سے جھٹلایا۔ قوم ثمود اس قوم کے ایک فرد کے نام سے موسوم ہے۔ جس کا سلسلہ اس طرح ہے۔ ثمود بن عامر بن ارم بن سام بن نوح[1]۔ اس طرح قوم عاد کا سلسلہ یہ ہے عاد بن ارم بن سام بن نوح[2]۔ قوم عاد یمن کی وادی دہنا میں آباد تھی۔ ان کی ہلاکت کے دو اڑھائی سو سال بعد قوم ثمود کو عروج حاصل ہوا[3]۔ گویا قوم ثمود کا نام اس کے ایک فرد کے نام پہ ہے۔ جیسے مدین ایک شخص کا نام ہے۔ اور اسی نام پر شہر بھی مشہور تھا۔ اور اسی نام پہ قوم مشہور تھی۔ مدین ابراہیم علیہ السلام کے ایک فرزند کا نام تھا[4]۔ جس کے نام پہ مدین والے مشہور ہوئے۔

الغرض قوم ثمود حجاز اور شام کے علاقے وادی قریٰ سے وادی حجر تک آباد تھی۔ تبوک بھی ادھر ہی ہے۔ حضور علیہ السلام رومیوں سے جہاد کرنے کے لیے وہاں تشریف لے گئے۔ یہ جگہ مدینہ منورہ سے ۹ سو یا ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ وادی حجر راستے میں پڑتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا جب وہاں سے گذر ہوا تو فرمایا[5]۔ لوگو! اس وادی سے جلدی جلدی گذر جاؤ کوئی شخص یہاں سے پانی نہ لے سوائے اس کنویں کے جہاں سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیتی تھی۔ جن لوگوں نے کسی دوسری جگہ سے پانی لیکر آٹا وغیرہ گوندھا تھا آپ نے

---

۱ ابن کثیر ص ۲۲۷ ج ۲ ۲ ابن کثیر ص ۲۵۹ ج ۴ ۳ ملاحظہ ہو ارض القرآن ص ۱۲۹ و ۱۸۷

۴ ارض القرآن ص ۳ ج ۲، قصص القرآن ص ۳۱۲ ج ۱

۵ بخاری ص ۴۷۸ ج ۱، مسلم ص ۴۱۱ ج ۲

ضائع کرا دیا۔ آپ نے حکم دیا کہ اس وادی سے عاجزی کے ساتھ ڈرتے ہوئے نکل جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا کا وہ قہر نازل ہو جائے، جو قوم ثمود پہ نازل ہوا تھا۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں[1]۔ کہ وادی قریٰ اور وادی حجر کے درمیان قوم ثمود کے سترہ سو قصبات تھے اور بڑے بڑے شہر آباد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو فن تعمیر میں کمال عطا کیا تھا۔ یہ لوگ پتھروں کو تراش کر نہایت اعلیٰ قسم کے مجسمے بناتے تھے۔ ان کی صناعی کے نمونے دیکھ کر آج بھی لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔ یہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر مکانات بنا لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر سورۃ اعراف اور سورۃ شعراء میں کیا ہے "وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا" اور پھر مکانوں پر ایسے نقش و نگار بناتے تھے۔ کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

(یہاں (برصغیر) ہندوستان میں دکن کے علاقہ میں اجنٹہ، ایلورا اور گندھارا کی تہذیب کے آثار ملتے ہیں۔ غاروں کے اندر عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ چھتوں اور دیواروں پر عجیب و غریب نقش و نگار ہیں۔ یہ چیزیں آج بھی لوگ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں اور اس وقت کا ماحول آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ کہیں شادی کا ماحول دکھایا گیا ہے۔ کسی دیوار پر کسی محفل کی عکس بندی کی گئی ہے کہیں کوئی ماتمی اجتماع نظر آتا ہے۔ کمال درجے کی منظر کشی کی گئی ہے۔ یہ لوگ نہ صرف پہاڑوں کے اندر عمارات بنانے میں ماہر تھے۔ بلکہ میدانی علاقوں میں بھی بڑی عالیشان عمارتیں تعمیر کرتے تھے۔

قوم عاد اور ثمود میں مماثلت

قوم عاد اور ثمود میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں۔ جس طرح قوم عاد کے لوگ سرکش تھے۔ اسی طرح قوم ثمود کے متعلق بھی "طغوٰی" کا لفظ آیا ہے۔ کہ یہ بھی بڑے سرکش تھے۔ غرور و تکبر میں مبتلا تھے۔ قوم عاد بھی شرک میں مبتلا تھی۔ اور قوم ثمود بھی تھی۔ سورہ اعراف میں موجود ہے۔ کہ حضرت صالح علیہ السلام اسی قوم ثمود کے فرد تھے۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں رسول بنا کر بھیجا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا تھا "يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" اے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں تم کس گندگی میں پڑے ہوئے ہو۔ یہ قومیں بڑی صناع اور کاریگر تھیں۔ یہ لوگ عیاشی کے لیے

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۴۷ پارہ ۳۰

عالیشان عمارتیں بناتے تھے اور ان پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔

قوم ثمود کی تکذیب

الغرض فرمایا کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىھَا قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا۔ اس کی بات کو تسلیم نہ کیا۔ اور پھر اللہ نے ان کی شرارت کی مثال بیان فرمائی۔ اِذِ انْبَعَثَ اَشْقٰىھَا جب ان میں سے ایک بدبخت آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ فَقَالَ لَھُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ پس کہا ان کو اللہ کے رسول صالح علیہ السلام نے۔ صالح علیہ السلام کا نام دوسری جگہ موجود ہے۔ "وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا" قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ تو فرمایا کہ اللہ کے رسول صالح علیہ السلام نے فرمایا نَاقَةَ اللّٰہِ وَسُقْیٰھَا یعنی چھوڑ دو اللہ کی اونٹنی کو اور اس کے پانی پینے کو۔ یہاں پر ابتداء میں دَعُوْا یا ذَرُوْا کا لفظ محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اونٹنی کو چھوڑ دو۔ اس کے ساتھ کسی قسم کا تعرض نہ کرنا۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔ ورنہ عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

ناقۃ اللہ کا مفہوم

دیانند سرسوتی ہندو نے نَاقَةَ اللّٰہِ کے لفظ پر اعتراض کیا تھا۔ کہنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ (معاذ اللہ) اللہ کوئی بدو تھا جو اونٹنی پر سوار تھا۔ اس لیے تو اللہ کی اونٹنی کہا گیا ہے دنیا میں ایسے ایسے خبیث لوگ بھی ہیں۔ جو عقل و خرد سے بھی کام نہیں لیتے۔ یہ ارض اللہ اور بیت اللہ وغیرہ بھی تو ایسے ہی مرکبات ہیں۔ کیا اس سے مراد یہ ہے۔ کہ اس گھر میں اللہ رہتا ہے کہ یہ اس کے نام پر گھر ہے۔ نہیں بلکہ یہ تو شرافت کے لیے اللہ کی طرف نسبت ہوتی ہے اللہ کا گھر تو اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے۔ اور زمین حقیقت میں اللہ کی ملکیت ہے اسی طرح ناقۃ اللہ بھی ہے یعنی اللہ کی اونٹنی۔ اونٹنیاں تو ساری کی ساری اللہ ہی کی ہیں مگر اس اونٹنی کی نسبت اللہ کی طرف محض شرافت کی وجہ سے ہے۔ کہ وہ عام طریقے سے پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کو تو اللہ تعالے نے معجزے کے طور پر پیدا فرمایا تھا۔

صالح علیہ السلام اور قوم کے درمیان مناظرہ

صالح علیہ السلام کی قوم ہمیشہ آپ کو جھٹلاتی رہی۔ شرک، کفر، غرور، عیاشی میں مبتلا قوم کو آپ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف دعوت دیتے رہے مگر وہ قوم انہیں تسلیم کرنے پر تیار

لے

نہ ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم تمہیں رسول تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ تو ہمیں ہمارے معبودان سے ہٹانا چاہتا ہے۔ صالح علیہ السلام دلائل دیکر سمجھاتے کہ جن معبودوں کی تم پرستش کرتے ہو ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہو۔ چڑھاوے چڑھاتے ہو۔ ان کی تعظیم کرتے ہو۔ یہ تمہاری تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر وہ ہمیشہ آپ کی تکذیب کرتے رہے۔

قوم ثمود کا سالانہ میلہ قریب تھا۔ وہاں سب لوگ جمع ہوتے تھے ان کے بڑے بڑے معبود بھی لائے جاتے تھے۔ قوم نے صالح علیہ السلام سے کہا کہ آپ ہمارے میلے میں شریک ہوں۔ آپ بھی اپنے رب سے اپنی خواہش کے مطابق دعا کریں۔ ہم بھی اپنے معبودوں کے پاس اپنی خواہش کے مطابق طلب کریں گے۔ وہاں پتہ چل جائے گا۔ کہ آپ سچے ہیں۔ یا ہمارے یہ معبود۔ صالح علیہ السلام نے موقع کو غنیمت جانا۔ اور اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اور میلے میں شریک ہو گئے۔ قوم نے اپنے شرکیہ طریقوں کے مطابق اپنے بتوں کے سامنے آہ و زاری کی، حاجات طلب کیں۔ مگر ان کی کوئی خواہش پوری نہ ہوئی۔ اب انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ صالح علیہ السلام سے کوئی ایسا مطالبہ کرنا چاہیے۔ جو پورا نہ ہو سکے۔ چنانچہ کہنے لگے۔ کہ اے صالح (علیہ السلام)! اگر آپ سچے ہیں تو اپنے رب سے دعا کریں۔ کہ وہ اس پتھر کے ٹیلے سے ٹیلے جتنی بڑی اونٹنی نکالے جو بے عیب ہو۔ دس ماہ کی گابھن ہو۔ اس کی پیشانی سیاہ۔ اور وہ ہمارے سامنے بچہ جنے۔ ہم آپ کو مان لیں گے۔

اونٹنی کی پیدائش

صالح علیہ السلام نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ اور اپنے پیروکاروں کو لے کر نکلے۔ پہلے نماز ادا کی اور اس کے بعد نہایت عاجزی اور گریہ زاری سے بارگاہ رب العزت میں دعا کی۔ پیروکار آمین کہتے رہے۔ اور باقی لوگ ہزاروں کی تعداد میں گھیرا باندھے کھڑے تھے اور دعا کی قبولیت کے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے صالح علیہ السلام کی دعا مستجاب ہوئی۔ پتھر پر عورتوں جیسی زہ کی کیفیت طاری ہوئی۔ وہ پھٹا اور اس میں سے بڑی قد آور اونٹنی برآمد ہوئی۔ وہ ٹیلے جتنی بڑی تھی، مطالبہ کے مطابق اس کی وضع قطع تھی اور وہ گابھن بھی تھی۔ سفید رنگ اور سیاہ پیشانی والی اونٹنی چرنے لگی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اونٹنی کو دردِ زہ شروع ہوا، اور اس نے بچہ جنا۔ جو قوم کے مطالبے کے مطابق فوراً اونٹنی جتنا بڑا ہو گیا۔ یہ معجزہ دیکھ کر تقریباً چھ ہزار آدمی

ایمان لے آئے۔[1] تاہم باقی لوگوں نے اُسے جادو کہہ کر رد کر دیا۔

چونکہ یہ اونٹنی غیر معمولی طور پر پیدا ہوئی تھی۔ اس سے بڑی دہشت آتی تھی، جانور اس سے ڈرتے تھے۔ جہاں یہ اونٹنی چرتی، وہاں کوئی دوسرا جانور نہ جاتا اور جہاں یہ پانی پیتی، وہاں پر کوئی دوسرا جانور نہ پھٹکتا تھا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے[2] کہ میں وادی حجر کے اُس مقام پر گیا، جہاں حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی بیٹھا کرتی تھی۔ میں نے اُس جگہ کی اپنے ہاتھ سے پیمائش کی، تو وہ جگہ نوے فٹ نکلی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اونٹنی کتنی بڑی تھی۔

پانی پینے کی باری

سورۃ قمر میں موجود ہے کہ اللہ نے حکم دیا کہ پانی پینے کی باری مقرر کر لو۔ ایک دن یہ اونٹنی اس کنویں پر پانی پیئے گی، کوئی دوسرا جانور یا شخص کنویں کے قریب نہیں آئیگا اور دوسرے دن باقی لوگ اور ان کے جانور پانی استعمال کر سکیں گے، باری مقرر ہو گئی۔ فریقین رضامند ہو گئے مگر قوم کے خبیث لوگ اس معاہدے پر قائم نہ رہے۔

اونٹنی کے قتل کی سازش

قوم ثمود میں قدار بن سالف نام کا ایک شخص تھا اس کے عنیزہ نامی ایک فاحشہ عورت کے ساتھ تعلقات تھے۔ عورت بڑی خوبصورت اور دولت مند تھی۔ لوگوں نے ان دونوں کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ گناہ کی زندگی بسر کرنے کی بجائے آپس میں نکاح کر لیں۔ عورت کے بہت سے جانور تھے۔ جو حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی سے پریشان رہتے تھے۔ چنانچہ اس عورت نے نکاح کے لیے یہ شرط مقرر کی کہ اگر اس اونٹنی کو قتل کر دو تو وہ نکاح کرے گی۔ قدار نے جو کہ سرخ رنگ اور ٹھگنے قد کا آدمی تھا۔ اس شرط کو قبول کر لیا۔[3]

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[4] کہ قدار اونچے خاندان کا فرد تھا۔ اس کے بہت سے حواری تھے۔ جن کی وجہ سے طاقتور سمجھا جاتا تھا۔ ویسے بھی بہت بڑا عالم تھا۔ حضور علیہ السلام نے اس کی مثال مکے کے ابو زمعہ سے دی قدار بہت بڑا مفسد تھا۔ اس کے ساتھ دیگر نو غنڈے بھی تھے، جو اس کے ہمنوا تھے۔ ان کا تذکرہ سورۃ نمل میں موجود ہے "وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ" کہ اس شہر میں نو غنڈے قسم کے اشخاص تھے جنکا کام ہی فتنہ فساد برپا کرنا تھا یہ لوگ صلح جوئی کے بالکل قائل نہ تھے۔ ان لوگوں نے غریب عوام پر ظلم و ستم برپا کر رکھا تھا۔

غرض اس عورت کی فرمائش پر ان لوگوں نے طے کیا۔ کہ اونٹنی کی گذرگاہ پر چھپ کر بیٹھ جائیں۔ اور جونہی وہ ادھر سے گذرے، اس پر اچانک حملہ کر کے اُسے قتل کر ڈالیں

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۴۸، [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۴۹، [3] تفسیر ابن کثیر ص ۲۲۸، [4] ترمذی ص ۴۸۳

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ لوگ ایک درّے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب اونٹنی وہاں سے گذری تو انہوں نے حملہ کر دیا۔ اونٹنی زخمی ہوئی مگر وہاں سے آگے نکل گئی۔ قدار نے اس پر تلوار سے حملہ کر کے اس کی ٹانگیں کاٹ دیں۔ چنانچہ اونٹنی گر گئی۔ پھر سب نے مل کر تلواروں سے اس کے ٹکڑے کر دیے اور اونٹنی کا گوشت تقسیم کیا۔ اس کامیابی پر حضرت صالح علیہ السلام کے دشمن بہت خوش ہوئے کہ ہمیں اس اونٹنی سے نجات مل گئی۔

عذاب الٰہی کی آمد

اونٹنی تو ہلاک ہو گئی۔ مگر قوم کو اس کی ہلاکت سے بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا۔ جس طرح وہ اونٹنی ایک دن میں سارا پانی پی جاتی تھی۔ اسی طرح وہ دودھ بھی بہت زیادہ دیتی تھی۔ چنانچہ وہ لوگ فوری طور پر دودھ سے محروم ہو گئے۔ مسند احمد کی روایت[1] میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اے لوگو! اپنے منہ سے نشانیاں نہ طلب کرو۔ دیکھو! قوم ثمود نے اپنے منہ سے نشانی طلب کی، پھر اس کی ناقدری کی۔ تو اللہ تعالیٰ کا ایسا غضب بھڑکا کہ اس نافرمان قوم میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔ اس وقت قوم کا ایک آدمی حرم شریف میں تھا۔ جس کو ابورغال کہتے تھے۔ وہ سزا سے بچ گیا کیونکہ وہ مکہ میں تھا۔ مگر جب وہ حرم سے نکل کر طائف کی طرف روانہ ہوا تو اس پر بھی وہی عذاب نازل ہوا جو قوم پر ہوا تھا۔[2] اس کی قبر کا نشان وہاں موجود تھا۔ لوگ اس پر پتھر مارتے تھے۔ حضور علیہ السلام کا وہاں سے گذر ہوا۔ تو فرمایا معلوم ہے کہ لوگ یہاں پتھر کیوں مارتے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا[3] یہ ابورغال کی قبر ہے۔ یہ قوم ثمود کا آدمی تھا۔ جب تک حرم میں موجود رہا عذاب سے محفوظ رہا۔ مگر جب وہاں سے نکلا تو اس کو بھی عذاب نے پکڑ لیا۔ فرمایا اس کی نشانی یہ ہے۔ کہ اس شخص کے پاس سونے کی چھڑی تھی۔ اس کی قبر اکھاڑی گئی تو لاش تو گل سڑ کر معدوم ہو گئی تھی، مگر سونے کی چھڑی وہاں موجود تھی۔ اس طرح اس معتوب شخص کی نشاندہی بھی ہو گئی۔

---

[1] مسند احمد ج ۳ ص ۲۹۶ [2] مسند احمد ج ۳ ص ۲۹۶ و تفسیر ابن کثیر ص ۲۲۷

[3] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۲۹

حضرت علیؓ کی شہادت کی پیشین گوئی

مسند احمد کی روایت میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علی! میں تجھے بتاؤں کہ پہلی امت کا ایک بدبخت آدمی تھا۔ جسے احمر ثمود یعنی قوم ثمود کا سرخ رنگ والا آدمی کہتے تھے۔ اُس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ہلاک کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ خود بھی ہلاک ہوا اور قوم کو بھی عذاب میں مبتلا کرایا۔ فرمایا جس طرح قوم ثمود کا یہ بدبخت آدمی تھا۔ اسی طرح اس امت سے بھی ایک بدبخت آدمی ہوگا۔ جو تیرے سر پر تلوار چلا کر تیری داڑھی کو رنگین کر دے گا۔ اس وجہ سے امت محمدیہ سے خلافت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد لوگ مشکلات کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ شخص بھی عبدالرحمن بن ملجم خارجی تھا۔ اُس نے قطامہ نامی عورت کو حاصل کرنے کے لیے حضرت علیؓ کو شہید کیا تھا۔ وہ شخص اُس خارجی عورت کے عشق میں مبتلا تھا۔ اور اسی کی فرمائش پر وہ حضرت علیؓ پر حملہ آور ہوا تھا[2]۔ جس طرح قوم ثمود کے بدبخت آدمی نے عورت کی خاطر حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیے تھے چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت پر خلافت علی منہاج النبوۃ ختم ہو گئی۔

قوم ثمود کی تباہی

فرمایا اِذِ انۡۢبَعَثَ اَشۡقٰهَا جب ان میں سے ایک بدبخت آدمی اٹھ کھڑا ہوا مگر اللہ کا نبی تو انہیں پہلے سمجھا چکا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص حکمت سے اونٹنی پیدا کی ہے اس سے تعرض نہ کرنا مگر فَكَذَّبُوۡهُ انہوں نے نبی کی بات کو جھٹلا دیا فَعَقَرُوۡهَا اور اونٹنی کے پاؤں کاٹ دیے۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ بِذَنۡۢبِهِمۡ پس ان کے رب نے ان پر ان کے گناہ کی وجہ سے (معاملہ) الٹ دیا۔ فَسَوّٰٮهَا اور سزا میں سب کو برابر کر دیا۔ ایک چیخ آئی اور زلزلہ آیا۔ جس سے سب کے سب ملیا میٹ ہو گئے۔ ایک بھی کافر زندہ نہ بچا۔

حضرت صالح علیہ السلام کی ہجرت

اب صالح علیہ السلام کے حالات یہ ہیں۔ کہ جب ان کی قوم شرارتوں میں حد سے بڑھ گئی۔ تو فرشتوں نے ان لوگوں کو سزا دی۔ کسی کو مار دیا کسی کا سر توڑ دیا کسی کی ٹانگ توڑ دی۔ تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا[3]۔ کہ اونٹنی کو تو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اب صالح

---

[1] مسند احمد ص ۱۳۰ ج ۱، تفسیر عزیزی ص ۲۵۴ پارہ ۳۰، ابن کثیر ص ۵۱۷ ج ۴ [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۵۶ پارہ ۳۰ [3] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۵۱ پ ۳۰

علیہ السلام کا کام بھی تمام کر دینا چاہیے۔ کیونکہ ان کی اور ان کی اونٹنی کی وجہ سے ہمارے آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام رات کو مسجد میں عبادت کر رہے تھے۔ جبرائیل علیہ السلام نے آکر خبر دی کہ کفار قتل کے لیے آ رہے ۔ آپ گھر چلے جائیں اور گھر کا دروازہ بند کر لیں۔ آپ کے ساتھی بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ گو تعداد میں کم تھے۔ تاہم جب ان لوگوں نے حملہ کرنا چاہا۔ تو حضرت صالح علیہ السلام کے پیروکار بھی لڑائی کے لیے تیار ہو گئے۔ لڑائی سے تو بچ بچاؤ ہو گیا۔ تاہم طے یہ ہوا کہ صالح علیہ السلام یہاں سے نکل جائیں۔ اس فیصلے کے مطابق آپ شہر سے چلے گئے۔ خدا تعالیٰ کا یہ قانون ہے۔ کہ کسی قوم پہ عذاب اس وقت آتا ہے۔ جب نبی اُن سے الگ ہوتا ہے۔ مکہ والوں کے ساتھ بھی ایسا ہوا۔ نبی علیہ السلام ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ تو صرف ڈیڑھ سال کے عرصہ میں مکے والوں کو جنگ بدر کی صورت میں سزا مل گئی۔ قوم ثمود کو بھی اسی طرح سزا ملی جب صالح علیہ السلام اُن سے علیحدہ ہو گئے۔ تو خدا کی پکڑ آگئی۔ ایسا زلزلہ آیا کہ ان کے بڑے بڑے شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے۔ اور ایسی چیخ آئی کہ ایک فرد بھی زندہ نہ بچا۔ سب برابر ہو گئے۔

نشانِ عبرت

یہ ان لوگوں کا حال ہے جنہوں نے اپنے نفس کو ذلیل کیا۔ کفر و شرک سے آلودہ کیا اور اصحاب تذلیل میں شامل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود کی مثال بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ اتنی سخت سزا دینے کے بعد وَلَا یَخَافُ عُقْبٰهَا ۔ اُس کے نتائج کی پروا نہیں کرتا۔ دنیا کے بادشاہ کسی کو سزا دے کر ڈرتے رہتے ہیں۔ کہیں بغاوت یا ایجی ٹیشن نہ ہو جائے لوگ مخالفت میں نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ مگر مالک الملک تو خود مختار ہے۔ ہر چیز اُس کے قبضہ قدرت میں ہے وہ کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اُس کے انجام سے خائف نہیں ہوتا۔

اصحاب تذلیل کی یہ مثال بیان کر کے دوسرے لوگوں کو تنبیہ فرمائی۔ کہ جو کوئی بھی اپنے نفس کو ذلیل کرے گا۔ قوم ثمود کی طرح تباہ و برباد ہو جائے گا۔

I

سُورَةُ اللَّيْلِ

پارہ ۳۰   اللیل ۹۲

درس اوّل   (آیت ۱ تا ۱۱)

سُوْرَةُ الَّيْلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى وَعِشْرُوْنَ اٰيَةً

سورۃ لیل مکی ہے۔ اور یہ اکیس ۲۱ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ① وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ② وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى
③ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ④ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ⑤ وَصَدَّقَ
بِالْحُسْنٰى ⑥ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ⑦ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ⑧
وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ⑨ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ⑩ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا
تَرَدّٰى ⑪

ترجمہ:۔ قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے ① اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہو جائے
② اور قسم ہے اس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا ③ بے شک تمہاری کوشش
البتہ مختلف ہے ④ پس بہرحال جس نے مال خرچ کیا اور تقویٰ اختیار کیا ⑤ اور اس
نے بھلی بات (کلمہ توحید) کی تصدیق کی ⑥ تو ہم اس کے لیے آسانی تک پہنچنا آسان کر دیں گے۔
⑦ اور بہرحال جس نے بخل کیا اور بے پرواہی اختیار کی ⑧ اور بھلی بات (کلمہ توحید) کو
جھٹلایا ⑨ تو ہم آہستہ آہستہ اس کو دشواری تک پہنچائیں گے ⑩ اور جب وہ جہنم کے
گڑھے میں گرے گا تو مال اس کے کچھ کام نہیں آئے گا۔ ⑪

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سُوْرَةُ الَّيْلِ ہے۔ اس کی پہلی آیت میں لیل کا لفظ مذکور ہے اور اسی لفظ سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ بھی مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی اکیس ۲۱ آیات، اکہتر ۷۱ الفاظ اور تین سو دس ۳۱۰ حروف ہیں۔

حضرت معاذؓ کی روایت[1] میں آتا ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سورۃ بقرہ جیسی لمبی سورتیں نماز میں پڑھنے سے منع فرما دیا تھا۔ نماز عشاء کا واقعہ ہے۔ جب حضرت معاذؓ نے لمبی سورت پڑھنی شروع کی۔ تو ایک شخص نے سلام پھیری اور الگ نماز پڑھ کر چلا گیا جب اس کی شکایت حضور علیہ السلام سے کی گئی تو آپ نے فرمایا اے معاذ! کوئی بیمار ہوتا ہے۔ کوئی تھکا ماندہ ہوتا ہے کوئی پریشان حال ہوتا ہے۔ اس لیے آپ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا یا "وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى" جیسی سورتیں کیوں نہیں پڑھ لیتے۔

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط

اس سورۃ کا مضمون بھی پہلی سورۃ کے ساتھ ملتا جلتا ہے۔ پہلی سورۃ میں اللہ تعالے نے یہ بات سمجھائی تھی کہ مختلف چیزوں کے اثرات پڑنے سے انسان کے دل میں ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی ارادہ انسانیت کا خلاصہ اور نچوڑ ہے ارادہ اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ اس لیے اللہ تعالے نے ہر نفس میں فطری طور پر تقویٰ اور فجور کا الہام بھی کیا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اچھے کام کا ارادہ کریں گے وہ اصحاب تزکیہ میں شمار ہوں گے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے نفوس کو پاک کیا بُرے اعمال اور بُرے عقیدے سے انہیں بچائے رکھا۔ برخلاف اس کے جو لوگ اپنے نفوس کو بُرے اعتقاد اور بُرے عمل سے آلودہ کریں گے۔ ان کا شمار اصحاب تدلیل میں ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کی قسم اٹھا کہ بیان فرمایا کہ ان چیزوں سے کس طرح ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بُرے اعمال کی مثال بھی بیان فرمائی۔ کہ قوم ثمود نے کس طرح اللہ کے رسول کو جھٹلایا، اور وہ کس طرح ذلیل ہوئے۔ اللہ تعالےٰ نے اُن کو سزا میں مبتلا کیا۔ انہوں نے اللہ کی نشانی اونٹنی جو معجزے کے طور پہ پیدا ہوئی تھی۔ اُسے مٹا یا۔

سورۃ زیر درس میں اللہ تعالےٰ نے اعمال کے مختلف ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ارادہ مختلف ہوگا۔ تو اعمال بھی مختلف ہوں گے۔ اور یہ بات بھی سمجھا دی۔ کہ اگر اعمال مختلف ہوں گے تو ان کے نتائج بھی مختلف ہوں گے۔

---

[1] مسلم صفحہ ۱۸۷ ج ۱، بخاری صفحہ ۹۸ ج ۱

ماحول کا اثر

ارشاد ہوتا ہے۔ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى قسم ہے رات کی جب وہ چھا جاتی ہے وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى اور قسم ہے دن کی جب وہ روشن ہوتا ہے رات اور دن کے اختلاف سے یہ بات واضح ہوتی کہ ماحول کے مختلف ہونے کی وجہ سے اعمال بھی مختلف ہوں گے۔ گرم ماحول میں رہنے والے انسان کے اعمال اور قسم کے ہوں گے۔ اور سرد ماحول کے باشندے کے اعمال اور قسم کے ہوں گے اسی طرح جو شخص آلودگی کے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے اعمال اس ماحول کے مطابق ہونگے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ اِنَّمَا الْاَخْلَاقُ بِالْاَحْوَالِ اخلاق کا دارومدار ماحول پر ہوتا ہے۔ جیسا کسی کو ماحول میسر ہوگا، اسی کے مطابق اُسکے اخلاق کی تعمیر ہوگی۔ کسی شخص کے گھر کا ماحول کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ مگر اس کی اولاد گلی محلے کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ اپنے بچوں پر کتنی بھی پابندی لگائیں گے۔ مگر وہ وہی کچھ کریں گے جو محلے کے دوسرے بچے کرتے ہیں۔ لہٰذا جو لوگ ایمان دار ہیں اور علت اور معلول (CAUSE AND EFFECT) کو سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔ کہ ان کا ماحول درست رہے۔ تعلیم، تبلیغ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مقصد بھی یہی ہے کہ ماحول ٹھیک رہے۔ اس میں کسی قسم کا نقص نہ آئے۔ اگر ماحول درست نہیں، تو لاکھ کوشش کے باوجود بھی اخلاق حسنہ پیدا نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ماحول کی پاکیزگی نہایت ضروری ہے اس ماحول کو آپ گھر گلی محلے سے نکال کر شہر، علاقے اور پھر پورے ملک پر وسعت دے لیں۔ ماحول جس قدر وسیع ہوگا۔ اس کے اثرات اسی قدر وسیع ہوں گے۔ غرضیکہ ماحول کے مختلف ہونے سے اعمال بھی مختلف ہوں گے۔

رات اور دن میں اختلاف

جس طرح رات اور دن کے اوقات مختلف ہیں۔ اسی طرح ان اوقات میں انجام دیے جانے والے کام بھی مختلف ہیں۔ دن چونکہ روشن ہوتا ہے۔ اسی لیے ان اوقات میں رات کی نسبت زیادہ اہم امور انجام دیے جاتے ہیں۔ رات کے اندھیرے کی وجہ سے بعض کام خوش اسلوبی سے نہیں کیے جا سکتے۔ لہٰذا انہیں دن میں کیا جاتا ہے۔ قربانی کے مسئلہ میں فقہاء کرام فرماتے ہیں[2] کہ اگرچہ رات کے وقت بھی قربانی کر لینا جائز ہے، مگر بہتر نہیں ہے اس کی علت یہی ہے کہ

---

[1] پدورہ بازغہ ص۴۱ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور (انڈیا) [2] درمختار ص ۵۲۵/۴ و فتاوی شامی ص ۲۷۹/۵

رات کے وقت شاید خوش اسلوبی سے نہ کی جاسکے۔ البتہ رات کو کرنے کے بھی کچھ کام ہوتے ہیں۔ جنہیں خاص طور پہ رات کو ہی کیا جاتا ہے۔ چور اور ڈاکو عام طور رات کے وقت ہی اپنے کام پہ نکلتے ہیں۔ کہ اُن کے لیے یہی وقت مناسب ہوتا ہے۔ اسی طرح شراب خور، زانی، جواری وغیرہ بھی رات کا وقت ہی پسند کرتے ہیں۔ عیاش لوگ دادِ عیش دینے کے لیے رات کا وقت ہی منتخب کرتے ہیں عاشق مزاج لوگ اپنے عشق کی تکمیل کے لیے یہ وقت پسند کرتے ہیں تاکہ دن کے وقت وہ چیز ظاہر نہ ہو جائے۔ جسے وہ چھپانا چاہتے ہیں۔ فاسق اور فاجر لوگ بھی رات کے وقت میں ہی اپنا رنگ جماتے ہیں۔ ان تمام بُرے اعمال کے برخلاف کچھ لوگ شب زندہ دار بھی ہوتے ہیں۔ جو اپنے رب سے تعلق قائم کرنے کے لیے رات کے انتظار میں رہتے ہیں۔ الغرض رات اور دن کے اعمال بھی اسی طرح مختلف ہوتے ہیں جس طرح وہ خود مختلف ہوتے ہیں۔

مرد و زن میں اختلاف

رات اور دن کے اختلاف واضح کرنے کے بعد فرمایا وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى اور قسم ہے اُس ذات کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا۔ یعنی ایک ہی شکل وصورت کی دو ہستیوں میں جنسی تفریق ڈال دی۔ یہ تفریق جس طرح پیدا ہوتی ہے۔ اُس کی علت کوئی نہیں بتا سکتا۔ حمل کے ابتدائی دور میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ نر ہے یا مادہ۔ مگر ایک وقت ایسا آتا ہے جب جنسی تفریق واضح ہو جاتی ہے۔ اب مذکر اور مؤنث کے بعض اعضاء میں فرق ہوگا۔ ان کے کوائف مختلف ہوں گے۔ بڑے ہوکر ان کی ذمہ داریاں متفرق ہوں گی۔ غرض اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے جسے چاہتا ہے۔ نر بنا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے مادہ بنا دیتا ہے۔

امام جلال الدین سیوطیؒ اور امام جلال الدین محلیؒ کی تفسیر جلالین[1] میں لکھا ہے۔ کہ جنس کی ایک تیسری قسم بھی ہے جسے خُنثیٰ کہتے ہیں۔ اگر مادہ تولید میں کوئی خرابی واقع ہو جائے تو پیدا ہونے والا بچہ خنثیٰ ہوتا ہے۔ اس کی ظاہری علامات جس جنس پہ غالب ہوں گی۔ اسی صنف میں شمار ہوگا۔ اور اگر کسی فرد میں نر اور مادہ کی علامات برابر ہوں، تو وہ

---

[1] تفسیر جلالین ص ۴۹۹

خنثیٰ مشکل کہلاتا ہے۔ اور ایسے شخص کے مسائل میں پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً وراثت یا غسل وغیرہ کے مسائل میں اُن پر نر کا حکم عاید ہوگا یا مادہ کا ہوگا۔ امام جلال الدین محلیؒ نے ایسا ہی ایک مسئلہ پیش کیا ہے کہ کوئی قسم کھائے کہ میں نہ مرد سے بات کروں گا اور نہ عورت سے۔ مگر وہ خنثیٰ مشکل سے کلام کر لیتا ہے تو اس کے لیے کیا حکم ہوگا۔ کیا اس پر قسم پڑ جائے گی یا نہیں۔ پھر خود ہی حل پیش کرتے ہیں کہ ایسی صورت میں قسم واقع ہو جائے گی۔ کیونکہ خنثیٰ مشکل تو ہمارے نزدیک ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو وہ کسی نہ کسی صنف میں ضرور ہے۔ یا وہ مذکر ہے یا مؤنث ہے۔ لہذا اُس پر قسم کا کفارہ لازم آئے گا۔ الغرض جس طرح اللہ تعالےٰ نے رات اور دن کو جدا جدا پیدا کیا۔ اسی طرح نر اور مادہ کو الگ الگ پیدا کیا۔ ان کو علیحدہ علیحدہ وضع دی۔ ان کی ضروریات اور ذمہ داریاں بھی الگ الگ مقرر کیں۔ لہذا جس طرح رات اور دن مختلف ہیں اسی طرح مرد اور زن مختلف ہیں۔

انسانی کوشش میں اختلاف

فرمایا اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى بے شک تمہاری کوششیں بھی مختلف ہیں۔ تمام لوگوں کی کوشش یکساں نہیں ہے۔ کوئی کفر و شرک کے پروگرام پر عمل کر رہا ہے اور کوئی ایمان کی دعوت دے رہا ہے۔ وہ بے چارہ ہر وقت اس فکر میں غلطاں رہتا ہے کہ مرتے وقت ایمان کی دولت نصیب ہو جائے۔ کوئی دھوکہ فریب سے دوسروں کا مال ہضم کرنا چاہتا ہے اور کوئی اپنے ایمان کی سلامتی کی فکر میں ہے چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈرتا ہے کہ کہیں مؤاخذہ نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے۔ کہ ہر دو اقسام کے لوگوں میں بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہر ایک کا اپنا اپنا ماحول ہے۔ اور ماحول کے اختلاف کی وجہ سے اعمال بھی مختلف ہیں۔ فرمایا اسی طرح تمہاری سعی بھی مختلف ہے۔ کوئی نیکی کا کام کر رہا ہے اور کوئی شرک و کفر کو غالب کرنے کے لیے تگ و دو کر رہا ہے۔ غرضیکہ نیکی اور بدی، خوش اخلاقی اور بداخلاقی، اطاعت اور معاصی بالکل مختلف معاملات ہیں۔ اور ان کے پیروکار ان کی ترویج کے لیے کوشاں ہیں۔

آگے اس کی مزید تشریح آتی ہے۔ کہ جب لوگوں کے نظریات مختلف ہیں۔ عقیدے مختلف ہیں۔ افکار اور اعمال مختلف ہیں۔ تو ظاہر ہے ان کے نتائج بھی مختلف ہوں گے۔ جس قسم کی سعی یا کوشش ہوگی۔ اُسی قسم کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ اسی لیے فرمایا اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى

تمہاری کوشش بھی مختلف ہوگی۔

انفاق فی سبیل اللہ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک مخیر اور ایک بخیل شخص کی مثال بیان کر کے سمجھایا کہ دیکھو ہر ایک نے اپنی اپنی کوشش کے مطابق مختلف کام انجام دیے تو ان کے نتائج بھی مختلف برآمد ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى بہر حال جس نے مال خرچ کیا، اور وہ بڑھتا بھی رہا۔ یعنی اس کی کوشش یہ ہے کہ نیکی کے لیے مال خرچ کرے اعطیٰ کا مطلب یہ ہے کہ وہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کر رہا ہے۔ اس میں کنجوسی کا مادہ نہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ ہے۔ آپ تجارت پیشہ اور مالدار تھے۔ راہ خدا میں خرچ کرنے میں ہمیشہ پیش پیش ہوتے بے شمار غلام اور لونڈیاں بھاری قیمت دے کر خریدے۔ اور اللہ کی راہ میں آزاد کیے۔ ادھر امیہ بن خلف تھا۔ جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ مالدار تھا۔ بڑے بڑے غلام خرید رکھے تھے۔ نوکر چاکر تھے۔ ادھر طائف وغیرہ میں باغات اور زرعی زمین بھی، مگر یہ شخص حد درجے کا بخیل تھا۔ غریبوں پر ظلم کرتا تھا، ان کے حقوق غصب کرنا اس کا وطیرہ بن چکا تھا۔ جو غلام اور لونڈی ایمان قبول کر لیتے اُن پر بڑے مظالم ڈھاتا تھا

حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور عامر رضی اللہ عنہ پر مظالم

حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی اسی امیہ کے غلام تھے۔ ایمان لانے کی وجہ سے آپ نے بیحد تکلیفیں برداشت کیں۔ ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ اُن کے واقعات پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ایسا مضبوط دل عطا کیا تھا۔ کہ سخت سے سخت اذیت کے وقت بھی، احد، احد پکارتے تھے[1] یعنی اللہ ایک ہی ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ امیہ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو سخت جسمانی تکلیف دے رہا تھا۔ پاس سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا گذر ہوا تو پوچھا اس بیچارے کو کیوں تکلیف دے رہے ہو۔ ظالم ببول کے کانٹے جسم میں چبھوتا جو ہڈی تک چلے جاتے۔ دوپہر کے وقت تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر غلاموں سے پٹواتا، آپ کی چھاتی پر گرم پتھر رکھوا دیتا۔ غرض جب حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اُسے ظلم سے منع کیا

---

[1] روح المعانی ص ۱۴۸ ج ۳۰، معالم التنزیل ص ۲۳۶ ج ۴، در منثور ص ۳۵۸ ج ۶، مجمع البیان ص ۱۳۱ ج ۲

[2] مستدرک حاکم ص ۲۸۴ ج ۳۔

تو کہنے لگا۔ کہ اگر تجھے اس پر رحم آتا ہے۔ تو اُسے خرید کیوں نہیں لیتا۔ حضرت صدیق اکبر رضؓ خریدنے پر آمادہ ہو گئے۔ تو کہنے لگا۔ میں اس کے بدلے میں بڑا قابل غلام لوں گا۔ آپ نے نہ صرف بڑا قابل غلام دیا۔ بلکہ ایک ہزار دینار بھی ادا کر کے حضرت بلالؓ کو خرید لیا۔ اور راہِ خدا میں آزاد کر دیا[1]

عامر بن فہیرہؓ بھی ایسا ہی تھا۔ یہ بھی حضرت صدیق اکبرؓ کے آزاد کردہ غلام[2] تھے۔ یہ شخص ہجرت میں حضور علیہ السلام کے ہمراہ تھا[3]

بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ انہوں نے بھی بڑی تکالیف برداشت کیں۔ آخر حضرت صدیق رضؓ نے بھاری رقم دے کر خرید لیا۔ آپ نے بئرِ معونہ میں شہادت پائی[4]

توحید پرست لونڈی

اسی طرح زنیرہؓ نامی لونڈی کو بھی ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا۔ یہ بھی اسلام قبول کر چکی تھی۔ آخر حضرت ابو بکر رضؓ نے خرید لیا۔ آپ کو اس قدر تکلیف پہنچائی گئی۔ کہ آپ کی بینائی جاتی رہی۔ مالک کہنے لگے کہ تو نے لات اور عزیٰ کی توہین کی ہے۔ اس لیے تیری بینائی زائل ہو گئی ہے۔ انہوں نے تیری روشنی سلب کر لی ہے۔ مگر لونڈی نے اس حالت میں بھی علی الاعلان کہا کہ لات و عزیٰ کسی طاقت کے مالک نہیں۔ یہ میرے مالک الملک کا اختیار ہے۔ کہ اپنی حکمت کے ساتھ جس کی چاہے بینائی سلب کر لے۔ اور جس کو چاہے بینائی عطا کر دے اللہ تعالیٰ کو اس کا ایمان پسند تھا۔ اور اس کی توحید پر استقامت منظور تھی۔ لہٰذا اُسے بینائی بھی دوبارہ عطا کر دی[5]

محدثین میں مشہور ہے۔ کہ امام بخاریؒ بچپن میں نابینا ہو گئے تھے۔ آپ کی والدہ نہایت صالح خاتون تھیں۔ انہوں نے نہایت عجز و انکساری کے ساتھ بارگاہِ رب العزت میں دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے امام صاحبؒ کی بینائی لوٹا دی[6]

الغرض ایک طرف صدیق اکبرؓ جیسے ایثار پیشہ اور مونس و غمخوار تھے جو اپنے مال کو

---

[1] اصابہ صفحہ ۲۳ جلد ۱، طبقات ابن سعد صفحہ ۲۳۰ جلد ۳ [2] الاصابہ فی تمیز الصحابہ صفحہ ۲۴۷ جلد ۲، رجلہ ۴ صفحہ ۵۲ [3] اصابہ صفحہ ۲۴۷ جلد ۲، حلیۃ الاولیاء صفحہ ۱۰۹ جلد ۱
[4] طبقات ابن سعد صفحہ ۲۳۰، ۲۳۱ جلد ۳ [5] اصابہ صفحہ ۳۰۵ جلد ۴ [6] تاریخ بغداد صفحہ ۱۰ جلد ۲

راہِ خدا میں صرف کرتے اور دوسری طرف امیہ بن خلف تھا۔ جو حد درجے کا کنجوس اور ناداروں اور اپنے لونڈی غلاموں پر ظلم ڈھانے والا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے یہ مثالیں بیان فرمائیں۔

کلمہ گو جنت میں جائیگا

اُسی پہلے گروہ کے متعلق بیان ہے کہ اس شخص کی کوشش یہ ہے۔ کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرکے کسی طرح اللہ کی گرفت سے بچ جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے[1] اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ یعنی دوزخ کی آگ سے بچو، چاہے کھجور کا آدھا دانہ دیکر ہی ایسا کرو۔ گویا معمولی سے معمولی صدقہ خیرات بھی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لہٰذا ایسا شخص خدا کے عذاب سے ڈرتا بھی ہے۔ اور برائی سے بچتا بھی ہے۔ اَتْقٰی کا یہی معنی ہے کہ کفر و شرک اور برائی سے بچتا ہے۔ اور اس کے مال کو نیکی کے کاموں میں لگاتا ہے۔

ایسے شخص کی ایک صفت یہ بھی ہے۔ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى کہ وہ اچھی بات کی تصدیق کرتا ہے۔ بنیادی طور پر تو اچھی بات کلمہ توحید لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔ اس کے بعد تمام اچھی باتیں آتی ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج اور نیکی کی دوسری باتیں جس کی وہ تصدیق کرتا ہے اسی کلمہ توحید کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے[2]۔ مَنْ كَانَ اٰخِرُ كَلَامِهٖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ یعنی جس کا آخری کلام کلمہ لاالٰہ الا اللہ ہو گیا۔ وہ جنت میں جائیگا۔ ایسا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہیں رہ سکتا۔ اگر اپنے گناہوں کی وجہ سے وہ ایک دفعہ دوزخ میں چلا بھی گیا۔ تو سزا بھگتنے کے بعد اس کلمہ کی بدولت وہاں سے خلاصی پا جائیگا۔

تو فرمایا ایسا شخص جو نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتا اور اچھی باتوں کی تصدیق بھی کرتا ہے۔ اس کے لیے ہم نے انعام یہ مقرر کیا ہے کہ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ہم اُس کے لیے آسانی تک پہنچنا آسان کر دیں گے۔ جب اس دنیا کا دور ختم ہو جائے گا۔ تو آخر میں وہ آسانی تک پہنچ جائے گا۔ یعنی اللہ کی رحمت، جنت اور اس کے اعلیٰ درجات تک پہنچ جائے گا۔ ایسے شخص کی کوشش کا یہ نتیجہ ہوگا۔ کہ وہ آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچ جائے گا۔ ایسی آسانی جہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ بلکہ ہر طرف آرام و سکون کا دور دورہ ہوگا۔

---

[1] مسلم صفحہ ۳۲۶ ج ۱، صفحہ ۳۲۷ و بخاری صفحہ ۱۹۰ ج ۱ [2] ابوداؤد صفحہ ۸۸ ج ۲

بخیل کی مثال

اب دوسرے گروہ کی مثال آتی ہے۔ جو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا۔ بلکہ وَاَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ اور جس نے بخل کیا وَاسۡتَغۡنٰی اور بے پرواہی اختیار کی۔ بخل ایک بہت بڑی بیماری ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان[1] ہے اَیُّ دَاءٍ اَدۡوَءُ مِنَ الۡبُخۡلِ یعنی بخل سے بڑھ کر کون سی بیماری ہے۔ فرمایا[2]۔ بخیل کی حالت یہ ہے۔ کہ بَعِیۡدٌ مِّنَ النَّاسِ بَعِیۡدٌ مِّنَ اللّٰہِ وَبَعِیۡدٌ مِّنَ الۡجَنَّۃِ ایسا شخص لوگوں سے دور ہے۔ اللہ سے دور ہے۔ اور جنت سے دور ہے۔ وَاسۡتَغۡنٰی سے مراد یہ ہے کہ اسے اپنے مال پر غرور ہے۔ وہ کسی کی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ امیہ اور ابوجہل بھی یہی کہتے تھے "نَحۡنُ اَکۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا" ہمارے پاس مال اور اولاد کی فراوانی ہے۔ ہم کسی کو کیا سمجھتے ہیں۔ اگر گرفت بھی ہوگی تو مال ہمارے کام آئے گا۔ ہم مال کو فدیہ کے طور پر ادا کر کے اپنے آپ کو چھڑا لیں گے۔ حالانکہ دوسری جگہ موجود ہے کہ جب اللہ کے حضور پیشی ہوگی تو یہ مال و اولاد والے "وَیَاۡتِیۡنَا فَرۡدًا" بالکل تن تنہا آئیں گے۔ محاسبے کے وقت دنیا کی کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔ ہاں جس کے پاس ایمان کی دولت ہوگی، وہی اس دن کام آئے گی۔ باقی کچھ کام نہ آئے گا۔

فرمایا، جس نے بخل کیا اور بے پرواہی اختیار کی وَکَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی اور بھلی بات کو جھٹلایا، کلمہ توحید کی تکذیب کی، کفر و شرک میں مبتلا رہا اور اس پر اصرار کرتا رہا۔ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡعُسۡرٰی ہم آہستہ آہستہ اس کو سختی تک پہنچائیں گے۔ آرام و آسائش کے دن تو گذر چکے ہوں گے۔ اسے آہستہ آہستہ عُسرٰی یعنی سختی یا تکلیف کی طرف لے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اسکا انجام جہنم ہے۔ جہاں کبھی راحت نصیب نہیں ہوگی۔ اور پھر یہ ہوگا کہ وَمَا یُغۡنِیۡ عَنۡہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی جب وہ جہنم کے گڑھے میں گرے گا۔ تو مال اس کے کچھ کام نہیں آئے گا وہی مال جس کے لیے وہ لوگوں پر ظلم و ستم کرتا تھا۔ ان کا حق چھینتا تھا۔ آج وہ اسکے کسی کام نہ آئے گا ایسا شخص پکار پکار کر کہے گا مَاۤ اَغۡنٰی عَنِّیۡ مَالِیَہۡ" آج میرا مال مجھے دھوکا دے گیا۔ "ہَلَکَ عَنِّیۡ سُلۡطٰنِیَہۡ" افسوس! میرے عہدے نے بھی

---

[1] کنز العمال صفحہ ۲۵۷ جلد ۳ [2] ترمذی صفحہ ۲۹۰

میرے ساتھ وفا نہ کی۔ میں دنیا میں بڑا صاحب اقتدار تھا۔ مگر آج میں بالکل بے دست و پا ہوں۔ اللہ تعالٰے فرمائے گا۔ تم نے کام ہی اچھا نہیں کیا۔ تمہاری فکر پاک نہیں تھی۔ تمہاری سعی بُری تھی۔ اس لیے آج نتائج بھی بُرے ہی تمہارے سامنے آئیں گے۔ ہم آہستہ آہستہ تجھے بدبختی کی طرف لے جائیں گے اگر تم اچھے کام کرتے۔ تمہاری روح پاک ہوتی، تو تمہاری کشش حظیرۃ القدس میں تجلی اعظم کی طرف ہوتی۔ مگر تو نے تزکیہ اختیار نہ کیا۔ اس لیے ہم تجھے سختی کی طرف لے جائیں گے۔

درس دوم (آیت ۱۲ تا ۲۱)

اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡہُدٰی ﴿۱۲﴾ وَ اِنَّ لَنَا لَلۡاٰخِرَۃَ وَ الۡاُوۡلٰی ﴿۱۳﴾ فَاَنۡذَرۡتُکُمۡ
نَارًا تَلَظّٰی ﴿۱۴﴾ لَا یَصۡلٰہَاۤ اِلَّا الۡاَشۡقَی ﴿۱۵﴾ الَّذِیۡ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ﴿۱۶﴾
وَ سَیُجَنَّبُہَا الۡاَتۡقَی ﴿۱۷﴾ الَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی ﴿۱۸﴾ وَ مَا لِاَحَدٍ
عِنۡدَہٗ مِنۡ نِّعۡمَۃٍ تُجۡزٰۤی ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ رَبِّہِ الۡاَعۡلٰی ﴿۲۰﴾
وَ لَسَوۡفَ یَرۡضٰی ﴿۲۱﴾ ع ۱۷

ترجمہ :- بے شک ہمارے ذمے ہے البتہ راہنمائی کرنا ﴿۱۲﴾ اور بے شک ہمارے لیے ہی ہے آخرت اور دنیا ﴿۱۳﴾ پس میں نے تم کو اس آگ سے ڈرا دیا ہے جو شعلہ مارتی ہے ﴿۱۴﴾ اس آگ میں نہیں داخل ہو گا مگر جو بڑا بدبخت ہو گا ﴿۱۵﴾ وہ جس نے تکذیب کی اور روگردانی کی ﴿۱۶﴾ البتہ دور رکھا جائے گا اس بھڑکتی ہوئی آگ سے اس شخص کو جو بڑا پرہیزگار ہے ﴿۱۷﴾ جو اپنا مال صرف کرتا ہے تاکہ تزکیہ حاصل کرے ﴿۱۸﴾ اور کسی کا اس پر احسان نہیں کہ جس کا بدلہ دیا جائے ﴿۱۹﴾ سوائے اس کے کہ اپنے بلند و برتر رب کی رضا حاصل کرسکے ﴿۲۰﴾ اور عنقریب وہ اس سے راضی ہو جائے گا۔ ﴿۲۱﴾

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ درس میں یہ بیان ہوا تھا۔ کہ جس طرح رات اور دن میں اختلاف ہے اور جس طرح نر اور مادہ میں اختلاف ہے اسی طرح انسانوں کی سعی اور کوشش میں بھی اختلاف ہے۔ جس کی کوشش اس طرح کی ہے کہ اس نے مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور خدا تعالیٰ سے ڈرتا رہا، برائیوں سے بچتا رہا۔ پھر اچھی بات یعنی کلمہ توحید اور کلمہ ایمان کی تصدیق کی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم اُسکو آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے۔ اور جس نے بخل کیا، مال کو راہ خدا میں صرف نہ کیا۔ کنجوسی سے کام لیا اور اپنی جگہ مستغنی یعنی بے پروا رہا۔ آخرت کی فکر نہ کی آخرت کی تکذیب کی۔ کلمہ توحید کی تکذیب کی۔ تو ہم اس کو آہستہ آہستہ سختی تک پہنچائیں گے۔ یعنی وہ جہنم میں جائے گا۔ گویا ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا۔ وہاں

اُسے یہ مال کچھ فائدہ نہ دے گا۔

ہدایت دینا اللہ کی ذمہ داری ہے

اس مقام پہ ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جس مالک الملک نے انسان کو نر اور مادہ کی شکل میں پیدا کیا، وہ اُسے راہِ ہدایت پہ کیوں نہیں لگا دیتا۔ تاکہ کوئی بھی انسان گمراہی کا راستہ اختیار نہ کرتا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اسی خیال کی تردید فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

"اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى بے شک ہمارے ذمّے ہے۔ البتہ ہدایت کی طرف راہنمائی کرنا مگر ہم کسی کو ہدایت پر مجبور نہیں کرتے۔ کہ وہ ضرور ہی سیدھا راستہ اختیار کرے۔ یہ بات حکمتِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اگر ایسا ہو جائے، تو انسان کی آزمائش نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ وہ مجبورِ محض بن کر رہ جائے۔ اس طرح نہ تو انسان کی فضیلت واضح ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی اُسے دوسری مخلوق پر فوقیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے "لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا" اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ہدایت پر مجبور کر دیتا ــــ مگر یہ بات حکمت کے خلاف ہے وہ کسی چیز پہ جبر نہیں کرتا بلکہ ہدایت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ کہ جو شخص چاہے ہدایت کو اختیار کرلے اور جو چاہے کفر کے راستہ پر چل نکلے اسی لیے فرمایا کہ ہمارے ذمے البتہ ہدایت کا راستہ واضح کرنا ہے۔

ہدایت کے ذرائع

اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے ہدایت کا راستہ واضح کرتا ہے۔ جب وہ انسان کی تخلیق کرتا ہے۔ تو ہدایت کے سارے ذرائع اس کے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً حواسِ ظاہرہ، قوتِ بینائی، قوتِ شنوائی، قوتِ گویائی، وغیرہ یہ سب ہدایت کے حصول کے ذرائع ہیں۔

انہیں ذرائع سے کوئی انسان معلومات حاصل کر کے اپنے لیے ہدایت کا راستہ متعین کر سکتا ہے۔ وہ آنکھوں کے ذریعے دیکھ سکتا ہے۔ کانوں کے ساتھ سن سکتا ہے۔ ناک کے ذریعے سونگھ سکتا ہے، ہاتھوں کے ذریعے ٹٹول سکتا ہے۔ یہ تمام حواس ظاہرہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے ذرائع علم پیدا کیے ہیں۔ تاکہ انسان ان کو بروئے کار لا کر ہدایت کا راستہ تلاش کرے اور پھر اُس پہ گامزن ہو جائے۔ حواس ظاہرہ کے علاوہ حواس باطنہ ہیں۔ مثلاً (قوتِ وہم) خیال حس مشترک، قوتِ عاقلہ قوتِ مفکرہ یہ سب انسان کے اندرونی ذرائع ہیں۔ جو اسے غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں تاکہ خوب سوچ سمجھ کر بہتر نتیجے پر پہنچ جائے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی بے شمار نشانیاں جگہ جگہ قائم کی ہیں۔ تاکہ انسان ان کو دیکھ کر ہی عبرت حاصل کرلے فرمایا" وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ" اللہ کی قدرت کی لاتعداد نشانیاں موجود ہیں۔ مگر لوگ ان کے پاس سے بالکل غفلت کی حالت میں گذر جاتے ہیں ان سے کوئی عبرت نہیں پکڑتے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات کی معرفت ان نشانیوں سے بخوبی حاصل ہوسکتی ہے۔ مگر انسان ان سے مستفید نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے رسول بھی دنیا میں بھیجے ہیں فرمایا۔ "وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ" اور پھر ان کو کتابیں دیں۔ مختلف نبیوں کو شریعت بھی عطا کی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں وعظ و نصیحت کرنے والے لوگوں کو کھڑا کیا۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں، جہاں اللہ کا پیغام پہنچانے والے لوگ موجود نہ ہوں۔ اللہ نے یہ تمام ذرائع پیدا کیے۔ تاکہ لوگ ہدایت حاصل کرسکیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص کہے۔ کہ اُسے ہدایت نہیں پہنچی، تو پھر وہ تباہ و برباد ہوگا۔ ایک مقام پر اللہ نے فرمایا" لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ" قیامت کے دن اللہ کے سامنے کوئی حجت بازی نہیں کرسکے گا۔ کہ اس کے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ یعنی "مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ" اللہ تعالیٰ نے جواب میں واضح کردیا "فَقَدْ جَاءَكُم بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ" تمہارے پاس بشیر اور نذیر آچکے ہیں۔ اب تمہارا کوئی بہانہ قابل قبول نہ ہوگا۔ لہٰذا تمہیں اللہ کی طرف ہی آنا ہوگا" وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو ہماری طرف آنا چاہتے ہیں وہ تھوڑی سی کوشش بھی کریں تو ہم ان کے لیے راستہ واضح کردیتے ہیں۔ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ" اور جو لوگ ہدایت کا راستہ اختیار کرتے ہیں اللہ ان کے لیے ہدایت کا راستہ زیادہ واضح کرتا ہے۔ اور انہیں تقویٰ عطا کرتا ہے۔

الغرض اللہ نے فرمایا کہ ہدایت کا سامان پیدا کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے بے شمار سامان پیدا کئے ہیں۔ اس کے باوجود اگر کوئی کفر، شرک یا گمراہی کی طرف

جاتا ہے۔ تو وہ خود ذمہ دار ہے۔ اللہ نے حجت تمام کر دی ہے۔ اب اس کا مؤاخذہ ہوگا۔
البتہ وہ کسی پر جبر نہیں کرتا، کیونکہ یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسان
کو کسی حد تک اختیار دے دیا ہے۔ تاکہ وہ اپنی پسند کا راستہ اختیار کر سکے۔ اس سے انسان
کی فضیلت ظاہر کرنا بھی مقصود ہے۔ لہٰذا فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ"
جو چاہے ایمان کا راستہ اختیار کرے اور جو چاہے، کفر کے راستے پر چل نکلے۔ اب یہ اس
کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ کہ وہ کونسا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے عذاب سے
ڈرانے کے ذرائع بھی پیدا کر دیے ہیں، بزرگانِ دین یا کسی نبی کا قول ہے۔ كَفٰى بِالْمَوْتِ
وَاعِظًا یعنی موت سے بڑھ کر کوئی واعظ نہیں۔ اگر کوئی شخص ہدایت کا راستہ اختیار کرنا چاہے
تو اللہ تعالیٰ نے اس پر تمام راستے واضح کر دیے ہیں۔

مکذبین کے لئے وعید

باقی رہا وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى دنیا اور آخرت میں سارا تصرف اللہ کا ہے
کیونکہ ہر چیز کا مالک وہ ہے۔ فرمایا فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى میں نے تم کو اس آگ سے ڈرا
دیا ہے جو شعلہ مارتی ہے۔ یعنی تمہیں بھڑکنے والی آگ سے خبردار کر دیا گیا ہے اگر کلمہ توحید
اور ایمان کی تکذیب کرو گے تو بھڑکتی ہوئی آگ بھی تیار ہے۔ اس کا شکار بنو گے۔ نیز یہ بھی سن
لو لَا يَصْلٰهَآ اس بھڑکتی ہوئی آگ میں نہیں داخل ہوگا۔ اِلَّا الْاَشْقٰى مگر جو بڑا بدبخت
ہے۔ اَشْقٰى اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ ایک شقی ہوتا ہے جو کم درجے کا بدبخت اور ایک
اشقٰی جو بہت بڑا بدبخت ہو۔

شقی کی تعریف

فرمایا وہ بڑا بدبخت کون ہے۔ الَّذِیْ كَذَّبَ جس نے کلمہ توحید اور نبی کی تکذیب
کی ہے۔ اور جس نے کتب سماویہ اور آخرت کی تکذیب کی ہے یعنی ہر معروف چیز کو جھٹلایا
ہے۔ نہ صرف جھٹلایا ہے بلکہ وَتَوَلّٰى روگردانی کی ہے بات تک نہیں سنی۔ اللہ کا نبی تبلیغ
کر رہا ہے۔ خدا کی کتاب اور اس کا پیغام پہنچا رہا ہے۔ شریعت کے احکام بتلا رہا ہے۔
مگر یہ شخص ہے۔ کہ منہ پھیر کر دوسری طرف جا رہا ہے۔ نبی کی بات کی پرواہ ہی نہیں کرتا کفر و

شرک میں ملوث ہے۔ اور اس کے اندر کبائر اور صغائر بھرے ہوئے ہیں۔ ایسا ہی شخص بہت بڑا بدبخت ہے۔ اس کی بدبختی کبھی ختم نہیں ہو گی۔ اس کے لیے بدبختی سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

شقاوت کی اقسام

شقاوت کی کئی اقسام ہیں۔ کوئی چھوٹا شقی (بدبخت) ہوتا ہے۔ کوئی درمیانے درجے کا اور کوئی بڑا بدبخت۔ مسند احمد[1] کی حدیث میں ہے۔ مِنْ سَعَادَةِ الْمَرْءِ یعنی یہ بات انسان کی سعادت مندی میں سے ہے۔ کہ اُس کو بیوی اچھی ملے، مکان اچھا ملے اور سواری اچھی ملے۔ پھر فرمایا مِنْ شَقَاوَةِ الْمَرْءِ دنیا کے اعتبار سے بدبختی کی ایک نشانی یہ ہے۔ کہ نہ اُسے بیوی اچھی ملے، نہ مکان اچھا ملے اور نہ سواری اچھی ملے مفسرین کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ بعض بدبخت وہ ہوتے ہیں، جو نیکی کرنے کی بجائے چھوٹے چھوٹے گناہ کرتے ہیں اور ان پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے کم درجے کے بدبخت ہوتے ہیں۔ جب ایسا شخص نیک اعمال انجام دیتا ہے۔ تو اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور بدبختی دور ہو جاتی ہے بدبختی کی دوسری قسم یہ ہے کہ صغائر اور کبائر دونوں قسم کے گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ پہلے شخص سے بڑا بدبخت ہے محاسبے کے وقت اگر نبی، شہید یا مومن اس کی سفارش کر دے گا تو ایسا شخص سزا پا کر پاک ہو جائے گا اور اس کی بدبختی ختم ہو جائے گی۔ تیسری قسم کا شخص اشقی یعنی بڑا بدبخت ہے۔ اس کی مثال ابوجہل یا امیہ بن خلف جیسے لوگ ہیں۔ جو کفر، شرک اور دیگر ہر قسم کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور پھر ان گناہوں پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ بڑے بدبخت ہیں۔

شقی اور اتقیٰ میں تقابل

اب اشقیٰ کے مقابلہ میں اتقیٰ کا بیان آتا ہے۔ شقی کا بیان گذر چکا ہے متقی کے متعلق فرمایا وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى اور اس بھڑکتی ہوئی آگ سے دور رکھا جائے گا اس شخص کو جو پرہیزگار ہے۔ اور اس کی مثال حضرت ابوبکر صدیق رضؓ ہیں۔ بنیادی طور پر حضرت صدیق رضؓ اور امیہ بن خلف کی کوششیں بالکل متضاد ہیں۔ امیہ بڑا دولت مند، مالدار اور ظالم تھا

---

[1] مسند احمد ص ۱۶۸/ج ۱، مستدرک ص ۱۶۲/ج ۲ [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۶۶/پارہ ۳۰

وہ اپنے اُن غلاموں اور لونڈیوں کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ جنہوں نے ایمان قبول کر لیا۔ دوسری طرف ابوبکر صدیق رضؓ بھی بڑے مالدار تھے مگر آپ کا کام یہ تھا۔ کہ جن غلاموں اور لونڈیوں کو ایمان کی وجہ سے ظلم کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ آپ انہیں بھاری قیمت پر خرید کر آزاد کر دیتے۔ آپ کے ساتھ غلاموں اور لونڈیوں کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ جنہیں آپ نے آزاد کیا۔ تو اتقیٰ کا معنیٰ ہوگا سب سے بڑا متقی۔ جو تمام گناہوں سے پاک ہے۔ وہ نور ایمان سے منور ہے ایسا شخص دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ سے دور رہے گا۔ جو شخص اتقیٰ یعنی بہت بڑا متقی تو نہیں ہے۔ مگر عام درجے کا متقی ہے وہ بھی فی الجملہ دوزخ سے دور رکھا جائے گا۔ وہ شخص ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہیں جائے گا۔

ایک حدیث میں آتا ہے[1] کہ حضور علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ بدبخت آدمی کونسا ہے تو آپ نے فرمایا اَلَّذِی لَا یَعْمَلُ بِطَاعَۃٍ وَلَا یَتْرُکُ مَعْصِیَۃً یعنی بدبخت وہ ہے جو نیکی کے کام تو کرتا نہیں اور برائی کے کام چھوڑتا نہیں۔ اس کے مقابلے میں بڑے متقی کی مثال حضرت صدیق رضؓ ہیں۔ اور اُن سے کم درجے کے لوگ عام متقیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مگر وہ بھی دوزخ کی آگ سے محفوظ رہیں گے۔

متقی کے اوصاف

فرمایا متقی سے مراد وہ شخص ہے اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی جو اپنا مال صرف کرتا ہے یَتَزَکّٰی تاکہ تزکیہ حاصل کرے۔ تزکیہ کا معنیٰ نشو و نما اور طہارت ہوتا ہے۔ مقصد یہ کہ ایسا شخص ترقی کرتا جا رہا ہے اور پاکیزگی بھی حاصل کر رہا ہے وہ مال اس لیے نہیں خرچ کر رہا ہے کہ وہ کسی کا احسان مند ہے بلکہ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَہٗ مِنْ نِّعْمَۃٍ تُجْزٰٓی کسی کا اس پر احسان نہیں ہے۔ کہ جس کا بدلہ چکا رہا ہو۔ بلکہ وہ تو محض رضائے الٰہی کی خاطر خرچ کرتا ہے۔ جب صدیق اکبرؓ نے حضرت بلالؓ اور عامر بن فہیرہؓ وغیرہ کو خرید کر آزاد کر دیا تھا تو آپ پر کسی کا احسان نہیں تھا۔ انہیں تو تزکیہ کی ضرورت تھی جو انہوں نے حاصل کر لیا۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے اوصافِ حمیدہ

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیقؓ کی بڑی تعریف فرمائی ہے[2]۔ آپ نے ارشاد فرمایا

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۵۲۰ ج ۴ [2] ترمذی ص ۵۲۶

مَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَحَدٍ قَطُّ مَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَبِیْ بَکْرٍ یعنی مجھے کسی دوسرے شخص کے مال نے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا حضرت صدیق رضؓ کے مال نے اور مجھ پر کسی نے احسان نہیں کیا۔ جس کا میں نے دنیا میں بدلہ نہ چکا دیا ہو۔ مگر ابوبکر صدیق رضؓ کی ایک ذات ہے۔ کہ جس کا بدلہ میں دنیا میں نہیں چکا سکا ہوں۔ اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ اُسے آخرت میں ہی عطا کرے گا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ جب کسی کمزور لونڈی یا غلام کو خریدتے اتو ان کے والد ابو قحافہ[۱] کہا کرتے کہ اے ابوبکر! اگر تم نے کسی غلام کو آزاد کرنا ہے تو پھر کوئی طاقتور غلام خرید اکرو۔ جس پر تمہارا احسان ہو اور زندگی میں کبھی تمہارے کام آسکے۔ آپ فرماتے[۱] کہ میرا مقصد ان غلاموں سے فائدہ اٹھانا نہیں بلکہ میں تو رضائے الٰہی کی خاطر انہیں آزاد کرتا ہوں۔

آپ کے والد ابو قحافہ فتح مکہ کے دن اسلام لائے[۲] اللہ کی شان ہے کہ بیٹا اولین جانثاروں میں ہے۔ اور باپ بعد میں ایمان لاتا ہے تاریخی لحاظ سے امام موسیٰ بن عقبہؒ نے لکھا ہے[۳] کہ حضرت ابوبکر رضؓ کا واحد خاندان ہے جس کی چار پشتیں صحابی ہیں یعنی ابو قحافہ رضؓ حضرت صدیق رضؓ آپ کا بیٹا اور آپ کا پوتا۔ تمام کے تمام جماعت صحابہ میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنا شرف بخشا۔ یہ شرف کسی اور خاندان کو حاصل نہیں ہوا۔ ابو قحافہ رضؓ اسلام لانے سے پہلے بھی ایک شریف آدمی کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ بوڑھے آدمی تھے۔ دوسرے کفار کی طرح اسلام دشمنی میں ملوث نہیں ہوتے تھے۔

رضائے الٰہی

فرمایا کہ وہ شخص مال اس لیے خرچ کرتا ہے۔ کہ اولاً پاکیزگی اور طہارت حاصل کر سکے اور ثانیاً اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى اپنے بلند و برتر خدا کی رضا حاصل کر سکے وجہ کا لفظی معنیٰ چہرہ ہے۔ مگر اس سے مراد رضا ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح مولا راضی ہو جائے تو مال کی کوئی حیثیت نہیں۔

اس آیت کے شان نزول کے اعتبار سے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی فضیلت مسلّم ہے۔ اس سلسلہ میں حضور علیہ السلام کی بہت سی احادیث بھی موجود ہیں۔ حدیث اہل بیت

۱؎ تفسیر عزیزی ص ۲۶۹ پ ۳۰، ترمذی ص ۵۲۶ ۲؎ اسد الغابہ ج ۵ ص ۲۷۵ و ج ۳ ص ۳۷۴ ۳؎ الریاض النضرہ ج ۱ ص ۱۵۷

ہیں۔ امام محمد جعفرؒ اپنے والد محمد باقرؒ، وہ اپنے والد امام زین العابدینؒ سے ——— وہ اپنے والد حضرت امام حسینؓ سے اور وہ اپنے والد حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1]۔ کہ سورج جن چیزوں پر طلوع ہوتا ہے ان میں ابوبکرؓ سے زیادہ فضیلت والا کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سب سے زیادہ فضیلت بخشی ہے۔ چنانچہ لبا اوقات خطبے کے دوران بھی مومن یہ الفاظ سنتے ہیں اَفْضَلُ الْبَشَرِ بَعْدَ الْاَنْبِیَاءِ بِالتَّحْقِیْقِ اَبُوْبَکْرِنِ الصِّدِّیْقُؓ یعنی انبیاء کے بعد تمام انسانوں میں سب سے زیادہ فضیلت والے صدیق اکبرؓ ہی ہیں۔

فرمایا متقی کے رضا الٰہی کی خاطر مال خرچ کرنے کا صلہ یہ ملے گا کہ وَلَسَوْفَ یَرْضیٰ عنقریب اللہ اس سے راضی ہو جائے گا۔ یرضیٰ کی ضمیر اگر اتقیٰ کی طرف لوٹائی جائے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ مال خرچ کرنے والے کو اللہ تعالیٰ آخرت میں اس قدر انعام و اکرام فرمائیں گے۔ کہ وہ بھی راضی ہو جائے گا۔ یعنی اسے اپنے ایثار کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۷۰ پارہ ۳۰ بحوالہ کتاب الموفقہ لابن السمان

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سُورَةُ الضُّحَى

الضُّحٰی ۹۳
(آیت ۱ تا ۷)

عمّ ۳۰
درس اوّل

سُوْرَةُ الضُّحٰى مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً
سورۃ ضحیٰ مکی ہے اور یہ گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

وَالضُّحٰى ① وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ② مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ③
وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ④ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى
⑤ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ⑥ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ⑦

ترجمہ:۔ قسم ہے دھوپ چڑھتے وقت کی ① اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے ②
آپ کو آپ کے پروردگار نے نہیں چھوڑا اور نہ ہی آپ سے دشمنی کی ہے ③ اور آپ کا آنیوالا
دور گذشتہ دور سے بہتر ہوگا۔ ④ اور آپ کا رب عنقریب آپ کو اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ
راضی ہو جائیں گے ⑤ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم نہیں پایا تھا پس اس نے جگہ دی ⑥
اور پایا آپ کو ناواقف پس راہنمائی فرمائی ⑦

نام اور کوائف
اس سورۃ کا نام سُوْرَةُ الضُّحٰى ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی اس کی گیارہ آیات ہیں۔ اور یہ سورۃ چالیس ۴۰ الفاظ اور ایک سو بانوے ۱۹۲ حروف پر مشتمل ہے اس کی پہلی آیت میں ضحیٰ کا لفظ مذکور ہے، جس سے اس سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔

شان نزول
صحیح احادیث میں آتا ہے[1] کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بوجہ بیماری دو تین راتیں نماز کے لیے نہ اٹھ سکے۔ تو مکے کے مشرکین کی ایک نہایت ہی متعصب عورت نے طعنہ دیا، کہ اے محمد! معلوم ہوتا ہے۔ کہ تیرے شیطان نے تجھے چھوڑ دیا (العیاذ باللہ) وہ عورت

---

[1] بخاری صـ ۷۳۸ ج ۲، مسلم صـ ۱۰۹ ج ۲

ابو لہب کی بیوی اور حضور علیہ السلام کی چچی اُمّ جمیلہ تھی۔ یہ وہی عورت ہے جس کی مذمت میں سورۃ لہب میں آیا ہے وَامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ دوسری روایت[1] میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر چند دن تک وحی نہ آئی تو مشرکین نے استہزاء شروع کر دیا، اور اس قسم کے جملے کہے۔ وَدَّعَهٗ رَبُّهٗ وَقَلٰی محمد کے رب نے اُسے چھوڑ دیا ہے۔ اور اُس سے نفرت کر لی ہے۔ تو گویا اِس قسم کے حالات میں اس سورۃ مبارکہ کا نزول ہوا۔

مضمون سورۃ

سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اُن بیہودہ خیالات اور طعن و تشنیع کی تردید فرمائی ہے۔ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کا ذکر کیا ہے، جو اس نے اپنے پیغمبر علیہ السلام پر کیے۔ اور آخر میں ان انعامات کا شکریہ ادا کرنے کا ذکر ہے۔ نیز حضور علیہ السلام کو تسلی دی گئی۔ کہ آپ مخالفین کی ان باتوں سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ ان کا تو شیوہ ہی ایذاء رسانی ہے۔ اس طرح آپ کو تسلی دی گئی ہے۔

ضحیٰ اور اشراق

ابتداء میں دن اور رات کی قسمیں کھا کر بات کو واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَالضُّحٰىۙ قسم ہے دھوپ چڑھتے وقت کی۔ ضحیٰ دن کے اُس حصے کو کہتے ہیں۔ جب دن خوب روشن ہو جاتا ہے۔ یعنی سورج بلند ہو جاتا ہے۔ اور اس کی تپش سے ریت گرم ہو جاتی ہے۔ اُس وقت جو نماز پڑھی جاتی ہے اُس کو صَلٰوۃُ الضُّحٰی یا چاشت کی نماز کہا جاتا ہے۔

اس سے پہلے سورج کے طلوع کے تھوڑی دیر بعد جو نماز ادا کی جاتی ہے۔ اُسے اشراق کی نماز کہتے ہیں۔ اشراق کا معنی سورج کا چمکنا ہے۔ یعنی جب سورج چمکتا ہے یا ظاہر ہوتا ہے۔ اس کو اشراق کہتے ہیں۔ یہ دونوں نفل نمازیں ہیں۔

نماز ضحیٰ یا اوابین

حدیث شریف[2] میں آتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے دریافت کیا گیا۔ کیا حضور علیہ السلام چاشت کی نماز ادا فرماتے تھے۔ تو آپ نے جواب دیا۔ ہاں! آپ چاشت کی چار رکعت یا اس سے زیادہ بھی پڑھتے تھے۔ فتح مکہ کے دن آپ نے چاشت کی

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۵۲۲ ج ۴ [2] مسلم ص ۲۴۸

نماز آٹھ رکعت ادا فرمائی[1]۔ یہ نماز بارہ رکعت تک پڑھی جاسکتی ہے۔ اور کم سے کم دو رکعت حضور علیہ السلام سے دو، چار یا آٹھ رکعت تک ثابت ہے[2]۔ اکثر بزرگانِ دین بارہ رکعت بھی پڑھتے ہیں۔

صلوٰۃ ضحیٰ کے متعلق ترمذی شریف[3] کی روایت میں آتا ہے اِنَّ صَلٰوۃَ الْاَوَّابِیْنَ حِیْنَ تَرْمَضُ الْفِصَالُ چاشت کے وقت پڑھی جانے والی نماز صلوٰۃ الاوّابین ہے۔ اَوّاب کا معنیٰ ہے خدا کی طرف رجوع کرنے والا۔ یہ نماز فرض تو ہے نہیں، محض نفل ہے۔ اس لیے یہ نماز ادا کرنے والے لوگ خصوصی طور پہ اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس لیے اس نماز کو صلوٰۃ الاوّابین کہا گیا ہے۔ ان نوافل کا یہ نام اصطلاحاً نہیں بلکہ معنوی طور پہ ہے۔ چونکہ ان نوافل کا ادا کرنے والا ــــ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرتا ہے۔ اس لیے اسے بھی اوّابین کی نماز کہا گیا ہے۔ اصطلاح کے طور پر جس نماز کو صلوٰۃ الاوّابین کہا گیا ہے۔ وہ وہی نماز ہے۔ جو چاشت کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ جب سورج اتنا بلند ہو جاتا ہے۔ کہ اس کی تپش سے اونٹوں کے چھوٹے بچوں کے پاؤں گرمی کی وجہ سے تپنے لگتے ہیں۔ آجکل کے وقت کے لحاظ سے یہ نو، دس بجے کا وقت ہوتا ہے۔ تاہم مغرب کے بعد چھ نوافل کی بڑی فضیلت ہے ابن ماجہ شریف[4] کی روایت میں ہے۔ کہ جو شخص بعد از نماز مغرب چھ نفل اخلاص کے ساتھ ادا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بارہ سال کی نمازوں کا اجر عطا فرمائے گا۔

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط

گذشتہ سورۃ کی ابتدا رات کی قسم سے ہوئی تھی "وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی" یعنی قسم ہے رات کی جب وہ پھیل جائے۔ اور اس سورۃ میں فرمایا وَالضُّحٰی یعنی قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن ہوجائے وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی اور قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[5] کہ گذشتہ سورۃ کی آخری آیات میں حضرت صدیق اکبرؓ کے اخلاق حسنہ اور ان کے تقویٰ کی طرف اشارہ ہے چونکہ انکی زندگی کا پہلا دور زمانہ جاہلیت میں بسر ہوا جسے رات کی تاریکی کے ساتھ مشابہت ہے۔ اس لیے وہاں

---

[1] مسلم ص ۲۴۹ ج ۱، بخاری ص ۱۵۷ ج ۱ [2] مسلم ص ۲۴۸ ج ۱ تا ص ۲۵۰ ج ۱ [3] ترمذی ص ـــ مسند احمد ص ۳۶۷ ج ۴
[4] ابن ماجہ ص ۸۱، [5] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۲۴ پ ۳۰

سورۃ کی ابتداء وَالَّیْلِ یعنی رات سے ہوئی۔ بعد میں آپ ایمان لائے۔ اور ساری امت سے افضل قرار پائے۔ اس سورۃ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کا ذکر ہے لہٰذا یہاں پہ والضحیٰ کا لفظ استعمال کر کے آپ کو روز روشن سے تشبیہ دی گئی۔ گویا آپ کی ذات خوب روشن دن کی طرح صاف وشفاف اور واضح ہے۔

ضحیٰ اور لیل وسیع تر معنوں میں

حقیقت میں قرآنِ حکیم نے حکیمانہ طریقے پہ بہت سی باتیں سمجھائی ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے جملوں اور چھوٹی چھوٹی سورتوں میں علم وحکمت کے موتی بکھرے ہیں۔ اور مختلف طریقوں سے نہایت گہری باتیں ذہن نشین کرائی ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو نور اور روشنی فرمایا ہے۔ جب کہ کفر وضلالت کو تاریکی سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح حدیث پاک میں سنت کو روشنی اور بدعات کو تاریکی قرار دیا گیا ہے۔ جب انسان کے باطن پہ کفر وشرک کی تاریکی چھا جاتی ہے۔ تو اس کی بصیرت زائل ہو جاتی ہے۔ اُسے صحیح بات کی سمجھ ہی نہیں آتی۔ وہ غلط تاویلوں اور فاسد عقیدے کے اندر ہی پڑا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اعمال بھی فاسد ہو جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جسے ایمان کی دولت نصیب ہو جائے۔ اُس کے قلب و ذہن میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے جس کے ذریعے وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے لگتا ہے۔ اس کا دل اور دماغ بھی روشن ہو جاتا ہے۔

پیغمبر علیہ السلام پہ نزول وحی کی مثال ایسی ہے جیسے دوپہر کے وقت روشنی ہوتی ہے اور یہ ایک مسلمہ اصول ہے۔ کہ انسانیت ہمیشہ علم سے ترقی کرتی ہے۔ تاریکی ایک عارضی چیز ہے۔ کیونکہ اس کے بعد روشنی ضرور آتی ہے۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ دوپہر کے بعد رات کا آنا بالکل عارضی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب روز روشن نہیں آئے گا۔ بلکہ دن تو بڑی آب وتاب سے آئے گا۔ وَالضُّحٰی[۱] کا بھی یہی معنیٰ ہے اگر کچھ عرصہ کے لیے انقطاعِ وحی کی تاریکی چھا گئی ہے تو یہ بالکل عارضی چیز ہے۔ وحی الٰہی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو کر اس عارضی تاریکی کو ختم کر دے گا۔ اور دنیا پھر سے ہدایت کی روشنی سے منور ہو جائے گی۔

سلہ

بعض فرماتے ہیں۔ کہ والضحٰی میں یہ اشارہ ملتا ہے۔ کہ قسم ہے اسلام کے روشن دور کی ظاہر ہے۔ کہ اسلام کے دو دور ہیں۔ ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک سے لے کر جنگ صفین تک روشن دور ہے۔ جس میں دینِ اسلام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکا تھا۔ مگر اس کے بعد تاریکی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ مگر اس تاریک دور میں بھی اسلام کی شمع گل نہیں ہوئی۔ بلکہ جس طرح رات کی تاریکی میں چاند نمودار ہو کر کچھ نہ کچھ روشنی بہم پہنچاتا ہے۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کے بعد خلفائے راشدین کی مثال چاند کی سی ہے۔ جنہوں نے حضور علیہ السلام سے روشنی حاصل کر کے دنیا کو منور کیے رکھا۔ جب چاند بھی غروب ہو جاتا ہے۔ تو ستاروں کی کم تر روشنی بھی کسی حد تک کفایت کرتی ہے۔ صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین اور تبع تابعین ستاروں کی مانند ہیں جنہوں نے اپنی بساط کے مطابق اسلام کے راستے کو منور رکھا مکمل تاریکی کے دور میں لوگ چراغ جلاتے ہیں یا اور کسی طرح سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ امت مسلمہ میں بھی یہ فریضہ اہل علم، صالحین اور مجاہدین نے انجام دیا۔ اور اللہ نے اس تاریک دور میں روشنی کا کچھ نہ کچھ سامان پیدا کر دیا۔ تاہم اسلام کا اولین دور روزِ روشن کی مانند ہے۔

بہتر مستقبل کی بشارت

بہر حال اللہ تعالیٰ نے دھوپ چڑھتے وقت اور رات کی تاریکی کی قسم اٹھا کر فرمایا مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ آپ کو آپ کے پروردگار نے نہیں چھوڑا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انقطاع وحی کے دور میں کفار اپنے عناد، دشمنی اور خبیث ذہنیت کی بنا پر یہ طعنہ دیتے تھے۔ کہ معاذ اللہ حضور علیہ السلام کو ان کے رب نے چھوڑ دیا ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طعن کی تردید کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ ان کے دعوے کی کوئی حیثیت نہیں۔ آپ کو آپ کے رب نے ہرگز نہیں چھوڑا۔ وَمَا قَلٰی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے آپ سے نفرت کا اظہار فرمایا ہے۔ وحی کے چند روز کے لیے رک جانا یا کسی عارضہ کی وجہ سے آپ کا چند دن کے لیے عبادت کے واسطے نہ اٹھ سکنا، یہ عارضی دور ہے۔ یہ تاریکی چھٹ جائے گی اور روشنی کا دور دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ آپ یقین جانیں۔ وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ

میں اُن کو بتائیں کہ آپ کا آئندہ دور گذشتہ دور سے بہتر ہو گا۔ ظہورِ اسلام کا پہلا دور مشکلات کا دور ہے اور اس کے بعد جو دور آنے والا ہے۔ وہ تابناک ہے۔ لہٰذا آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوں تاریکی کے یہ بادل عنقریب چھٹ جائیں گے۔

بعض[1] اس کو آخرت پر محمول کرتے ہیں۔ کہ دنیا کی زندگی سے آپ کا آخرت کا دور بہتر ہے۔ یہ وہ دور ہو گا جب قیامت کے روز اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائیں گے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء علیہم السلام آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گے۔ آپ شفاعت کبریٰ اور صغریٰ فرمائیں گے اور آپ کی شان اور مرتبے کا مکمل ظہور ہو گا۔ آخرت کے بہتر ہونے کا یہی مطلب ہے اس دنیا میں تکالیف ہیں۔ طرح طرح کی پریشانیاں لاحق ہیں۔ مگر آخرت آپ کے لیے بہر حال بہتر ہے یہ تو بہرحال امر مُسلّم ہے۔

بعض[2] فرماتے ہیں، کہ اس دنیا کا ہر دوسرا دور پہلے کی نسبت ترقی کا دور ہے۔ چونکہ ترقی ایک مسلسل عمل ہے جو جاری رہتا ہے۔ اس لیے آپ کا ہر آنے والا دور گذشتہ کی نسبت ترقی یافتہ دور ہے۔ جس طرح رات کی تاریکی کے بعد اگلا دن پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔ اسی طرح مصائب کا یہ عارضی دور ختم ہو کر آپ کو مادی اور روحانی ترقی ضرور حاصل ہو گی۔

خوش کن انعامات

فرمایا آنے والے دور کی بہتری کی نشانی یہ ہے کہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ آپ کا رب عنقریب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔ آخرت کا معاملہ تو یہ ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا[3] کہ جب تک میری امت کا ایک فرد بھی دوزخ میں ہو گا میں راضی نہیں ہوں گا۔ میری رضا اُس وقت ہو گی جب میری امت کے تمام لوگ دوزخ سے رہائی حاصل کر لیں گے۔ رہا اس دنیا کا معاملہ تو یہاں آپ کی انتہائی خواہش یہ تھی۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۱۵ جلد ۴، تفسیر عزیزی پ ۳۰ صفحہ ۲۵۷ — [2] المقام المحمود پ ۳۰ صفحہ ۱۱۲

[3] در منثور صفحہ ۳۶۱ جلد ۶، روح المعانی جلد ۳۰ صفحہ ۱۶۰

کہ اسلام کو عروج حاصل ہو۔ آپ اس معاملے میں ہمیشہ متفکر رہتے تھے لہذا اللہ تعالےٰ نے آپ کو بشارت دی کہ آپ کی تمنا ضرور پوری ہو گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی۔ "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ" اے پروردگار میری اولاد میں سے امت مسلمہ پیدا کر اور پھر انہیں میں سے آخری رسول بھیج۔ بلاشبہ حضور علیہ السلام ہی اس دعا کے مصداق تھے[1] اور اپنا فرض منصبی "يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ط" جلد از جلد پورا کرنا چاہتے تھے۔ آپ کی دلی خواہش تھی۔ کہ میری تعلیم و تربیت کا نتیجہ جلد از جلد ظاہر ہو۔ اور لوگ دھڑا دھڑا دین اسلام میں داخل ہو جائیں۔ تو اس مقام پہ اللہ تعالیٰ نے بشارت دی کہ آپ کی یہ خواہش عنقریب پوری ہو گی "وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" اور آپ لوگوں کو گروہ در گروہ دین میں داخل ہوتے ہوئے دیکھیں گے اور راضی ہو جائیں گے۔

حضور علیہ السلام کا بچپن کا زمانہ

دلیل کے طور پہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے بچپن کا ذکر کیا کہ کس طرح آپکو مشکل حالات سے نکال کر موجودہ منزل تک پہنچایا فرمایا "اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى" کیا اللہ تعالےٰ نے آپ کو نہیں پایا تھا یتیم پس اُس نے جگہ دی۔ یعنی آپ تو پیدا ہی یتیم ہوئے تھے۔ آپ کے والد آپ کی ولادت سے دو ماہ پہلے صرف تیئس [۲۳] چوبیس [۲۴] سال کی عمر میں وفات پا گئے تھے[2] چھ سال کی عمر میں آپ کی والدہ کا سایہ بھی اُٹھ گیا اور باپ کے بعد آپ ماں کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کی پرورش کا اس طرح انتظام فرمایا کہ آپ کے دادا عبدالمطلب کے دِل میں آپ کی محبت ڈال دی۔ وہ آپ کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ دو سال بعد یعنی آٹھ سال کی عمر میں شفیق دادا بھی داغ مفارقت دے گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا ابوطالب کا دِل آپ کی طرف مائل کر دیا۔ آپ کو حضور علیہ السلام سے اس قدر محبت تھی کہ سفر میں تنہا چھوڑ کر نہ جاتے بلکہ ہمراہ لے جاتے مبادا آپکو کوئی گزند پہنچ جائے

---

[1] مسند احمد صفحہ ۲۶۲ ج ۵

[2] تفسیر عزیزی صفحہ ۲۷۸ پ ۳۰، ابن کثیر صفحہ ۵۲۳ ج ۴

آپ کی عمر مبارک تیرہ سال کی تھی جب آپ نے اپنے چچا کے ساتھ سفر اختیار کیا۔ راستے میں ایک بہت بڑا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے آپ کو واپس لوٹا دیا گیا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے حالتِ یتیمی میں آپ کی پرورش کی، تو کیا اب ہم آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے ہرگز نہیں۔ اللہ اپنی رحمت کا سایہ اب بھی آپ پر قائم رکھے گا۔

یتیموں کی پرورش

ان حالات سے یتیموں کی پرورش کا قانون قائم ہوتا ہے۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طالب ہو تو یتیموں کی پرورش کیا کرو۔ مسند احمد[1] کی روایت میں ہے کہ ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! میں اپنے دل میں سختی پاتا ہوں۔ اس کا علاج فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا، یتیم کے سر پر ہاتھ رکھو اور مسکین کو کھانا کھلاؤ، خدا تمہارے دل کی سختی کو دور کرے گا۔ تنگدلی بہت بڑی بیماری ہے۔ خدا تعالیٰ سے جس قدر تنگ دل بعید ہوتا ہے کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ فرمایا غلاموں، یتیموں اور مسکینوں کی دلجوئی کرو گے، خدا تم پر رحم کرے گا۔ تمہارے دل میں نرمی پیدا ہو گی اور پاکیزہ خیالات کو جگہ ملے گی۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان[2] ہے کہ مسلمان گھرانوں میں سے وہ بہترین گھر ہے۔ جس میں کوئی یتیم ہے، اور اس کے ساتھ احسان کیا جا رہا ہے۔ اور بدترین گھر وہ، جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جا رہی ہے گذشتہ سورۃ بلد میں بھی یہ مضمون گذر چکا ہے "اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِیۡ یَوۡمٍ ذِیۡ مَسۡغَبَۃٍ ۙ یَّتِیۡمًا ذَا مَقۡرَبَۃٍ ۙ اَوۡ مِسۡکِیۡنًا ذَا مَتۡرَبَۃٍ" یہاں بھی یتیم و مسکین کی پرورش کا قانون بتلایا گیا ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو یاد دلایا کہ کیا آپ کو اللہ نے یتیم نہیں پایا۔ پھر اس نے ٹھکانا مہیا کیا۔ اور پرورش کا سامان پیدا کیا۔

لفظ ضال کا مفہوم

یتیمی میں ٹھکانا دینے کا احسان جتلانے کے بعد دوسرا احسان یہ بتلایا وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اور پایا آپ کو ضال، پس راہنمائی فرمائی۔ لفظ ضال مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک معنی تو وہی ہے جیسے گمراہ، کافر وغیرہ اس کی مثال "غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ" میں موجود ہے یعنی اے اللہ! ہمیں مغضوب علیہم (یہود) اور ضالین (نصاریٰ)

---

[1] مسند احمد ص ۲۸۷/۲ [2] ابن ماجہ ص ۲۶۲

کے راستے سے بچا۔ اور سیدھے راستے پر چلا۔

یہ معنی پیغمبر علیہ السلام کی ذات والا صفات پر تو ہرگز عاید نہیں ہوتا۔ نبی کی ذات پر کفر، شرک زندگی کے کسی بھی مرحلے پر محال ہے[1]۔ کیونکہ اللہ تعالے ابتدار سے ہی نبی کی ذات کا محافظ اور نگران ہوتا ہے۔ ضال کا ایک دوسرا معنی حیران اور سرگردان ہے۔ جو شخص گم ہو جائے اُسے بھی ضال کہتے ہیں۔ جیسے اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ[2] دانائی اور حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے۔ ضال کا ایک اور معنی ناواقف بھی ہے۔ اگر یہ معنی لیا جائے۔ تو آیت کا مفہوم ہوگا اور آپ کو ناواقف پایا اس قسم کا مفہوم بعض دوسری آیات میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً "مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ" آپ کو پتہ نہیں تھا کہ کتاب کا علم کیا ہے اور ایمان کی تفصیل کیا ہے یہ روشنی تو ہم نے آپ کے دل میں ڈالی۔ آپ کو صحیح عقاید اور صحیح پروگرام معلوم نہیں تھا۔ یہ تو اللہ تعالی نے آپ کو بتلایا۔ مقصد یہ کہ آپ کے اندر پروگرام کو اخذ کرنے کی صلاحیت اور جذبہ تو موجود تھا مگر آگے کوئی راستہ معلوم نہیں تھا۔ اس لیے اللہ نے آپ پر مہربانی فرمائی۔ آپ کو سرگردان یا ناواقف پایا تو منزل مقصود تک پہنچا دیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ پر کتاب نازل فرمائی، قانون دیا، پروگرام تبلایا۔ صحیح فکر اور صحیح عقائد بتلائے۔ اعمال کی صحت کا قانون عنایت کیا۔ آپ کو شریعت دی۔ جس سے آپ ناواقف تھے "ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْھَا" اللہ تعالی نے آپ پر بڑا احسان فرمایا کہ وحی کے ذریعے آپ پر شریعت نازل فرمائی۔

الغرض! یہاں پر ضال کا معنی گمراہ نہیں بلکہ ناواقف ہے۔ آپ ناواقف تھے۔ اللہ تعالی نے مہربانی فرما کر منزل مقصود تک پہنچایا۔ وحی نازل فرمائی۔ شریعت کا علم عطا کیا۔ اور قانون کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ وہ علم اور وہ تفصیلات جن کے ذریعے آپ دنیا کی راہنمائی فرما سکیں۔

---

[1] شرح عقائد صـ۹۸ طبع کراچی
[2] ترمذی صـ۳۸۵ ابن ماجہ صـ۳۰۷

عو ۳۰ — الضحیٰ ۹۳

درس سوم — (آیت ۸ تا ۱۱)

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴿۸﴾ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ﴿۹﴾ وَاَمَّا
السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿۱۰﴾ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾ ع ۱۸

ترجمہ :- اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مفلس پایا پس اس نے مستغنی کر دیا ﴿۸﴾ پس بہرحال یتیم پر آپ قہر نہ کریں ﴿۹﴾ اور بہرحال سائل تو آپ اس کو مت جھڑکیں ﴿۱۰﴾ اور بہرحال اپنے رب کی نعمت کو بیان کرتے رہیں ﴿۱۱﴾

گذشتہ سے پیوستہ

ابتدائے سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی کہ چند دن کے لیے وحی کے منقطع ہونے پر مشرکین جو اعتراضات کرتے ہیں، وہ درست نہیں ہیں۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اس مقام پر دن اور رات کی قسم کھا کر آپ کو تسلی دی گئی ہے۔ کہ آپ کا پروردگار مکمل طور پر آپ کے ساتھ ہے۔ نہ اُس نے آپ کو چھوڑا ہے۔ اور نہ اُس نے آپ سے نفرت کا اظہار فرمایا ہے۔ یہاں پر دھوپ کے روشن ہونے سے مراد وحی الٰہی کا نزول ہے۔ جس طرح چاشت کے وقت دن خوب روشن ہوتا ہے۔ اور ہر چیز واضح ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی الٰہی کے نزول پر حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ وحی الٰہی کا منقطع ہونا بھی ترقی کی علامت ہے۔ اور اس کا منشاء یہ ہے کہ آپ پہلے سے موجود پروگرام کی تعلیم دیتے رہیں۔ اور اپنی جماعت کی تربیت فرماتے رہیں۔ انقطاع وحی کے دوران کام معطل نہیں ہو جاتا۔ بلکہ آپ کو جماعت بندی اور تبلیغ دین کا کام کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ کہ اس دوران آپ اسلام کا پروگرام دوسرے لوگوں تک پہنچاتے رہیں۔ یہ کام مزید ترقی کا پیش خیمہ ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ آپکا آخری دور آپ کے پہلے دور کی نسبت بہتر ہوگا۔ آپ ہر لحہ ترقی کی منازل طے کرتے جائیں۔ یہ ترقی مسلسل جاری رہے گی اس دنیا میں، عالم برزخ میں بھی اور پھر آخرت میں بھی ترقی کا تسلسل برقرار رہنا چاہیئے۔

پھر فرمایا کہ عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا کچھ عطا کرے گا۔ کہ آپ راضی ہو جائینگے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دلی خواہش کو پورا کرے گا۔ سابقہ انعام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

کیا اللہ نے آپ کو یتیم نہیں پایا تھا۔ پھر اس حالت میں آپ کی پرورش کس طریقہ پر کی۔ آپ کو ٹھکانا دیا۔ باپ کا سایہ ولادت سے پہلے اُٹھ چکا تھا۔ چھ سال کی عمر میں والدہ بھی وفات پا گئی۔ پھر اللہ نے قوم کے سردار عبدالمطلب کے دل میں آپ کی محبت ڈال دی۔ جنے آپ کی پرورش نہایت اچھے طریقے پر کی۔ دو سال کے عرصے بعد دادا بھی فوت ہوگیا۔ تو اللہ تعالےٰ نے آپ کی پرورش کی خدمت آپ کے چچا ابوطالب سے لی۔ وہ آپ کو سفر و حضر میں ساتھ رکھتا تھا۔ تاکہ خدانخواستہ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی سے ہوا ایک اور بہت بڑی مہربانی اللہ نے یہ کی۔ کہ حضور علیہ السلام ناواقف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو شریعت اور کتاب کا علم دیا۔ اور منزل مقصود تک پہنچایا۔

حضور علیہ السلام کا استغناء

اس کے بعد اگلے احسان کے متعلق فرمایا وَوَجَدَكَ عَائِلًا ابتدائی دور میں اللہ تعالےٰ نے آپ کو مفلس پایا فَأَغْنَىٰ[1] پس اُس نے مستغنی کر دیا، بے پرواکر دیا۔ عائل کا معنی احتاج ہوتا ہے۔ یعنی آپ کی مالی حالت کمزور تھی۔ عائل کا دوسرا معنی اعیالدار بھی ہوتا ہے۔ جس کی کفالت میں اہل وعیال زیادہ ہوں اور ضروریات زندگی بخوبی پوری نہ ہوتی ہوں۔ حضور علیہ السلام کی ابتدائی زندگی احتیاج کی زندگی تھی۔ بچپن میں آپ دادا اور چچا کے زیر کفالت رہے۔ بعد میں آپ نے تجارت شروع کی تو اللہ نے کافی نفع دیا۔ اس کے بعد آپ مکہ کی ایک نہایت شریف اور مالدار خاتون حضرت خدیجہؓ کے مال میں مضاربت کرنے لگے اس سلسلہ میں آپ نے سفر بھی اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے تجارت میں بڑا نفع دیا۔ اُس خاتون نے حضور علیہ السلام سے نکاح کر لیا۔ اور اپنا مال و دولت حضور علیہ السلام کی خواہش کے مطابق صرف کرنے لگی[1]۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے بھی آپ کی حسب منشا اپنی ساری دولت صرف کر دی۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[2] مَا نَفَعَنِيْ مَالُ اَحَدٍ قَطُّ مَا نَفَعَنِيْ مَالُ اَبِيْ بَكْرٍ یعنی مجھے کسی کے مال نے اتنا فائدہ نہیں پہنچایا، جتنا حضرت صدیق رضؓ کے مال نے۔ الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی علیہ السلام! آپ نادار تھے۔ ہم نے آپ کو غنی کر دیا۔

---

[1] روح المعانی ص۱۶۳ ج۳۰، تفسیر عزیزی ص۲۸۱ پ۳۰ [2] ترمذی ص۵۲۶

غنائے قلب

الغنیٰ کا عام فہم معنی تو یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ جیسی بے مثال شخصیت کو وسیع قلب، عطا فرمایا اور آپ کو وہ اخلاق حسنہ عطا کیا، کہ جس کی تعریف اُس نے خود فرمائی۔ "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" یعنی آپ عظیم اخلاق کے حامل ہیں۔ دنیا کے سارے خزانے بھی آپ کی قلبی کیفیت اور آپ کے اخلاق سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ تو غنیٰ کا مطلب صرف یہ نہیں ہے۔ کہ حضرت خدیجہ رضؓ یا حضرت ابوبکر رضؓ یا خاندان بنو ہاشم کا مال آپ کے حسب منشا خرچ ہوا۔ بلکہ حقیقی غنار یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو غنائے قلب عطا کر دیا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ[۱] یعنی حقیقی غنار اس ظاہری مال و اسباب سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اصل غنار تو دل کا غنار ہے۔ خواہ ظاہری اسباب کم ہی کیوں نہ ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے دل میں بے حد استغناء پیدا کیا تھا۔ آپ حقیر چیزوں کی طرف قطعی متوجہ نہیں ہوتے۔

قناعت کی فضیلت

برخلاف اس کے دنیا کے بڑے بڑے مالداروں پر نگاہ ڈالیے۔ نہایت خسیس کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ معمولی سے منافع کی خاطر ایمان تک کو داؤ پہ لگا دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے حضور علیہ السلام کو ایسی چیزوں سے پاک رکھا۔ اور آپ کے قلب مبارک میں اعلیٰ درجے کا استغنار پیدا فرما دیا۔ اسی لیے آپ کا ارشاد ہے۔ حقیقی غنا دل کا ہے۔

عام طور پہ یہ بھی مشاہدہ میں آتا ہے۔ کہ اکثر امیر لوگ دل کے غریب ہوتے ہیں زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کر کے بھی ان کا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے پیچھے اور زیادہ بھاگتے ہیں اور خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا[۲] جسے قناعت کی دولت نصیب ہو جائے۔ وہ بڑے سے بڑے دولتمند سے بہتر ہے۔ فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ هُدِيَ اِلَى الْاِسْلَامِ وَرُزِقَ الْكَفَافَ وَقَنَعَ بِهٖ یعنی وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اسلام قبول کر لیا۔ اگرچہ اس کے پاس گذر اوقات کا سامان بقدر ضرورت ہی ہو۔ یہ قناعت بہت بڑی دولت ہے۔ حرص و لالچ کی مذمت خود قرآن پاک نے بیان کی ہے۔

---

۱ مسلم صفحہ ۳۳۶/۱، بخاری صفحہ ۹۵۴/۲ ۲ ابن ماجہ صفحہ ۳۰۵، ترمذی صفحہ ۳۴

"اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ o" تمہیں مال و دولت کی کثرت (طلب) نے غفلت میں ڈال دیا ہے۔ یہاں تک کہ تم قبروں میں پہنچ جاؤ۔ مقصد یہ کہ مال کے مقابلے میں قناعت عظیم نعمت ہے۔

اللہ جل شانہ نے حضور خاتم النبیین علیہ السلام کو جو استغناء عطا فرمایا تھا وہ سب سے زیادہ تھا۔ یہی حال آپ کے خاندان اور اہل بیت کا تھا۔ ان پر کیسی بھی تکلیف آئی مگر شکوہ و شکایت کبھی زبان پر نہیں آئی۔ وہ بھی قناعت کے پیکر تھے اپنے خرچ میں سے راہ خدا میں دے دیتے۔ امہات المومنینؓ کا بھی یہی حال تھا۔ حضرت عائشہؓ کے پاس درہموں کی دو بوریاں بھر کر آئیں۔ آپ کی جود و سخاوت اور قناعت و استغناء کا یہ حال تھا کہ شام تک اتنا بھی باقی نہ رکھا کہ روزہ افطار کر لیتیں۔ سارا مال مستحقین میں تقسیم کر دیا۔[1] اللہ تعالٰے نے آپ کے اہل بیت اور اہل خاندان کو بڑی قناعت دی تھی۔ ظاہری مال و اسباب کے ساری دنیا کے خزانے بھی آپ کے سامنے آ جاتے تو ضروریات پوری نہ ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ آپ کا قلب بہت وسیع تھا۔ آپ کا اخلاق بہت بلند تھا۔ مگر اللہ نے آپ کو بہت بے پروا کر دیا تھا۔ اسی لیے سعدی صاحبؒ کہتے ہیں۔ ؎

تونگری بدل است نہ بمال　　　بزرگی بعقل است نہ بہ سال

تونگری دل کے ساتھ ہوتی ہے نہ کہ مال کے ساتھ بزرگی عقل کے ساتھ ہوتی ہے۔ عمر کے ساتھ نہیں کیونکہ بعض اوقات چھوٹی عمر کے لوگ بھی دانائی کی باتیں کرتے ہیں۔ جب کہ عمر رسیدہ حماقت کر بیٹھتے ہیں۔

الغرض یہ اللہ تعالیٰ کے حضور علیہ السلام پر انعامات تھے کہ آپ یتیم تھے تو اللہ نے ٹھکانا فراہم کیا۔ آپ ناواقف تھے، اللہ کریم نے کتاب و شریعت کے ذریعے علم دیا آپ محتاج تھے اللہ نے مستغنی بنا دیا۔ ان آیات میں انہیں باتوں کا تذکرہ ہے۔

یتیم کے ساتھ شفقت

مذکورہ تین احکام کے مقابلے میں اللہ تعالٰے نے حضور علیہ السلام کو تین احکام

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۶۷ ج ۸ ، مستدرک حاکم ص ۱۳ ج ۴

بھی دیے ہیں۔ آپ کی یتیمی کا تذکرہ کیا۔ تو اس کے ساتھ پہلا حکم یہ ہو رہا ہے۔ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ یتیم پر قہر نہ کریں۔ آپ نے خود بحیثیت یتیم جان لیا۔ کہ وہ کس قسم کے سلوک کا مستحق ہوتا ہے لہٰذا اللہ نے آپ کو اور آپ کی وساطت سے ساری امت کو تعلیم دی۔ کہ یتیم کے ساتھ سختی سے پیش نہیں آنا، بلکہ ان کے ساتھ شفقت اور ہمدردی کا سلوک کرنا ہے جب کسی یتیم کو دیکھو۔ تو یاد کرو کہ ہمارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یتیم تھے آپ نے فرمایا یتیم کے ساتھ مہربانی کیا کرو۔ اس کا اجر یہ ملے گا۔ اَنَا وَ کَافِلُ الْیَتِیْمِ کَھَاتَیْنِ[1] میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا قیامت کے دن اکٹھے ہوں گے۔ گویا ایسے شخص کو میرا قرب نصیب ہوگا۔

مسند احمدؒ کی روایت گذشتہ درس میں بیان ہو چکی ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا حضور! میں اپنے دل میں سختی پاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا یتیم کے سر پر ہاتھ رکھو۔ اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو۔ خدا تمہاری سختی دور کر دے گا۔ یتیموں کے مال کی حفاظت کے متعلق سورۃ نساء میں آتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ جو لوگ یتیموں کا مال دھوکے فریب سے کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ ڈال رہے ہیں۔ ایسے لوگ عنقریب جہنم کا شکار بنیں گے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ یتیم کے ساتھ زیادتی نہ کرو، بلکہ ان کی پرورش کرو۔ یتیم سرپرست سے محروم ہوتا ہے، اور مسکین بے کس ہوتا ہے۔ ان کی پرورش کرو۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا۔ کہ تمہاری جماعت مضبوط ہوگی۔ جن لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرو گے۔ وہ تمہاری جماعت میں شامل ہو جائیں گے۔ جو قوم اپنے کمزور طبقوں کا ہاتھ نہیں پکڑتی ان کی پرورش نہیں کرتی۔ وہ ناکامی کا منہ دیکھتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں جگہ جگہ حکم ہے "اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْکِیْنَ" اپنے قرابت داروں اور مسکین کا حق ادا کرو۔

سائل کے ساتھ حسن سلوک

اللہ تعالیٰ نے دوسرا حکم یہ ارشاد فرمایا وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ سائل کو مت جھڑکو۔ سائل سے مراد حقیقی محتاج ہے۔ ان کے متعلق اللہ کا فرمان ہے کہ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ

---

[1] بخاری ص۸۸۸ ج۲، مسلم ص۴۱۲ ج۲، ترمذی ص۲۸۵، مسند احمد ص۳۷۵ ج۲، [2] مسند احمد ص۳۸۷ ج۲

حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ مال داروں کے مال میں سائل اور محروم کا حق ہے۔ انہیں ان کا حق ادا کرو۔ ان کے فرضی حقوق بھی ہیں۔ اور مسنونہ اور مستحب بھی۔ ان کے تمام حقوق ادا کرو۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ ہر سائل اس کا مصداق نہیں۔ بلکہ وہ حقیقی سائل مراد ہے۔ جو اعانت کا مستحق ہے۔ یہ پیشہ ور بھکاری جو اکڑ کا کھڑا ہو جائے اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے ایسے سائل کو ڈانٹ دینا بھی روا ہے۔ روح المعانی والے مفسر قرآن لکھتے ہیں[1] کہ نہ ڈانٹنے کا حکم اُس سائل کے لیے ہے جو نرمی سے سوال کرتا ہے۔ اور واقعی محتاج ہے۔ تم بھی اس سے نرمی سے بات کرو۔ اگر اس کی ضرورت پوری نہیں کر سکتے۔ تو اُس سے نرمی سے معاف مانگ لو۔ کیونکہ " قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَآ اَذًى "[2] جس صدقے کے بعد تکلیف پہنچائی جائے یا گالی دی جائے۔ مارا پیٹا جائے یا طعنہ دیا جائے۔ اُس صدقے کی بجائے اس سے نرمی کی بات زیادہ بہتر ہے۔ یہ سب باتیں سائل کے ساتھ حسن سلوک سے متعلق ہیں۔

انعامات الٰہی کا تذکرہ

تین انعامات کے مقابلے میں اللہ تعالےٰ نے تیسرا حکم دیا۔ وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ اپنے رب کی نعمت کو بیان کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو انعام تم پر کیا ہے اس کو بیان کرو۔ اللہ کے احسان کو چھپانا نہیں چاہیے۔ بلکہ ظاہر کرنا چاہیئے۔ تاکہ اُس کے احسانات کا شکریہ ادا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام پہ بے شمار احسان کیے۔ ختم نبوت عطا فرمائی۔ جو کہ بہت بڑا احسان ہے۔ قرآن پاک جیسی عظیم دولت عنایت کی۔ یہ تحفہ آپ کی وساطت سے ساری اُمت کو نصیب ہوا۔

غلامی صرف اللہ کی

قرآن پاک کی تعلیمات میں دو چیزوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اوّل اللہ کی غلامی اور دوسری تعلیم دین۔ اللہ تعالیٰ کی غلامی اختیار کرنے سے متعلق فرمایا " يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ " اے لوگو عبادت اللہ کی کرو یعنی غلامی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی اختیار کرو۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے کی غلامی اختیار نہ کرو۔ چاہے وہ قیصر و کسریٰ ہو، یا کوئی بادشاہ یا شاہنشاہ اللہ ہی کو اپنا کارساز اور قادرِ مطلق سمجھو۔ اگر یہ

---

[1] روح المعانی صفحہ $\frac{164}{30}$

عقیدہ تمہارے دل میں راسخ ہو گیا تو غیر اللہ کی غلامی سے نجات حاصل کر لو گے۔ تمہارے قلب و ذہن میں آزادی کی لہر پیدا ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی غلامی ایسا پاکیزہ عقیدہ ہے جس کو اختیار کرنے سے کفر و شرک کی نجاست سے بچ جاؤ گے۔ یہ چھوٹے بڑے سارے کے سارے اللہ ہی کے غلام ہیں۔ اس لیے انسان کو انسان کی غلامی کسی صورت میں قبول نہیں کرنی چاہیے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا یہی مطلب ہے۔

کوئی انسان دوسرے انسان کو غلام بنائے۔ یہ بدترین خصلت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ قیصر و کسریٰ نے کسانوں اور دیگر غریب لوگوں کو بیل اور گدھے کی طرح استعمال کیا۔ ایک وقت کا معمولی کھانا کھلا کر چوبیس ۲۴ گھنٹے کام لیا۔ انہیں جانوروں کی طرح استعمال کیا۔ نہ ان کی اپنی ضروریات پوری کیں۔ اور نہ پورے معاشرے کی ضروریات کی طرف توجہ کی۔ غلامی اسی لیے لعنت ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ آج بھی دنیا میں ایسے بادشاہ اور امراء موجود ہیں۔ جو انسانوں کو جانوروں کی طرح غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقین نہیں رکھتے۔ جو شخص موحد ہو گا۔ اللہ کی عبادت اور اس کی غلامی اختیار کرنے والا ہو گا۔ وہ دوسروں کو بھی خدا کی مخلوق سمجھے گا۔ بحیثیت انسان سب کو برابر خیال کرے گا اور کسی کو غلام بنانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ لہٰذا تمام لوگوں کو صرف اللہ ہی کی غلامی اختیار کرنی چاہیئے۔ قرآن پاک کے پروگرام کی یہ پہلی بنیادی چیز ہے۔

دین کی تعلیم

فرمایا دوسری بنیادی چیز یہ ہے۔ کہ تعلیم حاصل کرو۔ سب سے پہلے کتاب اللہ کی تعلیم حاصل کرو کیونکہ سب سے پہلی آیت جو حضور علیہ السلام پر نازل ہوئی وہ یہی تھی[۲] "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ" اپنے رب کا نام لے کر پڑھیئے جس نے پیدا کیا۔ وَالضُّحٰى سے بھی یہی مراد ہے کہ اے لوگو! جس طرح چاشت کے وقت خوب روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح تعلیم دین بھی روشن اور منور ہے۔ انسان علم کی روشنی میں ترقی کرے گا۔ اس علم کے بغیر کوئی انسان انسان بن ہی نہیں سکتا۔ انسان اپنے آپ کو، اپنے رب کو اور اپنے فرائض کو دین کی تعلیم کی روشنی

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۵ ج ۱ [۲] بخاری ص ۳ ج ۱

میں ہی پہچان سکتا ہے۔ ہر شخص پر تعلیم فرض عین ہے[1]۔ اس کے بغیر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ دنیاوی تعلیم تو ایک زائد چیز ہے۔ جسے فضل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقی اور بنیادی تعلیم، کتاب اللہ کی تعلیم ہے۔ سنت رسول کی تعلیم ہے۔ اور تیسرے نمبر پر فریضہ عادلہ ہے۔ تعلیم کے بغیر انسان اور جانور برابر ہیں۔ جانور بھی کھاتا پیتا اور عشق کرتا ہے۔ انسان بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ جس طرح جانور کے بچے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کے بھی ہوتے ہیں۔ وہ بھی سردی گرمی سے پناہ ڈھونڈتا ہے۔ یہ بھی بچتا ہے۔ وہ بھی سو جاتا ہے۔ یہ بھی سوتا جاگتا ہے۔ وہ بھی بول و براز کرتا ہے۔ یہ بھی اس امر پر مجبور ہے۔ الغرض بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان تعلیم دین کی روشنی میں اپنے فرائض کو پہچانے۔ کہ اس کے ذمے اللہ تعالیٰ کے کون سے حقوق ہیں۔ اور بنی نوع انسان کے کون سے حقوق ہیں لہٰذا قرآن پاک کی تعلیم کو دوسروں تک پہنچاؤ۔ یہ خدا کی نعمت ہے۔ دنیا اسی روشنی میں ترقی کر سکتی ہے۔ اور برائی سے بچ سکتی ہے۔

دشمنانِ قرآن انگریز کہتے تھے اگر یہ کتاب یعنی قرآن پاک انسان اور تہذیب کی دشمن ہے ان کے ہاں عریانی فحاشی اور زنا تہذیب و فیشن میں داخل ہے۔ جس سے قرآن پاک روکتا ہے قرآن پاک کہتا ہے " وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى " زنا کے قریب بھی نہ جاؤ کیونکہ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً یہ تو بے حیائی کی بات ہے " وَسَاءَ سَبِيلًا " اور برا برا راستہ ہے اس سے نسل خراب ہوتی ہے۔ اخلاق کا جنازہ نکلتا ہے۔ دین ضائع ہوتا ہے۔ اور خدا کی ناراضگی کا سبب ہے مگر انگریز کے ہاں فیشن میں داخل ہے۔ اس لیے وہ قرآن کی تعلیم کو تہذیب کا دشمن سمجھتا ہے۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے " وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ " ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ مگر وہ لوگ تو ہر باطل طریقہ سے حاصل کردہ مال کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس لیے قرآن ان کا دشمن ہے۔

نعمت کا اظہار

بہر حال قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ حکم دے رہے ہیں کہ اس کو ظاہر کرو، اسکی تعلیم کو دنیا میں عام کرو۔ علاوہ ازیں اگر اللہ تعالیٰ کوئی مادی نعمت

---

[1] ابن ماجہ صنہ ۲

بھی عطا کرے، تو اس کے اظہار میں بخل نہیں ہونا چاہیے۔ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا[1] وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ آپ نے دریافت کیا۔ کیا اللہ نے تمہیں مال میں وسعت دی ہے۔ عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اللہ نے مجھے وسعت دی ہے۔ میرے پاس اونٹ، بھیڑ بکریاں اور دیگر جانور ہیں۔ زمین ہے مال و دولت ہے۔ غلام ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ نے تجھے اتنی نعمتوں سے نوازا ہے۔ مگر اس کا اثر تم پر ظاہر نہیں ہو رہا ہے۔ تمہارے کپڑوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم ایک محتاج آدمی ہو۔ کم از کم تمہارے لباس سے تو اللہ کی نعمت کا اثر ظاہر ہونا چاہیے۔

بعض فرماتے ہیں[2] کہ نیکی کے کام کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ حالانکہ وہ بھی اللہ کی نعمت ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ایسا اظہار ریاکاری میں شمار نہ ہو جائے۔

بعض[3] دوسرے فرماتے ہیں کہ نیکی کو ظاہر کرنا چاہیے۔ تاکہ دوسرے بھی دیکھ کر اس کی اقتدا کر سکیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ اللہ کے عطا کردہ انعام کو دوسروں کے سامنے بیان کرنا تحدیث نعمت میں داخل ہے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے انعامات کا تذکرہ کرنے کے بعد تین حکم دیے۔ کہ کمزور طبقوں کا خیال رکھو، یتیم پر قہر نہ کرو۔ سائل کو جھڑکو مت اور اپنے رب کی نعمت کو بیان کرو اور مخلوق کے سامنے ظاہر کردو۔

---

[1] روح المعانی ص ۱۶۴/۳۰، تفسیر عزیزی ص ۲۸۴ پارہ ۳۰ [2] تفسیر عزیزی ص ۲۸۴ پارہ ۳۰ [3] تفسیر عزیزی ص ۲۸۴ پارہ ۳۰

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سُورَةُ الانْشِرَاحِ

عم ۳۰ — الم نشرح ۹۴

درس سورۃ الم نشرح — (مکمل)

سُوْرَۃُ اَلَمْ نَشْرَحْ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورۃ الم نشرح مکی ہے اور یہ آٹھ آیتیں ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالےٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے ۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ① وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ② الَّذِيْٓ
اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ③ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ④ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا
⑤ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ⑥ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ⑦ وَاِلٰى
رَبِّكَ فَارْغَبْ ⑧ ع ۱ ۸ ۱۹

ترجمہ:۔ کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا ① اور کیا ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ نہیں اتارا ② جس نے آپ کی پشت کو بوجھل کر دیا تھا ③ اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کر دیا ہے ④ پس بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے ⑤ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے ⑥ پس جب آپ فارغ ہوں تو محنت کریں۔ ⑦ اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جائیں ⑧

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سُوْرَۃُ الْاِنْشِرَاح ہے اس کی پہلی آیت میں شرح کا لفظ مذکور ہے اسی لفظ سے اس سورۃ کا نام اخذ کیا گیا ہے۔ انشراح کا معنی کشادگی ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس میں آٹھ[۸] آیات ہیں اور یہ سورۃ اٹھائیس[۲۸] الفاظ اور ایک سو اکتیس[۱۳۱] حروف پر مشتمل ہے

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط

یہ سورۃ دراصل پہلی سورۃ وَالضُّحٰی کا تتمہ ہے۔ گذشتہ سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے بعض انعامات کا تذکرہ فرمایا تھا۔ اور اس سلسلہ میں بعض احکام صادر فرمائے تھے۔ اس سورۃ میں بھی بعض اضافی انعامات کا ذکر ہے جو رب کریم نے نبی علیہ السلام پر کئے۔ یہاں بھی سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے بعض احکام ہیں

شرح صدر

سورۃ کی ابتدا احسانات کے تذکرہ سے ہو رہی ہے۔ ان میں سے ایک عظیم الشان احسان شرح صدر ہے، جو حضور علیہ السلام پر کیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا ؟ یہاں پر استفہامیہ طریقے سے بات کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم نے یقیناً آپ کے سینے کو کھول دیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ شرح صدر دو طریقوں پر ہے۔ ایک تو ظاہری شرح صدر ہے جس کا ذکر احادیث میں بالتفصیل آیا ہے۔ مگر اس سورۃ میں جس شرح صدر کا ذکر ہے۔ وہ ظاہری نہیں بلکہ باطنی شرح صدر ہے[1]۔

ظاہری شرح صدر کے چار واقعات

ظاہری شرح صدر یہ ہے کہ حضور علیہ السلام کے سینہ مبارک کو چار دفعہ چاک کیا گیا ہے۔ پہلے شرح کے متعلق احادیث[2] میں آتا ہے کہ آپ کی عمر مبارک ابھی چار سال تھی۔ آپ حلیمہ سعدیہؓ کے ہاں دیار بنی بکر میں تھے۔ قبیلے کے بچے بستی سے باہر جانوروں کو چراتے تھے یا کھیل کود میں مشغول تھے اور حضور علیہ السلام بھی ان کے ہمراہ تھے جب یہ واقعہ پیش آیا روایات میں آتا ہے کہ دو عجیب وغریب قسم کی شخصیتیں وہاں آئیں۔ انہوں نے حضور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر زمین پر لٹایا۔ اور آپ کا سینہ مبارک چاک کر دیا یہ دیکھ کر حلیمہ سعدیہ کے بچے بھاگ کر گھر پہنچے اور اپنی والدہ کو بتایا کہ بعض لوگوں نے ہمارے بھائی کو مار دیا ہے۔ حلیمہ اور خاندان کے دوسرے لوگ پریشانی کے عالم میں موقع پر پہنچے۔ تو حضور علیہ السلام گھر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ مگر آپ کے چہرہ مبارک پر تغیر کے آثار نمایاں تھے یہ آپ کی زندگی میں شرح صدر کا پہلا واقعہ تھا۔ آپ کا سینہ مبارک چاک کر کے قلب مبارک کو نکالا گیا اور صاف کر کے دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ بچپن میں بچوں کے خیالات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ طبیعت کھیل کود کی طرف راغب ہوتی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات مبارکہ سے بڑا کام لینا تھا۔ اس لیے بچپن کے اس قسم کے رجحانات کو نکالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب مبارک کو صاف کیا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں[3]۔ کہ حضور علیہ السلام کے سینہ مبارک کو جس مقام

---

[1] تفسیر عزیزی پارہ ۳۰ صہ ۲۸۸
[2] مستدرک حاکم ج ۲ صہ ۶۱۶ ، مسند احمد ج ۴ صہ ۱۸۴
[3] مسلم ج ۱ صہ ۹۲

سے چاک کیا گیا، وہاں پہ زخم مندمل ہونے کا نشان نظر آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نشان باقی رکھا تھا۔

مسند احمدؒ کی روایت کے مطابق شرح صدر کا دوسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضور علیہ السلام کی عمر مبارک دس سال کی تھی۔ روایت[۲] ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ کہ حضور نبوت کے سلسلے میں آپ کو کن چیزوں سے واسطہ پڑا۔ تو آپ نے فرمایا سنو! میری عمر اس وقت دس سال کی تھی۔ میں صحرا میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ عجیب وغریب وضع قطع کے دو شخص آئے۔ یہ اجنبی شخص تھے۔ ان جیسا لباس اور وضع قطع پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک شخص نے دوسرے سے کہا ھُوھُو کیا یہ وہی ہیں دوسرے نے جواب دیا ہاں، یہ وہی ہیں۔ پھر انہوں نے مجھے پکڑ کر زمین پہ لٹا دیا، اور میرا سینہ چاک کیا، اس کو صاف کیا اور پھر اُسی طریقے سے جوڑ دیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ایسا کرنے سے نہ تو خون نکلا اور نہ مجھے کوئی تکلیف محسوس ہوئی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ دس سال کی عمر جوانی کی آمد آمد ہوتی ہے۔ اس عمر میں جس قسم کے انسان کے خیالات ہوتے ہیں۔ ان کو صاف کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے شرح صدر کا یہ انتظام کیا۔

سینہ چاک ہونے کا تیسرا واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ کو نبوت ملنے کا وقت بالکل قریب تھا۔ اُس وقت آپ کی عمر شریف چالیس سال کی ہوگئی تھی۔[۳] اور شرح صدر اس لیے کیا گیا تاکہ آپ کے اندر نبوت کا بار اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

چوتھا شرح صدر آپ کے معراج پہ روانگی کے وقت پیش آیا۔[۴] آپ اُمِّ ہانیؓ کے مکان پر تشریف فرما تھے۔ فرشتے آئے۔ آپ کو اٹھایا۔ اور مکان کی چھت پھاڑ کر آپ کو حطیم میں لے گئے۔ وہاں آپ کا سینہ مبارک چاک کیا اور اسے زمزم کے پانی سے دھویا۔ پھر علم وحکمت سونے کی طشت میں رکھ کر لایا گیا۔ اور آپ کے سینہ میں بھر دیا گیا۔ پھر

---

۱ فتح الباری صہ ۳۷۳ ج ۷، مجمع الزوائد صہ ۲۵۵ ج ۸ بحوالہ مسند احمد عن ابی ذرؓ، ۲ دلائل ابونعیم صہ ۷ ج ۱

۳ دلائل ابی نعیمؒ صہ ۶۹ ج ۱ ۴ بخاری صہ ۵۴۸ ج ۱ ، مسلم صہ ۹۲ ج ۱

سینہ مبارک کو سی دیا گیا۔ اور وہ پہلے کا ویسا ہی ہو گیا۔ اس کے بعد آپ کو معراج پر لے جایا گیا۔ معراج میں چونکہ غیر معمولی واقعات پیش آنے والے تھے۔ اس لیے شرح صدر ضروری تھا تاکہ آپ کسی قسم کی گھبراہٹ وغیرہ محسوس نہ کریں۔

باطنی شرح صدر

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس سورۃ مبارکہ میں جس شرح صدر کا ذکر ہے، وہ مذکورہ ظاہری شرح نہیں ہے۔ اگرچہ یہ چار دفعہ شرح صدر کا واقع ہونا اور آپ کے سینہ مبارک سے غلط چیزوں کو نکال کر علم و حکمت بھر دینا بذات خود حضور علیہ السلام کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم اس مقام پر اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ سے مراد یہ ہے کہ نبی کریم! کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھولا اور اس میں علوم و معارف کے سمندر نہیں اتارے۔ کیا ہم نے آپ کے سینے میں فرائض رسالت کو ادا کرنے اور مشکلات کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھی۔ اور کیا ہم نے آپ کو عظیم حوصلہ عطا نہیں کیا۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ" وہ شخص جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے۔ اور وہ اپنے رب کی طرف سے عطا کردہ روشنی پر ہے۔ کیا ایسا شخص اس شخص کی مانند ہے جس کے دل میں کفر و شرک کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے گویا یہاں پر شرح صدر سے مراد دل کی کشادگی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ رب العزت کی بارگاہ میں درخواست کی تھی "رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ" اے اللہ! میرا سینہ کھول دے "وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ" اور میرے معاملے کو آسان کر دے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے شرح صدر اللہ تعالیٰ سے مانگ کر لی تھی۔ ان کا مقابلہ بڑے بڑے ظالموں اور جباروں کے ساتھ تھا اس لیے انہوں نے دل کی کشادگی کی دعا کی۔ تاکہ مقابلے میں کہیں تنگ دلی واقع نہ ہو جائے۔ مگر حضور علیہ السلام کا سینہ مبارک اللہ تعالیٰ نے خود بخود ہی کشادہ فرما دیا۔ اور آپ کو جتلا دیا کہ ہم نے آپ کا سینہ کھول دیا ہے۔ کیونکہ آپ سے بہت بڑا کام لینا ہے

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۸۸ پارہ ۳۰

اور دنیا میں انقلاب برپا کرنا ہے۔ لہٰذا اس کام کی نوعیت کے اعتبار سے آپ کو بڑے عالی حوصلے کی ضرورت ہے۔

دوسری بڑی بات یہ ہے۔ کہ جتنا بڑا کام کسی نے انجام دینا ہو، اُسی کے مطابق اس کا عزم و حوصلہ بھی بلند ہونا چاہیئے۔ اگر کام کے مطابق سینہ کشادہ نہیں ہوگا۔ تو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ شرح صدر یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی قانون، شریعت، یا دین یا اصول دیا ہے اس کے مطابق کسی قسم کا شک وشبہ نہ ہو، بلکہ اُس قانون کی صحت پر قطعی طور پر یقین ہو۔ چونکہ قرآن پاک کے پروگرام کو حضور علیہ السلام کی معرفت دنیا میں نافذ کرنا تھا لہٰذا اللہ نے آپ کے سینہ مبارک کو کھول دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ فرعون سے تھا۔ لہٰذا انہوں نے شرح صدر کے لیے اللہ سے دعا کی۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کا مقابلہ اس زمانے کے فرعونوں اور کافر ومشرک طاقتوں سے تھا۔ آپ کو اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر دشمن سے جنگ کرنا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے کام کی نوعیت کے اعتبار سے بلند حوصلہ اور دل کی کشادگی عطا فرمائی۔

بوجھ سے مراد اور اس بوجھ میں تخفیف

پہلا احسان شرح صدر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام پر دوسرا احسان یہ فرمایا وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ اور کیا ہم نے آپ سے بوجھ نہیں اتارا اَلَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ جس نے آپ کی پشت کو ٹیڑھا کر دیا تھا۔ یہ کون سا بوجھ تھا جو اللہ نے آپ سے ہلکا کر دیا۔ یہ بوجھ دین کے نفاذ کا بوجھ تھا۔ جو آپ کو دے کر مبعوث کیا گیا۔ تاکہ آپ اس دین کو قائم کریں۔ اور اس بوجھ کو ہلکا اس طریقے سے کیا۔ کہ آپ کے ساتھ ایک جماعت پیدا کر دی، جو قرآن پاک کے پروگرام کو پھیلانے کیلئے کمربستہ ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے پروگرام پر عملدرآمد کرنا کسی اکیلے شخص کا کام نہیں بلکہ اس کے لیے جماعت ناگزیر تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ کی امداد کے لیے صحابہؓ کی جماعت کو پیدا کیا۔ کیونکہ جماعت کے بغیر نہ کوئی قانون نافذ ہو سکتا ہے۔ نہ کسی پروگرام پر عمل درآمد ہو سکتا ہے۔ اور نہ عدل قائم کیا جا سکتا ہے لہٰذا جماعت کے ذریعے کام کو تقسیم کر کے اللہ نے حضور علیہ السلام کا بوجھ ہلکا کر دیا۔

جماعت بندی کا حکم

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ چند آدمی جمع ہو جائیں، تو جماعت تشکیل پا جاتی ہے

لے

حدیث میں جماعت کی بڑی اہمیت آئی ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے مَا مِنْ ثَلٰثَةٍ یعنی اگر تین آدمی بھی کسی بادیہ بستی یا دیہات میں موجود ہوں اور وہ نماز باجماعت ادا نہ کریں تو ان پر شیطان غالب آجاتا ہے۔ مقصد یہ کہ جس مقام پر صرف تین آدمی بھی ہوں تو ان پر جماعت بندی لازم ہو جاتی ہے۔

بعض فرماتے ہیں۔ کہ کسی کام کی اشاعت کے لیے دس آدمیوں کی جماعت کافی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں[۱] کہ جماعت چالیس[۲] آدمیوں سے قائم ہوتی ہے گویا چالیس آدمی ایک جگہ موجود ہوں تو ان پر جمعہ فرض ہو جاتا ہے۔ اسی طرح چالیس آدمیوں سے نظام حکومت قائم ہو سکتا ہے۔ اگر نظام کو سمجھنے والے اور صحیح معنوں میں پروگرام کو چلانے والے ہوں تو حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ سارا نظام چل سکتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ تبلیغ کا کام شروع کر دیا تھا۔ پیر کے روز آپ کو نبوت عطا ہوئی۔ اور دوسرے روز یعنی منگل کے دن آپ نے نماز باجماعت ادا کی۔ آپ کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ، حضرت علیؓ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ اور آپ کے آزاد کردہ غلام اور متبنّیٰ حضرت زیدؓ تھے۔ تبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔ جماعت بندی ہونے لگی۔ اگرچہ مکی زندگی میں آپ کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تاہم جماعت تشکیل پا گئی۔ اور پھر مدنی زندگی میں نظام حکومت بھی قائم ہو گیا۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ احسان فرمایا کہ جس قسم کے مخلص، سمجھدار اور تبلیغ دین کا بوجھ اٹھانے والے لوگ آپ کو درکار تھے۔ اللہ نے پیدا کر دیے۔ حضور علیہ السلام کو بڑی فکر تھی کہ دنیا میں قرآن پاک کا نظام کس طرح قائم ہو گا۔ یہ آپ پر بہت بڑا بوجھ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کی جماعت کے ذریعے اس بوجھ کو ہلکا کر دیا۔

حضور علیہ السلام پیر کے دن اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس دن آپ نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا نہیں فرمائی۔ کیونکہ آپ کو بڑی تکلیف تھی۔ اس دن لوگ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ حضور علیہ السلام نے اپنے کمرے سے پردہ ہٹا

---

[۱] میزان الکبریٰ صـ [۲] میزان الکبریٰ صـ

کر لوگوں کو باجماعت نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا تو بڑے خوش ہوئے اور آپ مسکرائے۔ آپکا شوق دیکھ کر لوگ سمجھے کہ شاید آپ تشریف لا رہے ہیں اور انہوں نے پیچھے ہٹنا چاہا، مگر آپ نے اشارہ کیا کہ اپنی جگہ قائم رہو اور نماز پڑھتے رہو۔ چنانچہ آپ پردہ ڈال کر کمرے میں واپس تشریف لے گئے[1] اس مقام پر مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں۔ کہ جماعت کو دیکھ کر آپ کا اظہار مسرت اس وجہ سے تھا۔ کہ آپ کو اطمینان ہو گیا تھا کہ جس کام کے لیے اللہ نے آپ کو مبعوث کیا تھا۔ وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ ایک ایسی جماعت قائم ہو چکی تھی، جس نے اشاعت دین کے کام کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا تھا۔

عشرہ مبشرہ کی جماعت مکی زندگی میں ہی قائم ہو چکی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو نظام اسلام کو چلانے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ لہٰذا حضور علیہ السلام خوش ہو گئے۔ کہ ان کا مقصد پورا ہو گیا اور اب مشن کی ناکامی کا کوئی امکان نہیں۔ نظام کو چلانے کے لیے جماعت پیدا ہو چکی ہے۔ لہٰذا آپ کا بوجھ اللہ نے کم کر دیا۔

وحی الٰہی کے نزول کا بوجھ بھی حضور علیہ السلام کی ذات پر تھا۔ سورۃ مزمل میں ہے "اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا"۔ یہ نزول قرآن کی ابتدائی آیات میں سے ہے[2]۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم آپ پر ایک بھاری بوجھ ڈالنے والے ہیں۔ اس لیے آپ پہلے اللہ کی عبادت اور ریاضت کریں۔ تاکہ آپ کو اعلیٰ درجے کی روحانی ترقی نصیب ہو اور آپ میں بوجھ برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو جائے۔ مطلب یہ کہ ذمہ داری کے اس بوجھ نے آپ کی پشت کو ٹیڑھا کر دیا تھا۔ جسے اللہ نے صحابہؓ کی جماعت کے ذریعے ہلکا کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی بلندی

تیسرا احسان اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ "وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" یعنی ہم نے آپکے ذکر کو بلند کر دیا۔ مخالفین تو مکی زندگی میں ہی آپ کو پریشان کرنا چاہتے تھے۔ مگر اللہ نے آپ کا ذکر اس طرح بلند کیا کہ ہر محفل میں آپ کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اے نبی علیہ السلام

---

[1] — [2]

[3] — [4]

جس مقام پر میرا نام لیا جائے گا۔ اس کے ساتھ آپ کا نام بھی ضرور لیا جائے گا۔ اذان میں دیکھ لیں جہاں اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ ساتھ حضور علیہ السلام کا نام بھی آتا ہے نماز جیسے اعلیٰ فریضہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ نبی علیہ السلام کا ذکر ہے۔ خطبے میں جہاں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ حضور علیہ السلام پر بھی درود پاک بھیجا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے۔ جہاں آپ کا ذکر خیر نہ ہوتا ہو۔ اور آپ کی فضیلت نہ بیان کی جاتی ہو۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کے ذکر کو اس قدر بلند کر دیا کہ تمام کائنات میں آپ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ لوگ اس نام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ مگر اللہ جل جلالہٗ اس نام کو بلند فرمانا چاہتے ہیں۔ یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ جہاں اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہ درود بھی پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذکر کو پھیلا دیا ہے مکے کے مشرکین جس قدر مخالفت کرتے تھے، اسی قدر دین کی ترویج ہوتی تھی۔ باہر سے جو وفد بھی حضور علیہ السلام کے پاس آتا، آپ کا ذکر ہمراہ لے کر جاتا۔ ایک سال تقریباً ڈیڑھ سو وفود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے[1] سب کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ اور آپ کا مشن لے کر لوٹے۔ جو کوئی اسلام سے محروم رہتا تھا وہ کمزور ہو کر جاتا تھا۔ اس میں مقابلے کی تاب باقی نہ رہتی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کا رُعب اس قدر بڑھا دیا تھا۔ کہ بڑے بڑے بادشاہ ڈرتے تھے۔ الغرض وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ہم نے آپ کا ذکر بلند کر دیا۔

مشکل کے ساتھ آسانی

تین انعامات یا احسانات یعنی شرح صدر، بوجھ میں تخفیف اور ذکر کی بلندی کا تذکرہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ آپ مشکلات سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ ہمارا یہ اصول ہے۔ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ تاکیداً اس جملے کا تکرار فرمایا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ مشکلات آئیں گی مگر آپ یقین جانیں کہ آگے آسانی کی منزل آنے والی ہے۔ جو کوئی دنیا میں مشکلات کو خندہ پیشانی سے قبول کرے گا۔ اس اصول کے مطابق آخرت میں اس کے لیے آسانیاں ہوں گی۔ ہر شخص

---

[1] طبقات ابن سعد صـ ۲۹۱ تا ۳۵۹ ج۲

کو جان لینا چاہیئے۔ کہ تکلیف آسانی کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔

محنت اور ریاضت

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا فَاِذَا فَرَغْتَ جب آپ تبلیغ اور دیگر فرائض سے فارغ ہو جائیں فَانْصَبْ تو آپ محنت بھی اٹھائیں محنت سے مراد اللہ تعالیٰ کی خاص عبادت اور ریاضت ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر خاص احسانات فرمائے ہیں۔ لہٰذا جب آپ کو دیگر امور سے فرصت ملے تو اللہ کی خصوصی طور پر عبادت کریں۔

مفسرین کرامؒ[1] فرماتے ہیں۔ کہ جس نے اجتماعی کام کرنا ہے۔ تبلیغ کا فریضہ انجام دینا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ وقت کے لیے تنہائی میں ذکر الٰہی کرے۔ ورد وظائف کریں تاکہ روحانی طور پر تقویت حاصل ہو۔ اور وہ فرائض کی ادائیگی زیادہ بہتر طریقے پر کر سکے۔ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ اسی طریقے پر عمل کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اعلیٰ درجے کی روحانیت حاصل ہوئی۔ اللہ کے ساتھ اُن کا تعلق درست ہو گیا۔ یہ چیز انہیں "وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا" پر عمل کرنے کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ انہوں نے تنہائی میں تعلق باللہ قائم کیا اور کامیابی حاصل کی۔

حضور علیہ السلام کے مکاتیب

بعض مفسرینؒ[2] فرماتے ہیں۔ کہ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ چھوٹی جنگ سے فارغ ہو جائیں تو بڑی جنگ کی طرف توجہ دیں۔ چنانچہ جب آپ نے معاہدہ حدیبیہ کی صورت میں قریش مکہ سے معاملہ طے کر لیا تو آپ اُس دور کے بادشاہوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ان کو خطوط لکھے۔ جن میں اسلام کی دعوت دی ہے۔ آپ نے سب کو لکھا[3] اَدْعُوْكَ بِدِعَايَةِ الْاِسْلَامِ اَسْلِمْ تَسْلَمْ یعنی میں آپ کو اسلام کی دعوت دے رہا ہوں۔ اسلام قبول کر لو سلامتی پا جاؤ گے۔ اگر اکڑ دکھاؤ گے۔ تو رعایا کا گناہ بھی تم پر پڑے گا کیونکہ تم ان کے پیشرو ہو۔ اس زمانے میں جتنے بھی جابر زمین پر تھے سب کی طرف آپ نے خطوط لکھے وَاِلٰی کُلِّ جَبَّارٍ[4]

ان تمام خطوط کو جمع کیا گیا ہے اور ان میں سے بعض کی نقول بھی ہیں۔ ہندوستان کے جلیل القدر عالم حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے "مکاتیب سید المرسلین" کے نام سے

---

[1] تفسیر عزیزی ص ۲۹۵ پارہ ۳۰ [2] المقام المحمود تفسیر حضرت مولانا سندھیؒ ص ۱۲۲ پارہ ۳۰ [3] مسلم ص ۹۸ ج ۲ بخاری ص ۵ ج ۱ [4] مسلم ص ۹۹ ج ۲

دو جلدوں میں کتاب لکھی ہے۔ ان میں یہ تمام خطوط درج ہیں۔ اس کی شرح بھی ساتھ لکھی ہے یہ بعض مفسرین نے فرمایا ہے۔ تاہم اس آیت کا عام مفہوم یہی ہے کہ جب آپ فرائض سے فارغ ہو جائیں تو خصوصی عبادت یعنی تنہائی میں ذکر الٰہی کی طرف توجہ دیں۔ ایسا کرنے سے روحانیت کی بلند منزل حاصل ہوگی۔ تاکہ آپ جماعت کے کام کو آگے چلا سکیں۔ فرمایا وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ خصوصی عبادت کے ذریعے اپنے رب کی طرف راغب ہو جائیں۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعامات کے بعد محنت اٹھانے کا حکم بھی دیا۔ حضور علیہ السلام کی اتباع میں امت کے لوگوں کو بھی یہی حکم ہے کہ دیگر فرائض کے علاوہ ذکر اذکار بھی کرنا چاہیے تاکہ روحانیت صحیح طور پر قائم رہے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سُورَةُ التِّينِ

التین ۹۵ (مکمل) — درس ۳۰ — درس سورۃ تین

سُوْرَةُ التِّيْنِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورۃ تین مکی ہے اور یہ آٹھ آیات ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ① وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ② وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ
③ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ④ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ
سٰفِلِيْنَ ⑤ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ
مَمْنُوْنٍ ⑥ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ⑦ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ
الْحٰكِمِيْنَ ⑧ ع ۸/۱۴

ترجمہ:۔ قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی ① اور قسم ہے طور سینا کی ② اور قسم ہے اس امن والے شہر (مکہ مکرمہ) کی ③ بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے ④ پھر اس کو ہم نے نیچوں سے نیچے لوٹا دیا ⑤ مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیے پس ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے ⑥ پس (اے انسان) روز جزاء کو جھٹلانے پر تجھے کیا چیز آمادہ کرتی ہے ⑦ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ⑧

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سُوْرَةُ التِّيْنِ ہے۔ تین کا لفظ پہلی ہی آیت میں مذکور ہے جس سے سورۃ کا نام لیا گیا ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی آٹھ آیات ہیں اور یہ سورۃ چونتیس ۳۴ الفاظ اور ایک سو پچاس ۱۵۰ حروف پر مشتمل ہے۔ حدیث میں آتا ہے[۱] کہ حضور علیہ السلام بسا اوقات یہ سورۃ مغرب یا عشاء کی نماز کی کسی ایک رکعت میں تلاوت فرماتے تھے۔

۱۔ بخاری ص۱۰۵، ۱۰۶ ج۱، مسلم ص۱۸۷ ج۱، ترمذی ص۴۷

موضوع

اس سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں کی قسم اٹھا کر انسان کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ اُس نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا ہے۔ اس سے بہتر صورت اللہ نے کسی مخلوق کو عطا نہیں فرمائی۔ اس کی مزید تفصیل یہ ہے۔ کہ اگر انسان اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتا ہے۔ تو واقعی وہ کائنات کی بہترین ہستی ہے۔ اور اگر وہ ان فرائض کی بجا آوری نہیں کرتا۔ تو پھر اس سے بڑھ کر ذلیل چیز بھی دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتی۔ ایسا انسان کائنات کی حقیر سے حقیر چیز سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

چار چیزوں کی قسم

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی عربی زبان میں تین انجیر کو کہتے ہیں۔ اور زیتون بھی ایک درخت ہے۔ انجیر کا پھل بہت عمدہ ہوتا ہے کھانے میں لذیذ ہے۔ زیتون بھی پھل دیتا ہے اور اس کا تیل بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ فرمایا وَطُورِ سِينِينَ اور قسم ہے طور سینا کی طور ایک پہاڑ ہے۔ جس پہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تکلم فرمایا تھا۔ اور کتاب بھی عطا کی تھی۔ یہ بڑا مبارک پہاڑ ہے۔ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ اور قسم ہے اس امن والے شہر یعنی مکہ مکرمہ کی۔ یہ وہی شہر مقدس ہے۔ جس میں حضور خاتم النبیین علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اور جس میں آپ کے سر پر نبوت کا تاج رکھا گیا۔ جہاں آپ کو قرآن پاک ملا۔

ہاں وہی شہر جس میں بیت اللہ شریف واقع ہے اور جو حرم ہے۔ اور وہ شہر ہے جس کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمعیل علیہ السلام نے رکھی۔ یہاں پہ اللہ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان چاروں یعنی انجیر، زیتون، کوہ طور اور بلد امین کی قسم اٹھائی ہے۔

انجیر کے خواص

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ دونوں درخت یعنی انجیر اور زیتون کثیر المفاد ہیں۔ ان سے کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ نے ان میں بڑی برکت رکھی ہے۔ انجیر کے پھل میں اللہ نے عجیب خصلت رکھی ہے۔ انجیر کا پھل اُن کامل الایمان، نیک اور پاک

لہ تفسیر عزیزی فارسی صہ ۲۹۶ پارہ ۳۰

طینت لوگوں کی مثال ہے۔ جن کا ظاہر اور باطن یکساں ہوتا ہے۔ بیشتر پھلوں کا چھلکہ ہوتا ہے جو اتار دیا جاتا ہے گٹھلی ہوتی ہے، جو نکال دی جاتی ہے۔ اور بقیہ حصہ استعمال کیا جاتا ہے مگر انجیر کا ایک ایسا پھل ہے جو پورے کا پورا غذا بنتا ہے۔ نہ اس کا چھلکہ اتارنا پڑتا ہے اور نہ اس کی گٹھلی علیحدہ کرنی پڑتی ہے۔ اللہ نے اس کو خوش ذائقہ اور نرم بنایا ہے۔ معتدل لقمے کی طرح ہوتا ہے۔ اور خاصیت ایسی کمال کہ فاسد اخلاط کو جسم سے خارج کرتا ہے۔ بواسیر کے مریض کے لیے مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں کئی ایک بیماریوں کی شفا رکھی ہے۔

زیتون کے خواص

زیتون کے درخت کا ہر حصہ مفید ہے۔ تنا، شاخیں، لکڑی، چھال اور پھل ہر چیز کارآمد ہے۔ اللہ نے اسے بڑا بابرکت بنایا ہے۔ سورۂ نور میں ہے۔ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ" انجیر کی طرح زیتون کا پھل بھی غذا کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اللہ نے اسمیں بڑی غذائیت رکھی ہے۔ کھانے سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ یہ دوا کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اللہ نے اس میں روغن اور تیل کا ایک بڑا ذخیرہ رکھا ہے۔ ہر سال پھل آتا ہے لوگ اس سے تیل نکالتے ہیں۔ جو ساری دنیا میں استعمال ہوتا ہے۔ ترمذی شریف[1] کی حدیث میں آتا ہے۔ كُلُوا الزَّيْتَ وَادَّهِنُوْا بِهٖ فَاِنَّهٗ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زیتون کو کھاؤ اور اس کے تیل کی مالش کرو اسے اللہ نے بابرکت درخت سے پیدا کیا ہے۔ یہ درخت بالعموم شام اور فلسطین میں ہوتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے لکھا[2] ہے۔ کہ زیتون کے بعض درخت جو یونانیوں کے زمانہ میں لگائے گئے، آج تک قائم ہیں۔ یہ درخت اڑھائی ہزار ۲۵۰۰ سال عمر پا چکے ہیں اللہ نے اس میں اتنی برکت رکھی ہے۔

کوہ طور اور بلد امین

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ کوہ طور ایک متبرک پہاڑ ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ اسی پہاڑ پر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اور اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔ اسی پہاڑ پر اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کی تھی۔ بلد امین یعنی شہر مکہ کو ساری دنیا میں شرف حاصل ہے

۱؎ ترمذی ص ۲۷۷ ۲؎ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۹۸ پارہ ۳۰

اسی شہر میں واقع بیت اللہ کے حج کے لیے دنیا کے کونے کونے سے لوگ ہر سال پہنچتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کے متعلق فرمایا "فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ" اسمیں اللہ کی واضح نشانیاں ہیں۔ اسی شہر کے متعلق فرمایا "لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ"

انسانی جسم کے ساتھ مطابقت

ان چار چیزوں کی قسم اٹھا کر اللہ تعالیٰ نے تخلیق انسانی کا ذکر فرمایا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا گویا یہ چاروں چیزیں تخلیق انسانی کی عمدگی پر گواہ ہیں کیونکہ انسان کے اندر بھی چار متوازی چیزیں رکھی ہیں پہلی چیز انسان کا جسم ہے۔ دوسری چیز روح حیوانی یا نسمہ ہے۔ جس کی وجہ سے جسم میں حس و حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کا تمام نظام چلتا ہے۔ اب ان کا موازنہ اشیائے قسم سے کیجئے۔ انسانی جسم کی مماثلت تین یعنی انجیر کے ساتھ ہے۔ جس طرح جسم ظاہر ہے۔ اسی طرح انجیر بھی ظاہر ہے۔ اس میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ انسان کے جسم میں جو روح یا نسمہ ہے، یہ زیتون کی مانند ہے۔ روح انسانی بھی پوشیدہ ہے۔ نظر نہیں آتی، اسی طرح زیتون میں تیل پوشیدہ ہے۔

انسان کے اندر تیسری چیز ملکیت ہے شاہ ولی اللہؒ کی زبان میں اور ان کی حکمت کے مطابق ملکیت ایک اعلیٰ خصلت ہے۔ جو فرشتوں سے ملتی جلتی ہے۔ یہ وہ خصلت ہے کہ جسے انسان غالب کر لے، تو اُسے کمال حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بہیمیت یعنی جانوروں جیسی خصلت ہے۔ اگر وہ غالب آجائے تو انسان ناکام ہو جاتا ہے۔ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے حکم یہی ہے کہ ملکیت کو غالب اور بہیمیت کو مغلوب کرو۔ تزکیہ کا مقصود بھی یہی ہے "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی" وہ فلاح پا گیا جس نے تزکیہ حاصل کر لیا۔ الغرض یہ ملکیت طور سینا کے موافق ہے۔ کہ اس میں تجلی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ تجلی الٰہی کوہ طور پر پڑی، اللہ سے تکلم ہوا، اسی طرح خصلتِ ملکیت کی کشش بھی تجلی الٰہی کی طرف ہوتی ہے۔

انسانی جسم میں چوتھی چیز اللہ نے محبت الٰہی رکھی ہے۔ اس جذبہ کی مثال بلد امین ہے یہ امن والا شہر عاشقانِ الٰہی کی بستی ہے۔ دنیا بھر کا مرکز ہے۔ خدا کی محبت کا جذبہ انہیں

کھینچ کر اس شہر کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی لیے حج اللہ کی محبت کا ذریعہ ہے۔ روزہ محبت الٰہی کا ابتدائی درجہ ہے۔ جب کہ حج اعلیٰ درجہ ہے۔ لہٰذا محبت الٰہی کی مطابقت بلد امین سے ہو گئی۔

انسان بہترین ہستی ہے

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اللہ نے انسانی جسم میں چار چیزیں رکھی ہیں۔ یعنی ظاہر میں انسان کا جسم، باطن میں نسمہ، صفت ملکیت اور محبت الٰہی کا جذبہ۔ یہ چاروں چیزیں انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ اگر انسان ان چیزوں کو فطرت کے مطابق استعمال کرے گا۔ اپنے فرائض کی بجاآوری کرے گا۔ تو پھر سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ کائنات میں انسان سے بڑھ کر کوئی دوسری ہستی نہیں ہے۔ کیونکہ ظاہری طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے انسان میں وہ کمالات رکھے ہیں۔ جو کسی دوسری مخلوق کو حاصل نہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے انسان کو بہترین ہستی یعنی احسن تقویم میں پیدا کیا ہے۔ ظاہراً بہترین شکل و صورت عطا کی، اور باطن میں وہ قویٰ رکھے جو صرف انسان کا ہی حصہ ہے۔

عیسیٰ بن موسیٰ خلیفہ منصور عباسی کا ایک درباری چاندنی رات میں اپنی بیوی سے گفتگو کر رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنی بیوی سے یوں کہا[1] اِنْ لَّمْ تَكُونِيْ اَحْسَنَ مِنَ الْقَمَرِ فَاَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا یعنی اگر تو اس چاند سے زیادہ حسین نہ ہو۔ تو تجھ پر تین طلاق" بات تو اس نے کہہ دی مگر اس کا نتیجہ دور رس تھا۔ بات خلیفہ کے دربار تک پہنچی کہ ایسا کہنے سے واقعی طلاق ہو گئی ہے یا نہیں۔ علماء سے فتویٰ لیا گیا، تو انہوں نے کہا کہ طلاق پڑ گئی ہے کیونکہ عورت چاند سے حسین نہیں ہو سکتی۔ دربار میں امام ابوحنیفہ رح کے ایک شاگرد بھی موجود تھے۔ خلیفہ خاص طور پر ان کی طرف متوجہ ہوئے کہ وہ بھی اپنی رائے دیں۔ تو انہوں نے بسم اللہ شریف پڑھ کر سورۃ تین کی ابتدائی آیات وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ تلاوت کیں اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم فرمایا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ نے انسان جیسی کوئی ہستی

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صہ ۳۰۲ پارہ ۳۰، روح المعانی صہ ۱۷۵ ج ۳۰

کائنات میں پیدا ہی نہیں کی تو چاند ایک انسان سے زیادہ بہتر کیسے ہوسکتا ہے۔ لہذا عورت چاند سے حسین ہے اور اس پر طلاق نہیں پڑی۔ یہ سن کر سب لوگ مطمئن ہو گئے کہ حقیقت یہی ہے۔ کہ انسان بہترین مخلوق ہے مگر اس کے ساتھ شرط یہ ہے۔ کہ وہ اپنے فرائض منصبی فطری امور کے مطابق ادا کرے۔

دو بنیادی عقائد

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے ذریعے انسان کو دو بنیادی عقیدے عطا کئے ہیں ایک ایمان باللہ اور دوسرا ایمان بالآخرت۔ تمام اعمال صالحہ، جنت میں پہنچنے اور ترقی کرنے کی اساس ایمان باللہ ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان لے آیا، اُس کے نیک اعمال قبول ہوں گے اور قیامت کے روز ان کا صلہ پائے گا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں،[1] جو شخص ایمان سے محروم رہا، اس کے اور عالم بالا کے درمیان دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ جو کبھی نہیں کھلے گا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں، اُس شخص کی مثال اُس جانور کی ہے۔ جسے پنجرے میں بند کر دیا ہوگا، جس کا کوئی دروازہ نہ ہو۔ وہ اسی میں بند ہو کر رہ جائے گا، اُس کے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ ہو گا۔ اللہ کی وحدانیت، اُس کی صفات اُس کے رسول، کتابیں اور مسئلہ تقدیر یہ سب چیزیں ایمان باللہ میں آجاتی ہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ ایک شخص اللہ کو تو مانے مگر اس کی تقدیر کا انکار کرے۔ ایسا کرنے سے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا۔ خدا کی ذات کا اقرار کر کے اس کی صفات کا انکار کرنے والا بھی دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ رسولوں کا بھیجنا اللہ کی صفت ہے "وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ رسولوں کو بھیجنا ہمارا کام ہے۔ انہیں شریعت کے احکام دینا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ لہذا ان امور سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تمام چیزیں ایمان باللہ کا حصہ ہیں۔

دوسرا اساسی عقیدہ قیامت پر ایمان ہے۔ ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالآخرت کا تذکرہ قرآن پاک میں جگہ جگہ آیا ہے: "مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ" موت کے بعد دوبارہ زندگی اور دنیوی زندگی کا محاسبہ اور پھر اس کے مطابق جزا یا سزا، جنت یا دوزخ یہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۸۱ ج۱ باب المعاصی التی فی ما بینہ و بین نفسہ

سب باتیں اسی بنیادی عقیدہ ایمان بالآخرت میں آجاتی ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں۔ جو قرآن پاک انسان کے اندر راسخ کرنا چاہتا ہے۔

بدترین مخلوق

پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ اگر انسان اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتا ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت پر پورا اترتا ہے۔ تو وہ کامیاب ہے۔ اور اگر ان چیزوں کے خلاف کرتا ہے نہ وہ اپنے فرائض ادا کرتا ہے۔ نہ اللہ پر ایمان ہے۔ اور نہ آخرت پر تو اُس کے متعلق فرمایا ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ایسے شخص کو ہم نے نیچے سے نیچے گرا دیا، اس سے زیادہ ذلیل ہستی دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا "اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ" یہ بدترین مخلوق ہے۔ اس سے کتے، بندر اور ریچھ بہتر ہیں۔ کیڑے مکوڑے، سانپ، بچھو ہر چیز ایسے انسان سے بہتر ہے، جو فرض ادا نہیں کرتا اور بنیادی عقائد کے خلاف کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کی پے در پے نافرمانیوں کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ اللہ نے کہا "كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ" ذلیل بندر بن جاؤ۔ کیونکہ تم بندروں جیسی بُری خصلتوں کے حامل ہو۔ ایک مقام پر "الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِیْرَ" کا لفظ آیا ہے۔ خنزیر بھی نجاست میں ملوث ہیں۔ جو شخص بنیادی عقائد پر قائم نہ رہا، وہ بندروں اور سوروں سے بھی نیچے چلا گیا۔ اس سے ذلیل کوئی مخلوق نہیں ہے۔

ایمانداروں کے لیے انعامات

فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جنہوں نے فرائض منصبی صحیح طور پر ادا کیے۔ ایمان کی دولت حاصل کی اور نیک اعمال انجام دیے۔ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ سو ایسے لوگوں کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ انہیں قیامت کو ایسی جزا ملے گی جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ فَمَا یُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ روزِ جزا کو جھٹلانے پر تجھے کیا چیز آمادہ کرتی ہے۔ وہ کونسی دلیل ہے۔ جس کی بنا پر تم قیامت کا انکار کرتے ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سمجھانے کے لیے تمام اسباب مہیا کر دیے ہیں۔ مالک یوم الدین نے بتلا دیا ہے کہ قیامت کے دن تیرے کیے کا بدلہ ضرور دیا جائے گا۔ بعث بعد الموت برحق ہے، پلصراط، جنت دوزخ، محاسبہ ہر چیز برحق ہے۔ اللہ نے خوب اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ اس کے باوجود تو قیامت کے دن کا انکار کس طرح کرتا ہے۔

اعلیٰ ترین عدالت

دنیا میں کوئی انسان یا عدالت فیصلہ کرے، اُس میں غلطی کا امکان بہرطور موجود ہوتا ہے۔ یہ عدالت خواہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ، ہائی کورٹ ہو یا سپریم کورٹ، خطا سے خالی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یہ فطرت کا تقاضا ہے۔ کہ کوئی ایسی عدالت بھی موجود ہو۔ جس سے غلطی ناممکن ہو۔ اور ایسی عدالت قیامت کے روز ہی قائم ہوگی، جو ہر شخص کو اُس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دلائے گی۔ لہٰذا قیامت کا انکار اس فطری تقاضے کے خلاف ہے۔ اگر وہ اعلیٰ ترین عدالت قائم نہ ہو، تو پورے پورے انصاف کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔ انسان کے ساتھ ظلم و زیادتی کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انسان کی آخری اپیل کے لیے اعلیٰ ترین عدالت اللہ کی بارگاہ ہوگی۔ اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ ایسی عدالت ضرور قائم ہوگی۔

فرمایا تم ایسی اعلیٰ ترین عدالت پر شک کرتے ہو کہ یہ کس طرح قائم ہوگی اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ کیا خدا سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں۔ کیوں نہیں، ضرور ہے اگر وہ سب سے اعلیٰ حاکم ہے۔ تو اس کی عدالت بھی سب سے اعلیٰ ہے۔ جہاں آخری اپیل کی شنوائی ہوگی اور صحیح صحیح فیصلے کیے جائیں گے۔

الغرض یہاں پہ دونوں چیزیں آگئیں۔ جو اللہ پہ اور قیامت پہ ایمان لائیں گے۔ اور اپنے فرائض منصبی ادا کریں گے، وہ کامیاب ہوں گے۔ بصورت دیگر اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو نیچے سے نیچے گرا دے گا اور وہ جانوروں اور درندوں سے بھی ذلیل تر ہو کر رہ جائیں گے۔

حدیث شریف[1] میں آتا ہے۔ کہ جب حضور علیہ السلام یہ آیت تلاوت فرماتے یعنی اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ تو فرماتے بَلٰی وَ اَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشّٰہِدِیْنَ میں اس پہ گواہ ہوں کہ تیری عدالت آخری اور قطعی عدالت ہے۔ جو شخص بھی یہ آیت پڑھے یا سنے وہ یہ الفاظ کہے خواہ نماز میں ہو یا الگ۔ یہ مستحب ہے۔ تاہم نماز میں آہستہ آواز سے کہنا چاہیے[2]

---

[1] ترمذی ص۴۸۳ ، [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۵۶ / پارہ ۲۹

سورة العلق

عم ۳۰ — العلق ۹۶

درس اوّل — (آیت ۱ تا ۵)

سُوْرَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعَ عَشْرَةَ اٰيَةً

سورۃ علق مکی ہے اور یہ انیس ۱۹ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ②
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ
يَعْلَمْ ⑤

ترجمہ:- اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ پڑھیں اپنے رب کا نام لے کر وہ رب جس نے پیدا کیا ①
جس نے انسان کو بستہ خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ② آپ پڑھیں اور آپ کا رب بڑا کریم ہے
③ وہ جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی ④ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا ⑤

گذشتہ سورۃ کا خلاصہ

گذشتہ سورۃ تین میں بلحاظ عقیدہ دو بنیادی باتیں بیان کی گئی تھیں۔ جن کی تعلیم قرآن پاک دیتا ہے۔ ان میں سے ایک ایمان باللہ ہے اور دوسری ایمان بالآخرت۔ حقیقت یہ ہے کہ اعمال کی عمارت انہیں دو بنیادی عقائد پر استوار ہوتی ہے۔ اگر یہ بنیادی عقیدے درست نہ ہوں تو اعمال و اخلاق کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سورۃ تین تک قرآن پاک کی تعلیمات تین قسم کی سورتوں پر مشتمل ہے۔ یعنی لمبی سورتیں، درمیانی سورتیں اور چھوٹی سورتیں۔ لمبی سورتیں کئی ایک مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور ہر مضمون کے متعلقہ دلائل ہوتے ہیں اور ان کی تفصیلات ہوتی ہیں۔ درمیانے درجے کی سورتوں اور چھوٹی سورتوں میں بات کو حکیمانہ طریقے پر مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات دلائل بیان کئے جاتے ہیں اور بعض اوقات چھوڑ دیے جاتے ہیں، تاہم بات مختصر طریقے پر سمجھا دی جاتی ہے۔

تفصیل اور تلخیص

مفسرین کرامؒ[1] فرماتے ہیں کہ سورۃ اِقْرَاْ سے آخر قرآن تک تعلیمات قرآنی کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ جس طرح کوئی شخص لمبی چوڑی تقریر کرنے کے بعد آخر میں اُس کا خلاصہ بیان کر دیتا ہے۔ اسی طرح ان چھوٹی چھوٹی سورتوں میں قرآنی تعلیمات کا خلاصہ ہے اور اس کی ابتداء اس سورۃ یعنی سورۃ علق سے ہو رہی ہے۔

سب سے پہلی سورۃ

تمام محدثین اور مفسرینؒ[2] اس بات پر متفق ہیں۔ کہ نزول وحی کے اعتبار سے سورۃ علق سب سے پہلی سورۃ ہے۔ اس کی ابتدائی پانچ آیتیں حضور علیہ السلام پر اس وقت نازل ہوئیں۔ جب آپ غار حرا میں تشریف فرما تھے۔ ان آیات میں ایک دعویٰ ہے۔ جسے آخر میں خلاصے میں دہرایا گیا ہے۔ اور یہ پورے قرآن پاک میں بیان ہوا ہے۔

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سُوْرَۃُ الْعَلَق ہے۔ علق کا لفظ اس کی دوسری آیت میں موجود ہے علق بستہ خون کو کہتے ہیں۔ اسے خون کا لوتھڑا بھی کہہ سکتے ہیں۔ جونک کو بھی علقہ کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق بھی خون سے ہوتا ہے۔ انسان کی پیدائش کے مختلف درجات میں ایک درجہ علقہ کا بھی ہوتا ہے۔۔ پہلے نطفہ ہوتا ہے۔ پھر وہ علقہ یعنی بستہ خون میں تبدیل ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُسے تبدیل کر کے گوشت کی شکل پہناتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سورۃ انیس ۱۹ آیات، بہتر ۷۲ الفاظ اور ایک سو اکہتر ۱۷۱ حروف پر مشتمل ہے۔

وحی کی ابتداء

بخاری شریف[3] کی روایت ہے۔ کہ جب حضور علیہ السلام کا عطائے نبوت کا وقت قریب آگیا۔ تو حُبِّبَ اِلَیْہِ الْخَلَاءُ آپ تنہائی پسند فرمانے لگے۔ شہر سے دور نکل جاتے اور تنہائی میں اللہ کا ذکر کرتے۔ آپ کا عام معمول یہ ہو گیا تھا۔ کہ جبل نور پہ واقع غار حرا میں تشریف لیجاتے اور چار یا پانچ دن یا ہفتہ بھر وہیں قیام فرماتے۔ بعض اوقات آپ مہینہ بھر بھی ٹھہر جاتے۔ جب گھر تشریف لاتے تو ام المومنین حضرت خدیجہؓ آپ کو توشہ وغیرہ باندھ دیتیں اور پھر تنہائی میں قیام پذیر ہو جاتے۔ نزول وحی سے چھ ماہ قبل آپ کو رؤیائے صادقہ یعنی ایسے سچے خواب آنے لگے کہ جو کچھ خواب میں دیکھتے اس کا نتیجہ روز روشن کی طرح

---

[1] المقام المحمود تفسیر مولانا سندھیؒ ص ۱۲۹ پارہ ۳۰

[2] بخاری ص ۲ ج ۱، مسلم ص ۸۸ ج ۱، مستدرک حاکم ص ۵۲۹ ج ۲، ابن کثیر ص ۵۲۷ ج ۴، روح المعانی ص ۱۷۹ ج ۳، معالم التنزیل ص ۲۴۲ ج ۴ وغیرہ

[3] بخاری ص ۲ ج ۱، مسلم ص ۸۸ ج ۱۔

سامنے آجاتا۔ تو یہ وہ غیر معمولی باتیں تھیں جو نزول وحی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

روایات میں آتا ہے۔ کہ آپ حسب معمول غار حرا میں تشریف فرما تھے۔ آپ اچانک غار سے باہر تشریف لائے۔ آپ پانی کے قریب تھے۔ کہ جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے پہاڑ پر پانی کی موجودگی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ ایسا بارشی پانی ہوگا، جو پہاڑ کے کسی نشیبی حصہ میں جمع ہوگیا ہوگا۔ یا پھر وہ پانی ہوگا، جو آپ استعمال کے لیے ساتھ لے گئے تھے الغرض جبرائیل علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلی مرتبہ فضا سے خطاب کیا "یَا مُحَمَّد" آپ ادھر اُدھر دیکھنے لگے اتنے میں فرشتہ انسانی صورت میں متشکل ہو کر سامنے آگیا۔ اور آپ سے دوبارہ خطاب کیا اِقْرَأ یعنی پڑھیے۔ بعض[۲] روایات میں یوں آتا ہے کہ یہ آیات کسی ٹکڑے پر لکھی ہوئی تھی۔ اور جبرائیل علیہ السلام نے وہ ٹکڑا حضور علیہ السلام کے سامنے رکھ کر کہا اِقْرَأ حضور علیہ السلام نے جواباً فرمایا مَا اَنَا بِقَارِیٍٔ "میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں بلاشبہ آپ تو امی تھے اَلنَّبِیُّ الْاُمِّیُّ" آپ کی خصوصیت ہے۔ اسی لیے آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ کیونکہ آپ نے کسی مکتب سے یا کسی استاد سے پڑھنا لکھنا سیکھا ہی نہ تھا۔

الغرض آپ کے اس جواب پر جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو اپنے سینے سے لگا کر زور سے اتنا دبایا۔ کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں مجھے تکلیف ہونے لگی۔ اس کے بعد جبرائیل علیہ السلام نے مجھے چھوڑ دیا اور پھر کہا پڑھیے۔ میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ جبرائیل علیہ السلام نے دوبارہ پکڑ کر مجھے زور سے دبایا۔ پھر چھوڑ کر کہا اِقْرَأ میرا جواب دوسری مرتبہ بھی یہی تھا۔ کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرماتے ہیں۔ کہ تیسری دفعہ جبرائیل علیہ السلام نے مجھے پکڑ کر اتنا زور کے ساتھ دبایا۔ جو پہلی دونوں مرتبہ سے زیادہ شدید تھا۔ اور جس سے مجھے سخت تکلیف ہوئی۔ اس نے مجھے چھوڑا پھر کہا اِقْرَأ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ اب کے میری زبان جاری ہوگئی اور جو کچھ جبرائیل علیہ السلام نے تلفظ کیا وہ میں نے پڑھا۔ یعنی یہ ابتدائی پانچ آیتیں میں نے پڑھ لیں۔

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۳۰۶ پارہ ۳۰، [۲] مستدرک حاکم صفحہ ۵۲۹ ج ۲، روح المعانی صفحہ ۱۷۹ ج ۳۰

جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو سینے سے لگا کر کیوں دبایا تھا۔ یہ اثر ڈالنے کے لیے تھا۔ اس کو توجہ بھی کہتے ہیں۔ دوسرے کے طلب کرنے پر کاملین حضرات جو توجہ ڈالتے ہیں۔ وہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب انسلاخ ہو رہا ہے۔ حضور علیہ السلام کو ملکیت کی طرف لیجایا جا رہا ہے۔ لہذا فرشتے نے آپ کو دبا کر آپ پر اثر ڈالا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے پڑھنا شروع کر دیا حالانکہ امی شخص تو پڑھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ مگر یہاں اس کی وجہ بھی بیان کر دی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ وہ ایسا بھی کر سکتا ہے۔ تو گویا یہ پانچ آیتیں سب سے پہلے وحی کے طور پر نازل ہوئیں۔

نماز کا حکم

تفسیر اتقان، روح المعانی اور دیگر تفاسیر[1] میں مذکور ہے۔ کہ حضرت علیؓ کی روایت کے مطابق پہلی وحی سے متصل ہی حضور علیہ السلام کو طہارت اور وضو کا طریقہ بتایا گیا۔ اور پھر آپ کو حکم ہوا، اِسْتَعِذْ بِاللّٰهِ یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کے ذریعے استعاذہ کریں۔ اور پھر اللہ کا نام لیں یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو سورۃ فاتحہ بھی پڑھائی گئی۔ اور پھر آپ کو نماز کے لیے کھڑا ہونے کا حکم ہوا۔ یہ سب کچھ پہلی وحی کے بعد متصلاً ہوا۔

وحی کے اثرات

اس عجیب و غریب اور حیرت ناک واقعہ کا حضور پر گہرا اثر ہوا، اور آپ کو بخار ہو گیا۔ کسی قدر آپ پر دہشت بھی طاری ہوئی۔ اسی حالت میں آپ گھر تشریف لائے۔ آپ پر کپکپی طاری تھی، رفیقہ حیات سے فرمایا، مجھے سردی لگ رہی ہے۔ زَمِّلُوْنِیْ مجھ پر کپڑا ڈال دو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضور علیہ السلام نے اس واقعہ کے پیش نظر پریشانی کا اظہار فرمایا۔ ام المؤمنینؓ آپ کے حالات سے بخوبی واقف تھیں۔ انہوں نے آپ کو تسلی دی۔ بیوی سے بات کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ دیکھیں وہ کس حد تک ایمان لاتی ہیں۔ اگر بیوی ہی انکار کر دے تو دوسروں سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ تاہم انہوں نے تسلی دی۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ آپ کو ساتھ لے کر اپنے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس

---

[1] تفسیر اتقان ص ۲۴ ج ۱، تفسیر روح المعانی ص ۱۷۹ ج ۳۰، تفسیر عزیزی ص ۳۰۷ پارہ ۳۰

پہنچیں۔ ورقہ ضعیف آدمی اور پرانے تجربہ کار تھے۔ انہوں نے مشرکوں کا دین چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ پرانی کتابوں کا مطالعہ تھا۔ انہوں نے انجیل کو عبرانی زبان سے عربی میں نقل کیا تھا۔ ام المومنین رضی نے ان سے کہا۔

یعنی اے بھائی! اپنے بھتیجے کی بات سنو، کہ یہ کیا کہتے ہیں۔ ورقہ نے کہا یَا ابْنَ اَخِیْ مَاذَا تَریٰ یعنی اے میرے بھتیجے کیا بات ہے۔ حضور علیہ السلام نے پیش آنے والا سارا واقعہ بتا دیا۔ وہ فوراً بول اٹھا ھٰذَا النَّامُوْسُ الَّذِیْ اُنْزِلَ عَلٰی مُوْسٰی صلی اللہ علیہ وسلم۔ خدا کی قسم یہ تو وہی ناموس اکبر ہے جو موسیٰ علیہ السلام پہ آیا تھا۔ اور جو سارے نبیوں پہ آتا رہا۔ اس نے تصدیق کر دی کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر کہا کاش! میں اس وقت جوان ہوتا جب یہ لوگ آپ کو اپنے شہر سے نکال دیں گے۔ آپ نے تعجب سے کہا اَوَ مُخْرِجِیَّ کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے۔ حالانکہ میں تو ان کی خدمت کرتا رہتا ہوں اور ان کے ساتھ اخلاق سے پیش آتا ہوں۔ ورقہ نے کہا کہ ہاں! جو بھی یہ چیز لایا، جو تم لائے ہو، اس کے ساتھ دشمنی کی گئی اور اسے نکالا گیا۔ اگر میں اس وقت زندہ رہا تو آپ کی مدد کروں گا۔ اس واقعہ کے تین روز بعد ورقہ فوت ہو گئے۔ حضور علیہ السلام نے انہیں خواب میں دیکھا کہ سفید لباس پہنے ہوئے ہیں۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے حالات اچھے ہیں۔ بہر حال اگرچہ اسے موقع نہ ملا، مگر وہ حضور علیہ السلام کی تصدیق کر گیا۔

ان پانچ ابتدائی آیات کے بعد نازل ہونیوالی دوسری سورتیں

جیسا کہ بیان ہوا، سب سے پہلے سورۃ علق کی یہ پانچ آیات نازل ہوئیں اور ان سے متصل اعوذ باللہ اور بسم اللہ اور سورۃ فاتحہ نازل ہوئی[1]۔ اس کے بعد مزمل کا پہلا رکوع نازل ہوا۔ "یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ" اے چادر پوش! قُمِ الَّیْلَ تکمیل ذات کے لیے رات کو اٹھ کر نماز پڑھیں۔ گویا آپ کو نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد فترت وحی کا زمانہ آتا ہے تقریباً تین سال تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ بعض مفسرین کرام[3] فرماتے ہیں۔ کہ سورۃ "ن"

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۰۷ پارہ ۳۰، [2] تفسیر اتقان ص ۲۴ و ۲۵ ج ۱، [3] روح المعانی ص ۲۲ ج ۲۹، در منثور ص ۳۱۸ ج ۶ وغیرہ۔

بھی ابتدائی سورتوں کے ساتھ نازل ہوئی۔ تاہم مذکورہ بالا کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ یہ پہلے مرحلے میں نازل ہوئیں۔ تین سال کے انقطاع کے بعد سورۃ مدثر کا نزول ہوا۔ "یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ" آپ کو حکم ہوا "قُمْ فَاَنْذِرْ" آپ اُٹھ کھڑے ہوں۔ اور مخلوق خدا کو عذاب سے ڈرائیں۔ گویا آپ کو تبلیغ دین کا حکم دیا گیا۔ تاکہ اپنے ساتھ کچھ ساتھی پیدا کر لیں۔ جو قرآن پاک کے پروگرام کو لے کر آگے چل سکیں۔ اور دنیا میں اسلامی انقلاب کی ابتدا کر سکیں۔

توحید اور شرک میں حد فاصل

الغرض یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پہلی وحی تھی۔ جس میں ارشاد ہوا۔ اِقْرَاْ آپ پڑھیں، بِاسْمِ رَبِّكَ اپنے رب کے نام کی برکت سے یا اپنے رب کا نام لے کر پڑھیں، الَّذِیْ خَلَقَ وہ رب جس نے پیدا کیا۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ ان میں سے دو درجوں میں تو تمام انسان متفق ہیں۔ اور دو میں اہل توحید اور مشرک مختلف ہو جاتے ہیں۔ متفق علیہ درجات میں اللہ تعالیٰ کی صفت خلق اور اس کا واجب الوجود ہونا ہے۔ دہریوں کی ایک قلیل تعداد کے سوا اہل توحید، کافر، مشرک اور دیگر تمام اہل مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ خالق صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ قرآن پاک میں اس بات کو جگہ جگہ دہرایا گیا ہے کہ آپ ان سے پوچھیں کہ ارض وسما اور ہر چیز کا خالق کون ہے؟ تو وہ کہیں گے، اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی خالق نہیں۔ اسی طرح اس بات کو بھی تمام انسانیت تسلیم کرتی ہے۔ کہ واجب الوجود بھی صرف خدا کی ذات ہے: اس کا وجود خود بخود ہے کسی کا عطا کیا ہوا نہیں، یہ بات بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ اس میں بھی کسی مذہب والے کو اختلاف نہیں۔

توحید کے دوسرے دو درجے جن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ ہیں تدبیر اور عبادت یہاں آکر مشرکین اہل توحید سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اہل ایمان کا عقیدہ ہے۔ کہ مدبر بھی صرف ذات خداوندی ہے۔ مگر مشرکین اس میں دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں جب ان سے پوچھا جاتا ہے "وَمَنْ یُّدَبِّرُ الْاَمْرَ" کہ تدبیر کون کرتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۵۹ / ج ۱

ہوتا ہے "یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ" بلندیوں سے پستیوں تک ہر چیز کی تدبیر اللہ ہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تدبیر کرنے والا نہیں ہے۔ مگر یہاں حالت یہ ہے کہ کوئی انبیاء علیہم السلام کو تدبیر میں شریک کرتا ہے۔ کوئی جنات کو، کوئی فرشتوں کو اور کوئی دیگر مخلوق میں سے کسی اور کو۔ کہ یہ بھی کچھ تدبیر کرتے ہیں۔ لہٰذا شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

عبادت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ یہ بھی صرف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے۔ عبادت سے مراد وہ انتہائی درجے کی تعظیم ہے۔ جس کے متعلق یہ اعتقاد ہو کہ جس ہستی کی تعظیم کی جا رہی ہے ————— وہ نافع اور ضار ہے اور مافوق الاسباب متصرف ہے۔ یعنی اُسے عالم اسباب پر کنٹرول حاصل ہے۔ یہ تعظیم زبان کے ذریعے بھی ہوتی ہے۔ عمل سے بھی ہوتی ہے اور مال سے بھی۔ یہی چیز عبادت ہے اور جو کوئی یہ عمل اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے کرے گا۔ شرک میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور یہ شرک فی العبادت ہوگا۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم

لفظ اِقْرَاْ اپنے اندر تعلیم کا وسیع پروگرام رکھتا ہے۔ اب تعلیم کی دو قسمیں ہیں یعنی ابتدائی اور ثانوی اسے پرائمری اور ہائی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں اپنے رب کا نام لے کر پڑھنا ابتدائی تعلیم ہے۔ یہ اس تعلیم کا پہلا نصاب ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ میں اجمال تھا یعنی وہ رب جس نے پیدا کیا آگے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ میں تفصیل ہے کہ اُس نے انسان کو بستہ خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ قطرہ آب چالیس دن کے بعد خون کے لوتھڑے میں تبدیل ہوتا ہے پھر چالیس دن بعد گوشت میں تبدیل ہوتا ہے۔ پھر ہڈیاں اور اعضاء بنتے ہیں۔ تو یہاں پر یہی تعلیم دی جا رہی ہے۔ کہ ذرا غور کریں۔ کہ جو ذات حق تعالیٰ انسان کو علق سے پیدا کر سکتی ہے۔ حقیر اور ناقص چیز سے انسان جیسی اشرف المخلوقات ہستی کو پیدا کر سکتی ہے۔ وہ ذات اُمّی اور ان پڑھ ہستی کو عالم بنا سکتی ہے اور بلند ترین مرتبے پر فائز کر سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ وہ ناواقف اور نہ جاننے والے کو علم کی اعلیٰ منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ تو گویا رب کا نام یاد کرنا یہ ابتدائی تعلیم ہو گئی جیسا کہ سورۃ مزمل میں آتا ہے "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا"

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا "خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ثانوی یا اعلیٰ تعلیم کا نمبر آتا ہے۔ یہ سلسلہ تعلیم ہر دور اور ہر سلطنت میں رائج رہا ہے۔ یونانیوں اور دیگر اقوام میں بھی یہی طریقہ جاری تھا۔ ثانوی یا اعلیٰ تعلیم میں الٰہیات کی تعلیم ہے۔ یا دوسرے فنون کی جو زیادہ کارآمد ہوتے ہیں اور ہر شعبے کی الگ الگ تعلیم ہوتی ہے۔ آجکل کی اعلیٰ تعلیم سے مراد ٹیکنالوجی یا دیگر فنون کی تعلیم ہے مگر یہاں پہ اعلیٰ تعلیم سے مراد وہ تعلیم ہے۔ جس کے ذریعے انسان اپنے حقوق، مخلوق کے حقوق اور اللہ تعالےٰ کے حقوق کو پہچان سکے۔ لہٰذا جو شخص ان حقوق سے واقفیت حاصل کرے گا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تصور ہوگا اور انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوگا۔

الغرض ابتدائی تعلیم اللہ کا نام لینا ہے۔ اور یہ ابتدائی نوشت وخواند ہے۔ کہ آدمی کچھ پڑھ لکھ کر جہالت کی تاریکی سے باہر نکل جائے۔ کیونکہ ؎ بے علم نتواں خدا را شناخت علم کے بغیر انسان نہ خود شناس ہو سکتا ہے اور نہ خدا کو پہچان سکتا ہے اور نہ دوسروں کو پہچان سکتا ہے۔ اس ابتدائی تعلیم کے بعد جب اعلیٰ تعلیم حاصل کریگا تو انسانیت کے اعلیٰ مقام پہ فائز ہو جائیگا۔

قلم کا فیضان

اسی تعلیم کے تعلق سے دوبارہ فرمایا اِقْرَاْ پڑھیے وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ آپ کا رب بڑا کریم ہے اَلَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی ابتدائی تعلیم عام طور پر زبانی ہوتی ہے اور اس کے بعد جو اعلیٰ تعلیم ہوتی ہے وہ قلم کے ذریعے سے حاصل کی جاتی ہے۔ تمام گذشتہ تاریخ اور علوم وغیرہ قلم کے ذریعے ہی محفوظ رکھے جاتے ہیں، قلم کو تمام علوم کا شکاری سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ علوم کو شکار کر لیتا ہے۔ علم والے کہتے ہیں[1] کہ لَوْ لَا الْقَلَمُ لَمَا قَامَ الدِّيْنُ وَلَا صَلَحَ الْعَيْشُ اگر قلم نہ ہوتا انسان کی حالت درست نہ ہوتی۔ اور معاشیات بھی انسان کے درست نہ ہو سکتے۔ کتابوں کے ذریعے علوم وفنون کی اشاعت قلم کے فیضان سے ہی باقی ہے تمام علوم قلم کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ اور

---

[1] تفسیر عزیزی صفحہ ۲۱۲ پارہ ۳۰

آنیوالے لوگ اس سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ اس رب کے نام کے ساتھ پڑھیے جس نے قلم کے ذریعے سے سکھلایا۔ یہاں پر لطیف اشارہ یہ ہے کہ وہ رب کریم جو عام طور پر قلم کے ذریعے سکھاتا ہے وہ اللہ بغیر قلم کے سکھانے پر بھی قادر ہے۔ قلم کے ذریعے سکھانا بھی اسی کا کام ہے اور بغیر قلم کے سکھانا بھی اسی کی قدرت ہے لہذا اس نے خاتم النبیین کو بغیر قلم کے وہ تعلیم دی، جو کسی دوسرے انسان کو عطا نہیں کی۔

"نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ" میں بھی قلم کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اگر قلم نہ ہوتا تو لوگ تمام علوم، تاریخ اور سابقہ لوگوں کے علمی کارناموں سے بے خبر رہتے۔ یہ قلم ہی ہے جس نے ان سب چیزوں کو محفوظ رکھا۔

اب خلاصہ کلام یہ ہوا کہ قرآن کریم انسانیت سے بحث کرتا ہے ان کے حالات بیان کرتا ہے۔ ان کی اصلاح اور فساد کی باتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ تو قرآن کا موضوع علم کی برکات
(SUBJECT) انسان ہے۔ اور قرآن پاک یہی چیز بیان کرتا ہے۔ کہ انسان کا کمال کس چیز میں ہے۔ اور زوال کس بات میں۔ کونسی چیزیں انسان کو ترقی کی منازل پر پہنچاتی ہیں۔ اور کون سی چیزیں اور اصول انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتے ہیں اس سورۃ مبارکہ سے چونکہ قرآن پاک کے خلاصے کی ابتداء ہو رہی ہے۔ تو سب سے پہلے انسان ہی کا ذکر کیا گیا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ جس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر مِنْ عَلَقٍ کہہ کر یہ نکتہ سمجھا دیا کہ علم کے بغیر انسان لوتھڑے کی مانند ہے۔ بے سود محض ہے۔ علم سے ہی کمال پیدا ہوگا۔ اسی لیے حکم دیا گیا کہ پڑھو۔ علم کا حاصل کرنا فرض ہے اور پھر حصول علم میں قلم کی اہمیت کو بھی واضح کیا۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو ظاہری اور باطنی ذرائع علم مہیا کیے۔ حواس خمسہ یعنی آنکھ، کان، ناک، زبان اور لمس ظاہری ذرائع ہیں اور قوت مفکرہ باطنی ذریعہ علم ہے۔ جس کے ذریعے انسان غور و فکر کرکے علم کی منزل پاتا ہے۔ اس کے بعد علم کا ایک بہت بڑا ذریعہ وحی اور الہام ہے۔ اس ذریعے سے حاصل ہونے والا علم قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔ وحی انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے۔ لہذا اس سورۃ میں یہ بنیادی بات بتائی گئی کہ انسان کو سب سے زیادہ ضرورت وحی کی ہے۔ کیونکہ تمام معاملات میں عقل خود کفیل نہیں ہو سکتی حواس تمام چیزوں پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ اکثر غلطی کھا جاتے ہیں۔ عقل سوچنے میں غلطی

کرتی ہے۔ انسان غور وفکر میں غلطی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ ہاں! غلطی سے مبرا اگر کوئی علم ہے۔ تو وہ صرف وحی الٰہی کا علم ہے جسکی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کو بَدْءُ الْوَحِیِ سے شروع کیا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام پہ وحی کس طرح نازل ہوئی۔ کیونکہ علم کا سارا دارومدار وحی پہ ہے تو یہاں فرمایا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ انسان کو وہ کچھ سکھایا، جو وہ نہ جانتا تھا۔ اور قطعی اور یقینی ذرائع علم ہیں وحی اور الہام ہے۔ اللہ نے وحی کے ذریعے علم سکھایا۔ اور الہام کا انسان بہت محتاج ہے۔ اگلی سورۃ میں یہی مسئلہ بیان ہوگا۔

درسِ دوم

(آیت ۶تا ۱۹)

كَلَّآ إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰٓ ﴿٦﴾ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰٓ ﴿٧﴾ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰٓ
﴿٨﴾ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ﴿٩﴾ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰٓ ﴿١٠﴾ أَرَأَيْتَ إِن
كَانَ عَلَى الْهُدَىٰٓ ﴿١١﴾ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰٓ ﴿١٢﴾ أَرَأَيْتَ إِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰٓ
﴿١٣﴾ أَلَمْ يَعْلَم بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ ﴿١٤﴾ كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ
﴿١٥﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ﴿١٧﴾ سَنَدْعُ
الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾ كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب ۩ ﴿١٩﴾ ع ۱۹/۲۱ آیتِ سجدہ

ترجمہ:- خبردار! بے شک انسان البتہ سرکشی کرتا ہے ⑥ کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتا ہے ⑦ بے شک سب کا تیرے رب کی طرف ہی لوٹنا ہے ⑧ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جو منع کرتا ہے ⑨ بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے ⑩ آپ بتلائیں کہ اگر نماز پڑھنے والا بندہ ہدایت پر ہو ⑪ یا وہ تقوے کا حکم دیتا ہو ⑫ آپ تبلائیں کہ اگر یہ منع کرنے والا شخص تکذیب کرتا ہے اور روگردانی کرتا ہے ⑬ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس (طاغی کی تمام حرکات) کو دیکھ رہا ہے ⑭ خبردار! اگر یہ باز نہ آیا تو پھر ہم اُسے پیشانی سے پکڑ کر گھسیٹیں گے ⑮ جو پیشانی جھوٹی اور خطاکار ہے ⑯ پھر بلائے وہ اپنی مجلس والوں کو ⑰ عنقریب ہم اس کے مقابلے میں پیدل سیاست کرنے والے فرشتوں کو بلائیں گے ⑱ خبردار! آپ اس کی اطاعت نہ کریں اور (اللہ تعالیٰ کے حضور) سجدہ ریز ہو جائیں اور خدا کا قرب حاصل کریں ⑲

گذشتہ سے پیوستہ

سورۃ کی ابتدائی آیات میں انسان کا ذکر ہوا۔ اور اس کے ساتھ اللہ تعالےٰ نے تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا۔ جہالت کی تاریکی کو لفظ اِقْرَأْ سے دور کیا۔ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ سے قلم کی اہمیت واضح کی۔ اور پھر عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ کے ذریعے انسان پر علم کی فضیلت بیان فرمائی کہ انسان ہی کمالِ تعلیم کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ اگر تعلیم نہ ہو، تو انسان

بیکار محض ہے۔ اس کی مثال علقہ یعنی گوشت کے لوتھڑے کی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ لبتہ خون کے لوتھڑے کو اپنی صفت تخلیق کے ساتھ اشرف المخلوقات انسان کی شکل میں پیدا فرماتا ہے اسی طرح وہ انسان کو جہالت اور نادانی کی تاریکیوں سے نکال کر علم کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ لہذا علم حاصل کرنا فرض عین ہے۔ چونکہ قرآن پاک انسان کے بارے میں بحث کرتا ہے اور یہ اسے درجہ کمال تک پہنچانے والے اور اسے مرتبہ انسانیت سے گرانے والے امور کو واضح کرتا ہے، لہذا سورۃ کے ابتدائی حصے میں انسان کا ذکر بھی ہو گیا اور اس کی تعلیم کی اہمیت بھی واضح ہوئی

مومن یا طاغی

اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے انسانوں کا تذکرہ یہاں بیان فرمایا ہے۔ ایک قسم کے وہ انسان ہیں جو اپنی فطرت کے مطابق قرآن کریم کے بتلائے ہوئے پروگرام کو تسلیم کرتے ہیں۔ تعلیم حاصل کر کے نیکی کو اپناتے ہیں۔ جو انہیں درجۂ کمال تک پہنچاتی ہیں۔ ایسے لوگ مومن کہلاتے ہیں۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں، جو قرآنی تعلیم سے روگردانی کرتے ہیں۔ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اسے ناکام بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ طاغی یا سرکش کہلاتے ہیں۔

مومن کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی ہے۔ لہذا اس کو کمال نصیب ہو گا۔ حظیرۃ القدس میں پہنچے گا، جنت میں جائے گا اور اس طرح اسے فلاح نصیب ہوگی۔ اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گا۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کی مکمل اطاعت کرتا ہے۔ فکر کو پاک رکھتا ہے اور اعمال کو صحیح طور پہ انجام دیتا ہے۔ یہی شخص ایماندار ہے برخلاف اس کے جو شخص قرآنی تعلیم سے اعراض کرتا ہے اُس کے حصول میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ وہ طاغی کہلاتا ہے، طاغی کا معنی سرکش ہے۔ کیونکہ طغیان کا معنی سرکشی یعنی حد سے بڑھنا ہے۔ ایسے لوگ انسانیت کی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اشارۃً وہ اسباب بھی بیان فرمائے، جن کی بنا پر ایسے لوگ سرکشی کا راستہ اختیار کرتے ہیں پھر ان کو وعید بھی سنائی کہ اگر یہ اپنی مذموم حرکات سے باز نہیں آئیں گے تو انہیں اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی سزا میں مبتلا کریں گے۔ اور آخرت کے عذاب کے متعلق تو یوں فرمایا۔

"وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ"

سرکش انسان

فرمایا کَلَّآ خبردار! سارے انسان قرآنی تعلیم حاصل کرنے والے نہیں بلکہ کچھ لوگ اس کے خلاف کرنے والے بھی ہیں۔ اسی قسم کے انسان کے متعلق فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی بے شک انسان البتہ سرکشی کرتا ہے۔ قوم ثمود کی سرکشی کے متعلق فرمایا کَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَا "قوم ثمود نے سرکشی کی وجہ سے اللہ کے نبی کو جھٹلایا۔ اس کے پروگرام کو تسلیم نہ کیا۔ اسی طرح فرمایا کہ حضور علیہ السلام کے دور میں بھی کچھ لوگ سرکشی اختیار کئے ہوئے ہیں جو آپ کے پروگرام کو تسلیم نہیں کرتے، بلکہ الٹا اس کی مخالفت کرتے ہیں اور طرح طرح تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔

استغناء کی وجوہات

فرمایا کسی سرکش کی سرکشی کی وجہ یہ ہے اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتا ہے۔ اب استغناء کی کئی وجوہات ہیں۔ جن کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتے ہیں۔ ان میں مال وجاہ ہے، حکومت ہے، جسمانی قوت ہے۔ کوئی ماہر ہے یا اچھی شکل وصورت ہے جس کی وجہ سے وہ بے پرواہ ہے۔ ان تمام وجوہات میں مال وجاہ کو اولیت حاصل ہے۔ عام طور پر انہیں کی بدولت انسان اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگتا ہے دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھتا ہے۔ سورۃ النّٰزِعٰت میں فرعون کی مثال گذر چکی ہے۔ اور یہاں پر ابوجہل کی طرف اشارہ ہے یہ اور اس قسم کے دوسرے لوگ مال کی وجہ سے اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتے ہیں کہ ہمارے پاس مال و دولت ہے۔ ہم کسی کے محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ اقوام کے حالات بھی بیان فرمائے۔ جو کہتے تھے نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ "ہمارے پاس مال اور اولاد کی کثرت ہے۔ ہمیں کس بات کا فکر ہے۔ کفار مکہ میں بھی ایک شخص ایسا تھا۔ جس کے دس بیٹے جوان تھے اور مجلس میں حاضر ہوتے تھے۔ بڑا مالدار تھا اس کا لاکھوں کا کاروبار تھا وہ بھی دولت اور سرداری کی وجہ سے اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتا تھا۔ ایسے ہی لوگ اپنے آپ کو باعزت اور دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں کسی کو اپنے کام میں مزاحم نہیں ہونے دیتے نیکی سے روکتے ہیں۔ بلکہ نماز پڑھنے سے روکتے ہیں۔ اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتے ہیں حالانکہ کائنات میں کوئی چیز مستغنی نہیں ہے۔ سارے کے سارے انسان محتاج ہیں۔

صرف ذات خداوندی ہی واحد ذات ہے۔ جو ہر لحاظ سے مستغنی ہے "یَاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ج وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ" اے بنی نوع انسان! تم سب محتاج ہو۔ اور بے نیاز اور مستغنی صرف اللہ کی ذات ہے۔ جو انسان ہو کر اپنے آپ کو مستغنی سمجھتا ہے۔ وہ خدا کا نافرمان اور طاغی ہے۔

اللہ کے حضور پیشی

حقیقت یہ ہے۔ کہ اس تمام تر سرکشی اور نافرمانی کے باوجود اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی سب کا تیرے رب کی طرف ہی رجوع ہوگا۔ ہر شخص اللہ کے حضور پیش ہوگا۔ لہٰذا تمام انسانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی توجہ اُسی مالک الملک کی طرف رکھیں۔ اپنے آپ کو خدا تعالےٰ کے سامنے عاجز اور محتاج خیال کریں۔ جو شخص اللہ کی طرف رجوع کرے گا۔ وہ اُس کا بندہ ہوگا۔ وہ اللہ کی مخلوق کو حقیر نہیں جانے گا۔ وہ ضرور خیال کرے گا کہ جس طرح میں اللہ کا محتاج ہوں اسی طرح ساری مخلوق اس کی محتاج ہے۔ اس طرح توحید اور ایمان کی فکر سے آپس میں مساوات پیدا ہوگی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بلحاظ انسانیت سب انسان برابر ہیں۔ اس لیے کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکے گا۔

طاغی لوگ مال و جاہ کی بدولت اپنے آپ کو مستغنی سمجھتے ہیں۔ اکڑ دکھاتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے حقوق ضائع کرتے ہیں۔ مگر عبد مومن کبھی ظلم و زیادتی کا ارتکاب نہیں کریگا کیونکہ اس کی توجہ حظیرۃ القدس کی طرف لگی ہوئی ہے وہ اپنے آپ کو خدا کا عاجز بندہ سمجھتا ہے اور مخلوق کا خادم خیال کرتا ہے۔ لہٰذا وہ سرکشی اختیار نہیں کرے گا۔

نماز سے روکنے والا

فرمایا اَرَءَیْتَ الَّذِیْ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی جو منع کرتا ہے، روکتا ہے بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ مکی زندگی میں حضور علیہ السلام کے ساتھ ایسے کئی واقعات پیش آئے۔ مسلم شریف[1] کی حدیث میں ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے ابوجہل نے دیکھا تو کہنے لگا۔ کہ اگر میں نے محمد کو دوبارہ سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی گردن کو روند ڈالوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس

---

[1] مسلم صــــ ، ترمذی صـ ۴۸۳ ، بخاری صـ ۷۴۲/۲ ۔

آیت میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اُس شخص کو دیکھا، جو آپ کی نمازیں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ اُسے نماز سے کیوں ضد ہے وہ نماز سے کیوں روکتا تھا۔

ایک دفعہ ایسا[1] ہوا کہ آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل آگے بڑھا تاکہ آپ کو تکلیف پہنچائے مگر فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔ لوگوں نے پوچھا، کیا بات ہوئی، تم جلدی واپس لوٹ آئے کہنے لگا مجھے خندق نظر آئی جس میں آگ تھی۔ وہاں پہ مجھے پر نظر آئے، اس لیے میں آگے نہیں جاسکا۔ ابوجہل، حضور علیہ السلام کے دَور کا سب بڑا طاغی تھا۔ بلکہ یہ اپنے زمانے کا فرعون تھا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اگر یہ شخص آگے بڑھکر مجھے تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتا تو فرشتے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ اس پہ خدا کا قہر نازل ہوتا۔ کہ یہ نماز سے روکتا ہے۔

نماز سے روکنے کی وجہ

نماز سے روکنے کی بنیادی وجہ یہ تھی۔ کہ آپ نمازیں قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے تلاوت قرآن نماز کا اعلیٰ رکن ہے اور قرآن پاک کی تلاوت سے انسان کو یہ پروگرام ملتا ہے کہ وہ خدا کی طرف رجوع رکھے، اس کی وحدانیت کو تسلیم کرے۔ مخلوق پہ ظلم نہ کرے۔ کسی کا حق غصب نہ کرے، تکبر اور غرور نہ کرے۔ وحی اور الہام کا علم حاصل کرے۔ اسی لیے سب سے پہلے وحی کا آغاز اقراء سے کیا عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ کا حکم دیا۔ یہ قرآن پاک ہی ہے جو انسان کو من مانی کرنے سے روکتا ہے۔ لہٰذا وہ شخص نماز سے روکتا ہے۔ تاکہ قرآن پاک کی آواز کو بلند ہونے سے روکا جاسکے۔ نماز کی مخالفت کی یہی وجہ ہے۔

دوسرے مقام پہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی مذمت میں فرمایا۔ کہ جب آپ قرآن پڑھتے تو یہ لوگ کہتے " وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ " تم اس وقت شور و غوغا کیا کرو۔ تاکہ قرآن کی آواز دب کر رہ جائے۔ اور کوئی اسے سن نہ سکے۔ کہتے تھے تم اس صورت میں اسلام پہ غالب آسکتے ہو۔ کہ اس کی آواز کو دوسروں تک پہنچنے سے روک دو۔ ایک اور مقام پہ آتا ہے۔ کہ جب آپ قرآن کی آیات پڑھتے، تو کفار طیش میں آجاتے ایسا معلوم ہوتا کہ حملہ آور ہو جائیں گے۔ اور مار ڈالیں گے۔ کیونکہ قرآن کی تعلیم تو یہی ہے۔ کہ اللہ کی

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج۴ ص۵۲۹ مسلم ص ۔ ، درمنثور ج۶ ص۳

وحدانیت پر ایمان لاؤ۔ تم سب محتاج ہو، غنی فقط وہی ہے۔ مال و دولت محض آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ یہ مکمل کامیابی کی ضمانت نہیں ہیں۔ یہ تو اللہ کی حکمت ہے کسی کو کم دے دیا کسی کو زیادہ عطا کر دیا۔ مال وجاہ کی وجہ سے دوسروں کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ غرور نہیں کرنا چاہیے اسی لیے فرمایا کہ طاغی شخص نماز سے روکتا ہے۔ تاکہ قرآن پاک کا پروگرام لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے۔

نماز کی برکات

فرمایا اَرَءَیْتَ اِنْ کَانَ عَلَی الْھُدٰٓی اگر نماز پڑھنے والا بندہ ہدایت پر ہو اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی یا وہ تقویٰ کا حکم دیتا ہو، تو کیا پھر یہ نماز سے منع کرے گا۔ اب تقویٰ میں عدل بھی آتا ہے۔ غنیۃ الطالبین[1] میں ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ سے دریافت کیا گیا، تقویٰ کیا چیز ہے تو آپ نے اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی۔ "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی" مطلب یہ کہ تقویٰ اسی صورت میں حاصل ہو گا۔ جب عدل و انصاف کو قائم کرے گا اگر ظلم کا بازار گرم کرے گا تو تقویٰ سے محروم ہو گا۔ تقویٰ ظلم، شرک اور منافقت کے خلاف ہے جہاں تقویٰ ہو گا۔ وہاں عدل قائم ہو گا۔ مخلوقِ خدا اور قرابت داروں کے ساتھ احسان ہو گا۔ پھر "وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ" فواحش، منکرات اور سرکشی کو روک دے گا۔

اب دیکھئے نماز بہت بڑی چیز ہے۔ ہم تو پرواہ ہی نہیں کرتے بس رواروی میں پڑھ جاتے ہیں۔ حالانکہ لاپرواہی سے نماز پڑھنے والوں کے لیے بڑی وعید ہے۔ "فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ" ان نمازیوں کے لیے جہنم ہے "اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ" جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں۔ اسی طرح منافقوں کی نماز کی مذمت بیان کی "وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی" جب وہ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو سست روی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وقت ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہر حال نماز ایک بہت بڑی چیز ہے جو نماز کے مقصد کو سمجھے گا وہ توحید کے مقام کو پالے گا۔ وہ اپنی عاجزی اور خدا کی بے نیازی

---

[1] غنیۃ الطالبین ص ۱۴۲ ج ۱ طبع مصر

کو سمجھے گا، اور مخلوق پر کبھی ظلم نہیں کرے گا۔ اگر نمازی ہو کر ظلم و زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے تو جان لو کہ وہ نماز کا مطلب ہی نہیں سمجھا جس نے نماز کے مقصد کو پالیا، وہ ہر قسم کی معصیت سے بچ گیا۔ الغرض فرمایا کیا یہ نماز پڑھنے سے روکے گا۔ اگرچہ نمازی ہدایت پر ہو یا تقویٰ کا حکم دیتا ہو۔

مکذبین کی دھمکی

آگے فرمایا اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی آپ بتلائیں کہ اگر یہ منع کرنے والا شخص تکذیب کرتا ہے۔ قرآن پاک کی آواز اور اس کی تعلیم سے روگردانی کرتا ہے تو اَلَمۡ یَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس طاغی کی تمام حرکات کو دیکھ رہا ہے۔ کہ کس طرح مخلوق کو تنگ کرتا ہے۔ نمازی کو نماز پڑھنے سے اور قرآن کریم کی تلاوت سے روکتا ہے انہیں ظلم کے خلاف آواز اٹھانے سے روکتا ہے۔ اُسے جان لینا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالےٰ اس کے ہر فعل سے واقف ہے۔ اس کے بعد تنبیہ کے انداز میں فرمایا کَلَّا خبردار لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ اگر یہ آدمی اپنی اس گندی حرکت سے باز نہ آیا۔ تو پھر لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِیَۃِ ہم اُسے پیشانی سے پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ ناصیہ پیشانی کو کہتے ہیں۔ نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ یہ پیشانی جھوٹی اور خطا کار ہے، ہم اسی سے پکڑ کر اُسے ذلیل کریں گے۔ اُس نے بال تو شریف آدمیوں کی طرح رکھے ہیں۔ مگر حقیقت میں جھوٹا، ظالم اور طاغی ہے۔ اس کے اندر ظلم، زیادتی اور کفر بھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سب سے پہلی سورۃ میں ہی دھمکی دے دی کہ اگر یہ لوگ باز نہ آئے۔ تو انہیں ذلیل و رسوا کیا جائے گا۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ بدر کے میدان میں ابوجہل اور دیگر مقتولین کفار کو ان کے بالوں سے پکڑا گیا اور گھسیٹ کر اندھے کنوئیں میں پھینک دیا گیا[1] دنیا میں تو ان کا یہ حشر ہوا اور آخرت میں فرشتے انہیں گھسیٹ کر دوزخ میں ڈالیں گے۔

نماز سے روکنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سخت وعید سنائی کیونکہ یہ روکنا اللہ کے حکم کے خلاف تھا۔ ہاں البعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں۔ جب نماز پڑھنے سے

---

[1] بخاری ص ۵۶۶ ج ۲ -

شرعاً روکا جاتا ہے۔ مثلاً سورج کے طلوع یا غروب کے وقت، زوال کے وقت، عصر کے بعد نفل پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔[1] حضرت عمرؓ آدمی کو بھیجا کرتے تھے۔ کہ دیکھو جو شخص نماز عصر کے بعد نفل پڑھتا ہے۔ اُس کو دُرّے مارو۔[2] مگر یہ حکم اللہ تعالیٰ کی منشا کے مطابق تھا۔ یہ تو اللہ کے حکم کی تعمیل تھی۔ مگر مشرک اور طاغی کی ممانعت اللہ کے حکم کی خلاف ورزی تھی۔ اس لیے اُسے سخت تنبیہ کی گئی۔ کہ اُسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔

کہتے ہیں[3] کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سر کے بالوں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور انہیں جان کے برابر خیال کیا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی سر منڈاتے والوں اور بال کترانے والوں کو مُحَلِّقِیْنِ اور مُقَصِّرِیْنَ فرما کر ان کی تعریف فرمائی ہے۔ غرضیکہ بالوں کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے بڑی سخت تنبیہ کی کہ تمہیں انہیں باعزت بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔ اگر تم نمازی کو نماز سے روکنے سے باز نہ آئے۔

مشرکین سے مقابلہ

ایک دفعہ اُس بدبخت نے حضور علیہ السلام کو نماز سے روکنا چاہا۔[4] تو آپ نے سختی سے منع فرمایا۔ وہ کہنے لگا۔ تم مجھے دھمکاتے ہو، میں شہر کا سب سے معزز آدمی ہوں۔ میری مجلس بھری رہتی ہے۔ اور میں اس وادی کو اپنے حامیوں سے بھر سکتا ہوں۔ وہ سب میری حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ جب یہ شخص ہماری گرفت میں آئے گا۔ فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ تو اپنی مجلس والوں کو بلائے، اور ہم ان کے مقابلے میں سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ پیدل سیاست کرنے والے فرشتوں کو بلا لیں گے۔ وہ اُسے پکڑ کر ذلیل و رسوا کر دیں گے۔ اور اس کا کوئی حامی اُس کی مدد کو نہیں پہنچ سکے گا۔ زبانیہ پکڑنے والے یا دھکیلنے والے کو کہتے ہیں جو پکڑ کر اور باندھ کر جیل میں ڈال دیں۔ اس دنیا میں زبانیہ حضور علیہ السلام کے پیروکاروں کو بتایا گیا۔ جنھوں نے نہایت بہادری اور جرأت کے ساتھ کفار کا مقابلہ کیا۔ اور مشرکوں کو مارا۔ ان میں انصار مدینہ بھی شامل ہیں۔ آخرت میں زبانیہ سے مراد اللہ کے فرشتے ہیں، جو

---

1 طحاوی ص ۱۰۵ ج ۱ 2 طحاوی ص ۲۰۸ ج ۱ 3 المقام المحمود تفسیر مولانا سندھیؒ ص ۱۳۶ پارہ ۳۰
4 روح المعانی ص ۱۸۷ ج ۳۰، مظہری ص ۳۰۸ ج ۱۰

مجرموں کو پکڑ کر لے جائیں گے۔

مصالحت سے انکار

فرمایا کَلَّا خبردار! یہ طاغی لوگ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے لَا تُطِعْهُ آپ ان کی اطاعت نہ کریں یعنی مصالحت نہ کریں۔ کیونکہ ان کی بات مان لی گئی تو اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ سارا پروگرام ناتمام رہ جائے گا۔ لہٰذا آپ اپنے پروگرام پر قائم رہیں اور ان سے صلح ہرگز نہ کریں۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے اس مضمون کو اس طرح بیان فرمایا "وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ" یہ چاہتے ہیں کہ آپ ڈھیلے پڑ جائیں، تو وہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے۔ یعنی آپ شرک اور ظلم کی مذمت کرنا چھوڑ دیں۔ فرمایا یہ نہیں ہو سکتا، "وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا" آپ ان میں سے کسی گنہگار، مجرم اور ناشکرگذار کی بات نہ مانیں، کیونکہ ان کا پروگرام سراسر غلط ہے۔ ان کی بات مان کر آپ اپنا صحیح پروگرام نہ چھوڑ دیں۔ اس کی بالکل اجازت نہیں۔ یہ لوگ آپ کو طرح طرح کے لالچ دیتے ہیں ڈراتے دھمکاتے ہیں اور مخالفت میں پورا زور لگاتے ہیں۔ مگر آپ کو حکم یہی ہے۔ کہ ان کی بات ہرگز نہیں ماننی۔

سجدہ کمال اطاعت کی نشانی ہے

فرمایا ان مشرکین سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے وَاسْجُدْ آپ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جائیں، کیونکہ سجدہ کمال اطاعت کی نشانی ہے۔ اور بہت بڑی عبادت ہے۔ آپ ہر وقت اللہ کی اطاعت میں مصروف رہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد[1] ہے۔ اَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ یعنی سجدہ بندے کو اللہ سے قریب تر کرنے والی حالت ہے لہٰذا آپ کثرت سے سجدہ کریں وَاقْتَرِبْ اور خدا کا قرب تلاش کریں۔ یعنی کثرت سے نماز پڑھیں جس میں کثرت سے سجدے آئیں گے اور آپ کو قرب خداوندی حاصل ہوگا۔ آپ ان کے کہنے سے نماز میں کمی نہ کریں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ اس سب سے پہلی سورۃ میں ہی اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ کفار کے ساتھ مقابلے کی جنگ ضرور ہوگی، ان طاغیوں کے ساتھ صلح کی کوئی گنجائش نہیں آپ قرآن پاک کے پروگرام کو کامیاب کرنے کے لیے مستعد رہیں۔ کمزوری دکھانے سے

---

[1] مسلم ص ۱۹۱ ج ۱ [2] المقام المحمود یعنی تفسیر مولانا سندھی ص ۱۳۹ پارہ ۳۰

کامیابی حاصل نہیں ہو گی۔ اگر اپنے پروگرام پر جمے رہیں گے تو "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" تو پھر کامیابی تمہارے ہی قدم چومے گی۔ تم ہی ان پر حاوی ہو گے۔ تمہارا پروگرام غالب آئے گا۔

حدیث شریف میں صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے "اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ" سجدہ تلاوت والی سورۃ پڑھ کر سجدہ کیا۔ اور یہ اِقْرَاْ والی سورۃ پڑھ کر بھی آخر میں سجدہ کیا۔ یہ سجدہ پڑھنے اور سننے والوں سب پر واجب ہو جاتا ہے۔ پورے قرآن پاک میں کل چودہ سجدے ہیں۔ جب ان مقامات کی آیات پڑھی یا سنی جائیں۔ تو سجدہ ضروری ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ اجازت ہے کہ اگر فوری طور پر سجدہ کے لیے تیار نہ ہو تو جس وقت بھی موقع ملے سجدہ کر لے۔ اور اگر پڑھنے یا سننے کے وقت سجدہ کے لیے تیار ہو اور سجدہ کا وقت بھی ہو تو اسی وقت سجدہ کر لینا چاہیئے۔ تاہم یہ مؤخر بھی کیا جا سکتا ہے۔

لہ مسند احمد ج۲ ص۴۶۱ مسلم ج۱ ص۲۱۵

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

سورة القدر

سُوْرَۃُ الْقَدْرِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ خَمْسُ ۵ اٰیَاتٍ

سورۃ قدر مکی ہے اور یہ پانچ آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ ۝١ وَمَآ اَدْرٰىکَ مَا لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ۝٢
لَیْلَۃُ الْقَدْرِ ۵ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ ۝٣ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ
فِیْھَا بِاِذْنِ رَبِّھِمْ ج مِنْ کُلِّ اَمْرٍ ۝٤ سَلٰمٌ قف ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝٥

ترجمہ :۔ بے شک اس قرآن پاک کو ہم نے لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ① اور آپ کو کس نے بتلایا کہ لیلۃ القدر کیا ہے ② لیلۃ القدر ہزار مہینے سے زیادہ بہتر ہے ③ اس رات میں فرشتے اور روح اترتے ہیں اپنے رب کے حکم سے ہر معاملے میں ④ سلامتی ہوتی ہے اس رات یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جائے ⑤

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سُوْرَۃُ الْقَدْرِ ہے۔ اس کی پہلی آیت میں قدر کا لفظ مذکور ہے۔ جس سے اس سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ پانچ آیات پر مشتمل ہے اس کے تیس ۳۰ الفاظ اور ایک سو اکیس ۱۲۱ حروف ہیں۔

پہلی سورۃ کا خلاصہ

پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اور پھر اسے درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے علم کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد انسانوں کی دو اقسام کا ذکر کیا۔ ایک وہ قسم جو اہل ایمان ہیں اور فطرت کے مطابق قرآن پاک کا علم حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور اس کی وحدانیت کو مانتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کا عاجز بندہ سمجھتے ہیں اور اس کے حضور نماز ادا کرتے ہیں۔ تقویٰ کا حکم دیتے ہیں اور نیکی اور ہدایت کے راستے پر گامزن ہیں۔

انسانوں کا دوسرا گروہ سرکش ہے اپنے آپ کو مال وجاہ کی وجہ سے مستغنی خیال کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں رکھتا۔ اور اللہ کے بندوں کو اس کی عبادت کرنے سے، نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ قرآن پاک سننا نہیں چاہتا۔ اس کے پروگرام کی مخالفت کرتا ہے۔ اُس سے رُوگردانی اور اسکی تکذیب کرتا ہے۔ ایسے طاغی شخص کو تنبیہ کی گئی ہے۔ کہ اگر وہ اپنی مذموم حرکتوں سے باز نہ آیا تو اُسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔ اور اُسے ذلیل خوار کیا جائے گا۔ اس وقت وہ اپنی مجلس والوں کو بلائے گا۔ مگر کوئی بھی اسُ کی مدد کو نہیں پہنچے گا۔

اس کے برخلاف عبد مؤمن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی طاغیوں کی بات کو تسلیم نہ کرے۔ اور نہ اُن کے ساتھ مصالحت کرے۔ مؤمنین کو چاہیئے کہ وہ ہر وقت خدا تعالیٰ کی اطاعت کاملہ میں لگے رہیں۔ اور اُس کا قرب تلاش کریں۔ یہ سورۃ اِقْرَأْ کا خلاصہ ہے جو میں نے عرض کیا۔

موضوع

اس سورۃ مبارکہ میں الہام کا ذکر ہے۔ انسان وحی اور الہام کے محتاج ہیں۔ اس کے بغیر درجہ کمال تک نہیں پہنچ سکتے۔ گذشتہ سورۃ میں انسان کا ذکر تھا۔ اب وحی کا ذکر ہے گویا یہ دونوں چیزیں باہم مربوط ہیں۔

سورۃ فاتحہ ابتدائی وحی میں سے ہے[1]۔ اس میں جب ہم اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ" تو خدا تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ " یعنی اے انسان! تم جس چیز کے طلبگار ہو، جس کے بغیر تمہاری راہنمائی ممکن نہیں، یہ وہی کتاب ہے۔ جسے ہم نے نازل کیا ہے تو اس میں متقیوں کے لیے ہدایت کا سامان موجود ہے۔ تو یہاں پر اس کتاب کا ذکر ہے۔ جو وحی الٰہی ہے۔ اور الہام ربانی ہے۔ اور جس کے بغیر ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

---

[1] تفسیر اتقان صہ ۲۴/۱

شانِ نزول — اس سورۃ کے شانِ نزول میں مفسرین کرامؒ بیان کرتے ہیں۔ کہ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے ایک ہزار مہینے تک مسلسل اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔ وہ شخص دن کو جہاد کرتا تھا۔ اور رات بھر عبادت میں گزار دیتا۔ جب یہ واقعہ اہل ایمان نے سنا تو وہ متعجب ہوئے اور خیال کیا کہ ایسے لوگوں کے درجات بہت بلند ہوں گے ہم میں اتنی ہمت کہاں کہ ان کا مقابلہ کر سکیں۔

حضور علیہ السلام نے دوسرا ارشاد یہ فرمایا[۲] کہ اَعْمَارُ اُمَّتِیْ مَا بَیْنَ السِّتِّیْنَ اِلَی السَّبْعِیْنَ وَاَقَلُّهُمْ مَنْ یَّجُوْزُ ذٰلِكَ یعنی میری امت کی عمریں عام طور پر ساٹھ اور ستر سال کے درمیان ہیں اور بہت کم لوگ ہیں، جو اس سے آگے جاتے ہیں۔ آپ کے اس فرمان سے بھی صحابہ کرامؓ نے محسوس کیا کہ پہلے لوگوں کی عمریں زیادہ ہوتی تھیں۔ اس لیے انہیں عبادت کے لیے وقت بھی زیادہ مل جاتا تھا۔ مگر ہماری عمریں چونکہ مختصر ہیں۔ اس لیے ہم پہلے لوگوں کی طرح درجۂ کمال کو کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

ویسے بھی اگر غور کیا جائے، تو انسان اپنی ساٹھ سالہ زندگی میں تیس ۳۰ سال تو سو کر ہی گزار دیتا ہے۔ یعنی چوبیس ۲۴ گھنٹے میں سے دن کا نصف حصہ کام کاج کرتا ہے۔ اور باقی نصف حصہ رات کو سوتا ہے۔ زندگی کے بقیہ تیس ۳۰ سالوں میں سے دس سال بچپن کی زندگی کے نکال دیں تو اُسے باقی صرف بیس ۲۰ سال ہی ملتے ہیں۔ جن میں وہ خدا کی طرف رجوع کر سکتا ہے۔ مگر اس حصۂ زندگی میں بھی بہت کم لوگ خدا کی طرف آتے ہیں اکثر یہ وقت بھی فضول کاموں کی نذر ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ کہ اس امت کے لوگوں کو کم و بیش بیس ۲۰ سال کا عرصہ ملتا ہے۔ جس میں وہ کچھ نیکیاں کما سکتے ہیں۔ اس کے برعکس سابقہ امتوں کی عمریں چونکہ بہت لمبی ہوتی تھیں۔ اس لیے صحابہ کرامؓ نے محسوس کیا۔ کہ ہمارے اندر وہ کمال کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔ جو گذشتہ امتوں کو حاصل ہوا۔ صحابہ کرامؓ کے اس احساس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

---

[۱] روح المعانی ص ۱۹۲ ج ۳۰، معالم التنزیل ص ۲۴۶ ج ۴ [۲] ابن ماجہ ص ۳۱۲، ترمذی ص ۳۳۸

لیلۃ القدر کی فضیلت

اللہ جل شانہ نے حضور علیہ السلام کی امت کو جو خاص فضیلت بخشی ہے ۔ اس میں یہ بھی ہے ۔ کہ اگر اس امت کے لوگ تھوڑے وقت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت خلوص دل سے کریں ۔ تو وہ اجر و ثواب میں سابقہ امتوں کے ہزار مہینے کی عبادت سے بڑھ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے ایسے ایسے اوقات اور طریقے مقرر کر دیے ہیں ۔ کہ تھوڑے وقت میں زیادہ اجر حاصل کر سکتے ہیں ، چنانچہ اس سورۃ میں مذکورہ لیلۃ القدر بھی اللہ تعالیٰ نے اسی امت کو عطا فرمائی ، اور اس کا مرتبہ اس قدر بلند کیا ۔ کہ جو شخص اس ایک رات میں خلوص نیت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرے ، وہ ہزار مہینے کی مسلسل عبادت سے سبقت لیجاتا ہے ۔ اس ایک رات کو اللہ تعالیٰ نے اتنا شرف اور مرتبہ عطا کیا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام اور اہل ایمان کی تسلی کے لیے اس رات کی فضیلت یوں بیان فرمائی اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ اے لوگو ! جس وحی الٰہی کے تم محتاج ہو ، اس کو ہم نے لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ۔ یہاں " ہ " کی ضمیر قرآن پاک کی طرف لوٹتی ہے ۔ مگر اس کی عظمت کی وجہ سے اُسے مبہم رکھا گیا ہے ۔ مطلب یہی ہے ۔ کہ ہم نے قرآن پاک کو لیلۃ القدر میں اتارا ۔ وہی قرآن پاک جو تمہیں مطلوب ہے ۔ اور جیسے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ کہہ کر خطاب کیا گیا ہے ۔ یہ وہی وحی الٰہی ہے جسکے سب انسان محتاج ہیں ۔

قدر کا مفہوم

لفظ قدر کے دو مفہوم ہیں اور اس مقام پہ دونوں کا اطلاق ہوتا ہے ۔ قدر کا پہلا معنیٰ عظمت اور شرافت ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ رات اجر و ثواب کے اعتبار سے بڑی فضیلت رکھتی ہے ۔ قدر کا دوسرا معنیٰ تقدیر ہے ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں انسانوں اور کائنات کے لیے جو چیزیں مقرر ہیں ۔ ان کا سال بھر کا پروگرام فرشتوں کو نوٹ کرا دیا جاتا ہے ۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق وہ تدبیر میں لگ جائیں ۔ موت و حیات ، صحت اور بیماری ، خوشحالی اور بدحالی اور دیگر جو واقعات سال بھر میں رونما ہونے ہوتے ہیں ، وہ سب فرشتوں پہ واضح کر دیے جاتے ہیں ۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی اس رات کو لیلۃ القدر کہا گیا ہے[1] ۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۲۴ و ۲۲۵ پارہ ۳۰

اعمال اور ان کا اجر

فرمایا وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ لیلۃ القدر کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ لیلۃ القدر ہزار مہینے سے زیادہ بہتر ہے۔ باعتبار اجر و ثواب اس رات کو اتنی فضیلت حاصل ہے۔ اور یہ بھی اس امت کا خاصہ ہے[۱]۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بعض اعمال چھوٹے ہیں۔ مگر ان کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے[۲]۔ رِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ يَوْمٍ فِيمَا سِوَاهُ ایک رات بھر مسلمانوں کی چھاؤنی میں پہرہ دینا۔ تاکہ دشمن سے محفوظ رہ سکیں دیگر ہزار دنوں سے زیادہ بہتر ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے[۳] جو شخص اچھی ہیئت اور اچھی نیت کے ساتھ جمعہ کی نماز کے لیے آتا ہے۔ اُسے ہزار دن سے زیادہ اجر و فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ہزار دن کا ذکر ہے۔ اور لیلۃ القدر کے متعلق ہزار مہینے کا ذکر ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہاں ایک رات اور کہاں ایک ہزار مہینہ۔

استغفار کا نادر موقع

لیلۃ القدر کی اس فضیلت سے ہم کہاں تک مستفید ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے اعمال سے ظاہر ہے۔ لوگ حلوہ کھاتے ہیں۔ گندے بارود اور بدبودار آتش بازی سے کھیلتے ہیں جن بدبودار اشیاء سے فرشتوں کو نفرت ہے۔ ہم وہی چیزیں پیش کرتے ہیں۔ یہی چیز ذہنیت کی غلاظت پر دلیل ہے۔ حالانکہ نظریہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا۔ کہ سال بھر میں اللہ تعالےٰ نے ایک موقع عطا کیا ہے۔ عاجزی اور انکساری کے ساتھ اس کی عبادت کریں۔ عمر بھر کی کوتاہیوں کی معافی مانگ لیں۔ شاید یہ موقع پھر نصیب نہ ہو۔ مگر یہاں حالت یہ ہے۔ کہ کھانے پینے بارود اڑانے اور آتش بازی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

کچھ لوگ ایسے ہیں۔ جو غزل خوانی اور نعت خوانی میں مصروف رہتے ہیں۔ ساری رات یہی شغل جاری رہتا ہے۔ لوگوں کو اسی کام میں بہلایا جا رہا ہے۔ شور و شر اور گانا بجانا ہو رہا ہے۔ حالانکہ عبادت کے اعتبار سے یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ توبہ استغفار کیا جاتا۔ رو رو کر اللہ تعالےٰ سے عمر بھر کے گناہوں کی معافی مانگی

---

[۱] درمنثور ص ۳۷۱/۶ [۲] نسائی ص ۶۲/۲ ترمذی ص [۳] کنزالعمال ص ۵۴۱/۷

جاتی ، آ کہ اللہ راضی ہو جائے محکمہ یہاں تو کھانے پینے کا کاروبار ہے چراغاں ہے۔ جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں۔ اور اسی طرح لوگ اسراف و تبذیر کے مرتکب ہوتے ہیں۔

نزول ملائکہ

لیلۃ القدر کی خصوصیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ۔ اس رات میں فرشتے اور رُوح اترتے ہیں اپنے رب کے حکم سے۔ اس مقام پر روح سے مُراد جبرائیل امین علیہ السّلام ہیں بعض مفسّرین[1] فرماتے ہیں کہ جبرائیل علیہ السّلام تو فرشتوں کی جماعت میں شامل ہیں۔ لہٰذا روح اللہ تعالیٰ کی کوئی اور مخلوق ہوسکتی ہے۔ ویسے انسانی روح کا تقاضا یہ ہے۔ کہ انسان میں خدا کی محبت اور اس کا اشتیاق پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے دیدار کا شوق پیدا ہو۔ تاہم عام مفسرین نے روح سے مراد جبرائیل علیہ السلام لیے ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا۔ کہ اس رات میں جبرائیل علیہ السلام اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بے شمار فرشتے اترتے ہیں۔ جبرائیل امین علیہ السلام کا اترنا ویسے ہی باعث خیر و برکت ہے۔ انبیاء علیہم السلام پر جب وحی نازل ہوتی ہے۔ تو بے شمار خیر و برکات شامل حال ہوتے ہیں۔

خیر و برکت کا نزول

اس رات میں اترنے والے فرشتوں کی جماعت زمین میں پھیل جاتی ہے۔ اور وہ تلاش کرتے ہیں۔ کہ کون اللہ کی عبادت میں مصروف ہے۔ ایسے شخص کے لیے فرشتے دعائیں مانگتے ہیں۔ ایک حدیث[2] میں آتا ہے۔ کہ اس رات میں اترنے والے فرشتوں کی تعداد صحراؤں اور دریاؤں میں پڑی ہوئی ریت کے ذرّات سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ مگر وہ دعا اور استغفار صرف انہیں لوگوں کے لیے کرتے ہیں۔ جو اس رات عبادت میں مصروف رہ کر اپنے اللہ کو راضی کرتے ہیں۔ افسوس کہ بعض بدبخت لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جنہیں اس بابرکت رات میں بھی معافی نہیں ملتی۔ حدیث شریف[3] میں آتا ہے۔ جو شخص مسلسل شراب نوشی کرتا ہے۔ تو یہ نہیں کرتا، ماں باپ کا نافرمان ہے۔ شرک کو نہیں چھوڑتا، لوگوں سے قطع تعلق کرتا ہے۔ کینہ پرور ہے۔

---

[1] روح المعانی ص ۱۹۵ ج ۳۰ ، [2] ابن کثیر ص ۵۳۱ ج ۴ درمنثور ص ۳۷۵ ج ۶ [3] کنز العال ص ۲۶۶ ج ۸

ایسے شخص کو اس رات کی فیوض و برکات سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، وہ محروم رہتا ہے۔

فرمایا مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۛ سَلٰمٌ ہر معاملے میں سلامتی یا خیر و برکت ہوتی ہے یا اس کا معنی یہ بھی ہے کہ ہر معاملہ جو خدا کی جانب سے آئندہ سال مقدر ہونے والا ہے۔ وہ طے ہو جاتا ہے۔ اور سلامتی ہوتی ہے۔ ھِیَ یہ حالت قائم رہتی ہے۔ یعنی خیر و برکات کا نزول جاری رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی تجلیات آسمان دنیا کی طرف نازل ہوتی رہتی ہیں۔ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی رحمتوں کا نزول ساری رات جاری رہتا ہے۔

کتب آسمانی اور ماہِ رمضان

یہ بات واضح ہے۔ کہ قرآن پاک کا نزول ماہِ رمضان المبارک میں ہوا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ اور یہاں فرمایا اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ لہٰذا معلوم ہوا کہ لیلۃ القدر ماہِ رمضان میں ہے۔ بعض[1] روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمام آسمانی کتابیں رمضان کے مہینے میں ہی نازل ہوئیں۔ موسیٰ علیہ السلام پر تورات رمضان کی چھ تاریخ کو نازل ہوئی۔ بعض روایات میں تیسری تاریخ کا ذکر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے بھی رمضان میں نازل ہوتے۔ داؤد علیہ السلام کی زبور تیرھویں تاریخ کو اور انجیل سترھویں رمضان کو نازل ہوئی۔ اس طرح قرآن پاک رمضان المبارک کے آخری حصے میں نازل ہوا۔ بعض فرماتے[2] ہیں۔ کہ لیلۃ القدر میں قرآن پاک کو لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر بیت المکرم میں رکھ دیا گیا۔ اور پھر تئیس ۲۳ سال میں آہستہ آہستہ نازل ہوا۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ قرآن پاک کا ابتدائے نزول اس متبرک رات سے ہوا۔

ساری رات بابرکت ہے

بہر حال لیلۃ القدر بڑی بابرکت رات ہے۔ اور یہ رمضان المبارک کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات[3] ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ ہر سال ایک ہی مقرر رات ہو، بلکہ کسی سال اکیسویں ۲۱، کسی بار تیئیسویں ۲۳ اور کبھی انتیسویں ۲۹ بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم یہ رمضان کے آخری عشرے میں ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ جس نے خدا پر ایمان رکھتے ہوئے اجر و ثواب

---

۱ تفسیر مظہری ص ۳۱۱، ۳۱۲ ج ۱۰، ۲ معالم التنزیل ص ۲۴۴ ج ۴، تفسیر ابن کثیر ص ۵۲۹ ج ۴، ۳ بخاری ص ۲۷ ج ۱، مسلم ص ۳۷ ج ۱

طلب کرتے ہوتے۔ لیلۃ القدر میں قیام کیا، یعنی خدا کی عبادت کی، اللہ تعالیٰ اُس کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیں گے۔ اور اس کی مہربانی شامل حال ہوگی فرمایا حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ یہ کیفیت غروب شمس سے لے کر طلوع فجر تک برابر جاری رہتی ہے۔ اور اس کے بعد یہ دور ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور بلند درجات حاصل کرے۔ یہ نزول وحی کی رات ہے۔ اور وحی ایک ایسی چیز ہے جس کے بغیر چارہ نہیں۔ تمام بنی نوع انسان اس کے محتاج ہیں۔ حقیقی راہنمائی اسی سے حاصل ہوتی ہے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سُورَةُ البَيِّنَة

درس اول (آیت ۱ تا ۴)

سُورَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانُ اٰيَاتٍ

سورۃ بینہ مدنی ہے اور یہ آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ
حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ① رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ②
فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ③ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ④

ترجمہ:۔ جن لوگوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر کیا باز آنے والے نہیں تھے یہاں تک کہ ان کے پاس واضح بات آجائے ① اللہ تعالیٰ کا وہ (عظیم الشان) رسول ہے جو کہ پاکیزہ صحیفے پڑھتا ہے ② ان میں مضبوط باتیں لکھی ہوئی ہیں ③ اور نہیں پھوٹ ڈالی ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس وہ واضح بات آگئی ④

نام اور کوائف اس سورۃ مبارکہ کے کئی نام ہیں۔ یہ سورۃ ہجرت کے بعد مدنی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی آٹھ ۸ آیتیں ہیں اور یہ سورۃ چورانوے ۹۴ الفاظ اور ایک سو چھیانوے ۱۹۶ حروف پر مشتمل ہے۔

مفسرین کرام اس کا نام سورۃ قیامت بھی ذکر کرتے ہیں۔ جیسا کہ تفسیر روح المعانی میں[1] ہے اور سورۃ بریّۃ بھی اور منفکین، سورۃ بیّنۃ بھی۔ لیکن بیّنۃ زیادہ مشہور ہے۔ اس لیے کہ اس سورۃ میں دو دفعہ بیّنۃ کا لفظ مذکور ہے۔

اور بیّنۃ واضح چیز کو کہتے ہیں۔ واضح دلیل یا واضح بات بینۃ کہلاتی ہے جیسا کہ

---

[1] روح المعانی ص ۲۰۰ ج ۳۰

قرآن کریم کی آیات کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بینات کا لفظ استعمال کیا۔ "مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى" واضح واضح باتیں اور ہدایت کی باتیں۔ "اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى" یہ بینات کا لفظ آتا ہے۔ اس سے مراد وہ واضح اصول ہیں جو بالکل واضح ہوں آسانی سے معلوم ہو سکتے ہوں۔ ہدایت، واضح باتیں، واضح قانون، واضح دلائل ان سب پر بینات کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور معجزات پر بھی بینات کا اطلاق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بینہ کا لفظ معجزہ پر بھی بولا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب دنیا میں تشریف لائے تو انہوں نے کہا "قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ" اے لوگو میں تمہارے پاس واضح نشانی لے کر آیا ہوں۔ واضح نشانی سے وہی معجزات مراد ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت صالح علیہ السلام کے واقعہ میں "بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ هٰذِهٖ" مذکور ہے۔ کہ انہوں نے لوگوں سے کہا تھا۔ اے لوگو! یہ اللہ کی اونٹنی ایک واضح نشانی ہے۔ اس سے تعرض نہ کرنا۔ اس کو اذیت نہ پہنچانا، ورنہ تم نقصان اٹھاؤ گے۔ معجزہ بھی ایک واضح چیز ہوتی ہے اس لیے بینہ کا اطلاق معجزات پر بھی ہوتا ہے۔ اور جو دلائل ہوتے ہیں ان پر بھی بینات کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور احکام پر بھی بینات کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے لیکن اس مقام میں بینہ کا لفظ جو بولا گیا ہے۔ اس کی تشریح اور تفصیل خاص طور پر خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ اس سورۃ میں بینہ اور واضح چیز سے مراد پیغمبر علیہ السلام کی ذات مبارکہ ہے۔ یہاں بینہ کا لفظ پیغمبر کی ذات کے اوپر بولا گیا ہے۔ پیغمبر کی ذات بھی اللہ تعالیٰ کی ایک واضح نشانی ہوتی ہے اور پھر خاتم الانبیاء علیہ السلام اور آپ کی ذات مبارکہ۔ تو یہاں پر جو دوسری دفعہ بینہ کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہے اس سے مراد پیغمبر علیہ السلام کا وجود مبارک اور آپ کی ہستی ہے۔

فضائل سورۃ

حدیث شریف میں اس سورۃ کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ یہ بڑی جامع اور مانع سورۃ ہے۔ اس میں باطل فرقوں کا رد بھی ہے۔ اور اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ بھی۔ ویسے بھی سورۃ اقرأ کے بعد آخر قرآن تک تمام سورتیں قرآن پاک کا مختصر طریقہ پر خلاصہ ہیں حضور علیہ السلام نے اپنے صحابی حضرت ابی بن کعب سے فرمایا۔ "اِنَّ رَبِّيْ عَزَّوَجَلَّ اَمَرَنِيْ اَنْ اَقْرَاَكَ هٰذِهِ السُّوْرَةَ"

لہ مسند احمد ج۳ ص۴۸۹ روح المعانی ج۳۰ ص۲۰۱ در منثور ص۳۷۷ ابن کثیر ج۴ ص۵۳۶

اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا پڑھا دوں۔ ابی بن کعب نے عرض کیا حضور! کیا اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی میرے متعلق فرمایا ہے آپ نے اثبات میں جواب دیا تو ابی بن کعب آبدیدہ ہو گئے کہ مجھ جیسے معمولی ہستی کے آدمی پر اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا احسان فرمایا۔ یہ ذکر حضرت ابی بن کعب کے فضائل کے سلسلے میں آتا ہے۔

بعض صحابہؓ کی خصوصیات

اب رہا یہ سوال کہ حضرت ابیؓ بن کعب کو اس منصب کے لیے کیوں منتخب کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا۔ اَقْرَأُهُمْ اُبَیُّ بْنُ کَعْبٍ یعنی میری امت میں سب سے بڑا قاری ابیؓ بن کعب ہے۔ گویا آپ تمام قاریوں کے سردار ہیں۔ اسی طرح مفسرین کے سردار عبداللہؓ بن عباس، سب سے بڑے قاضی حضرت علیؓ ہیں امت میں سب سے زیادہ حیادار حضرت عثمانؓ ہیں۔ خدا کے معاملے میں سب سے زیادہ سختی کرنے والے عمرؓ بن خطاب ہیں۔ سب سے زیادہ رحیم اور کریم حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں۔ حلال و حرام کو سب سے زیادہ بہتر جاننے والے حضرت معاذؓ بن جبل ہیں اور علم فرائض اور وراثت کو سب سے زیادہ جاننے والے حضرت زیدؓ ہیں۔ جس طرح ان صحابہؓ کرام کو مختلف امور میں خصوصیت حاصل تھی، اسی طرح حضرت ابیؓ بن کعب کو قرأت میں خصوصی مقام حاصل تھا۔ چنانچہ بذریعہ وحی اللہ تعالیٰ نے سورۃ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا آپ کو پڑھانے کا حکم دیا۔

گذشتہ سورتوں کے ساتھ ربط

سابقہ سورت میں فرمایا تھا کہ اس قرآن پاک کو ہم نے لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔ "اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ" ایک ایسی رات میں نازل کیا جو بڑی برکتوں والی اور عظیم رات ہے۔ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینے کی عبادت سے بڑھ کر ہے۔ اسی رات میں وحی الٰہی نازل ہوئی جس کی انسان کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اُس سے پہلی سورۃ علق میں انسان کی پیدائش کا ذکر کیا کہ انسان کو لہو کے لوتھڑے جیسی معمولی چیز سے پیدا کیا "خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ" اور پھر اسے زیور تعلیم سے آراستہ کیا "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" اور ذریعہ تعلیم قلم کو بنایا۔ پھر اسی تعلیم کی وجہ سے انسان کو بلند مراتب عطا کیے۔

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک مومن جو کامل طریقے پر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کی وحدانیت کو مانتے ہیں۔ قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ اسلام کے اساسی عقائد

ہیں۔ اور سورۃ وَالتِّیۡنِ میں بیان ہو چکے ہیں۔ چونکہ قرآن پاک کا موضوع ہی انسان ہے۔ اس لیے انسان سے ہی شروع کیا۔ اس کی بہتری کے لیے ہدایت کا سامان مہیا کیا۔ یہ قرآن پاک "ھُدًی لِّلنَّاسِ" یعنی بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے ہی نازل ہوا ہے۔ انسانوں کی دوسری قسم وہ ہے جو طاغی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کی وحدانیت کو نہیں مانتے۔ ان کے اندر نہ ایمان ہے اور نہ یہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں بلکہ وہ مومن کی اس حد تک مخالفت کرتے ہیں کہ اُسے نماز بھی نہیں پڑھنے دیتے۔ وہ لوگ تو قرآن پاک کی آواز تک سننا نہیں چاہتے۔ اسی لیے وہ مخالفت کرتے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے یہ بات بالکل ترتیب کے ساتھ بیان فرما دی کہ اُس نے انسان کو پیدا کیا اُس کی راہنمائی کے لیے وحی کا سلسلہ جاری کیا، کیونکہ انسان وحی الٰہی کا محتاج ہے۔ اس کے بغیر اس کی راہنمائی نہیں ہو سکتی۔ وہ علم کا محتاج ہے۔ اور علم کا حقیقی سرچشمہ بھی وحی الٰہی ہے باقی جتنے بھی ذرائع ہیں، حواس ہوں یا عقل، کوئی بھی یقینی اور قطعی نہیں ہے۔ قطعی ذریعہ علم صرف وحی ہے۔ اس طرح گویا ترتیب کے ساتھ وحی الٰہی کا ذکر آ گیا ہے۔

اسوۂ حسنہ کی ضرورت

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایک خاص بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کہ کوئی تعلیم کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو، جب تک اس کا نمونہ سامنے نہ ہو، کامیابی ممکن نہیں۔ عام بزرگانِ دین، حضرت دقاقؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ وغیرہ فرماتے ہیں اِنَّ الرَّجُلَ لَا یُفْلِحُ اِلَّا اِذَا رَأَى الْمُفْلِحِیْنَ مَنْ لَّا یَرٰی مُفْلِحًا لَا یُفْلِحُ جو کسی کامیاب کو نہیں دیکھتا۔ وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یعنی جب کوئی شخص اپنے سامنے نمونہ دیکھتا ہے۔ تو اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس وحی کے ذریعے قرآن پاک کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا۔ اس کی تعلیمات کے عملی نمونے کے لیے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مبعوث فرمایا۔ حضور علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ" یعنی حضور علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ امت کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

---

[1] القول الجمیل مع شرحہ شفاء العلیل صہ ۲۱

صحابہ کرامؓ نے اسی نمونہ کو اپنایا۔ ان کو دیکھ کر تابعینؒ نے اپنے آپ کو ڈھالا، اور پھر سلسلہ آگے تک چلا آرہا ہے۔ الغرض اس آیت میں بینہ کا جو لفظ آیا ہے اس سے مراد حضور نبی کریم علیہ السلام ہیں

ٹیگور کا اعتراف حقیقت

سید سلیمان ندویؒ ہمارے دور کے مؤرخ اور بڑے عالم گذرے ہیں۔ آپ شاہ اشرف علی تھانویؒ سے بیعت تھے۔ آخر میں آپ کا بھی بڑا فیض جاری ہوا۔ آپ نے سیرۃ النبی جیسی کتاب چار جلدوں میں مکمل کی۔ اصل میں اس کتاب کی ابتدا علامہ شبلیؒ نے کی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں صرف دو جلدیں مکمل کر کے باقی چار جلدیں سید سلیمان ندویؒ نے لکھیں۔ سیرت نبوی پر اعلیٰ درجے کی ضخیم کتاب ہے۔ تو سید صاحبؒ فرماتے ہیں۔ کہ ہم یورپ کے سفر سے آرہے تھے۔ مصر یا کسی اور جگہ کا واقعہ ہے۔ ہم جہاز میں سوار تھے۔ نوبل انعام یافتہ بنگالی ہندو فلاسفر ٹیگور بھی اسی جہاز میں سفر کر رہا تھا۔ اس سے بات چیت کا موقع مل گیا۔ تو سید سلیمان ندویؒ نے پوچھا۔ کہ آپ نے مختلف مذاہب کی اچھی اچھی باتیں چن چن کر برہمو سماجی مذہب بنایا ہوا ہے۔ مگر یہ مذہب دنیا میں پھیلا کیوں نہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ ٹیگور نے بڑا معقول جواب دیا۔ کہنے لگا ہمارے مذہب کے اصول تو بڑے اچھے ہیں مگر اس کے پیچھے کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اور مذہب ہمیشہ نمونے سے پھیلا کرتے ہیں۔

یہ وہی ٹیگور ہے۔ جسے ڈاکٹر اقبال کے مقابلے میں نوبل پرائز ملا تھا۔ علامہ اقبال کی پیش کردہ نظم زمان اور تخیل کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی نظم ہے۔ جو آج بھی بانگ درا کی پہلی نظم کے طور پر موجود ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں ہندو اور انگریز کی ملی بھگت کی وجہ سے علامہ اقبال کو محروم کیا گیا۔ ہندو نے انگریز کے ساتھ سازش کر کے ٹیگور کو انعام دلایا تھا۔ انگریز اسلام کے ساتھ نفرت رکھتا ہے۔ اور باطنی طور پر ہمیشہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔

ہر نبی اپنے دور کا بینہ ہوتا ہے

اس وقت دنیا میں اسلام ہی واحد مذہب ہے۔ جس کے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ موجود ہے۔ دیگر مذاہب والوں نے تو اپنے انبیاء کے نمونے بھی

لہ خطبات مدراس صفحہ ۱۹

بگاڑ دیے ہیں۔ عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا کر انسانیت سے خارج کر دیا۔ لہذا انہوں نے اپنا نمونہ بگاڑ دیا۔ اسی طرح یہودیوں نے بھی اپنے نبی کا نمونہ باقی نہ رکھا مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نمونے کے بغیر کوئی چیز ترقی نہیں کرتی، ہر دور کا نبی اپنے زمانے کا نمونہ ہوتا ہے۔ جسے دیکھ کر انقلاب برپا کیا جاتا ہے۔ یہی بینہ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے کسی نے پوچھا کہ حضور علیہ السلام کا اخلاق مبارک کیسا تھا۔ تو ام المومنین نے جواب دیا[1] فَاِنَّ خُلُقَ نَبِیِّ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم کَانَ الْقُرْاٰن کیا تم قرآن نہیں پڑھتے۔ عرض کیا پڑھتا ہوں تو فرمایا قرآن ہی حضور علیہ السلام کا اخلاق تھا۔ یعنی جو کچھ قرآن پاک میں مذکور ہے۔ اس کا عملی نمونہ حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ ہے۔ مقصد یہ کہ کوئی تعلیم خواہ کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو۔ جب تک اس کا عملی نمونہ سامنے نہ ہو، اس تعلیم کے مطابق انقلاب برپا کرنا ممکن نہیں۔

حضور علیہ السلام کے زمانہ میں مذاہب عالم

حضور علیہ السلام پر جب یہ سورۃ نازل ہوئی۔ اس زمانے میں جو مذاہب دنیا میں موجود تھے۔ ان میں یہود، نصاریٰ اور صابی تھے۔ صابی ستارہ پرست تھے اور تعداد میں نسبتاً کم تھے۔ صابیوں کو بعض[2] اہل کتاب میں شمار کرتے ہیں۔ اور بعض[3] مشرکوں میں۔ ان کے علاوہ مجوسیوں کا مذہب تھا۔ یہ لوگ ایران کے آتش پرست تھے اس زمانے میں آدھی دنیا ان کے زیر نگین تھی۔ باقی آدھی دنیا قیصر کے زیر اثر تھی۔ قیصر عیسائی اور کسریٰ مجوسی تھا۔ مجوسی آگ میں کرشمہ مانتے ہیں۔ اور اس کی عبادت کرتے ہیں۔ پانچواں فرقہ مشرکین عرب کا تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا متبع کہتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور ان کا اتباع کرتے ہیں۔

یہ پانچوں کے پانچوں باطل فرقے تھے۔ قرآن پاک میں ان پانچوں کا ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تمام کے تمام جس باطل عقیدے پر چل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درمیان قیامت کے روز قطعی فیصلہ کر دے گا۔ اب اس سورۃ مبارکہ کی ابتداء میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ان لوگوں کے حالات اتنے بگڑ چکے تھے۔ ان کے عقائد اتنے فاسد ہو چکے

---

[1] مسلم ص۲۵۶ ج۱ [2] [3]

تھے کہ کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ، کوئی حکیم، کوئی فلاسفر بھی ان کی اصلاح کی کوشش کرتا تو کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ضرورت تھی کہ کوئی عظیم المرتبت رسول آئے جو انکی اصلاح کرے۔

اتمام حجت اور اہل کتاب

ان باطل فرقوں میں مشرکین عرب ایسے لوگ تھے۔ جنہوں نے کفر و شرک کو ملت ابراہیمی بنایا ہوا تھا۔ ان کی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ جب تک کہ ان میں ایک بیّنہ نہ آئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کو بطور بیّنہ بھیج کر حجت تمام کر دی۔ ان میں سے اہل کتاب بڑے متعصب ثابت ہوئے۔ یہ بد بخت حضور علیہ السلام کی بعثت سے قبل آپ کی آمد کے منتظر تھے کہ وہ آخری نبی آنے والا ہے۔ جس کی پیش گوئی ابراہیم علیہ السلام نے کی۔ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام نے کی۔ بلکہ سارے نبیوں نے کی یہ لوگ اس نبی کے انتظار میں دعائیں مانگتے تھے کہ وہ آئے اور ہم اس کا ساتھ دیں۔ اس کی برکت سے ہمیں دوسرے لوگوں پر غلبہ حاصل ہو۔ "وَكَانُوا يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا" "ہم کافروں پر فتح حاصل کریں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا وہ رسول آ گیا، تو ان بدبختوں نے انکار کر دیا۔ مشرکین کا حشر تو یہ ہوا کہ کچھ مارے گئے، کچھ چلے گئے اور باقیوں نے اسلام قبول کر لیا۔ مگر مدینہ طیبہ اور اس کے اطراف میں یہودی اسی طرح ڈٹے رہے۔ یہودیوں کے دس بڑے عالم تھے ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر یہ دس آدمی مسلمان ہو جائیں، تو کوئی یہودی باقی نہ رہے سارے کے سارے اسلام قبول کر لیں۔ مگر ان دس اشخاص میں سے صرف ایک نے اسلام قبول کیا باقی تو یہودیت پر قائم رہے اور اسی باطل عقیدہ پر ان کا خاتمہ ہوا۔

اہل کتاب کی ضد اور عناد

اللہ تعالیٰ نے شکوے کے انداز میں فرمایا ہے کہ ان کے حالات اس قدر خراب تھے کہ کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی ان کی اصلاح نہ کر سکتا، یہ عظیم المرتبت رسول کے منتظر تھے مگر جب وہ نبی آخر الزماں آ گیا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اہل کتاب کا یہ انکار کسی شبہ کی بنا پر نہیں تھا انہیں اس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ کہ یہ وہی رسول برحق ہیں جن کا انتظار تھا۔ بلکہ ان کا انکار اور مخالفت محض ضد اور عناد کی بنا پر تھا۔ قرآن پاک نے اس بات کی تصدیق فرمائی ہے۔ "حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ" کہ یہ

لہ

محض حسد کی وجہ سے تھا کہ نبی ہماری قوم بنی اسرائیل میں سے کیوں نہیں آیا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ" اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کرتا ہے۔ یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کے حق میں ودیعت کی تھی۔ صرف بنی اسرائیل ہی اس کے ٹھیکدار نہ تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کو تو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ تیرے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ایک ہستی کو پیدا کروں گا، اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔ وہ فاران کی چوٹیوں سے ظاہر ہوگا، اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی، وہ دنیا کی قوموں سے محبت کرنے والا ہوگا[1] اللہ تعالیٰ نے یہ سارے اوصاف بتا دیے تھے۔ مگر ان لوگوں نے محض حسد اور سرکشی کی بنا پر انکار کیا ان یہودیوں کو چودہ سو سال کا عرصہ گذرنے کے بعد بھی یقین نہیں آیا۔ لہذا یہ آج بھی اسی طرح مخالفت پر کمربستہ ہیں۔

بینہ سے مراد رسول آخر الزمان ہیں

یہ بات قاعدہ کلیہ کے طور پر بتا دی کہ تعلیم خواہ کتنی بھی اچھی ہو، جب تک اس کے ساتھ عملی نمونہ موجود نہ ہو، صحیح نتیجہ پیدا نہیں ہو سکتا، قرآن پاک وحی کے ذریعے نازل ہوا یہ ایسی تعلیم ہے۔ جس کی بنی نوع انسان کو اشد ضرورت ہے۔ مگر ایسی اعلیٰ وارفع تعلیم سے بطور احسن مستفید ہونے کے لیے نمونہ کی ضرورت تھی۔ جو نبی آخر الزمان کی شکل میں آگیا تو فرمایا لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ جن لوگوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر کیا مُنْفَكِّيْنَ باز آنے والے نہیں تھے حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ یہاں تک کہ ان کے پاس واضح چیز آجائے۔ اس وقت تمام گروہ اپنی اپنی غلطی پر مغرور تھے۔ کوئی بڑے سے بڑا حکیم یا ولی یا عادل بھی آتا تو انہیں راہِ راست پر نہ لا سکتا انہیں ایک ایسی واضح چیز کی ضرورت تھی جو انہیں راہ راست پر لے آتی۔ اور یہ واضح چیز یا بینہ کیا ہے رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ اللہ کا وہ عظیم الشان اور عالی مرتبہ رسول ہے۔ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً" پاکیزہ صحیفے پڑھتا ہے۔ قرآن پاک کی ہر سورۃ ایک صحیفہ ہے۔ کل

---

[1] ے

ایک[4] سو چودہ میں سے ہر سورۃ میں ایک ایسا پروگرام ہے جس پر عمل کرنے سے فلاح نصیب ہو جاتی ہے۔ ان میں ایسی پاکیزہ تعلیمات موجود ہیں۔ پھر ان صحیفوں میں کیا ہے فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ان میں مضبوط باتیں لکھی ہوئی ہیں یعنی ایسے ایسے مضبوط قوانین ان میں درج ہیں جو کبھی نہیں ٹوٹتے کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے قائم کردہ اصول ہیں۔ ازلی اور ابدی اصول ہیں۔ وہ ٹوٹنے والے اصول نہیں ہیں۔

اہل کتاب کی فرقہ بندی

یہ بات بیان کرنے کے بعد کہ اہل کتاب اور مشرکین باز آنے والے نہ تھے یہاں تک کہ انکے پاس بینہ آ جائے۔ ان کے متعلق مزید تفصیل میں فرمایا وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ نہیں تفرقہ کیا یا نہیں پھوٹ ڈالی ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ مگر واضح بات آجانے کے بعد۔ جب ان کے پاس بینہ یعنی اللہ کا رسول آگیا تو ان میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بعض نے تسلیم کر لیا اور باقیوں نے انکار کیا۔ مگر اے اہل کتاب "أَنَّ أَكْثَرَكُمْ فَاسِقُونَ" تم میں سے اکثر فاسق ہیں۔ جنہوں نے تفرقہ کیا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے یہ بات اشارۃً سمجھا دی کہ پہلے یہود و نصاریٰ کے بہتر[72] فرقے بنے اور میری امت کے تہتر[73] فرقے ہوں گے۔ جن میں سے صرف ایک ناجی ہوگا، باقی سب آگ میں جائیں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ ناجی فرقہ کون ہوگا، آپ نے ارشاد فرمایا[1] مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي ناجی فرقہ وہ ہوگا جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقے پر ہوگا۔ باقی سب دوزخی ہوں گے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے انکار کے وجوہ بیان فرمائے ہیں۔ کہ اُن کا انکار غلط تھا کیونکہ نبی کسی نئی بات کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ ہر نبی کی تعلیم وہی ہوتی ہے، جو اس سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام دیتے آئے ہیں۔

---

[1] ترمذی ص ۳۷۹

درس دوم (آیت ۵ تا ۸)

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ۬ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۭ ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۭ ﴿۶﴾
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۭ ﴿۷﴾
جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴿۸﴾ ع ۱ ۸ ۲۴

ترجمہ: اور ان لوگوں کو صرف اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اس حالت میں کہ اس کے لیے اطاعت کو خالص کرنے والے ہوں حنیف بن جائیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور دین قیم یہی ہے ﴿۵﴾ بے شک جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا خواہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکوں میں سے ان کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہیں گے یہ لوگ بدترین مخلوق ہیں ﴿۶﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیئے یہ لوگ بہترین مخلوق ہیں ﴿۷﴾ ان کے پروردگار کے ہاں ان کا بدلہ رہنے کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان میں رہیں گے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے یہ سب کچھ اس کے لیے ہے جو اپنے پروردگار سے ڈرتا ہے ﴿۸﴾

گزشتہ سے پیوستہ

اس سورۃ مبارکہ کے ابتدائی حصے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بینہ کے لقب سے ملقب حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اہل کتاب اور مشرکوں کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ وہ اپنے فاسد عقائد اور باطل مذاہب سے باز آنے والے نہیں تھے۔ یہاں تک کہ ان کے پاس بینہ یعنی اللہ کا وہ عظیم الشان رسول آ جائے جو پاک صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے قرآن کریم کی ہر سورۃ ایک مقدس صحیفہ ہے۔ جس میں مضبوط

اصول لکھے ہوئے ہیں۔ مگر جب وہ بیّنہ آگیا اور خدا تعالیٰ کی حجت تمام ہوگئی، تو اہل کتاب تفرقہ میں پڑ گئے۔ روح المعانی والے مفسر فرماتے ہیں[1] کہ تفرقے کا مطلب یہ ہے۔ بہت تھوڑے لوگ ایمان لائے، جب کہ ان کی اکثریت باطل عقیدے پر قائم رہی۔ یہ لوگ آج تک اپنی اسی ہٹ دھرمی پر اڑے ہوئے ہیں۔ برخلاف اس کے مشرکین کی ایک قلیل تعداد نے مقابلہ کیا اور ختم ہوگئے، مگر ان کی اکثریت نے ایمان قبول کر لیا۔

اہل کتاب کی بلاوجہ مخالفت

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ نے قرآن پاک کے پروگرام کی کیوں مخالفت کی۔ کیا نبی آخر الزمان نے کوئی نیا پروگرام پیش کیا تھا۔ جو انہیں راس نہ آیا۔ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ تو وہی مشترکہ بات پیش کرتے ہیں۔ جو سارے نبیوں کا مشترک نقطہ نگاہ رہا ہے۔ اصل بات یہ ہے وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ ان لوگوں کو تو صرف اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اس حالت میں کہ اس کے لیے اطاعت اور بندگی کو خالص کرنے والے ہوں اور حُنَفَآءَ اور حنیف بن جائیں۔ حنیف ابراہیم علیہ السلام کا لقب تھا۔ مطلب یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خالص اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کریں وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اور نماز قائم کریں وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ اور زکوٰۃ ادا کریں وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ دین قیم کے اصول یہی ہیں۔ کہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ حنیف بن جائیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تمام سابقہ انبیاء کرام یہی دین پیش کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ اہل کتاب کی مخالفت ان اصولوں میں کسی شبہ کی بنا پر نہیں بلکہ محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے اور جس کا کوئی علاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر اس ضد کے لیے "بَغْيًا" کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی اہل کتاب سرکشی اور حسد کی وجہ سے حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ورنہ مخالفت کی کوئی اور معقول وجہ نہیں ہے۔

اخلاص فی العبادت

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو پروگرام پیش کیا، وہ ملت ابراہیمی کا پروگرام ہے۔ اور

---

[1] روح المعانی صـ ۲۰۲ تا ۲۰۴ ج ۳۰

اس پروگرام کی بنیادی بات یہ ہے۔ کہ خالص اللہ کی عبادت کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ غلامی صرف خدا تعالیٰ کی اختیار کرو کسی دوسرے کی غلامی روا نہیں۔ غلامی عبادت ہی کا دوسرا نام ہے جو صرف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے۔

امام ابوبکر حصاصؒ فرماتے ہیںؒ کہ اخلاص فی العبادت اس وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب انسان کا عقیدہ شرک سے پاک ہو۔ اگر عقیدے میں شرک کی ملاوٹ ہو گی تو عبادت خالص نہیں ہو گی۔ شرک سے پاکیزگی ضروری ہے۔ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ کا یہی مطلب ہے۔

حنیف کا معنی

اس آیت میں حُنَفَآءَ کا جو لفظ آیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے۔ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ مُشْرِكِیْنَ یعنی خالص اللہ کی عبادت کرنے والے بن جاؤ، شرک کرنے والے نہ بنو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے فرمایا تھا اور حضور علیہ السلام بھی یہی ارشاد فرما رہے ہیں کہ حنیف بن جاؤ۔ حنیف دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب تھا۔ اور معنی اس کا یہ ہے کہ ہر طرف سے توجہ ہٹا کر صرف ایک خدا کی طرف متوجہ ہوتا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتےؒ ہیں۔ کہ حنیف اُسے کہا جاتا ہے۔ جو اللہ کی توحید کا قائل ہو۔ بیت اللہ شریف کا حج کرنے والا ہو۔ نماز میں بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے والا ہو، ختنہ کرنے والا ہو، اور نماز پڑھنے والا ہو۔ یہی توحید کا مقام ہے اور ایسے ہی انسان کو حنیف کہا جاتا ہے۔

نماز اور زکوٰۃ

جب کوئی انسان حنیف بن جائے اُسے اخلاص فی العبادت نصیب ہو جائے، تو اس کے بعد حکم ہے وَيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ نماز قائم کرو۔ بدنی عبادات میں نماز سر فہرست ہے اور یہ ام العبادات المقربہ یعنی قرب الٰہی دلانے والی عبادتوں میں نماز پہلے نمبر پر ہے نماز خدا پرستی کی نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ" یعنی اگر یہ لوگ تائب ہو جائیں۔ نماز ادا کرنے لگیں، زکوٰۃ کی ادائیگی شروع کر دیں تو یہ تمہارے بھائی ہیں دوسری جگہ فرمایا "فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ" یعنی ایمان کا راستہ پکڑ لیں۔ تو ان سے جھگڑا ختم

۱؎ احکام القرآن ص۴۷۴ ج۳ ۲؎ فتح الرحمان ص۱۷ زیر آیت سورۃ آل عمران آیت ۶۷

ہو گیا، ان کے ساتھ کوئی جنگ نہیں۔ یہ تمہارے دینی بھائی بن گئے۔ تم سب کا عقیدہ ایک ہو گیا۔

یہاں پہ نماز اور زکوٰۃ کا بطورِ خاص ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سے نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ گویا اخلاص فی العبادت کے بعد مالی اور بدنی عبادتوں میں سب سے اہم نماز اور زکوٰۃ ہیں۔ انہیں عبادات سے آدمی کی پہچان ہوتی ہے۔ اگر نماز پڑھتا ہے اور زکوٰۃ دیتا ہے تو یہ ہماری جماعت کا آدمی ہے۔ ہماری پارٹی کا ممبر ہے۔ اگر کسی میں نماز و زکوٰۃ کی علامات نہیں پائی جاتیں، تو وہ جماعت المسلمین کا ممبر نہیں سمجھا جائیگا۔

عقیدے کی پاکیزگی

الغرض! فرمایا کہ اہلِ کتاب کی مخالفت کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کے رسول نے تو انہیں تمام انبیاء علیہم السلام کے پیش کردہ مشترکہ اصول بتائے ہیں۔ کہ حنیف بن جاؤ۔ تمہارے اعمال اور اعتقاد میں کسی قسم کی شرک کی ملاوٹ نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ عقیدے کی پاکیزگی فلاح کی اولین شرط ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ جب تک شرک کی گندگی دور نہ ہو، قرآن پاک کی تعلیمات اور پیغمبر علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا فرماتے ہیں کہ اس کی مثال یوں سمجھو کہ جس شخص کو کوئی شدید بیماری لاحق ہو، اسے اچھی سے اچھی غذا بھی مفید نہیں ہوگی۔ اور اگر صحت اچھی ہے تو صالح غذا سے بڑے اچھے نتائج مرتب ہوں گے۔ توانائی آئے گی۔ افعال ٹھیک ہوں گے، فرماتے ہیں کہ اسی طرح قرآن پاک اور نبی علیہ السلام کی ذات اس وقت تک مفید نہیں ہوگی، جب تک انسان کی روحانی بیماری دور نہ ہو، قرآن پاک اور پیغمبر علیہ السلام سے فیض حاصل کرنے کے لیے عقیدے کی درستگی ضروری ہے۔

اہلِ کتاب بدترین مخلوق ہیں

ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ یاد رکھو! جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، خواہ وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکوں میں سے، یہودی ہوں یا نصاریٰ، عرب کے مشرک ہوں یا کسی دوسرے علاقے کے مشرک فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صـ۲۳۳ پارہ ۳۰۔

ان کا ٹھکانا دوزخ کی آگ ہے۔ اور وہاں کسی خاص عرصہ کے لیے داخل نہیں کیے جائیں گے بلکہ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔ اور اس لحاظ سے اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ وہ خدا کی مخلوق میں سے بدترین مخلوق ہیں انہی لوگوں کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا "اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ" وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین جانور ہیں بہرے اور گونگے ہیں۔ جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ ان لوگوں کے بدترین مخلوق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کو اللہ کے حکم پر مقدم رکھتے ہیں۔ ان میں حسد، خودغرضی اور سرکشی پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ادھر حکم ہو رہا ہے۔ کہ حنیف بن جاؤ مگر یہ اپنی خواہشات کو اس حکم پر مقدم رکھتے ہیں حالانکہ کوئی جانور یا موذی درندہ بھی خواہش نفسانی کو حکم الٰہی پر مقدم نہیں رکھتا۔ لہٰذا یہ انسان ہوتے ہوئے بھی دیگر مخلوق سے بدتر ہیں۔

مومنین بہترین مخلوق ہیں

اس کے مقابل فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ ایمان لائے۔ کہ ایمان سب سے پہلی منزل ہے۔ اور اس کے بعد وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ نیک اعمال انجام دیے۔ ایمان کے ساتھ نیک اعمال کی شرط لگائی گئی ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا "وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ" جو شخص نیک اعمال انجام دے۔ بشرطیکہ وہ ایماندار ہو۔ کیونکہ نیکی ایمان پر معتبر ہوگی۔ جو لوگ ایمان سے خالی ہوں گے، قیامت کے دن ان کی پہاڑ جتنی نیکیاں بھی رائیگاں جائیں گی۔ کچھ فائدہ نہیں دیں گی۔ تو فرمایا کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ وہ ساری مخلوق میں بہترین گروہ ہے وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نفسانی خواہشات کو حکم الٰہی کے تابع بنایا۔ اس کی وحدانیت کو دل وجان سے تسلیم کیا اور حنیف بن گئے انہوں نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی لہٰذا اللہ کی بہترین مخلوق ٹھہرے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ دنیوی اعتبار سے کافر اور مشرک خواہ کتنے

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۳۶/۲۰۷

بھی عروج پر ہوں، قرآن پاک کہتا ہے۔ کہ یہ جہنم کے کندۂ ناتراش ہیں۔ خدا کی مخلوق میں سے بدترین مخلوق ہیں۔ روسی ہوں یا امریکی، جرمن ہوں یا چینی، انگریز ہوں یا ہندو قرآن پاک کے نزدیک شَرُّ الْبَرِیَّۃِ ہیں۔ یعنی جانوروں، درندوں حتیٰ کہ کیڑے مکوڑوں تک سے بدتر ہیں۔ یہ لوگ خواہ آسمان پہ چلے جائیں، چاند کی تسخیر کر لیں۔ دنیوی ترقی کے بام عروج پہ پہنچ جائیں۔ مگر ایمان سے بے بہرہ ہونے کی بنا پہ بدترین مخلوق ہی رہیں گے۔

رضائے الٰہی

بر خلاف اس کے مؤمنین کے متعلق فرمایا جَزَآؤُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ خدا تعالیٰ کے ہاں ان کا بدلہ جنت ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس جنت میں رہیں گے۔ کیونکہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہوگیا۔ اُس نے ان کے ایمان اور اعمال صالحہ سے خوش ہو کر جنت عطا کی ہے۔ قرآن پاک میں دوسرے مقام پر موجود ہے وَاِنْ تَشْکُرُوْا یَرْضَہُ لَکُمْ اگر تم ایمان لے آؤ، تو خدا تعالیٰ راضی ہوتے ہیں۔ وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ اللہ تعالیٰ تو ایمان پر راضی ہوتا ہے، معصیت، شرک اور بغاوت سے ناراض ہو جاتا ہے۔

بندوں کی رضا

فرمایا ایمان والوں کو جنت میں داخل کر کے صرف اللہ ہی اُن سے راضی نہیں ہوگا بلکہ وَرَضُوْا عَنْہُ وہ بھی اللہ سے راضی ہو جائیں گے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے راضی ہو جانا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر بندوں کا اللہ کریم سے راضی ہونے کا کیا مطلب ہے۔ بخاری اور مسلم شریف کی حدیث میں آتا ہے[2]۔ کہ جب مومن لوگ بہشت میں پہنچ جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے جنت والو! کیا تم راضی ہو؟ بندے تعجب سے عرض کریں گے مولا کریم! کیا وجہ ہے کہ ہم راضی نہ ہوں۔ تو نے ہم پر بڑے احسان کیے بے شمار نعمتوں سے نوازا، ہمارے چہرے روشن بنائے، ہم راضی کیوں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میرے بندو! میں تمہیں کچھ اور بھی دینا چاہتا ہوں۔ لوگ تعجب کریں گے کہ اور

---

[1] روح المعانی صفحہ ۲۰۳ ج ۳۰، معالم التنزیل صفحہ ۲۴۶ ج ۴ [2] بخاری صفحہ ۱۱۲۱ ج ۲، مسلم صفحہ ۲۷۸ ج ۲۶۰

کیا چیز ملنے والی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِيْ فَلَا اَسْخَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهٗ اَبَدًا میں تمہیں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ آئندہ میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ لہٰذا اس موقع پہ بندے بہت زیادہ خوش ہو جائیں گے، اسی کو کہا گیا ہے وَرَضُوْا عَنْهُ کہ بندے بھی اپنے پروردگار سے راضی ہو جائیں گے۔ انہیں تمام تر انعامات کے علاوہ خدا تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو جائے گی جس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" اللہ کی تو چھوٹی سی رضامندی بھی ہر چیز سے بڑی ہے۔ چہ جائیکہ اتنی بڑی رضامندی حاصل ہو جائے۔ کہ اللہ تعالیٰ خود فرمائے میں آئندہ تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ اللہ تعالیٰ سے بندوں کی رضا کا یہی مطلب ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی توحید پہ راضی ہونا تو بندے پہ فرض ہے۔ جو بندہ ناراض ہوگا وہ مردود ہو جائے گا۔

خَيْرُ الْبَرِيَّة کون ہیں

مسند احمد کی حدیث[۱] میں آتا ہے کہ کفر اور شرک والے شَرُّ الْبَرِيَّة ہیں ایمان اور نیکی والے خَيْرُ الْبَرِيَّة ہیں۔ ایک موقع پر حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ خیر البریہ کون ہیں؟ فرمایا دیکھو! جو آدمی ہر وقت مستعد رہتا ہے۔ کہ جہاد کا موقع آئے تو جہاد میں شریک ہو جاؤں۔ وہ پہلے نمبر کا خیر البریہ ہے۔ جوں ہی کوئی خطرہ محسوس کیا۔ فوراً جنگ کے لیے کمربستہ ہو گیا۔ فرمایا دوسرے نمبر کا خیر البریہ وہ شخص ہے کہ اگر وہ کہیں جنگل میں ہے، یا بکریوں کے ریوڑ میں ہے۔ مگر نماز کا وقت آتا ہے تو وقت پہ نماز ادا کرتا ہے اور زکوٰۃ بھی دیتا ہے اللہ کے نزدیک یہ بھی خیر البریہ ہے۔

شر البریہ کون ہیں

پھر نبی علیہ السلام نے فرمایا، آؤ میں تم کو نہ بتلاؤں کہ شر البریہ کون ہیں؟ فرمایا شر البریہ میں بہت سے لوگ شامل ہیں جن میں کافر اور مشرک ہیں اور مخلوق خدا میں اور لوگ بھی ہیں تاہم وہ شخص بھی شر البریہ ہے۔ جو اللہ کا نام لے کر مانگتا ہے۔ مگر اس کو ملتا کچھ نہیں۔ خدا کے نام کی بھی کوئی عزت اور قدر نہیں کرتا۔ یہ شخص اس لیے شر البریہ میں داخل ہے۔ کہ اس نے خدا کے نام کی خود بے قدری کی۔ کیونکہ اس کے نام کو ایسے موقع پہ پیش کیا، جب کسی نے پرواہ نہ کی۔ اسی لیے خدا کا نام لے کر مانگنے سے منع کیا گیا ہے۔

---

[۱] [illegible]

خشیت الٰہی

فرمایا خیر البریہ ایمان اور نیکی والے لوگ ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغات ہیں۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ خدا اُن سے راضی ہو گا، اور وہ اپنے رب سے راضی ہوں گے۔ جو انہیں بے حد و بے شمار انعامات سے نوازے گا ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ یہ سب کچھ اُس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے جس کے اندر خشیت الٰہی ہو گی۔ حقیقت میں یہی تریاق ہے۔ اور یہی کامیابی کی نشانی ہے کہ اُس کے دِل میں خوفِ خدا پیدا ہو جائے۔ جب خوف پیدا ہو گا، تو ایسا شخص ایمان بھی درست کرے گا اور نیک کام بھی انجام دے گا۔ وہ ہمیشہ اس خوف میں مبتلا رہے گا، کہ اس کے ایمان میں کوئی خرابی نہ آجائے، کہیں وہ گرفت میں نہ آجائے کہیں وہ خدا تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی سے محروم نہ ہو جائے۔ یہی وہ خشیت الٰہی ہے جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی توجہ مبذول کرائی تھی اور کہا تھا۔ "وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى" آؤ میں تمہارے رب کی طرف تمہاری راہنمائی کروں تاکہ تمہارے اندر اُس کی خشیت پیدا ہو جائے۔ خشیت الٰہی کا پیدا ہونا بہت بڑی بات ہے۔ برائی سے بچنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

سورة الزلزال

عمّ ۳۰ — الزلزال ۹۹

درس — (مکمل سورۃ)

سُوْرَۃُ الزِّلْزَالِ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ ثَمَانُ اٰیَاتٍ

سورۃ زلزال مدنی ہے اور یہ آٹھ ۸ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ⓪

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ① وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ② وَ
قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ③ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ④ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى
لَهَا ⑤ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ⑥
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ⑦ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا
يَّرَهٗ ⑧ ع

۱/۸ ع ۲۴

ترجمہ:۔ جب ہلا دی جائے گی زمین اس کا ہلایا جانا ① اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی ② اور انسان کہے گا کہ اس زمین کو کیا ہو گیا ہے ③ اس دن زمین اپنی خبریں ظاہر کرے گی ④ اس وجہ سے کہ بے شک تیرے رب نے اس کو اشارہ کر دیا ہے ⑤ اس دن لوگ گروہ گروہ ہو جائیں گے تاکہ ان لوگوں کو ان کے اعمال (کے نتائج) دکھلائے جائیں ⑥ جس کسی نے ایک ذرے کے برابر بھی نیکی کا کام کیا ہو گا وہ اسے دیکھ لے گا۔ ⑦ اور جس کسی نے ایک ذرے کے برابر بھی برائی کا کام کیا ہو گا۔ وہ اسے دیکھ لیگا ⑧

نام اور کوائف اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ زلزال ہے۔ پہلی آیت میں زلزال کا لفظ آیا ہے۔ اسی سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔ یہ سورۃ مدنی زندگی میں نازل ہوئی، اس کی آٹھ آیات ہیں یہ سورۃ ترپن ۵۳ الفاظ اور ایک سو انچاس ۱۴۹ حروف پر مشتمل ہے۔

موضوع اس سورۃ کا موضوع جزائے عمل ہے اگرچہ سورۃ تو مختصر ہے تاہم موضوع کے لحاظ سے جامع اور مانع سورۃ ہے۔ اس سورۃ میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے۔

کہ جو کچھ بھی اعمال اس دنیا میں کرتا ہے اُن کی جزا لازم ہے۔ جس طرح انسان کوئی چیز کھاتا ہے تو اس کے نتیجے میں بدہضمی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان جو عمل کرتا ہے۔ اُس کے ساتھ اُس کی جزا بھی لازم ہے، جس طرح پیدائش کے ساتھ موت لازم ہے اور جس طرح طلوع کے ساتھ غروب لازم ہے۔ ایسے ہی عمل کے ساتھ جزائے عمل کا ہونا ضروری ہے۔ اس سورۃ مبارکہ میں یہی بات سمجھائی گئی ہے۔

فضیلت

حدیث پاک[1] میں اس سورۃ کی بہت فضیلت آئی ہے۔ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا۔ کہ حضور! مجھے قرآن کریم کا کچھ حصہ پڑھائیں آپ نے صحابہؓ سے فرمایا، اس شخص کو ذوات الرا سورتوں میں سے کوئی سورۃ پڑھا دیں۔ اس نے عرض کیا، حضور! میں بوڑھا ہو گیا ہوں، زبان ٹھیک نہیں چلتی، حافظہ بھی کمزور ہے آپ نے فرمایا ذوات حٰمٓ سورتوں میں سے اس کو پڑھا دو اُس نے پھر عرض کیا حضرت! یہ بھی لمبی سورتیں ہیں۔ چنانچہ آپ نے آٹھ آیات والی یہ سورۃ مبارکہ اس کو پڑھائی۔ وہ شخص کہنے لگا بخدا! میں اس پر کاربند رہوں گا اور اس پر عمل کرتا رہوں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ یہ آدمی سمجھدار ہو گیا ہے۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے۔ جب سورۃ کے آخر پر پہنچے تو اس شخص نے پھر کہا کہ میں اس کے مطابق عمل کروں گا۔ تو حضور علیہ السلام نے دوبارہ ارشاد فرمایا کہ اس کو دین میں سمجھ حاصل ہو چکی ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی[2] ہے اِذَا زُلْزِلَتْ تَعْدِلُ نِصْفَ الْقُرْاٰنِ یعنی سورۃ زلزال نصف قرآن کے برابر ہے۔ یعنی آٹھ آیتوں کی یہ چھوٹی سی سورۃ اجر و ثواب کے لحاظ سے نصف قرآن کے برابر ہے۔ فرمایا انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ دنیوی زندگی اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔ اور دوسرا حصہ آخرت اور اس کے متعلقات پر اس سورۃ مبارکہ میں آخرت کا حصہ سمجھایا گیا ہے۔ لہٰذا یہ نصف قرآن کے برابر ہے اسی طرح بعض دیگر سورتوں کے فضائل بھی آئے ہیں۔ مثلاً سُوْرَۃ کافرون

---

[1] مستدرک حاکم ص۵۳۲ ج۲، درمنثور ص۳۷۹ ج۶، [2] ترمذی ص۴۱۱، درمنثور ص۳۸۳ ج۶

کو ربع قرآن کے برابر کہا گیا سورۃ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کو ثلث قرآن کے برابر کہا گیا ہے[1]۔
قرآن پاک کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ احکام ہیں، دوسرا حصہ واقعات اور تیسرا حصہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ سورۃ اخلاص میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان ہوئی ہیں۔ لہٰذا اسے قرآن پاک کے تیسرے حصے کے برابر قرار دیا گیا ہے

موضوع کے لحاظ سے سورۃ زلزال کو اگرچہ نصف قرآن کہا گیا ہے۔ تاہم اس سورۃ کی آخری آیت نہایت ہی جامع اور مانع ہے۔ اور انسان کے تمام اعمال پر محیط ہے۔ کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ط وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔

سابقہ سورتوں کے ساتھ ربط

پہلی سورتوں میں بتایا گیا ہے۔ کہ قرآن کا موضوع انسان ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ اِقْرَاْ میں انسان کی تخلیق کا ذکر کیا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ دنیا میں انسان دو قسم کے ہیں ایک مومن ہیں، دوسرے طاغی ہیں۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ دنیا میں انسان محض عقل کے بل بوتے پر کامیاب زندگی نہیں بسر کر سکتے بلکہ وہ سب وحی الٰہی کے محتاج ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۃ قدر میں قرآن کریم اور وحی الٰہی کا ذکر فرمایا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے تاکہ اس سے انسان راہنمائی حاصل کر سکیں اس کے بعد سورۃ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ تعلیم کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو جب تک اس کا عملی نمونہ موجود نہ ہو۔ انسان کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عملی نمونے کا اتباع کر کے ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ خداوند کریم نے قرآن پاک کے خلاصہ اور نچوڑ کو نبی کریم علیہ السلام کی ذات مبارکہ میں جمع کر کے البینہ یعنی ایک واضح نشانی کی شکل میں مبعوث فرمایا۔ کہ اس نمونے کو اختیار کر کے حنیف بن جائیں۔ کفر و شرک سے باز رہیں۔ بدنی اور مالی عبادت انجام دیتے رہیں اور خدا کا خوف اپنے دل میں رکھیں تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔

الٰہی نظام کی برکات

سورۃ البینہ میں بیان کردہ الٰہی نظام قرآن پاک کا نظام ہے۔ اس کی تکمیل سے

---

[1] ترمذی ص۴۱۱

لیے اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو عملی نمونہ کے طور پر بھیجا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نظام آج سے چودہ سو سال قبل متعین کیا۔ بلکہ اگر حضور علیہ السلام کی مکی زندگی کے تیرہ سال بھی شمار کیے جائیں تو چودہ سو تیرہ سال قبل اللہ تعالیٰ نے نظام متشکل کر کے دنیا میں جاری کر دیا۔ یہ ایک ایسا نظام ہے کہ جو شخص بھی اسے سمجھتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہو گی کہ اس نظام کو آگے چلایا جائے۔ اور اس کام کے لیے وہ جماعت تیار کرے گا۔ ایسا شخص کسی گاؤں میں ہو یا شہر میں جماعت قائم کرنے کی کوشش کرے گا۔ تاکہ یہ کام جماعتی طور پر انجام دیا جا سکے۔ انہی چیزوں کی بجا آوری کے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ جماعت کو لازم پکڑو، اس سے علیحدگی اختیار نہ کرو۔ کیونکہ جو شخص جماعت سے علیحدہ ہو گیا، اس کی مثال اس بکری کی ہے۔ جو اپنے ریوڑ سے الگ ہو جائے اور اُسے بھیڑیا کھا جائے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر جماعت سے الگ ہو جاؤ گے تو شیطان تمہیں گمراہ کر دے گا۔ اگر جماعت کے ساتھ وابستہ رہو گے تو بچے رہو گے۔

اب دیکھئے اگر کوئی شہر میں رہتا ہے۔ تو وہ نظام الٰہی کے مطابق جماعت بنا کر سب سے پہلے اپنے محلے کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے گا۔ جب اس میں کامیابی حاصل کر لے گا، تو اس کی خواہش ہو گی کہ سارے شہر کی اصلاح ہو جائے۔ الٰہی نظام کا یہ خاصہ ہے۔ کہ کوئی شخص انفرادی طور پر ٹھیک نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اس کی کوشش ہو گی کہ اس کے ساتھی بھی ٹھیک ہوں، لہٰذا وہ اپنے ماحول کی اصلاح کی کوشش کرے گا۔ ان اجتماعی مساعی کی بدولت جب شہر کا ماحول درست ہو گا۔ تو پھر اس کی خواہش ہو گی کہ پورے ملک کی حالت درست ہو۔ اگر شہر سے باہر کا ماحول درست نہیں ہو گا، تو وہ شہر کی فضا کو بھی مکدر کر دے گا۔ لہٰذا وہ پورے ملک کی اصلاح کی کوشش کرے گا۔

اسی طرح جب پورا ملک صحیح ہو جائے گا۔ تو لامحالہ یہ خیال پیدا ہو گا۔ کہ بیرون ملک کے بُرے اثرات کہیں ملکی فضا کو خراب نہ کر دیں۔ لہٰذا دوسرے ممالک بھی ٹھیک ہونے چاہئیں۔ لہٰذا وہ دوسرے ملکوں کی اصلاح کے پروگرام بنائے گا۔ اور اس طرح یہ الٰہی نظام

۱؎ مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۴۳، ترمذی صفحہ ۳۱۵

پوری دنیا میں رائج ہو جائے گا۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مختلف ممالک کے اثرات دوسرے ملکوں میں کس طرح پڑتے ہیں۔ آج کی دنیا کا غالب نظام خواہ وہ امریکی ہو یا برطانوی یا روسی، وہ دوسرے ممالک کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ امریکی اور برطانوی نظام دو سو یا چار سو سال سے غالب ہیں۔ اب روسی نظام بھی غالب آرہا ہے۔ یہ نظام جہاں بھی جائیں گے، تباہی کا سبب بنیں گے۔ یہ خلاف اس کے جب الٰہی نظام قائم ہوا تو لوگ اسے لے کر پوری مستعدی کے ساتھ آگے بڑھے۔ تاکہ لوگ اس اجتماعی پروگرام سے فیض یاب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس پروگرام میں خاص برکت رکھی ہے۔ کہ اس کو ماننے والے اس کی ترویج کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے۔ کہ اس دور میں اس نظام کو ماننے والے کمزور ہیں، ان کو سمجھ ہی نہیں کہ یہ نظام کیا ہے۔ انہیں اس نظام کی تعلیم ہی نہیں دی جاتی۔ نتیجہ یہ ہے۔ کہ ان پر بیرونی اثرات حاوی ہیں جو انکی اصلاح میں حائل ہیں۔ حقیقت میں ہم نے اس نظام کو ترک کر دیا ہے۔ پہلے لوگ سمجھتے تھے کہ صرف عرب کی اصلاح کافی نہیں جب تک دوسرے ملک بھی درست نہ ہوں۔ اگر دوسرے ممالک کی اصلاح نہ ہوئی، تو عرب بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ لہٰذا وہ نظام الٰہی کو لے کر آگے بڑھے اور اس میں کامیاب ہوئے۔

جزائے عمل کب واقع ہوگی

درحقیقت یہ علت اور معلول کا سلسلہ ہے۔ قرآن پاک نے جزائے عمل کے مسئلے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تاکہ لوگ اپنے اعمال سے خبردار رہیں۔ کہ ان کے عمل کے ایک ایک ذرے کا نتیجہ سامنے آئے گا۔ پچھلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا "جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" دنیا میں انقلاب برپا کرنے والے ایماندار لوگوں کے لیے ان کے رب کے پاس آخرت میں بہشت ہے، جو انہیں نصیب ہوگی۔ اور اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی رضا نصیب ہوگی۔ جو بہت بڑی چیز ہے۔

جب زمین ہلا دی جائے گی

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جزائے عمل کب واقع ہوگی تو فرمایا اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا جب ہلا دی جائے گی زمین، اس کا ہلایا جانا۔ مطلب یہ کہ جزائے عمل اس وقت واقع ہوگی، جب زمین کو زور سے ہلا دیا جائے گا۔ اس پر زلزلہ طاری کر دیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس زمین پر رہائش ایک خاص وقت تک کے لیے ہے۔ اور یہ اس وقت تک ہے، جب تک انسانوں میں صلاحیت موجود ہے۔ جب صلاحیت کمزور ہو جائے گی، تو انسان زمین پر نہیں رہ سکے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1] کہ جب زمین پر خدا کا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا تو پھر یہ زمین بھی نہیں رہے گی۔ پھر سارا نظام بدل جائے گا جس طرح مکان جب بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ اس میں قائم رہنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ تو وہ گرنے لگتا ہے یا جس طرح خیمہ کی طنابیں ڈھیلی ہو جائیں۔ تو وہ گر جاتا ہے۔ اسی طرح جب انسانوں میں صلاحیت باقی نہیں رہے گی۔ تو یہ زمین بھی باقی نہیں رہے گی۔ اس کی بجائے دوسرا نظام قائم ہوگا۔ جو جزائے عمل کا نظام ہے۔ لہذا فرمایا کہ جزائے عمل اس وقت واقع ہوگی جب زمین کو زلزلہ دیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن پاک اور حدیث شریف میں آتا ہے۔

سب سے پہلے خدا تعالیٰ کی ایک عظیم اور بزرگ تجلی پڑے گی۔ اس کے متعلق فرمایا۔ "وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا" گویا زمین چمک اُٹھے گی۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ کی قہری تجلی نازل ہوگی۔ جسے کوئی چیز برداشت نہیں کر سکے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام چیزیں درہم برہم ہو جائیں گی۔ اس کے بعد تیسرا واقعہ یہ ہوگا کہ صور پھونکا جائے گا، جو کہ جزائے عمل کے لیے اٹھانے والا صور ہوگا۔

زمین ہر چیز اُگل دیگی

جب زلزلہ ارض سے کوئی چیز اپنے مستقر پر قائم نہیں رہے گی تو وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا زمین اپنے بوجھ باہر نکال دیگی۔ یعنی جو بھی چیز زمین کے اندر ہے خزائن ہیں یا دفائن، سونا ہے یا چاندی حتیٰ کہ مُردے بھی باہر نکال دے گی۔ حدیث شریف[2] میں آتا ہے۔ کہ قرب قیامت میں بعض مقامات پر اس قسم کی نشانیاں ظاہر ہوں گی۔ زمین کو حکم ہوگا۔ تمہارے اندر سونے کے جو خزانے ہیں۔ انہیں باہر نکال دو۔ تعمیل حکم میں زمین سونے کے ستون باہر پھینک دیگی۔ دنیا میں فساد پھیلانے والے سونے کی یہ بے قدری دیکھ کر افسوس کا اظہار کریں گے۔ کہ اس کی خاطر ہم لڑتے جھگڑتے رہے۔ قاتل کہے گا۔ کہ اس

---

[1] مسلم ج۱ ص۸۴، [2] معالم التنزیل ج۴ ص۲۴۷، روح المعانی ج۳۰ ص۲۰۹، ترمذی ص۳۲۱، مستدرک حاکم ج۴ ص۵۳۲

سوئے کی خاطر میں نے قتل ناحق کیا۔ چور کہے گا۔ کہ اس کی خاطر میں میرا ہاتھ کاٹا گیا۔ اب یہ ستونوں کی صورت میں پڑا ہے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ نہر فرات کے متعلق فرمایا کہ وہ بھی اپنے خزانے باہر نکال دے گی۔ الغرض قیامت کو تمام چیزیں باہر نکالی جائیں گی۔ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا کا یہی مطلب ہے۔

فرمایا وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا انسان حیرت اور دہشت کے مارے کہے گا۔ یہ زمین کو کیا ہو گیا ہے۔ اُس دن انسانوں کے اعمال بھی برہنہ ہو جائیں گے۔ یَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ تمام راز فاش ہو جائیں گے۔ شاہ ولی اللہ کی تشریح کے مطابق[2] انسان دیکھے گا کہ اس کے اعمال اس کو چمٹ رہے ہیں۔ ہر عمل خواہ برا ہے یا اچھا، انسان کے ساتھ چمٹ جائے گا۔ اور انسان کہے گا یہ کیا ہو گیا ہے۔

فرمایا یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا۔ اس دن زمین اپنی خبریں ظاہر کر دے گی۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[3] کہ زمین کا خبریں ظاہر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس زمین پر اللہ کے کسی بندے یا بندی نے جو بھی کام کیا ہے زمین اسے ظاہر کر دے گی جس جس جگہ پر کسی نے عبادت کی ہے یا نیکی کا کوئی کام کیا ہے۔ وہ سارے راز فاش کر دیئے جائیں گے۔ زمین کے اندر کی تمام چیزیں باہر آ جائیں گی۔ انسان سخت دہشت میں ہو گا۔ اور حیرت و استعجاب کے ساتھ کہے گا وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا کہ زمین کو کیا ہو گیا ہے کہ ساری خبریں بتلا رہی ہے۔ سارے راز ظاہر کر رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہو گا کہ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا تیرے رب نے زمین کو اشارہ کر دیا ہے۔ اور وہ اس کے حکم کی تعمیل میں اپنے اندر پوشیدہ ہر چیز باہر نکال رہی ہے۔ ہر چیز اس میں محفوظ تھی، کوئی چیز ضائع نہیں ہوئی۔ لہٰذا اب ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے گراموفون ریکارڈ میں کوئی چیز محفوظ ہوتی ہے۔ جب سوئی لگا دی جاتی ہے۔ تو وہ بات ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو گا۔ تمام پوشیدہ اعمال ظاہر ہو جائیں گے۔

راز فاش ہو جائیں گے

---

[1] مسلم ص ۳۲۱ ج ۱، [2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۹ ج ۱، [3] معالم التنزیل ص ۲۴۷ ج ۴، ترمذی ص ۴۸۴

زمین ہر چیز نکال باہر کرے گی۔

لوگ گروہ گروہ ہوجائیں گے

فرمایا یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا اس دن لوگ گروہ گروہ ہوجائیں گے مطلب یہ کہ اپنے اعمال کے اعتبار سے مختلف گروہوں میں تقسیم ہوجائیں گے۔ زانیوں کا گروپ الگ ہوگا، چوروں کا الگ مشرکوں کا الگ اور بدعتیوں کا الگ ٹولہ ہوگا۔ اسی طرح مومنوں کا گروہ الگ ہوگا۔ ایک موٹی سی تقسیم یہ کہ ایماندار الگ ہوجائیں گے اور کفر والے الگ۔ یعنی نیک وبد متفرق ہوجائیں گے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں دوسری جگہ آتا ہے "فَرِیْقٌ فِی الْجَنَّۃِ وَفَرِیْقٌ فِی السَّعِیْرِ" ایک گروہ بہشت کی طرف روانہ ہوگا جب کہ دوسرا گروہ دوزخ کی طرف جائے گا۔ پھر یہ سب اپنے اپنے ٹھکانے پہ پہنچ جائیں گے۔

اعمال سامنے رکھ دیے جائیں گے

فرمایا یہ گروہ بندی اس لیے ہوگی لِّیُرَوْا اَعْمَالَهُمْ تاکہ وہ سب اپنے اپنے اعمال کو دیکھ سکیں۔ یہی دراصل اس سورۃ کا مرکزی مضمون ہے کہ لوگوں کے اعمال ان کے سامنے رکھ دیے جائیں گے۔ تاکہ وہ ان اعمال کا بھگتان کر سکیں۔ چنانچہ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ جس کسی نے ایک ذرے کے برابر بھی نیکی کا کام کیا ہوگا، وہ اسے دیکھ لے گا۔ خدا تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتے، ہر چیز محفوظ ہے۔ اور وقت پر ظاہر ہوگی۔ حدیث شریف میں آتا ہے[1] اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَۃٍ " دوزخ سے بچو۔ خواہ کھجور کے آدھے دانے کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو۔ کھجور کے ایک ٹکڑے کی کیا حیثیت ہے۔ مگر یہ معمولی سی نیکی بھی وہاں موجود ہوگی۔ اس لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے[2] لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوْفِ شَیْئًا نیکی کی کسی چیز کو حقیر نہ سمجھو۔ یہی چھوٹی چھوٹی نیکیاں مل کر بڑے بڑے ڈھیر بن جائیں گی۔ کعب احبار کی روایت میں آتا ہے[3]۔ اس نے بیان کیا کہ پہلی کتابوں کے علوم میں آتا ہے کہ نیکی کی کسی بات کو حقیر نہ جانو لَا تَحْقِرُوْا شَیْئًا مِّنَ الْمَعْرُوْفِ کیونکہ سابقہ صحیفوں میں منقول ہے کہ ایک شخص نے خدا کے راستے میں جاتے ہوئے کسی شخص کو مانگنے کی سوئی دی تھی تاکہ وہ کپڑے میں ٹانکا لگالے۔ اللہ تعالیٰ نے اس معمولی عمل کے بدلے میں جنت میں پہنچادیا۔

---

[1] بخاری صفحہ ۱۹۰ ج ۱، صفحہ ۸۹ ج ۲، مسلم صفحہ ۳۲۷ ج ۱ [2] مسلم صفحہ ۳۲۹ ج ۲ ، [3] تفسیر کبیر صفحہ ۶۱ ج ۳۲

اور یہ بھی فرمایا[1] کہ ایک عورت نے بیت المقدس کی تعمیر کے سلسلہ میں گندم کا صرف ایک دانہ دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے اُسے جنت عطا کر دی، حالانکہ ایک دانے کی کیا حیثیت ہے۔ تفسیر کبیر[2] میں آتا ہے۔ کہ کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ سمجھو۔

فرمایا جس طرح چھوٹی سے چھوٹی نیکی ضائع نہیں ہو گی۔ اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی بُرائی بھی یقیناً اپنا اثر دکھائے گی، اس لیے فرمایا وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ اگر ذرہ برابر کسی سے زیادتی کی ہے، بدسلوکی کی ہے کسی کو بُرا بھلا کہا ہے یا کوئی اور برائی کا کام کیا ہے تو وہ سب ظاہر کر دیا جائے گا۔ اور اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

ایمان کے بغیر کوئی نیکی قابل قبول نہیں

مفسرین کرام[3] فرماتے ہیں کہ نیکی اور بدی کی معافی کا قانون بھی موجود ہے۔ کسی کافر کی نیکی قیامت کو کچھ کام نہیں آئے گی۔ اس کے کفر کی وجہ سے اس کی تمام نیکیاں اُڑ جائیں گی، کیونکہ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے، کفر کی وجہ سے نیکی قبول ہی نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے نیکی اور ایمان کی بدولت برائیاں بھی معاف ہوتی رہتی ہیں۔ انسان کے صغائر اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان[4] ہے۔ جب آدمی وضوء کرتا ہے تو ہاتھ، پاؤں اور منہ کے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں "اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ" نیکیوں کی وجہ سے برائیاں معاف ہو جاتی ہیں۔ مقصد یہ ہے۔ کہ قیامت کو کفار کے پلے میں برائیاں ہی برائیاں ہوں گی۔ جب کہ ایمانداروں کے بہت سے گناہ معاف ہو کر نیکیوں میں اضافہ ہو چکا ہو گا۔

خلاصہ کلام

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ مبارکہ میں جزائے عمل کا مسئلہ سمجھا دیا ہے اور اس سورۃ کو نصف قرآن کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان کا تعلق دو چیزوں سے ہے یعنی عمل اور جزائے عمل۔ اس سورۃ میں چونکہ جزائے عمل کا ذکر ہے اسلیے اسے نصف قرآن کے برابر کہا گیا ہے۔ پہلی سورۃ کیساتھ اس سورۃ کا ربط یہ ہے کہ جزائے عمل اس وقت واقع ہو گا جب پہلی سورۃ میں مذکورہ نظام قائم نہیں رہیگا۔ یہ نظام ایک خاص وقت تک ہے۔ جب تک کہ انسان میں صلاحیت موجود ہے جب یہ صلاحیت ختم ہو جائیگی۔ تو یہ نظام بھی ختم ہو جائیگا۔ اسکے بعد دوسرا دوسرا نظام قائم ہو گا جس میں جزائے عمل واقع ہوگا۔

---

[1] تفسیر کبیر صفحہ ۶۲ ج ۳۲، [2] تفسیر کبیر صفحہ ۶۱، ۶۲ ج ۳۲، [3] تفسیر کبیر صفحہ ۶۱ ج ۳۲، [4] مسلم صفحہ ۱۲۱، ۱۲۵ ج ۱

سُورَةُ العٰدِيٰت

عَمَّ - ۳ — العٰدیٰت ۱۰۰

درس — (مکمل سورۃ)

سُوْرَۃُ الْعٰدِیٰتِ مَکِّیَّۃٌ وَّهِیَ اِحْدٰی عَشَرَۃَ اٰیَۃً

سورۃ عادیات مکی ہے اور یہ گیارہ آیتیں ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا ① فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا ② فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا
③ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ④ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ⑤ اِنَّ الْاِنْسَانَ
لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ⑥ وَاِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِیْدٌ ⑦ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ
⑧ اَفَلَا یَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ ⑨ وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ ⑩
اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ ⑪ ع ۱۱/۲۵

ترجمہ :- قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپتے ہوئے ① پس آگ سلگانے والوں کی پاؤں جھٹک کر ② پھر ان کی جو غارت ڈالنے والے ہیں صبح کے وقت ③ پس ابھارتے ہیں وہ اس مقام میں گرد و غبار ④ پس وہ دشمن کی جماعت میں گھس جاتے ہیں ⑤ بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکر گذار ہے ⑥ اور بے شک وہ خود اس بات پر گواہ ہے ⑦ اور بے شک وہ انسان مال کی محبت میں بڑا پکا ہے ⑧ کیا انسان نہیں جانتا جس وقت کرید جائے گا ان کو جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں ⑨ اور سینے کے رازوں کو ظاہر کر دیا جائے گا ⑩ بے شک ان کا پروردگار ان کے ساتھ اس دن خبر رکھنے والا ہے ⑪

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سورۃ العٰدیٰت ہے۔ اس کی پہلی آیت میں عادیات کا لفظ مذکور ہے۔ اور اسی سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔ اکثر مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ یہ سورۃ

ل تفسیر عزیزی صفحہ ۲۴۲ پارہ ۳۰، تفسیر خازن صفحہ ۲۸۲ جلد ۷، المقام المحمود صفحہ ۱۵۸ ۔

مکی زندگی میں نازل ہوئی، تاہم حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت قتادہؒ اور امام مالکؒ سے منقول ہے کہ یہ مدنی سورۃ ہے۔ اس کی گیارہ آیات ہیں۔ یہ سورۃ چالیس الفاظ اور ایک سو تریسٹھ حروف پر مشتمل ہے۔[1]

گذشتہ سورۃ کے ساتھ ربط

سابقہ سورۃ زلزال میں انسان کے جزائے عمل کا ذکر تھا کہ جزائے عمل کا واقع ہونا لازم ہے۔ اُس سے پہلی سورۃ البینۃ میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ انسان کو اللہ کی عبادت کرنی چاہیئے۔ اور حنیف بن کر رہنا چاہیئے۔ بدنی اور مالی عبادات یعنی مال اور زکوٰۃ پر کاربند ہونا چاہیئے۔ خدا کا خوف ہر وقت دل میں جاگزین ہونا چاہیئے۔

اس سورۃ مبارکہ میں ان بیماریوں کا ذکر ہے جو کہ مذکورہ بالا پروگرام پر عمل درآمد میں مانع بنتی ہیں۔ ان میں سے ایک بیماری ناشکر گذاری ہے۔ اور دوسری مال کی شدید محبت مقصد یہ ہے۔ کہ ان دو بیماریوں کا علاج کرنا چاہیئے۔ تاکہ قرآن پاک کے پروگرام پر عملدرآمد میں موجود رکاوٹ کو دور کیا جاسکے۔

شان نزول

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ایک موقع پر صحابہؓ کی ایک جماعت کو بنی کنانہ کے کافروں کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا۔ بنی کنانہ کے کفار بڑے سخت لوگ تھے آپ نے لشکر کو بعض خصوصی ہدایات دیں۔ کہ یہاں سے فلاں تاریخ کو روانہ ہونا۔ اور فلاں تاریخ تک منزل مقصود تک پہنچ جانا۔ اُس روز رات کے آخری حصے میں یعنی علی الصبح دشمن پر حملہ کرنا اور پھر فلاں تاریخ کو واپس آجانا۔ جب صحابہ کرامؓ کی جماعت سفر پر روانہ ہوگئی، تو راستے میں ایک ندی میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ لہذا انہیں ایک دن وہیں رُکنا پڑا، دوسرے روز جب ندی کا پانی اُترا۔ تو صحابہؓ آگے روانہ ہوگئے۔ حضور علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق دشمن پر حملہ کیا اور پھر واپس روانہ ہوگئے۔ چونکہ واپسی میں ایک دن کی تاخیر ہوگئی۔ اور صحابہؓ مقررہ تاریخ پر نہ پہنچ سکے تو منافقین نے پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ کہ مسلمان اس مہم میں مارے گئے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں میں پریشانی کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اس موقع پر

---

[1] روح المعانی صفحہ ۲۱۴/۳۰، درمنثور صفحہ ۳۸۳/۶، تفسیر اتقان صفحہ ۱۴/۱

اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ عادیات نازل فرما کر مسلمانوں کو تسلی دی۔

عادیات کا مفہوم

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ عادیات سے مراد غازیوں کے گھوڑے ہیں جو جہاد میں جاتے ہیں۔ بعض دوسرے[2] فرماتے ہیں۔ کہ یہ مکی سورۃ ہے اور اس وقت جہاد فرض نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا یہاں مطلقاً گھوڑوں کے دوڑنے کا ذکر ہے۔ وہ گھوڑے خواہ ڈاکوؤں کے کیوں نہ ہوں۔ تاہم گھوڑوں کی حالت بیان کر کے انسان کی ناشکر گزاری کی بات سمجھائی گئی غازیوں کے گھوڑے جب دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں، تو یہ خدا تعالیٰ کے قہر کا نمونہ ہوتا ہے۔ دشمن مارے جاتے ہیں۔ اُن کا مال و اسباب چھین لیا جاتا ہے، دشمن ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ تو یہ بالکل قیامت کا نقشہ ہوتا ہے۔ قیامت کو بھی ایسی ہی حالت ہوگی۔ لوگوں کے پاس مال و اسباب نہیں رہے گا، جو آج عزیز ہیں، اُس دن ذلیل ہو جائیں گے اور نہایت خطرناک حالات ہوں گے۔

پانچ قسمیں

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی دو بیماریوں کے ذکر سے پہلے پانچ قسمیں اٹھائی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا قسم ہے ہانپ کر دوڑنے والے گھوڑوں کی۔ ضَبْحًا کا معنی سانس کا پھول جانا۔ یا ہانپنا ہے۔ یہاں گھوڑوں کی اُس حالت کا ذکر ہے جب وہ دوڑ کر ہانپنے لگتے ہیں۔ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا قسم ہے قدم جھٹک کر آگ سلگانے والے گھوڑوں کی ایرآء کا معنی آگ جلانا ہوتا ہے۔ جب گھوڑا دوڑتا ہے اور اس کے سُم پتھر سے ٹکراتے ہیں۔ تو آگ کی چنگاریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے۔ اس زمانے میں آگ چقماق پتھر کو ٹکرا کر حاصل کی جاتی تھی۔ اسی طرح جب گھوڑے کے نعل پتھر سے ٹکراتے تھے۔ تو چنگاریاں پیدا ہوتی تھیں۔

فرمایا فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا قسم ہے ان گھوڑوں کی جو صبح کے وقت غارت ڈالتے ہیں۔ یعنی شب خون مارتے ہیں ——— شب خون رات کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۵۴۱/ج۴ ، تفسیر خازن ص ۵۴۱/ج۴ ، معالم التنزیل ص ۲۴۸/ج۴ ، روح المعانی ص ۲۵۱/ج۳۰

[2] المقام المحمود ، تفسیر مولانا سندھیؒ ص ۱۵۸/پارہ ۳۰ ، تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۴۱/پارہ ۳۰

آخری حصے میں مارا جاتا۔ جب دشمن میٹھی نیند سو رہا ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دشمن پر حملہ کا ارادہ فرماتے۔ تو رات کے آخری حصے کا انتظار فرماتے۔ صبح صادق کے وقت اگر دوسری طرف سے اذان کی آواز سنائی دیتی تو سمجھتے کہ یہ لوگ اہل ایمان ہیں لہذا حملہ نہ کرتے۔ اور اگر اذان کی آواز نہ آتی تو حملہ کر دیتے۔ اسی کو فرمایا فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحًا قسم ہے ان گھوڑوں کی جو صبح کی وقت غارت ڈالتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعًا قسم ہے ان گھوڑوں کی جو گرد و غبار کو ابھارتے ہیں۔ یعنی جب میدان جہاد میں دوڑتے ہیں، تو لازم ہے کہ گرد و غبار اڑتا ہے۔ نقع غبار کو کہا جاتا ہے۔ فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعًا پس وہ دشمن کی جماعت میں گھس جاتے ہیں۔ جمع کی جمع جموع ہے مطلب یہ ہے کہ دشمن کے قلب پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ عام طور پر لشکر پانچ حصوں پر منقسم ہوتا ہے اور امیر لشکر مرکزی حصہ میں ہوتا ہے۔ تو فرمایا مجاہدوں کے ان گھوڑوں کی قسم ہے، جو مرکزی جماعت میں گھس جاتے ہیں تاکہ دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جا سکے۔

گھوڑے کی خصوصیات

گھوڑا بڑا وفادار جانور ہے۔ اس کا مالک اس کے ساتھ احسان کرتا ہے۔ اس کو پالتا ہے گھاس، دانہ وغیرہ کھلاتا پلاتا ہے۔ تو گھوڑا بھی مالک کی وفاداری میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے۔ موجودہ مشینی دور سے پہلے گھوڑے سے بہت زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ عام سواری کے علاوہ جنگ کے دوران گھوڑے کی اہمیت بہت بڑھ جاتی تھی۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک فوج میں رسالہ کو خاص مقام حاصل تھا۔ گھوڑے کی خیر و برکت کے متعلق حدیث[۲] میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ اَلْخَيْلُ مَعْقُوْدٌ فِىْ نَوَاصِيْهَا الْخَيْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ یعنی گھوڑا ایک ایسا جانور ہے۔ جس کی پیشانی کے ساتھ اللہ نے قیامت تک بہتری باندھ رکھی ہے۔ یعنی اس کی اہمیت کسی زمانہ میں کبھی کم نہیں ہوگی۔ جدید آلات اور سائنس کے دور میں گھوڑا آج بھی بڑے کام کا جانور ہے۔ جنگ کے دوران میں سینے

---

[۱] مسلم ص ۱۶۶ ج ۱، [۲] مسلم ص ۱۳۲ ج ۲

پر تیر، نیزہ اور گولی کھاتا ہے۔ مگر مالک کو ہر صورت بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

انسان ناشکر گزار ہے

گھوڑے کے عادات و خصائل میں انسان کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ گھوڑا اپنے مالک کے ساتھ کس قدر وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ حالانکہ اس کا مالک، نہ اس کا خالق ہے اور نہ حقیقی مالک بلکہ محض مجازی مالک ہے اور صرف اس کے گھاس دانہ کا ہی بندوبست کرتا ہے۔ برخلاف اس کے انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، وہی اس کا خالق اور حقیقی مالک ہے۔ اس کی تمام ضروریات پوری کیں، انعامات سے نوازا، مگر انسان کی حالت یہ ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ وہ اپنے رب کا بڑا ہی ناشکر گزار ہے۔ کنود کا معنی انتہائی ناشکر گزار۔ انسان کی حالت قابل افسوس ہے، کہ اس میں اپنے مالک کے لیے گھوڑے جتنی وفاداری بھی نہیں پائی جاتی۔

کنود بخیل کو بھی کہتے ہیں۔ حضور نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا[1] کنود وہ آدمی ہے جو اکیلا کھاتا ہے، خادم کو مارتا ہے۔ کسی کو خیر نہیں دیتا۔ اتنا حریص ہے۔ کہ نہ مہمان کی مہمان نوازی کرتا ہے۔ نہ کسی غریب، یتیم، مسکین کا خیال رکھتا ہے۔ محض اپنا پیٹ بھرنے کی فکر میں رہتا ہے ناشکر گزاری ایک شدید بیماری ہے۔ جو اکثر لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ نیز انسان نعمتوں کی قدر نہیں کرتا۔ یعنی اُسے صحیح مقصد کے لیے استعمال بھی نہیں کرتا۔ خدا تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اسے منجانب اللہ نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنی محنت کا صلہ سمجھتا ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے "اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ط" یہ مال و دولت تو مجھے میرے علم و ہنر کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ میں سائنس دان ہوں، انجنیئر ہوں، ڈاکٹر ہوں، ہنرمند ہوں اس وجہ سے میں نے مال جمع کیا ہے۔ حالانکہ نادان یہ نہیں سمجھتا کہ اس میں اہلیت پیدا کرنے والی ذات کون سی ہے۔ یہ بھی ناشکر گزاری کی ایک نشانی ہے۔

شکر گزاری کی تلقین

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس قدر نعمتیں عطا کی ہیں۔ کہ وہ ان کا شکر یہ ادا کر ہی

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۵۴۲/۴، روح المعانی ص ۲۱۸/۳۰

نہیں سکتا۔ وہ اپنی پیدائش پر ہی غور کرے کہ اللہ نے اسے کس طرح ایک حقیر قطرۂ آب سے پیدا کیا۔ اور پھر اس کی بتدریج پرورش کی۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق بھی ہے۔ اور رب بھی ہے پرورش اور تربیت کرنے والا بھی اُسکے سوا کوئی نہیں۔ لَا رَبَّ سِوَاہُ خدا تعالےٰ ہی انسان کو درجہ کمال تک پہنچانے والا ہے۔ مگر پھر بھی انسان اتنا بخیل واقع ہوا ہے۔ کہ ہر وقت ناشکر گزاری میں رہتا ہے۔ قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا "اِعْمَلُوْآلَ دَاوٗدَ شُکْرًا" یعنی اے داؤد علیہ السلام کے گھر والو! اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہ ادا کرو۔ نیز فرمایا "وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ" میرے بندوں میں شکر ادا کرنے والے تھوڑے ہی ہیں۔ انسانوں کی اکثریت کے متعلق فرمایا "اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ" کہ یہ تو ظالم اور خدا کی نعمتوں کے ناقدردان ہیں۔

ناشکر گزاری کی یہی وہ بیماری ہے، جس کا شکوہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر کیا ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے انسان صحیح پروگرام پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔ اگر ان میں شکر گزاری کا مادہ ہو۔ تو قرآن پاک کے پروگرام پر عمل کرنا مشکل نظر نہ آئے۔ مگر اس بیماری کی وجہ سے انسان اس پروگرام کو بہت بڑا بوجھ سمجھتا ہے۔ لہٰذا انسانوں کو چاہیئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں۔ "وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا" حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ انسان خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار تک نہیں کر سکتا۔ انسان کے جسم کے ایک ایک بال پر اللہ تعالےٰ کی اتنی نعمتیں خرچ ہوتی ہیں۔ کہ ان کا شکر ادا نہیں کیا جا سکتا۔ پانی کا ایک گھونٹ جو انسان پیتا ہے۔ کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس کی قدر اُس وقت معلوم ہوتی ہے، جب یہ میسّر نہ ہو۔ یہ تو انسان کی اندرونی نعمتیں ہیں۔ انسانی جسم سے باہر اس قدر انعامات ہیں۔ کہ انسان کے شمار سے باہر ہیں۔ مگر پھر بھی وہ ناشکر گزاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ "وَاِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ لَشَہِیْدٌ" اور وہ خود اس بات پر گواہ ہے۔ اس کی اپنی حالت بتا رہی ہے کہ وہ ناقدردان ہے۔ گھوڑے کی مثال اس کے سامنے ہے جو معمولی خوراک دینے پر اپنے مالک کا اس قدر مطیع اور فرمانبردار ہے اور یہ انسان ہو کر اپنے حقیقی مالک کا شکر تک ادا نہیں کرتا۔

مال کی محبت

فرمایا "وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ" بے شک انسان مال کی محبت میں بڑا پکا ہے

خیر نیکی کو بھی کہا جاتا ہے اور مال کو بھی۔ جیسے قرآن میں آتا ہے ”اِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ“ یعنی اگر کسی نے مال چھوڑا ہے اُسے چاہیئے کہ وصیت کر جائے۔ یہاں بھی خیر سے مراد مال ہے مال کے ساتھ محبت ہونا فطری ہے۔ مگر یہاں شدید کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہے۔ کہ وہ مال کی محبت میں اس قدر منہمک ہے۔ کہ اسی کو اپنا منتہائے مقصود سمجھنے لگا ہے۔ سورۃ فجر میں گذر چکا ہے ”وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا“ تمہاری بیماری یہ ہے کہ تم جی بھر کر مال سے محبت کرتے ہو۔ مال کی محبت میں حلال وحرام کی تمیز بھی نہیں کرتے۔ کہ کس ذریعے سے حاصل ہو رہا ہے۔ یہی وہ سٹیج ہے جہاں آکر انسان حقوق اور فرائض کو بھی بھول جاتا ہے۔ مال کے —— اس قدر زیادہ انہماک کی مذمت کی گئی ہے۔ اور اسے شدید محبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ مومن کے لیے مال اچھا ساتھی ہے۔ مسلم شریف[1] کی حدیث میں یوں بھی آتا ہے وَنِعْمَ صَاحِبُ الْمُسْلِمِ هُوَ لِمَنْ اَعْطٰى الخ جو اللہ کا حق ادا کرتا ہے اس کے لیے مال اچھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مال میں سے اللہ کا حق ادا کرتا ہے۔ زکوٰۃ دیتا ہے۔ صدقہ خیرات کرتا ہے۔ وہ اس کی شدید محبت میں مبتلا نہیں ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب کوئی مال کی شدید محبت میں پھنس جاتا ہے۔ مال اس کا معبود بن جاتا ہے۔ حلال وحرام کی تمیز اُٹھ جاتی ہے اور پھر ساری خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

حضرت علیؓ نے اپنے فرزندان حضرت حسنؓ اور حسینؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا[2]۔

اِبْنَيَّ اِنَّ مِنَ الرِّجَالِ بَهِيْمَةً ۔۔۔ فِيْ صُوْرَةِ الرَّجُلِ السَّمِيْعِ الْمُبْصِرِ

فَطِنٌ بِكُلِّ رَزِيَّةٍ فِيْ مَالِهٖ ۔۔۔ وَاِذَا اُصِيْبَ بِدِيْنِهٖ لَمْ يَشْعُرِ

اے بیٹو! بعض انسان جانوروں کی طرح ہوتے ہیں۔ کہ جب مال میں نقصان ہو جائے تو ذرہ بھر برداشت نہیں کرتے۔ مگر دین سارا بھی بگڑ جائے تو انہیں پرواہ

---

[1] مسلم ص ۳۲۶ ج ۱، [2] دیوان سیدنا علیؓ ص ۴۵ مطبوعہ کراچی

نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ اگرچہ انسانی شکل وصورت رکھتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ اسی کیفیت کے متعلق فرمایا وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ انسان مال کی محبت میں پکا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ مال کی یہ محبت عام لوگوں کا خاصہ ہے۔ ورنہ انبیاء علیہم السلام اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین میں مال کی محبت یا ناشکرگزاری کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا ان کے نزدیک مال کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس سورۃ میں عام لوگوں کی ذہنیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہ ان میں مال کی محبت شدید ہوتی ہے۔ نیز وہ ناشکرگزار ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ دو بیماریاں ہیں، جن کا ذکر اس مقام پر ہوا، اور جن کا علاج ضروری ہے۔ جب تک ان بیماریوں کا علاج نہیں ہوگا۔ اسلام کے پروگرام پر عمل درآمد ممکن نہیں۔

تمام راز کھل جائیں گے

فرمایا اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ کیا انسان نہیں جانتا جس وقت کہ پیدا جائے گا ان کو جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ یعنی انہیں قبروں سے باہر نکالا جائے گا۔ گذشتہ سورۃ میں آیا ہے " فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ " انسان اپنے اعمال کا ذرہ ذرہ مشاہدہ کرے گا۔ کیا وہ یہ تصور نہیں رکھتا کہ ان کی قبروں کو کھود کر باہر نکالا جائے گا۔ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ اور سینے کے رازوں کو ظاہر کر دیا جائے گا۔ آج تو انسان مال کی محبت میں اپنے راز چھپاتا ہے۔ دوسروں کو خبر نہیں ہونے دیتا بعض اوقات لوگوں کو دھوکا بھی دیتا ہے۔ بظاہر وہ لوگوں سے احسان کرتا نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت میں استحصال کر رہا ہوتا ہے۔ قیامت کے دن یہ تمام چیزیں ظاہر کر دی جائیں گی۔ اس دن ہر چیز سامنے ہوگی کہ کس شخص نے کیا کیا دھوکا کیا ہے۔ کون سا فراڈ کیا ہے۔ پراپگنڈا خدمت انسانی کا کرتا تھا۔ مگر درحقیقت اپنا دھندا چلاتا تھا۔ ظاہر کچھ تھا اور باطن کچھ تھا۔ اللہ تعالیٰ اُس دن سینوں کے رازوں کو ظاہر کر دیں گے۔

کیا انسان کے سامنے یہ حالت نہیں ہے۔ اگر انسان ان حالات پہ توجہ کرے تو ناشکرگذاری کا ارتکاب نہ کرے۔ مال کی شدید محبت سے بچ جائے۔ حقوق و فرائض کو ادا کرنے لگے۔ تاکہ اس دن شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ جس دن تمام راز فاش کر

دیے جائیں گے۔ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ بے شک ان کا پروردگار اس دن اُن سے باخبر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کو تو آج بھی ہر چیز کی خبر ہے۔ مگر اس دن خبردار ہونے کا مطلب یہ ہے۔ کہ سب پہ ظاہر ہو جائے گا کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہے گی۔

سورة القارعة

القارعۃ ۱۰۱
(مکمل سورۃ)

عمّ ۳۰
درس

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اِحْدٰى عَشْرَةَ اٰيَةً
سورۃ قارعہ مکی ہے اور یہ گیارہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان اور نہایت رحم کرنیوالا ہے

اَلْقَارِعَةُ ① مَا الْقَارِعَةُ ② وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ③ يَوْمَ
يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ④ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ
الْمَنْفُوْشِ ⑤ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ⑥ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ
⑦ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ⑧ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ⑨ وَمَآ
اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ⑩ نَارٌ حَامِيَةٌ ⑪ ع ۱ ۱۱/۲۶

ترجمہ:۔ کھٹکھٹا دینے والی ① کیا ہے وہ کھٹکھٹا دینے والی ② اور آپ کو کس نے بتلایا کہ وہ کھٹکھٹا دینے والی کیا ہے ③ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہو جائیں گے ④ اور پہاڑ رنگین دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے ⑤ پس بہرحال جس کے اعمال وزنی ہوں گے ⑥ پس وہ پسندیدہ عیش میں ہوگا ⑦ اور بہرحال جس کے اعمال ہلکے ہوں گے ⑧ اس کا ٹھکانا جہنم کا گڑھا ہوگا ⑨ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ وہ گڑھا کیا ہے ⑩ بھڑکتی ہوئی آگ ہے ⑪

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سورۃ القارعۃ ہے۔ اس کی پہلی آیت میں قارعہ کا لفظ مذکور ہے۔ اسی سے سورۃ کا نام اخذ کیا گیا ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی گیارہ آیتیں ہیں اور یہ چھتیس ۳۶ الفاظ اور ایک سو پچاس ۱۵۰ حروف پہ مشتمل ہے۔

موضوع پہلی سورۃ کی طرح یہ سورۃ بھی جزائے عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے پہلی سورۃ میں بھی یہی مضمون تھا۔ اس سورۃ میں بتایا گیا ہے۔ کہ بعض انسانوں کے اعمال وزنی ہوں گے

اور بعض کے ہلکے ہوں گے ۔ دونوں قسم کے لوگوں کو ان کے اعمال کی حیثیت کے مطابق بدلہ ملے گا. گویا یہ سورۃ بھی جزائے عمل کو بیان کرنے والی سورتوں میں سے ہے ۔

قیامت کے مختلف نام

قرآن پاک میں قیامت کے مختلف نام آئے ہیں۔ القارعۃ کا معنیٰ ہے کھٹکھٹا دینے والی ۔ قیامت کا ایک معنیٰ الطآمۃ بھی ہے ۔جس کا معنیٰ ہے سب چیزوں پر چھا جانے والی اسی طرح غاشیہ بھی قیامت کا نام ہے ' ڈھانپ لینے والی ہے ۔ قرآن پاک میں الحاقۃ کا نام بھی آیا ہے ۔یعنی ٹھیک طور پہ واقع ہونے والی۔ الغرض مختلف ناموں سے قیامت کی صفت اور حالت کو بیان کرنا مقصود ہے ۔

قَرَعَ کا معنیٰ کھٹکھٹا دینا ۔ اور قارعہ کا معنیٰ کھٹکھٹا دینے والی۔ یہاں پہ قارعہ کا لفظ تین مرتبہ استعمال ہوا ہے ۔ اس سے مخاطب کی توجہ مبذول کرنا مقصود ہے ۔کہ متعلقہ مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ کھٹکھٹا دینے والی اور کیا ہے کھٹکھٹا دینے والی ۔ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ کیا ہے کھٹکھٹا دینے والی ۔ امام سفیان بن عیینہؒ کا قول ہے[1] کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں " اَدْرٰكَ " لفظ آیا ہے ، اس کے بعد اس کی حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے ۔ اور جہاں پر " مَا يُدْرِيكَ " کا لفظ وارد ہوا ہے ۔ وہاں بات کو واضح نہیں کیا گیا ۔ جیسے " وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ " آپ کو کیا معلوم ہے شاید کہ قیامت قریب ہو ۔ یہاں پر وقوع قیامت کے وقت کو ظاہر نہیں کیا گیا ۔

قیامت کا نقشہ

جس طرح سورۃ حاقہ میں آیا تھا " اَلْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْحَاقَّةُ " اس سورۃ میں بھی وہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے ۔ اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ القارعہ یعنی کھٹکھٹا دینے والی ، اور کیا ہے ۔ قارعہ اور آپ کو کس نے بتلایا کہ وہ قارعہ کیا چیز ہے ۔ قیامت کو کھٹکھٹانے والی اس وجہ سے کہا گیا ہے ۔ کہ اس روز اللہ تعالیٰ کی قہری تجلی نازل ہوگی ، جس کا اثر ہر چیز پہ پڑے گا ۔ کوئی چیز اپنے ٹھکانے پر قائم نہیں رہے گی ۔ سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا ۔ اس کے بعد جب

---

[1] تفسیر کبیر ص ۱۲۷ ج ۳۲

صور پھونکا جائے گا۔ تو ہر چیز آپس میں ٹکرا جائے گی۔ جس کی وجہ سے کوئی بھی شے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ ایک اور بنیادی اثر یہ ہوگا۔ کہ ہر چیز سے ثقل ختم ہوگا۔ اور آپس میں جڑنے کی صلاحیت باقی نہیں رہے گی۔ تمام چیزیں ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔

دنیا میں زیادہ وزنی اور ثقیل چیز پہاڑوں کو سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی یہ عام تصور ہے۔ کہ پہاڑ ایک نہایت ہی مضبوط چیز ہے۔ مگر قیامت کو پہاڑوں کی جو کیفیت ہوگی، اس کا نقشہ آگے آرہا ہے۔ کہ ان کے ذرات رنگین دھنی ہوئی اون کی مانند منتشر ہو جائیں گے آسمان بھی ایک مضبوط چیز ہے۔ اس کے متعلق سورۃ الرحمٰن میں آتا ہے "فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ" آسمان پھٹ کر سرخ ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی آتا ہے کہ ٹوٹ کر دریچے ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے بھی گھبرا کر کناروں پر چلے جائیں گے "فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ" اس دن یہ مضبوط چھت بالکل کمزور ہو جائے گی۔ یہ آسمان ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اس کی جگہ دوسرا آسمان تبدیل کر دیا جائے گا۔ یہ زمین جو ساری چیزوں کا ثقل برداشت کرتی ہے، یہ بھی قائم نہیں رہے گی۔ اسے بھی تبدیل کر دیا جائے گا۔ اسی دن کے متعلق اللہ تعالےٰ نے فرمایا "اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ" اللہ تعالےٰ اس دن کے حالات سے بخوبی واقف ہے۔ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ معاذ اللہ غافل ہے۔ وہ آج بھی اُسی طرح جانتا ہے۔ جس طرح ہمیشہ جانتا تھا۔ اور آئندہ بھی اس کے علم میں ہوگا۔ "وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ" سینوں کے راز ظاہر کر دیئے جائیں گے۔ "بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ" قبروں کو اکھیڑ کر مُردوں کو باہر نکال دیا جائیگا۔ آج انسان اپنی خود غرضیوں کو چھپاتا پھرتا ہے، قیامت کو سب ظاہر کر دی جائیں گی۔ بڑی رسوائی ہوگی۔

لوگ انتشار کا شکار ہو جائینگے

فرمایا جس قیامت کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اس وقت واقع ہوگی "يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ" جس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں (پروانوں) کی طرح ہو جائیں گے جب آگ جلائی جاتی ہے۔ تو کیڑے مکوڑے، پتنگے وغیرہ ادھر ادھر بھاگنے لگتے ہیں۔ پتنگوں میں فطری طور پر انتشار اور بدنظمی کا مادہ پایا جاتا ہے۔ ان میں افراتفری پائی جاتی ہے۔ بلا سوچے سمجھے اور منزل کے تعین کے بغیر بھاگتے پھرتے ہیں۔ فرمایا قیامت کے روز انسان

کی حالت ان پتنگوں سے مختلف نہیں ہوگی۔ آج یہ بڑے وزنی اور صاحب تدبیر بنے پھرتے ہیں۔ مگر قیامت والے دن یہ بھی افراتفری کا شکار ہوجائیں گے۔ اور پتنگوں کی طرح دوڑنے لگیں گے۔ ان میں انتشار کی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔ نظم و نسق ختم ہوجائے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ یَمُوْجُ بَعْضُھُمْ فِیْ بَعْضٍ لوگ ایک دوسرے کے اندر گھسیں گے۔ انہیں پتہ نہیں چلے گا کہ ان کے عزیز و اقارب اور برادری کہاں ہے۔ فرمایا لوگوں کا یہ حال ضعف، بیتابی اور بدنظمی کی وجہ سے ہوگا۔

انسان کا حقیقی وزن

یہاں پہ انسان کے باوقار اور وزنی ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان میں ظاہری طور پہ وزن ہوتا ہے۔ مگر انسان کا حقیقی وزن وہ ہے۔ جو اُس کے باطن کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور اس باطنی ثقل کا مدار اُس کے اخلاق پہ ہوتا ہے۔ جس قدر کسی کا اخلاق اعلیٰ درجے کا ہوگا، اسی قدر اس کا حقیقی وزن زیادہ ہوگا۔ جیسا کہ عرب لوگ کہا کرتے ہیں۔ ع
عَلَی الْمِیْزَانِ ذُوْ زِنَۃٍ رَزِیْنٌ (ترازو پہ وزن والا اور بھاری ہے)

حضرت حسانؓ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی تعریف میں جو شعر کہا ہے

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِیْبَۃٍ وَتُصْبِحُ غَرْثٰی مِنْ لُحُوْمِ الْغَوَافِلِ

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پاکدامن ہے، باوقار ہے۔ اُس پر کسی قسم کا اتہام نہیں لگایا جاسکتا۔ مقصد یہ کہ باوقار ہونا اخلاق کی وجہ سے ہوتا ہے اگر انسان میں اعلیٰ اخلاق اور عقیدے کی پاکیزگی موجود ہے۔ تو وہ بڑا باوقار اور وزنی ہے۔ الغرض قیامت کے روز انسانوں کی حالت منتشر پتنگوں سے مختلف نہیں ہوگی۔ اس قدر افراتفری کا عالم ہوگا۔

پہاڑوں کے ذرات بکھر جائیں گے

اپنی ذات، وزن اور کلانی کے اعتبار سے پہاڑ بڑی مضبوط چیز ہے۔ پہاڑوں کی مضبوطی کو ضرب المثل کے طور پہ استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں کہتے ہیں تَزُوْلُ الْجِبَالُ الرَّاسِیَاتُ وَقُلُوْبُنَا مضبوط پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتے ہیں۔ مگر ہمارا عہد و پیمان پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ یہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ پہاڑوں کی ایک دوسری صفت

۱ے معالم التنزیل ص ۲۴۹ ج ۴، بخاری ص ۷۴۷ ج ۲، ۲ے بخاری ص ۶۹۹ ج ۲

یہ ہے۔ کہ یہ قدیم ترین چیزوں میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب زمین کو پیدا کیا تو اس میں اضطراب پایا جاتا تھا۔ اس اضطراب سے بچانے کے لیے اللہ نے اس پر پہاڑوں کو مختلف جگہوں پر ٹھونک دیا۔ اَنۡ تَمِیۡدَ کُمۡ" تاکہ زمین ڈولنے نہ پائے۔ مقصد یہ کہ پہاڑ بڑی مضبوط چیز ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے بھی کہا ہے[1] ۔ بخود خزیدہ و محکم چوں کہساراں زی یعنی اپنی جگہ پر مستقل مزاج بن کر پہاڑوں کی طرح زندہ رہو۔ طوفان آئیں تو ٹکرا کر چلے جائیں تم اپنی جگہ قائم رہو۔ اصل مضبوطی اعتقاد اور اخلاق کی مضبوطی ہے۔ جب یہ مضبوط ہوں تو انسان ہر قسم کے حوادثات کو برداشت کر سکتا ہے۔

فرمایا قیامت والے دن اس قدر مضبوط اور وزنی پہاڑوں کی یہ حالت ہوگی کہ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ رنگین دھنی ہوئی اون کی طرح بکھر جائیں گے "عھن" رنگین اون کو کہتے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے کہ مختلف علاقوں میں مختلف رنگوں کے پہاڑ پائے جاتے ہیں کسی جگہ کے پتھر اور مٹی کالی ہے۔ کہیں خاکستری ہے۔ کہیں سفید ہے اور کہیں سیاہ ہے۔ اسی طرح پختگی کے لحاظ سے بھی مختلف نوعیت کے پتھر ہوتے ہیں۔ کوئی بڑے سخت، کوئی سنگ خارہ، کوئی سماق، کوئی بھر بھرا اور کوئی کسی قسم کا۔ فرمان الٰہی کے مطابق جب ان تمام پہاڑوں کو دھنا جائے گا۔ اور ان کے ذرات اُڑیں گے، تو مختلف رنگ مل کر ایسا محسوس ہوگا۔ جیسے رنگین دھنی ہوئی اُون ہوتی ہے۔

پسندیدہ جزائے عمل

قیامت کا مذکورہ نقشہ کھینچنے کے بعد خطاب کا رُخ اصل موضوع کی طرف ہوتا ہے کہ جب یہ حالات پیدا ہوں گے، تو پھر دوسرا مرحلہ شروع ہوگا۔ لوگوں کے اعمال تولے جائیں گے۔ تمام اعمال نیک و بد کو حاضر کیا جائے گا۔ جیسا کہ پہلی سورۃ میں گذر چکا ہے "فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ پھر ان تمام اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ اور اس کے نتیجے میں فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ۔ بہرحال جس کے اعمال وزنی ہوں گے فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ وہ بہت ہی پسندیدہ

---

[1] پیام مشرق ص۱۰۸

عیش میں ہوگا۔ "عیشۃ" کے معنی عیش کی زندگی، گزران اور "راضیۃ" کے معنی نہایت ہی پسندیدہ اسی طرح مرضیہ کا معنیٰ ہوتا ہے۔ خواہش کے مطابق من مانی زندگی، مقصد یہ کہ جس انسان کے اعمال وزن دار نکلیں گے، اُسے وہاں عیش و آرام کی زندگی نصیب ہوگی۔ کہ اب جزائے عمل کی زندگی شروع ہو جائے گی۔

جہنم کا گڑھا

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اعمال کا تولنا دو طریقے پر ہوگا۔ پہلے مرحلے میں کفار اور اہل ایمان کے اعمال الگ الگ تولے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ کافروں کے اعمال نامے ان کے کفر کی وجہ سے بالکل بے وزن ہوں گے۔ لہذا انہیں الگ کر دیا جائے گا۔ یہ بالکل ہلکے ہوں گے۔ انہیں کے متعلق فرمایا وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ یعنی جن کے اعمال ہلکے ہوں گے۔ "فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ" ان کا ٹھکانا جہنم کا گڑھا ہوگا۔ حقیقت میں ثقل تو ایمان اور توحید کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جو اعمال ان بنیادی چیزوں سے خالی ہوں گے، وہ لامحالہ بے حقیقت اور وزن سے خالی ہوں گے۔ لہذا ایسے لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

اعمال تولے جائیں گے

جب کفار کے اعمال نامے الگ کر دیئے جائیں گے۔ تو اب اہل ایمان کے اعمال کا وزن شروع ہوگا۔ تاکہ ان کی نیکیوں اور بدیوں کا مقابلہ کیا جا سکے، کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتا رہا ہے۔ اگر نیکیوں کا وزن زیادہ ہوگا۔ تو وہ شخص کامیاب ہو جائے گا۔ اور اگر بدیاں وزن میں زیادہ نکلیں، تو ایسا شخص سزا کا مستحق ہوگا، مگر کفار کی طرح یہ سزا دائمی نہیں ہوگی۔ بلکہ گناہوں کی مقدار کے مطابق سزا بھگت کر رہائی حاصل کر لے گا۔

بعض فرماتے ہیں[1]۔ کہ سورۃ کہف کی آیت "فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا" کفار کے حق میں ہے۔ چونکہ ان کے اعمال میں وزن ہی نہیں ہوگا۔ لہذا انہیں تولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بلکہ ایسے لوگ سیدھے جہنم میں جائیں گے[2] بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے۔ بعض لوگوں کے اعمال اس قسم کے ہوں گے کہ انہیں

---

1 تفسیر کبیر ص ۲۳/۳۲ج ، تفسیر خازن ص ۲۸۴/۷ج ، 2 تفسیر خازن ص ۲۸۴/۷ج

قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جائے گا۔ تاہم تولے جانے کا عمل برحق ہے۔ میزان بھی برحق ہے۔ اور اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ یہاں پر یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اعمال کو اسلیے تولیں گے کہ اسے انکی حقیقت کا علم نہیں۔ بلکہ وہ تو علیم کل ہے۔ بغیر تولے بھی ہر چیز سے واقف ہے۔ تاہم یہ وزن مخلوق کے سامنے اتمامِ حجت کے لیے ہوگا۔ اب جو شخص دنیا میں صراطِ مستقیم پہ چلے گا۔ اُسے پل صراط پہ چلنا بھی آسان ہوگا۔ اور جو دنیا میں راہِ راست پہ گامزن نہیں ہوا وہ وہاں بھی نہیں چل سکے گا۔ بہرحال وزنِ اعمال کے سارے ضابطے طے کرنا ہوں گے۔

ایمان، اخلاق اور اتباعِ سنت

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اعمال میں وزن تین چیزوں کا ہوتا ہے۔ یعنی ایمان، اخلاق اور اتباعِ سنت۔ جس شخص میں ایمان ہوگا۔ اس کا عمل وزنی ہوگا۔ اور جس میں جس قدر اخلاص ہوگا۔ اُسی قدر اس کے اعمال میں ثقل ہوگا۔ اور جس شخص کے اعمال زیادہ سے زیادہ سنت کے مطابق ہوں گے۔ ان میں وزن اور ثقل بھی زیادہ ہوگا۔ دوسری طرف جس آدمی میں ایمان ہی نہیں، اس کا عمل بالکل بے وزن ہوگا۔ اور اگر ایمان موجود ہے تو پھر دیکھا جائے گا کہ اس کے اندر اخلاص کس ڈگری کا ہے۔ اور اتباعِ سنت کس درجے کا ہے اسی کے مطابق اعمال میں وزن ہوگا۔ اعمال میں وزن کا مدار اخلاق اور اتباعِ سنت پہ ہوگا۔[1] اور اس کے لیے عقیدے کی درستگی لازم ہے۔ اگر عقیدے میں ذرہ برابر بھی کہیں رخنہ آجائے، انسان کے ایمان میں فرق آجائے۔ کفر، شرک یا نفاق پیدا ہوجائے، الحاد یا دہریت میں مبتلا ہوجائے تو اعمال میں قطعاً کوئی وزن نہیں رہے گا۔

بعض ایسے لوگ ہوں گے جن کے اعمال مقدار میں تھوڑے ہوں گے۔ مگر وزن میں بھاری ہوں گے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت[2] میں آتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا أَخْلِصْ دِينَكَ يَكْفِكَ الْقَلِيلُ مِنَ الْعَمَلِ یعنی اپنے دین میں اخلاص پیدا کرو، تھوڑا عمل بھی کفایت کرے گا۔ مثال کے طور پہ ایک شخص ایک ہزار نفل پڑھتا ہے اور دوسرا شخص صرف دس، مگر دس نفل نہایت خلوص کے ساتھ ادا کیے گئے ہیں۔ تو ان کا وزن ہزار کی نسبت زیادہ

---

[1] تفسیر مظہری صـ ۳۳۲ ج ۱۰، تفسیر خازن صـ ۲۸۴ ج ۷۔ [2] فیض القدیر شرح جامع صغیر صـ ۲۱۶ ج ۱ عن معاذؓ

ہو گا۔ کیونکہ ان میں اخلاص کی کمی تھی۔ اسی طرح کوئی شخص دو رکعت سنت نبوی کے عین مطابق ادا کرتا ہے۔ مگر دوسرا شخص لاپرواہی کے ساتھ ہزار رکعت بھی ادا کرتا ہے تو ان کا وزن دو رکعت کے برابر نہیں ہوگا۔

آگ کا گڑھا

بہرحال جن کے اعمال نامے خفیف ہوں گے یعنی ہلکے ہوں گے، ان کا ٹھکانا ھاویہ ہو گا۔ فرمایا وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا هِيَهۡ آپ کو کیا معلوم کہ وہ گڑھا کیا ہے، پھر خود ہی جواب ارشاد فرمایا نَارٌ حَامِيَةٌ وہ کوئی خالی خولی گڑھا نہیں ہے۔ بلکہ بھڑکتی ہوئی آگ کا گڑھا ہے۔ وہ آگ جس کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] اس کی تپش دنیا کی آگ سے انہتر گناہ زیادہ ہوگی۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضور! جلانے کے لیے تو یہ آگ بھی کافی ہے۔ فرمایا ٹھیک ہے مگر دوزخ کی آگ اس آگ سے اتنی ہی زیادہ تیز ہوگی۔ تو گویا اللہ تعالیٰ نے جزائے عمل کا مسئلہ واضح کر دیا۔ کہ ایماندار اپنی پسندیدہ عیش میں ہوں گے کیونکہ ان کے اعمال وزنی ہوں گے۔ برخلاف اس کے جن کے اعمال ہلکے ہوں گے، وہ بھڑکتی ہوئی آگ کے گڑھے میں پھینکے جائیں گے۔

حاصل کلام

اس سے پہلی سورۃ میں انسان کی دو بیماریوں یعنی ناشکرگزاری اور مال کی محبت کا ذکر کیا گیا تھا اور پھر نصیحت کی گئی تھی۔ کہ ان بیماریوں کا علاج کرو۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرو۔ اور مال کی محبت میں اس قدر منہمک نہ ہو جاؤ کہ فرائض سے ہی غافل ہو جاؤ۔

اس سورۃ میں اس بات کی تلقین کی گئی ہے۔ کہ اپنے اعمال میں ثقل پیدا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت والے دن اعمال بے وزن نکلیں۔ اور ہم پسندیدہ عیش کی بجائے آگ کے گڑھے میں جا گریں۔ جزائے عمل کی منزل قطعی طور پر آنے والی ہے۔ لہذا انسانوں کا فرض ہے۔ کہ اپنے عقیدے کی اصلاح کریں۔ ایمان کی فکر کریں۔ اور اعمال میں وزن پیدا کرنے کی سعی کریں۔ اعمال میں اخلاص پیدا کریں اور سنت نبوی کے مطابق ادائیگی کریں تاکہ قیامت کے دن خفت اور رسوائی سے بچ جائیں۔

---

[1] مسند احمد ص ۴۷۸ ج ۲، مسلم ص ۳۸۱ ج ۲

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

سُورَةُ التَّكَاثُرِ

درس (مکمل سورۃ)

سُوْرَۃُ التَّکَاثُرِ مَکِّیَّۃٌ وَّهِیَ ثَمَانُ اٰیَاتٍ

سورۃ تکاثر مکی ہے اور یہ آٹھ ۸ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ ۝۱ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۳
ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۴ کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ ۝۵ لَتَرَوُنَّ
الْجَحِیْمَ ۝۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ ۝۷ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ
النَّعِیْمِ ۝۸ ع ۱ ۸ ۲۷

ترجمہ:۔ غفلت میں ڈال رکھا ہے تم کو کثرت کی طلب نے ① یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کرو (یعنی قبروں میں جا پڑو) ② خبردار! تم عنقریب جان لوگے ③ پھر خبردار! تم عنقریب جان لوگے ④ خبردار! اگر تم یقینی علم کے ساتھ جانتے (تو ایسا ہرگز نہ کرتے) ⑤ البتہ تم دیکھوگے جہنم کو ⑥ پھر تم البتہ اس کو یقین کی آنکھ سے دیکھوگے ⑦ پھر تم سے پوچھا جائے گا اس دن نعمتوں کے بارے میں ⑧

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سورۃ التَّکَاثُر ہے۔ اس کی پہلی آیت میں تکاثر کا لفظ مذکور ہے اسی سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔ تکاثر کا معنیٰ کثرت کا طلب کرنا ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی آٹھ ۸ آیتیں اٹھائیس ۲۸ الفاظ اور ایک سو بیس ۱۲۰ حروف ہیں۔

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط سورۃ عادیات کی آخری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان کو اس حالت کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ جب انہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا۔ اور سینے کے تمام رازوں کو آشکارا کیا جائے گا۔ اور پھر جس کے اعمال بھاری ہوں گے اُسے پسندیدہ زندگی میسّر آئے گی اور جن کے اعمال نامے ہلکے ہوں گے ان کا ٹھکانا بھڑکتی ہوئی آگ کا گڑھا ہوگا۔

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن اسباب کا ذکر کیا ہے۔ جن کی وجہ سے انسان اپنے اصلی مقصد سے غافل ہو جاتا ہے۔ اور وہ کیا وجہ ہے۔ جس کی وجہ سے انسان اپنے مقاصد حقیقیہ کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ جن کا ذکر سورۃ "لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا" میں کیا گیا ہے۔ تمام انسانوں کا فرض ہے کہ "وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ" یعنی خالص اللہ کی عبادت کریں۔ اور اس کے لیے اپنی عبادت میں اخلاص اختیار کریں۔ حنیف بن جائیں، نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیں، یہی ملتِ قیّمہ ہے۔ یعنی عقائد کی اصلاح اور خدا تعالیٰ کی راہ میں بدنی اور مالی قربانیاں جن کی بنا پہ انسان کو فلاح نصیب ہو سکے۔

مال کی محبت

انسان کو فرائض منصبی سے غافل کرنے والی چیزوں میں مال کی محبت سرِفہرست ہے یہاں پہ اس بات کو تکاثر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "اَلْهٰکُمُ التَّکَاثُرُ" تم کو کثرت کی طلب نے غفلت میں ڈال رکھا ہے حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کر دیعنی مر کر قبروں میں پہنچ جاؤ۔ تکاثر میں مال، اولاد، دنیا کا ساز و سامان اور جماعت سب کچھ شامل ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ لوگ دنیا کے مال و دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر اپنے حقیقی مقاصد یعنی اپنے مالک کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتے۔ ان کو یہی دھن لگی رہتی ہے۔ کہ جس طرح بھی ممکن ہو مال و دولت حاصل ہو، خاندان بڑا ہو، جتھا اور جماعت غالب آئے۔ فرمایا تم انہیں چیزوں کی طلب اور حرص میں مبتلا رہتے ہو۔ اور یہی وہ چیز ہے۔ جو تمہیں فرائض منصبی سے غافل بناتی ہے۔ یہاں تک کہ تم مر کر قبروں میں پہنچ جاتے ہو۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی[1] ہے یَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِیْ مَالِیْ یعنی اے آدم کے بیٹے تم میرا مال، میرا مال ہی کہتے رہتے ہو۔ حالانکہ تمہارا مال وہ ہے جو تم نے کھا کر ختم کر دیا یا پہن کر بوسیدہ کر دیا۔ یا اپنے ہاتھ سے صدقہ کر کے آگے بھیج دیا۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِکُہٗ تم اسے چھوڑ کر جانے والے ہو۔

---

[1] مسلم صفحہ ۴۰۷ ج ۲، ترمذی صفحہ ۳۳۹

یایسے مال کے وارث کوئی اور ہوں گے۔ آج تم جس مال کے لیئے تگ ودو کر رہے ہو، اور میرا مال میرا مال کہتے ہو، وہ تمہارا نہیں۔ تمہارے کام وہی آئے گا۔ جو تم نے کھا لیا۔ پہن لیا یا آگے بھیج دیا۔ یہ مکان، جائیداد، کوٹھی، باغ، موٹر تمہارے نہیں ہیں۔

میت کے تین ساتھی

حضور علیہ السلام[1] نے فرمایا جب انسان مرجاتا ہے، تو تین چیزیں اس کے ساتھ جاتی ہیں اَھلُہٗ وَمَالُہٗ وَعَمَلُہٗ یعنی اس کا مال، اہل وعیال اور عمل۔ مُردے کو دفن کرنے کے بعد دو چیزیں واپس آجاتی ہیں اور صرف ایک چیز اس کے ساتھ رہتی ہے۔ فرمایا مال اور اہل واپس آجاتے ہیں۔ اور عمل اس کے ساتھ رہتا ہے۔ مال اور اہل جن کی فکر میں انسان زندگی بھر ڈوبا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا، نہ اس کی ذات کی طرف، نہ صفات کی طرف، نہ احکام کی طرف، نہ افعال اور نہ اس کے دین کی طرف وہی مال اور اولاد اُسے قبر میں چھوڑ کر واپس چلی آتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ مال و دولت کی بہتات نے تمہیں غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ موت آجاتی ہے۔ اور انسان قبروں میں پہنچ جاتے ہیں یہ لوگ قبروں میں پہنچ کر نہایت ہی افسوس اور ندامت کا اظہار کریں گے مگر وہاں ان کا افسوس کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ کاش کہ وہ اس دنیا میں اپنے حقوق و فرائض کو سمجھتے اللہ کی طرف رجوع کرتے، اس کے احکام کی پیروی کرتے، مال میں اس قدر منہمک نہ ہو جاتے تو آج انہیں حسرت ویاس کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

علم الیقین

فرمایا کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ بس مرنے کی دیر ہے۔ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ کہ تم نے بہت غلط کام کیا۔ تاکیداً دوبارہ فرمایا ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ تم بہت جلد جان لوگے کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ اگر تم یقینی علم کے ساتھ جانتے کہ جزائے عمل ضرور واقع ہو گا۔ اور اس کے مطابق اپنا عمل جاری رکھتے، تو آگے چل کر کوئی دشواری لاحق نہ ہوتی۔ اس چیز کو بار بار سمجھایا گیا ہے۔ کہ انسان کا مکلف ہونا جزائے عمل کے لیے مستلزم ہے۔ جس طرح پیدائش کے ساتھ موت لازم ہے۔ اسی طرح جزائے عمل بھی لازم ہے۔ اگر انسان غور و فکر کرتا تو اُسے ضرور یقینی علم حاصل ہو جاتا۔ مگر افسوس کہ انسان اس طرف توجہ نہیں کرتا۔

---

[1] مسلم صفحہ ۴۰۷ ج ۲

فرمایا لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ تمہیں یقین اُس وقت آئے گا، جب جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ حالانکہ یہ یقین تمہیں اس دنیا میں ہونا چاہیئے، تاکہ تمہیں خوف پیدا ہو اور تمہیں معلوم ہو کہ "فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ" اگر انسان غور کرے تو اُسے جنت اور جہنم اسی دنیا میں نظر آجاتے ہیں۔ بشرطیکہ تم یقین کے ساتھ جانتے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم یقین سے محروم ہو، اسی لیے تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ جب جہنم سامنے نظر آئے گی، اس وقت تمہیں یقین آئے گا۔ اس وقت تم یقین کی آنکھ سے دیکھو گے۔ اور افسوس کا اظہار کرو گے کہ ہم کس گمراہی میں مبتلا تھے۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ۔ "پھر البتہ تم اس کو یقین کی آنکھ سے دیکھو گے۔

انعامات الٰہی کے متعلق بازپرس

فرمایا ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ پھر تم سے اس دن پوچھا جائے گا۔ کہ میرے عطا کردہ انعامات کی تم نے کیا قدردانی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا سلسلہ بڑا وسیع ہے، ترمذی شریف[1] کی روایت میں آتا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا، کہ قیامت کے دن اللہ کے بندوں کو کھڑا کیا جائے گا۔ پھر اُن سے چار باتوں کا سوال کیے بغیر ان کے قدم نہیں اُٹھنے دیں گے۔ عَنْ عُمُرِهٖ اللہ تعالیٰ عمر کے متعلق سوال کریں گے فِيْمَا اَفْنَاهُ اُسے کس چیز میں فنا کیا۔ عمر جیسی عظیم نعمت کو کیسے بسر کیا۔ اور عَنْ جِسْمِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ پھر جسم کے متعلق سوال ہوگا۔ وَعَنْ عِلْمِهٖ فِيْمَا فَعَلَ کہ علم کے مطابق تم نے کیا کام کیا۔ اور چوتھا سوال مال کے متعلق ہوگا۔ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ یعنی مال کہاں سے کمایا تھا، اور کہاں خرچ کیا تھا۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے "وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔ نیز یہ بھی کہ "وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا فضول خرچی مت کرو" "وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ" اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جس طرح ناجائز طریقے سے کمانا حرام ہے اسی طرح حرام جگہ پر خرچ کرنا بھی وبال ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ کی مادی نعمتوں کے متعلق یہ سوال ہوں گے۔

---

[1] ترمذی ص۳۴۸۔

اسی لیے فرمایا ثُمَّ لَتُسۡئَلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ

صحت اور فراغت

امام جعفر صادقؒ کی تفسیر[1] کے مطابق ہر مادی نعمت کے متعلق سوال ہوگا ترمذی شریف کی روایت میں[2] ہے۔ نِعۡمَتَانِ مَغۡبُوۡنٌ فِیۡهِمَا کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ دو چیزیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔ وہ دو چیزیں کون سی ہیں؟ اَلصِّحَّةُ وَالۡفَرَاغُ ایک تندرستی اور دوسری فراغت۔ انسان صحت و تندرستی کی حالت میں فضول کاموں میں لگا رہتا ہے۔ اچھے کام نہیں کرتا مگر جب صحت جواب دے دیتی ہے۔ تو افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ مگر اس وقت کا افسوس کرنا کسی کام نہیں آتا۔ اسی طرح جب آدمی کو فراغت میسر ہوتی ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا کر اچھے کام نہیں کر پاتا، مگر جب مشغول ہو جاتا ہے تو پھر اچھے کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اسی لیے فرمایا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی دو بڑی نعمتیں یعنی صحت اور فراغت میسر آتی ہیں، مگر اُن سے بروقت فائدہ نہ اٹھا کر نقصان میں رہتے ہیں۔

کوئی نعمت حقیر نہیں

صحابہ کرامؓ بیان کرتے[3] ہیں کہ حضور علیہ السلام یُعَظِّمُ النِّعۡمَةَ وَاِنۡ دَقَّتۡ ہر نعمت کی تعظیم کرتے تھے اگرچہ وہ چھوٹی سے چھوٹی کیوں نہ ہو لہٰذا کسی نعمت کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ قدر کرنا چاہیے۔ اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ نعمت کو صحیح مقام پر خرچ کرنے سے شکریہ ادا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں۔ جنہیں وہ شمار نہیں کر سکتا۔ وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا ط اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَظَلُوۡمٌ کَفَّارٌ انسان تو ایک بال کا حق ادا نہیں کر سکتا خواہ ساری عمر بڑی سے بڑی عبادت کرتا رہے

قرآن اور حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ

اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے دو بڑی عظیم نعمتیں ہیں۔ امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں[4] کہ ان میں سے ایک قرآن ہے۔ اور دوسری حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ۔ ان دونوں نعمتوں کے متعلق بھی قیامت کو سوال ہوگا۔ تو نے قرآن پاک کے پروگرام کو مانا یا

۱؎ روح المعانی صـ ۲۲۶/ج ۳۰ ، ۲؎ ترمذی صـ ۲۳۵

۳؎ شمائل مع ترمذی صـ ۵۸۴ ۴؎ روح المعانی صـ ۲۲۶/ج ۳۰

نہیں۔ اگر مانا تو اس کے مطابق عقیدہ درست کیا؟ اور اس پر عمل کیا؟ اسی طرح حضور علیہ السلام کی ذاتِ مبارکہ پر ایمان لائے یا نہیں؟ اور پھر آپ کا اتباع کیا یا نہیں

خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا[1] کہ میرے بارے میں تم سے سوال ہوگا۔ کہ اللہ کے پیغمبر نے اللہ کا پیغام پہنچایا یا نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا حضور! بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ حضرت! آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ امانت ادا کر دی، نصیحت کا حق بھی ادا کر دیا۔

کھجور اور پانی

ایک دفعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابوالہیثم بن التیہان رضی اللہ عنہ کے باغ میں تشریف لے گئے[2] آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ابوالہیثم رضی اللہ عنہ کہیں دور پانی لینے گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی گھر میں موجود تھی۔ آپ کے دریافت کرنے پر اس عورت نے بتایا کہ اس کا خاوند پانی لینے کے لیے گیا ہوا ہے۔ اتنے میں وہ بھی پانی کا مشکیزہ اٹھائے آ گیا۔ حضور علیہ السلام کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ کہ حضور علیہ السلام غیر متوقع طور پر اس کے گھر تشریف لائے اس شخص نے اپنے باغیچے میں مہمانوں کے لیے چٹائی بچھائی، پھر کھجوروں کا خوشہ توڑ کر لایا اور پیش کیا۔ آپ سب نے اس میں سے پکی پکی کھجوریں تناول فرمائیں، اور میٹھا پانی نوش فرمایا۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام نے ناصحانہ انداز میں فرمایا هٰذَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مِنَ النَّعِیْمِ الَّذِیْ تُسْئَلُوْنَ عَنْهُ یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں قیامت کو سوال ہوگا۔ رُطَبٌ طَیِّبٌ وَمَاءٌ بَارِدٌ یعنی یہ پاکیزہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی اللہ تعالیٰ کے انعام ہیں۔

روٹی بھی انعام ہے پانی بھی انعام ہے۔ انسان کا جسم بھی انعام ہے۔ اس کا کام کرنا بھی انعام ہے۔ ان کے متعلق انسان سے سوال کیا جائے گا۔ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ کہ تم نے ان نعمتوں کی کیا قدر کی۔

---

[1] مسلم ص ۳۹۶ ج ۱، [2] شمائل مع ترمذی ص ۵۹۸

فضیلت سورۃ

یہ سورۃ مبارکہ بڑی فضیلت والی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] کیا تم میں سے کوئی طاقت رکھتا ہے۔ کہ ہر دن یا ہر رات قرآن کریم کی ایک ہزار آیات تلاوت کرے ایک ہزار آیت قرآن پاک کا تقریباً چھٹا حصہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ حضور! ہم اتنی طاقت تو نہیں رکھتے۔ فرمایا۔ سورۃ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ایک ہزار آیت کے برابر ہے۔ جس طرح سورۃ زلزال کو نصف قرآن فرمایا۔ اس طرح اس سورۃ کو چھٹا حصہ فرمایا۔ اگر انسان صرف ایک سورۃ پر بھی غور و فکر کرلے اس کے مفہوم کو سمجھ لے اور اس کے مطابق اپنی فکر بنا لے تو کامیابی کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ ان اٹھ آیتوں کا تلاوت کرنا اتنا آسان ہے۔ کوئی لمبا چوڑا کام نہیں مگر اس کا اجر بڑا عظیم ہے۔

---

[1] روح المعانی ص ۲۲۳ / ج ۳۰

سُورَةُ العَصرِ

العصر ۱۰۳
(مکمل سورۃ)

عمّ ۳۰
درس

سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُ اٰيَاتٍ

سورۃ عصر مکی ہے اور یہ تین ۳ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③ ع ۳ / ۲۸

ترجمہ:- قسم ہے عصر کی ① بے شک تمام انسان البتہ خسارے میں ہیں ② مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی ③

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سورۃ العصر ہے۔ اس کی پہلی آیت میں عصر کا لفظ آیا ہے۔ جس سے یہ نام اخذ کیا گیا ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی تین ۳ آیات ہیں۔ اور یہ سورۃ چودہ ۱۴ الفاظ اور اڑسٹھ ۶۸ حروف پر مشتمل ہے۔

اس سورۃ کو قسم سے شروع کیا گیا ہے۔ اس میں انسانیت کی کامیابی کے لیے چار اٹل اصول بیان کیے گئے ہیں۔ جن کا نتیجہ قطعی طور پر سامنے آئے گا۔ اور اگر لوگ ان اصولوں کو اپنا لیں گے تو انہیں ضرور سعادت نصیب ہوگی۔

عصر کا مفہوم وَالْعَصْرِ قسم ہے عصر کی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ عام طور پر عصر سے زمانہ مراد لیا جاتا ہے۔ تاہم اس مقام پر عصر سے مراد عصر کی نماز بھی ہو سکتی ہے۔ عصر سے مراد خاص زمانہ یعنی حضور نبی علیہ السلام کا زمانہ بھی ہو سکتا ہے[2]۔ اگر ایسا ہے، تو بڑا مبارک اور فضیلت والا

---

[1] روح المعانی ص ۲۲۷ ج ۳۰، معالم التنزیل ص ۲۵۱ ج ۴ [2] بیضاوی ص ۴۳۸ ج ۲

زمانہ ہے۔ یہ کمالات کے لیے سب سے افضل زمانہ ہے۔ اس میں نبوت کے انوار کا ظہور ہوا۔ حضور علیہ السلام نے خود ارشاد فرمایا[۱] خَيْرُ اُمَّتِي قَرْنِي سب سے بہتر زمانہ میرا ہے اس کے بعد میرے صحابہؓ کا زمانہ اور پھر ان سے ملنے والے لوگوں کا۔ گویا خیر و برکت کے اعتبار سے یہ بہترین زمانہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

نمازِ عصر صلوٰۃ وسطیٰ

اگر عصر سے مراد صلوٰۃ العصر ہے۔ تو اسکی اہمیت مسلّم ہے۔ عصر کا وقت ایسا ہے جب دنیا بھر کے لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں۔ یہ وقت ان کے سود و زیاں کا وقت ہوتا ہے اس لیے بسا اوقات یہ نماز رہ جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[۲] مَنْ فَاتَتْهُ الْعَصْرُ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ جس شخص کی عصر کی نماز فوت ہو گئی، یوں سمجھو کہ اس کا اہل اور مال سب کو ہلاک کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اس نماز کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ" سب نمازوں کی حفاظت کرو، خاص طور پر صلوٰۃ وسطیٰ کی۔ غزوہ خندق کے موقع پر حضور علیہ السلام کی چار نمازیں فوت ہو گئیں تھیں۔ جن میں عصر کی نماز بھی شامل تھی۔ اس پر آپ کو صدمہ ہوا تھا۔ اور آپ نے مشرکین کے حق میں بددعا فرمائی تھی[۳] کہ اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں کو اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے کیونکہ شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى انہوں نے ہمیں عصر کی نماز نہیں پڑھنے دی۔ فوت شدہ نمازیں آپ نے مغرب اور عشاء کے درمیان قضا کیں۔ مقصد یہ کہ عصر سے مراد نمازِ عصر بھی ہو سکتا ہے۔

انسانی عمر قیمتی سرمایہ ہے

زمانے سے انسان کی عمر بھی مراد ہو سکتی ہے۔ یہ قلیل سی عمر انسان کا قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر انسان اس پونجی سے کوئی قیمتی سامان خرید لے۔ تو وہ اس کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کار آمد ہو گا۔ ورنہ انسان خسارے میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور زمانے سے تاریخ بھی مراد لی

۱؎ بخاری ص ۵۱۵ ج ۱، مسلم ص ۳۰۹ ج ۲، ترمذی ص ۲۲۳۔ ۲؎ مسلم ص ۲۲۶ ج ۱، بخاری ص ۷۸ ج ۱، ترمذی ص ۵۲
۳؎ مسلم ص ۲۲۶ ج ۱۔

جا سکتی ہے۔ تاریخ واقعات کو محفوظ رکھتی ہے۔ تو والعصر کا معنی یہ ہوا کہ تاریخ گواہ ہے۔ کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ تمام انسان خسارے میں ہیں۔ انسانوں کے تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دنیا میں بیشتر انسان خسارے میں ہی مبتلا رہے۔ ان کے حالات ان کی لڑائیاں فسادات اعمال، کردار اور عقائد جس چیز کا بھی مطالعہ کریں معلوم ہوگا کہ انسان نقصان میں مبتلا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عمر جیسا قیمتی سرمایہ دے کر بھیجا تھا کہ دنیا میں جا کر آخرت کے لیے کوئی اچھا سامان خرید لاؤ۔ مگر اکثر و بیشتر انسان اس پونجی کو ضائع کر دیتے ہیں۔

صحیح حدیث میں حضور علیہ السلام کا ارشاد[1] ہے کُلُّ النَّاسِ یَغْدُوْا فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا ہر رات کے بعد جب صبح ہوتی ہے تو انسان اپنے نفس کو بیچتا ہے اور ایسا سامان خریدتا ہے جو یا تو اس کے نفس کو آزاد کر دیتا ہے یا ہلاک کر دیتا ہے۔ جو شخص اپنے نفس کو آزاد کر دیتا ہے اسے ہمیشہ کے لیے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ عمر جیسی قیمتی چیز ہر آن ہر گھڑی کم ہوتی رہتی ہے۔ اس کی مثال برف جیسی ہے کہ اوپر سے بخاروں کی تپش ہے اور نیچے حبس زیادہ ہوتا ہے۔ اس مہینے میں اوپر سے بھی گرمی پڑتی ہے اور نیچے زمین میں بھی تپش ہوتی ہے اس لیے برف کے جلدی جلدی پگھلنے کا امکان ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی عمر بھی جلدی جلدی اور بتدریج ختم ہو رہی ہے اگر انسان نے اس سے بروقت کوئی فائدہ حاصل نہ کیا تو یہ پگھل کر ختم ہو جائے گی۔ اور پھر انسان ہمیشہ کے لیے خسارے میں پڑ جائے گا۔

عمر برف است و آفتاب تموز اندکے ماند و خواجہ غرہ ہنوز

حضور علیہ السلام نے قسم کے بارے میں یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ لَا تُقْسِمُوْا لِغَیْرِ اللّٰہِ یعنی اللہ کے سوا کسی اور کے نام کی قسم مت کھاؤ۔ جب بھی قسم کھاؤ، اللہ کی اس کی صفت کی قسم کھاؤ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا[2] لَا تَحْلِفُوْا بِالطَّوَاغِیْ یعنی طاغوت کے نام کی قسم نہ اٹھاؤ۔ اللہ کے سوا ہر باطل قوت جس کی پرستش کی جائے وہ طاغوت[3] ہے۔ قسم صرف اللہ کے نام کی ہونی چاہیئے

---

[1] مسلم ص 118 ج 1، [2] مسلم ص 46 ج 2، ابن ماجہ ص 152، [3] تفسیر درمنثور ص 230 ج 1

اسی طرح اپنے باپ دادا کے نام کی قسم نہ اٹھاؤ۔ ایک حدیث میں یہ بھی آتا ہے[1]۔ مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللّٰهِ فَقَدْ اَشْرَكَ۔ یعنی جس نے غیر اللہ کی قسم اٹھائی اُس نے شرک کا ارتکاب کیا۔

قسم بطور گواہی

قسم کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ بطور گواہی استعمال ہوتی ہے۔ دو فریقوں میں کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے۔ تو تصفیہ کے لیے دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو فریق گواہ پیش کر دیگا۔ اس کے حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔ اگر گواہ موجود نہ ہوں تو فریق ثانی کو یقین دلانے کے لیے اللہ کے نام کی قسم اٹھائی جاتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ قسم اٹھانے والا اللہ کو بطور گواہ پیش کرتا ہے۔ کہ اس معاملہ میں وہ حق پہ ہے۔

کسی معاملہ میں گواہی کے لیے دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر گواہان کی عدم موجودگی میں صرف ایک اللہ تعالیٰ کی گواہی بطور قسم پیش کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی گواہی، اس کی دو صفات یعنی علیم کُل اور قادر مطلق کی بنا پر دو گواہیاں تسلیم ہوتی ہیں۔ پہلی صفت علیم کُل ہونے کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہر چیز کو جاننے والا صرف اللہ ہے "اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" مخلوق میں سے کوئی شخص خواہ کتنا بھی عالم فاضل ہو، اس کا علم جزوی اور قلیل ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان "وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا" تو عالم الغیب والشہادۃ یا علیم کل صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دوسری صفت یہ ہے۔ کہ وہ قادر مطلق ہے "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" اُسے ہر چیز پہ قدرت حاصل ہے۔ لہذا جب کوئی شخص قسم اٹھاتا ہے۔ تو بخوبی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری ہر بات کو جانتا ہے۔ لہذا اگر میں جھوٹی قسم اٹھاؤں گا۔ تو وہ مجھے سزا دینے پر بھی قادر ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز کو جاننے والا کوئی اور نہیں ہے۔ الغرض قسم ایک گواہی ہوتی ہے۔ جو پیش کی جاتی ہے۔

ایمان اور عمل صالح

پوری تاریخ انسانی کو بطور گواہ پیش کیا کہ سب لوگ خسارے میں ہیں۔ البتہ بعض لوگ

---

[1] ترمذی صفحہ ۲۴

ایسے بھی ہیں۔ جو اس نقصان سے بچ جائیں گے۔ وہ کون لوگ ہیں۔ پہلے نمبر پہ فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ وہ لوگ ہیں، جنہوں نے ایمان کی دولت حاصل کی۔ دوسرے نمبر پہ فرمایا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جنہوں نے نیک اعمال انجام دیئے۔ یہ لوگ ابدی نقصان سے بچ جائیں گے۔ کافر اور منافق جو ایمان کی دولت سے محروم رہے۔ انہیں کے متعلق فرمایا "فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ" ان کی سوداگری نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ انہوں نے اپنی قیمتی پونجی لگا کر کفر و شرک اور نفاق کے سوا کچھ نہ خریدا۔ ان کی تجارت نے انہیں نقصان میں رکھا۔

ایمان مفصل

انسان کو چاہیئے کہ وہ عمر جیسی قیمتی پونجی کے عوض ایمان خریدے، جب تک ایمان موجود نہ ہو۔ عقیدہ درست نہ ہو، کوئی عمل قابل قبول نہیں۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ "وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا" جس نے اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسول اور آخرت کے دن کا انکار کیا، وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ باقی رہی یہ بات کہ ایمان کیا ہے۔ تو ہم ایمان مجمل اور مفصل میں پڑھتے ہیں اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ انسان اقرار کرتا ہے۔ کہ ان تمام چیزوں پر اس کا ایمان ہے۔ ایمان مجمل میں کہتے ہیں۔ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارًا بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقًا بِالْقَلْبِ۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کی ذات پہ اس کی تمام صفات سمیت ایمان لاتا ہوں۔ میں نے اس کے جملہ احکام قبول کیے اس بات کا زبان سے اقرار کیا اور دل سے تصدیق کی۔ میرا یہ بھی یقین ہے۔ کہ کائنات میں جو کچھ واقع ہوا یا ہوگا، اللہ کے علم اور مشیت کے مطابق ہے۔

نظریات کی درستگی

جس شخص نے ایمان کو درست کیا، اس کی فکر صحیح ہوگئی اس کے نظریات درست ہوگئے۔ ایمان کی درستگی نظریات کے صحیح ہونے کی علامت ہے۔ اب جو کام بھی کیا جائے گا۔ درست ہوگا اگر نظریات ہی غلط ہیں، تو ہر عمل ضائع ہوگا۔ الغرض اس مقام پر فلاح کے جو چار اصول بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سب سے اول نظریات کی تصحیح ہے

موجودہ دور میں اسے آئیڈیالوجی (IDIOLOGY) کہتے ہیں۔ تمام اعمال کا دارومدار اسی پر ہے کہ نظریات یا عقائد صحیح ہوں۔ چنانچہ قرآن پاک نے یہی بتایا "فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَھُوَ مُؤۡمِنٌ" جو آدمی بھی کوئی نیک کام کرے، بشرطیکہ وہ ایماندار ہو اس کی آیئڈیالوجی صحیح ہو۔ تو بہر حال اس کا جو بھی نام رکھ لیں مطلب ایک ہی ہے۔ اور قرآن پاک میں یہی بات مختلف طریقوں سے سمجھائی گئی ہے۔ کہ سب سے پہلا کام عقائد یا نظریات کی درستگی ہے[1] شاہ ولی اللہؒ اور شیخ مجدد الف ثانیؒ بھی یہی فرماتے ہیں[2] حضور علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ سے بھی یہی منقول ہے اور اسی کے مطابق اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔

جماعت کی اہمیت

فلاح کا تیسرا اصول جو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ وہ ہے وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ" یعنی ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرنا۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ اللہ کے دین اسلام میں اجتماعیت پائی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو حق بات کی تلقین کا تعلق جماعت سے ہے۔ یہ کام انفرادی نہیں۔ بلکہ اجتماعی ہے۔ پھر جماعت بھی وہ جس کے نظریات درست ہوں جس میں ایمان اور نیک اعمال موجود ہوں، جب تک ایک دوسرے کے ساتھ شریک نہ ہوں۔ جماعت قائم نہیں ہو سکتی۔ جماعت کا تو معنیٰ ہی یہ ہے۔ کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی ہو۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ جب یہ چیزیں امت میں پیدا ہو جائیں گی اور الٰہی پروگرام لے کر اٹھیں گے تو دنیا میں انقلاب برپا ہو گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے[3] کہ حضور علیہ السلام کے صحابہؓ جب ایک دوسرے سے ملتے تو سلام کے علاوہ سورۃ وَالۡعَصۡرِ پڑھ لیا کرتے تھے۔ اس سے آپس میں مشترکہ مشن کی یاد دہانی ہوتی تھی۔

حق کی وصیت

وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ" کے لفظ وصیت میں ایک بڑی حقیقت پوشیدہ ہے۔ وصیت اس وقت کی جاتی ہے۔ جب انسان دنیا سے رختِ سفر باندھ رہا ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں بار بار اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے" مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّۃٍ تُوۡصُوۡنَ بِہَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ" وراثت کی تقسیم کا جب وقت آتا ہے، تو حکم ہے کہ پہلے مرنے والے کی وصیت کو پورا کرو

---

[1] تفہیمات الٰہیہ ص ۱۲ ج ۱ [2] درمنثور ص ۳۹۲ ج ۶ روح المعانی ص ۲۲۷ ج ۳۰ تفسیر ابن کثیر ص ۵۴۷ ج ۴

یا اس کا قرضہ ادا کرو۔ اور پھر باقی ترکہ کو تقسیم کرو۔ مطلب یہ ہے۔ کہ وصیت اس چیز کی کیجاتی ہے۔ جو نہایت اہم ہو۔ تو یہاں پہ وصیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم خواہشات اور باطل نظریات سے بالکل الگ ہیں۔ ہمارا مشن محض حق ہے۔ اس لیے جہاں کہیں حق کے خلاف کوئی چیز پائی گئی۔ فوراً وصیت کر دی کہ اسے چھوڑ دو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہی مطلب ہے اور یہ جماعت کا کام ہے۔ تو گویا "تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ" میں جماعت کی ضرورت اور اہمیت کا مسئلہ بھی آگیا۔

صبر کی تلقین

فلاح کا چوتھا اصول جو یہاں بیان کیا گیا ہے وہ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ یعنی ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرنا۔ ہمارے مشن میں یہ بھی ضروری ہے۔ خواہشات نفسانی کو روکنے کے لیے صبر ایک ضروری امر ہے۔ انسان خواہشات کی بجائے عبادات اور نیکی کے دوسرے کاموں کی طرف راغب ہوتا ہے۔ کوئی حادثہ پیش آجائے یا کوئی مصیبت آجائے تو "اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ" کے مطابق اسے برداشت کرتا ہے اور صبر و نماز کے ساتھ استعانت حاصل کرتا ہے۔ تو یہ گویا نفس پہ کنٹرول کرنے کا چوتھا اصول ہے، جو یہاں بیان ہوا ہے کہ تکلیف کے وقت صبر سے کام لے جزع فزع نہ کرے۔ دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرے۔

فلاح کے چار اصول

ان چار اصولوں کو اس طرح سمجھنا چاہیئے جیسے گاڑی کے چار پہیئے ہوتے ہیں جس طرح گاڑی چار پہیوں کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اسی طرح ان چار اصولوں کو اپنائے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جو انسان ان اصولوں کو اپنا لے گا۔ ہمیشہ کے لیے کامیابی حاصل کرے گا۔ اور دنیا میں انقلاب برپا کرے گا ورنہ ہمیشہ کے لیے نقصان میں پڑ جائے گا۔ انسانی تاریخ یہی بتلا رہی ہے کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ انسان ہمیشہ گھاٹے میں ہیں، کیونکہ وہ کفر کرتے ہیں ان کے نظریات درست نہیں۔ شرک کرتے ہیں بدعات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایمان صحیح نہیں، سنت کا اتباع نہیں۔ برے اعمال کی کثرت ہے یہ سب ناکامی کے اسباب ہیں — انسان نے عمر کے قیمتی سرمائے سے غلط عقیدہ اور فاسد فکر خریدی ہے۔ ان کے قلب کی حالت اور اخلاق خراب ہو گئے ہیں حق کی بجائے

باطل کی تشہیر ہو رہی ہے۔ غلط چیزوں کا پراپیگنڈا ہو رہا ہے۔ حرام خوری، بداخلاقی، بدنظمی، کفر، شرک، فضول رسومات کی وصیت ہو رہی ہے حق گوئی سے روگردانی کی جا رہی ہے اس کا نتیجہ ہمیشہ کے لیے نقصان کی صورت میں نکلے گا۔

اس کے علاوہ یہ ہے کہ لوگ مصائب کے وقت اور نفس پہ کنٹرول کرنے کے وقت صبر کا دامن چھوڑ رہے ہیں۔ نہ اطاعت پہ دلجمعی ہے اور نہ جہاد فی سبیل اللہ کی طرف توجہ ہے صبر کی بجائے شور و شر، واویلا اور نوحہ ہو رہا ہے۔ زندگی کے ان چار اصولوں کو قرآن پاک میں مختلف مقامات پر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اور آخر میں خلاصے کے طور پہ یہ اصول اس سورۃ میں یکجا کر دیے ہیں۔ یعنی ایمان، اعمال صالحہ، ایک دوسرے کو حق کی تلقین اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین۔ اسی لیے فرمایا "اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا قف" صبر کرو، حق پہ جمے رہو، دوسروں کو بھی حق کی تلقین کرو۔ اور خود بھی صبر کرو۔ خدا سے ڈرتے رہو۔ ایمان میں پختگی اختیار کرو" وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ " تاکہ تم فلاح پا جاؤ

یہی باتیں لمبی سورتوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ یہاں پہ مختصر طریقے سے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے میں بات کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ انسان کی عمر، تاریخ زمانہ، یا عصر کا وقت یہ سب چیزیں شاہد ہیں۔ کہ بے شک انسان البتہ خسارے میں ہیں۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے، اچھے عمل کیے جنہوں نے ایک دوسرے کو حق اور سچے دین پر قائم رہنے کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کی، وہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فلاح پا جائیں گے۔

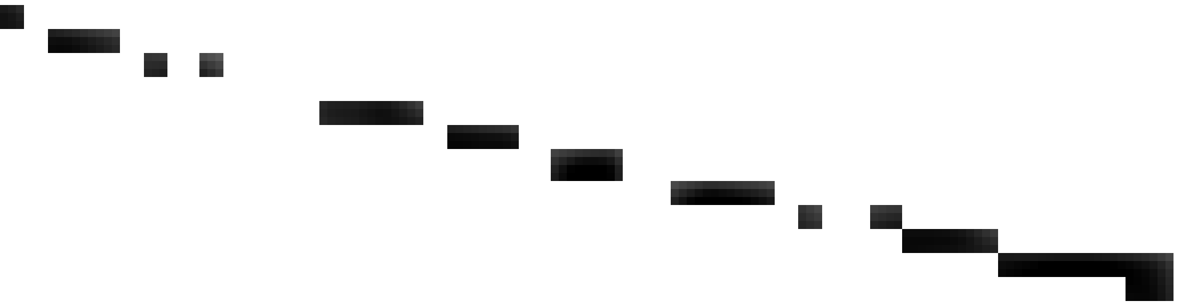

سورة الهمزة

درس (مکمل سورۃ)

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعُ اٰيَاتٍ

سورۃ ہمزہ مکی ہے اور یہ نو آیتیں ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۙ (۱) الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ (۲) يَحْسَبُ
اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ (۳) كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۡ (۴) وَمَآ اَدْرٰىكَ
مَا الْحُطَمَةُ ۭ (۵) نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ (۶) الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۭ (۷)
اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ (۸) فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۧ (۹) ع ۱ ۹ ۲۹

ترجمہ :- ہلاکت اور بربادی ہے ہر پس پشت غیبت کرنے والے اور روبرو طعن دینے والے کے لیے (۱) وہ جس نے مال اکٹھا کر رکھا ہے اور اُسے گنتا رہتا ہے (۲) کیا وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا ۔ (۳) خبردار ! ایسے شخص کو چور چور کر دینے والی میں ڈالا جائے گا (۴) اور آپ کو کس نے بتلایا کہ چور چور کر دینے والی کیا ہے (۵) اللہ تعالیٰ کی جلائی ہوئی آگ ہے (۶) جو دلوں پر چڑھ جاتی ہے (۷) یہ آگ ان پر بند کی ہوئی ہوگی (۸) لمبے لمبے ستونوں میں (۹)

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ الھمزۃ ہے ۔ اس کی پہلی آیت میں ہمزہ کا لفظ آیا ہے اور اُسی سے سورۃ کا نام اخذ کیا گیا ہے ۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی ، اس کی نو ۹ آیات ہیں ۔ یہ سورۃ تینتیس ۳۳ الفاظ اور چھیانوے ۹۶ حروف پر مشتمل ہے ۔

سابقہ اور آئندہ سورتوں کا خلاصہ

اس سے پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی کامیابی کے چار اصول بیان فرمائے تھے ۔ اس سورۃ میں افراد اور جماعت کی اس بیماری کا تذکرہ فرمایا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے صحیح پروگرام پر عمل نہیں کرتے یہ زرپرستی یا سرمایہ داری کی بیماری ہے

اللہ تعالٰی نے یہ سورۃ اسی کے ردّ میں نازل فرمائی ہے۔

اس سے اگلی سورۃ میں اللہ تعالٰی نے ملوکیت اور شہنشاہیت کا ردّ کیا ہے۔ یہ بھی انسانی پروگرام کے خلاف ہیں۔ اُس سے اگلی سورۃ میں قومیت پرستی یعنی نیشنلزم کا ردّ ہے اُس سے اگلی سورۃ میں چھوٹی مذہبیّت کا رد فرمایا ہے۔ کہ وہ بھی کام نہیں دے سکتی۔ اس کے بعد والی چھوٹی سی سورۃ میں اللہ تعالٰی نے چار اہم باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اس سے اگلی سورۃ میں یہ بات فرمائی ہے۔ کہ رجعت پسند کفار کے ساتھ صلح نہیں ہو سکتی۔ اِن کے ساتھ لامحالہ جنگ ہوگی۔ اور اگر اہل ایمان صحیح راستے پر قائم رہیں گے، تو انہیں فتح حاصل ہوگی۔ سورۃ فتح میں یہ اشارہ ہے۔ پھر محض سیاسی فتح کارگر نہیں ہوتی جب تک اُسکے ساتھ اخلاقی، اقتصادی اور مادی فتح حاصل نہ ہو۔ سورۃ لہب کا موضوع یہ ہے۔ اس کے بعد سورۃ اخلاص میں اسلام کے بنیادی نظریات یا آیڈیالوجی (IDIOLOGY) کا بیان ہے جس کے گرد ساری شریعت اور دین حرکت کرتے ہیں۔ اس سے مراد توحید خداوندی ہے۔

آخری دو سورتوں میں سے سورۃ فلق میں انسانیت کا کائنات کے ساتھ ربط بتلایا گیا ہے۔ اور آخری سورۃ "والناس" میں انسانیت کا ربط خدا تعالٰی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد ربط سورۃ فاتحہ کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جہاں سے قرآن پاک کی ابتداء ہوئی تھی۔ یہ ان سورتوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ جو میں نے عرض کر دیا۔

همزه اور لمزه۔

جیسا کہ عرض کیا ہے۔ اس سورۃ ھُمَزَہ میں افراد اور جماعت کی زر پرستی جیسی بیماری کا رد کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ہلاکت اور بربادی ہے پس پشت غیبت کرنے والے اور رُو برو طعن دینے والے کے لیے۔ دراصل یہاں پر تین باتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ یعنی ہمزہ، لمزہ اور زر پرستی۔ اول الذکر دو باتیں تیسری بات کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ جب کسی فرد یا جماعت میں زر پرستی کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اس کے ساتھ ہمزہ اور لمزہ شامل ہوتی ہیں۔

جہاں تک لفظ وَيْل کا تعلق ہے۔ قرآن پاک میں یہ لفظ شدت اور عذاب کے موقع پر استعمال کیا گیا ہے۔ جس طرح عربی زبان میں ویح کا لفظ افسوس اور ترحم کے

سے لیے آتا ہے۔ اسی طرح وَیْلٌ کا لفظ تباہی، بربادی یا ہلاکت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
ہمزہ اور لمزہ کے معنی میں مفسرین کرام نے اختلاف کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں[1] کہ ہمزہ پس پشت غیبت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ غیبت گناہ کبیرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "وَلَا یَغْتَب بَّعْضُکُم بَعْضًا" تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ یہ حرام ہے۔ اور لمز سے مراد کسی کو سامنے طعن دینا ہے۔ بعض[2] فرماتے ہیں کہ زبانی طعن کے ساتھ آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے کرنا بھی لمز میں داخل ہے کیونکہ لوگ ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے بھی عیب جوئی کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[3] کہ اَلْمَشَّاؤُنَ بِالنَّمِیْمَةِ یعنی غیبت کرنے والے شِرَارُ عِبَادِ اللّٰہِ مخلوق میں سب سے بُرے لوگ ہیں۔ ایسے لوگ اَلْبَاغُوْنَ الْبُرَآءَ الْعَنَتَ بری لوگوں کی عیب جوئی کرتے ہیں۔ یعنی بے گناہ لوگوں کی برائی کرتے ہیں الغرض ہمز کا معنیٰ غیبت کرنا اور لمز کا معنیٰ سامنے طعن دینا ہے۔ مگر یہ دونوں چیزیں انسانیت اور اخلاق سے گری ہوئی چیزیں ہیں۔ ایسے لوگ انسانوں کے گروہ سے نکل کر حیوانوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ارتکاز دولت

اب اس بیماری کا ذکر ہے۔ جس کی بنا پر ہمزہ اور لمزہ قابل مذمت ہیں فرمایا ہلاکت اور بربادی ہے اُس عیب جُو اور طعن باز کے لیے اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ جس نے مال اکٹھا کر رکھا ہے۔ اور اسے گنتا رہتا ہے۔ وہ دولت سے پیار اس لیے کرتا ہے کہ وہ اسے ہی کامیابی کا ذریعہ سمجھتا ہے، جو لوگ دولت سے محروم ہیں۔ ان کی عیب جوئی کرتا ہے۔ حتیٰ کہ نیکوکار، ہدایت کا راستہ بتلانے والے اور مصلح کی عیب جوئی سے بھی باز نہیں آتا۔ اس دور میں علماء کرام خاص طور پر ایسے لوگوں کے طعن کا نشانہ بنتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان مولویوں کے پاس روپیہ پیسہ تو ہے نہیں، یہ کیسے نظام حکومت چلا سکتے ہیں۔ پاکستان کے وزیر اعظم نے مفتی محمودؒ کی ذات پر رکیک حملے کیے تھے کہ یہ کیا حکومت چلائے گا۔ اس سے پہلے ایک صدر نے مفتی محمد شفیع مرحوم کو کہا کہ میں تم

---

[1] روح المعانی ص ۲۳۰ ج ۳۰، ابن کثیر ص ۵۴۸ ج ۴، درمنثور ص ۳۹۳ ج ۶ [2] درمنثور ص ۳۹۲ ج ۶ معالم التنزیل ص ۲۵۱ ج ۴
[3] مسند احمد ص ۲۲۶ ج ۴

سے زیادہ دین کو سمجھتا ہوں۔ حالانکہ مفتی صاحب مرحوم نے صدر کی توجہ عائلی قوانین کے غیر اسلامی ہونے کی طرف دلائی تھی۔ تو انہیں یہ جواب ملا تھا اس قسم کی ذہنیت سرمایہ پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس قماش کے لوگ دوسروں میں نقص نکالیں گے۔ عیب جوئی کریں گے، وجہ یہ ہے کہ وہ مال و دولت کو ہی کامیابی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ مال جمع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

اَلَّذِیْ جَمَعَ[29] میں جمع بھی پڑھا گیا ہے، اور جَمَّعَ بھی[1]۔ اس سے پہلے انتیسویں پارے میں گذر چکا ہے "وَجَمَعَ فَاَوْعٰی" جس نے مال جمع کیا اور سمیٹ کر رکھتا ہے۔ جمع کا معنی ہے۔ کہ وہ حلال و حرام کی تمیز کے بغیر مال اکٹھا کرتا ہے اور اَوْعٰی کا معنی ہے کہ اُسے سمیٹ سمیٹ کر رکھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ کہ وہ کنجوس بھی واقع ہوا ہے۔ اس میں بخل کا مادہ پایا جاتا ہے۔ ضرورت کے موقع پر خرچ نہیں کرتا۔

زر پرست کی خام خیالی

ایسے زر پرست اور سرمایہ دار کی حالت یہ ہے کہ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗ اس کا گمان ہے۔ کہ اس کا مال اُسے ہمیشہ رکھیگا یعنی احتساب سے بچائے رکھے گا۔ اُسے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ بلکہ اس کا سرمایہ ہر مقام پر اس کی مدد کرے گا۔ حالانکہ ایسے شخص کو سمجھ لینا چاہیئے کہ صرف سرمائے کو کامیابی کا مدار نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ یہ تو محض ایک ظاہری ذریعہ ہے۔ اس سے مکمل کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کامیابی اور فلاح کا اصل ذریعہ تو دین اور اخلاق ہے۔ اگر یہ نہیں ہوں گے تو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ آخرت میں مکمل ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ وہاں ایسے لوگوں کا بہت برا حشر ہوگا۔

سرمایہ دار کا حشر

فرمایا سرمایہ دارانہ ذہنیت کے لوگوں کا قیامت کو یہ حال ہوگا کہ کَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِ ایسے شخص کو چور چور کر دینے، روند دینے والی یا پامال کر دینے والی میں ڈالا جائے گا۔ پھر خود ہی استفہامیہ انداز میں فرمایا۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَۃُ آپ کو کس نے بتلایا کہ وہ چور چور کر دینے والی کیا چیز ہے۔ فرمایا وہ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ اللہ کی جلائی ہوئی

---

[1] تفسیر کشاف ص ۷۹۵ ج ۴ تفسیر بیضاوی ص ۴۳۹ ج ۲

آگ ہے۔ یعنی حطمہ دوزخ کی آگ ہے۔ جس میں عیب جُو، طعنہ باز، سرمایہ پرست کو دھکیل دیا جائے گا۔ اُسے اس وقت معلوم ہو گا۔ کہ جس سرمایہ پہ وہ دنیا میں فخر کرتا تھا۔ دوسروں کو حقیر سمجھتا تھا آج اُس کے کسی کام نہیں آیا۔ بلکہ وہی سرمایہ اس کی رسوائی کا سبب بن گیا۔ وجہ یہی ہے کہ ایسے شخص کی فکر صحیح نہیں تھی۔ دینداری کی بجائے سرمایہ داری اور خدا پرستی کی بجائے سرپرستی اس کا مذہب تھا۔

دوزخ کی آگ

آگ مختلف عناصر سے وجود میں آجاتی ہے۔ قدرتی آگ سورج کی ہے۔ مصنوعی طور پہ لکڑی یا کوئلہ وغیرہ جلا کر آگ حاصل کی جاتی ہے۔ مگر یہاں جس آگ کو نارُ اللّٰہ یعنی اللہ کی آگ کہا گیا ہے۔ وہ مذکورہ آگ میں سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مادہ انسان کے اپنے اندر موجود گناہ اور معاصی ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ آگ بھڑکتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے۔ کہ کسی گرم ملک میں دوپہر کے وقت سخت تپش ہو۔ اور اگر کوئی شخص خود بھی بخار میں مبتلا ہو یعنی اس کے اپنے جسم کے اندر بھی گرمی ہو۔ تو اس پہ دوپہر کا وقت کیسے گزرے گا۔ اس کے اندر کی گرمی باہر کی گرمی سے مل کر اُس کے لیے وبال جان بن جائے گی۔ اسی طرح سرمایہ دار اور زرپرست نے اپنے معاصی کا ایندھن جمع کر رکھا ہے۔ جب وہ دوزخ کی آگ کی لپیٹ میں آئے گا تو اس کی کیا حالت ہو گی۔ لہذا دوزخ کی اس آگ کو نارُ اللّٰہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان[1] ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ کو جلایا۔ یہ ہزار برس تک جلتی رہی۔ تو اس کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ مزید ایک ہزار سال تک جلتی رہی تو سفید ہو گئی۔ اس کے بعد ایک ہزار سال اور جلایا گیا تو اس کا رنگ سیاہ ہو گیا۔ اب اس کا رنگ سیاہ ہے۔ گنہگاروں کو اسی تاریک دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

آگ کا اثر دل پہ

یہ آگ ایسی ہے اَلَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَۃِ جو دلوں پہ چڑھ جاتی ہے۔ اس دنیا کی آگ کی خاصیت یہ ہے۔ کہ پہلے جسم کو جلاتی ہے اور پھر اس کا اثر اندر دل تک پہنچتا ہے مگر دوزخ کی آگ کی خاصیت یہ ہے۔ کہ جب وہ جسم سے ٹکرائے گی، تو اس کا اثر سب

---

[1] ترمذی ص ۳۷۱

سے پہلے دل پر ہوگا۔ وجہ یہ ہے۔ کہ دل مرکز اخلاق ہے۔ اس نے اس مرکز کو خراب کیا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے۔ اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہے۔ اور اگر وہ لوتھڑا خراب ہے تو سارا جسم خراب ہے۔ فرمایا اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ یہ لوتھڑا دل ہے۔ محبت یا نفرت کے تمام عزائم اسی دل میں پیدا ہوتے ہیں اس شخص نے مرکز اخلاق کو تباہ کیا۔ اس لیے جہنم کی آگ کا اثر سب سے پہلے قلب پر ہوگا۔ اس شخص نے لوگوں کے دل دکھائے، لوگوں پر ظلم کیے۔ یہ شخص وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا مال کو سمیٹ سمیٹ کر رکھتا رہا۔ یتیموں اور مسکینوں کا حق کھاتا رہا۔ اس نے حلال و حرام کی تمیز نہیں کی۔ حدود کی پابندی نہیں کی۔ دین اور اخلاق کی پروا نہیں کی۔ مکروہ اور مباح کا خیال نہیں کیا۔ اسی چیز کے متعلق فرمایا وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمًّا دوسروں کی وراثت بھی کھا جاتے ہیں۔ بہن اور پھوپھی کا حق بھی کھا جاتے ہیں۔ یہ لوگ جب دوزخ میں ڈالے جائیں گے تو آگ کا اثر پہلے دل پر ہوگا۔

دوزخ کی تلخی

اس آگ کی کیفیت کو مزید اس طرح بیان فرمایا إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ یہ آگ ایسے لوگوں پر بند کی ہوئی ہوگی کہاں فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ مطلب یہ ہے کہ آگ کے لمبے لمبے ستونوں میں مجرمین کو بند کر کے اوپر سے ڈھکنا دے دیا جائے گا۔ تاکہ وہ کسی طرف حرکت بھی نہ کر سکیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ تکلیف کے وقت اگر آدمی تھوڑی بہت حرکت کرے تو قدرے تخفیف محسوس ہوتی ہے۔ مگر جہنم کی آگ میں معمولی حرکت کی بھی گنجائش نہیں ہوگی۔ کیونکہ دوزخی آگ کے ستونوں میں بند کر دیے جائیں گے۔ اور پھر وہ جگہ بھی ایسی ہے۔ جہاں کسی کی آہ و بکا کچھ فائدہ نہ دے گی۔ کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان لوگوں کی بیماری ہی اسی قسم کی تھی۔ جس کا خمیازہ اسی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔ یہ ان کے انکارِ خدا، زر پرستی، ایذائے خلق، ظلم و زیادتی، عیب جوئی، طعنہ زنی اور سرمایہ پرستی کا

---

[1] مسلم ص ۲۸ ج ۲

نتیجہ ہے۔ انسان کو غور کرنا چاہیئے۔ کہ یہ کتنی سخت سزا ہے جس میں یہ لوگ گرفتار ہوں گے۔

سُورَةُ الفِيلِ

عَمَّ ۳۰ — الفیل ۱۰۵

درس — (مکمل سورۃ)

سُوْرَۃُ الْفِیْلِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ خَمْسُ اٰیَاتٍ

سورۃ الفیل مکی ہے اور یہ پانچ آیتیں ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ﴿۱﴾ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَھُمْ
فِیْ تَضْلِیْلٍ ﴿۲﴾ وَّاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ﴿۳﴾ تَرْمِیْھِمْ
بِحِجَارَۃٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ﴿۴﴾ فَجَعَلَھُمْ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ ﴿۵﴾ ع ۵/۳

ترجمہ :۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ﴿۱﴾ کیا خدا تعالیٰ نے ان کی تدبیر کو غلط نہیں کر دیا ﴿۲﴾ اور بھیجے ان پر پرندے غول در غول ﴿۳﴾ جو ان کو مارتے تھے پتھریاں کھنگر کی ﴿۴﴾ پس اللہ تعالیٰ نے ان کو کھائی ہوئی گھاس کی طرح پامال کر دیا ﴿۵﴾

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سورۃ الفیل ہے۔ عربی زبان میں فیل ہاتھی کو کہتے ہیں۔ اس سورۃ میں اصحاب فیل کا ذکر ہے۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی پانچ ۵ آیتیں ہیں۔ یہ سورۃ چوبیس ۲۴ الفاظ اور ننانوے ۹۹ حروف پر مشتمل ہے۔

موضوع گذشتہ سورۃ میں اللہ نے زرپرستی کی مذمت کی تھی اور اس کے برے نتائج سے آگاہ کیا تھا۔ اور مسلمانوں کو خبردار کیا تھا۔ کہ ایسے نظام کو قبول نہ کریں۔ اب اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے ملوکیت اور شہنشاہیت کا رد فرمایا ہے۔ کہ یہ نظام بھی باطل ہے۔ اور مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہیئے۔ یہ فاسد نظام ہیں۔ اور اس کے بعد والی سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے قومیت پرستی کا رد فرمایا ہے۔ یہ سب بیماریاں ہیں، جو لوگوں کو تباہ کر رہی ہیں۔ تاہم اس صورت میں امپیریلزم کا رد ہے۔

تاریخی پس منظر

سورۃ الفیل میں اصحاب فیل یعنی ہاتھی والوں کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ حضور علیہ السلام کے دنیا میں تشریف لانے سے ستر سال قبل ایک ایسا واقعہ پیش آیا جسے اللہ تعالیٰ نے سُوْرَۃُ الْبُرُوْجِ میں ذکر کیا ہے۔ وہاں ارشاد ہے "قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ۔ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ" تباہ و برباد ہوئے گڑھوں والے، جس میں بھڑکتی ہوئی آگ تھی۔ تو اصحابِ فیل کا واقعہ اس گڑھوں والے واقعہ کے ساتھ مربوط ہے۔

عربوں میں ایک بڑا مشہور قبیلہ حمیر تھا۔ ان کے سردار کا نام ذونواس تھا۔ یہ شخص مشرک تھا اور بڑا ظالم تھا۔ اس نے اس زمانے کے توحید پرست یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام پہ ایمان رکھنے والے لوگوں کو آگ کے گڑھے میں پھینک کر ہلاک کیا تھا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ ان ہلاک شدگان کی تعداد بیس ہزار تھی۔ جنہیں زندہ جلا دیا گیا تھا۔ ان میں سے دو آدمی کسی طرح جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے شاہِ روم کے پاس جا کر فریاد کی۔ کہ یمن کے ذونواس حمیری نے ہمارے ساتھیوں پہ اس طرح ظلم کیا ہے۔ روم کا بادشاہ نصرانی تھا۔ اس نے حبشہ کے نصرانی بادشاہ کو لکھا کہ یمن کے ظالم سردار کی سرکوبی کا انتظام کرو چنانچہ اس نے دو سرداروں اریاط اور ابرہہ کی کمان میں اپنی فوج بھیجی۔ لڑائی ہوئی جس میں ذونواس کی فوجوں کو شکست ہوئی۔ لشکر مارا گیا۔ ذونواس بھاگ نکلا مگر راستے میں کشتی میں سوار ہوا، اور پانی میں ڈوب کر مر گیا[2]

حبشی کمانڈروں نے فتح تو حاصل کر لی مگر ان کی آپس میں مخالفت پیدا ہو گئی۔ اریاط اور ابرہہ میں جنگ ہوئی۔ اریاط مارا گیا اور ابرہہ بلا شرکتِ غیرے یمن پہ قابض ہو گیا۔ شاہِ حبشہ نے اسے وہاں پہ اپنا گورنر مقرر کر دیا۔ ابرہہ بھی نصرانی تھا۔ مگر صحیح دین پہ نہیں تھا۔ پولس کی نسل کی طرح بگڑے ہوئے دین پہ تھا اور بڑا ظالم شخص تھا۔ جو لوگ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے صحیح دین پہ تھے۔ وہ تو مارے جا چکے تھے۔ باقی لوگ معہ گورنر دین سے پھر چکے تھے ابرہہ نے بالکل ظالم بادشاہ کا روپ دھار لیا

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۵ و ص ۵۴۹، [2] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۵، ص ۵۴۹

اس نے دیکھا کہ یمن سے کچھ لوگ ہر سال موسمِ حج میں بیت اللہ شریف کے طواف کے لیے حجاز جاتے ہیں۔ ابرہہ نے انہیں بیت اللہ کی زیارت سے روکنے کے لیے صنعا میں ایک بڑا عالیشان کلیسا بنوایا، اور اس کا نام قلیس گرجا رکھا۔ گرجے کی زیب و زینت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس میں خوب نقش و نگار کیا، قیمتی سامان سے مزین کیا اس میں ھیرے اور جواہرات جڑے۔ دروازوں پہ پردے لٹکائے اور پھر عام اعلان کیا کہ لوگ اس گرجے کا طواف کریں۔ اور بیت اللہ شریف کے طواف کے لیے نہ جایا کریں۔

یمن کے باشندے عربی النسل تھے اور ان کا تعلق عدنانی، ساسانی، حمیری وغیرہ قبائل سے تھا۔ ان کے دل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ بیت اللہ کی بہت قدر و منزلت تھی۔ اگرچہ وہ کفر و شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیح دین پہ قائم نہ تھے۔ تاہم کعبہ شریف کی محبت روائتی طور پہ اُن کے دلوں میں موجود تھی۔ لہٰذا ان لوگوں نے یہ بات پسند نہ کی کہ وہ بیت اللہ کی زیارت ترک کر دیں۔ ابرہہ نے پوری کوشش کی کہ لوگ حجاز نہ جائیں، مگر حج کے موسم میں لوگ وہیں جاتے تھے یمن کے لوگ جو ابرہہ کے ماتحت تھے۔ انہیں سخت پریشانی ہوئی۔ اور یمن سے باہر والے لوگ اس کا حکم ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

اس دوران میں دو ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے ابرہہ کو مشتعل کر دیا پہلا واقعہ یہ پیش آیا[1] کہ عربوں کے قبیلہ بنی کنانہ کے ایک شخص نے ابرہہ کے تیار کردہ گرجا میں پاخانہ کر دیا۔ اس کے دل میں ابرہہ کے خلاف نفرت تھی کہ اُس نے زیارت بیت اللہ سے لوگوں کو روکا ہے۔ لہٰذا اُس نے یہ حرکت کی اور وہاں سے بھاگ گیا۔ دوسرا واقعہ یہ پیش آیا[2] کہ گرجے کے قریب ہی عربوں کا کوئی قافلہ اترا ہوا تھا انہوں نے آگ جلائی جس کی چنگاری اُڑ کر گرجے میں پہنچی جس سے آگ لگ گئی اور گرجے کا بہت سا قیمتی سامان جل گیا۔ اگرچہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص ۵۴۹ ج ۴، روح المعانی ص ۲۳۳ ج ۳۰، معالم التنزیل ص ۲۵۲ ج ۴، تفسیر عزیزی ص ۲۵۴ پ ۳۰

[2] تفسیر ابن کثیر ص ۵۴۹ ج ۴، تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۵۴ پ ۳۰

آگ کسی نے قصداً نہیں لگائی تھی۔ مگر بعض کا خیال تھا۔ کہ قصداً ایسا کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان دو واقعات کی وجہ سے ابرہہ کے غصّے کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور اس نے بیت اللہ کو گرانے کا ارادہ کر لیا۔ اور اس کے لیے ساٹھ ہزار کا لشکر تیار کیا۔[1]

اس زمانے میں عرب کا خطہ آزاد تھا، وہاں کوئی منظم حکومت نہیں تھی بلکہ قبائلی نظام تھا۔ البتہ مکہ کے قریش کو باعزت مقام حاصل تھا۔ ان کے فیصلے کو سارا عرب بادشاہوں کی طرح مانتا تھا۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا تھا، یہ خطہ نہ رومیوں کے تحت تھا نہ ایرانیوں کے۔ تو جس طرح ابرہہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ بیت اللہ کو گرا کر وہاں سیاسی فتح حاصل کر لے اسی طرح رومی اور ایرانی بھی مدت سے اس خط پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ کہ کوئی موقع ملے تو اس علاقے کو اپنے زیر اثر کر لیں۔ رہا حبشہ، تو اس نے عملی کارروائی کا آغاز بھی کر دیا تھا۔

اُدھر عربوں میں تین قسم کے لوگ تھے۔ کچھ ایرانیوں کے طرفدار تھے کچھ رومیوں کے اور بعض آزاد خیال، جو غیر جانبداری کو پسند کرتے تھے۔ اس طرح یہ لوگ مختلف طبقات میں منقسم تھے۔

بہر حال ابرہہ ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس لشکر میں نئی بات ہاتھیوں کی موجودگی تھی۔ جس سے عرب لوگ واقف نہ تھے۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ہاتھیوں کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر ستونوں سے باندھ دیں گے اور پھر ہاتھیوں کو ہانکیں گے۔ تو بیت اللہ گر جائے گا۔ ان ہاتھیوں کا سردار محمود نامی بڑا ہاتھی تھا۔ جس پر ابرہہ خود سوار ہو کر لشکر کی کمان کرتا تھا۔[2]

ابرہہ اس ارادے کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ کہ راستے میں جو بھی اس سے مزاحم ہو گا۔ اُسے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ بعض عرب قبائل نے مزاحمت کی، مگر انہیں شکست ہوئی۔ ان کے کمانڈر گرفتار ہوئے اور وہ قبائل مغلوب ہو گئے۔ طائف والے خوفزدہ ہو گئے۔ کہ اگر انہوں نے مزاحمت کی تو کہیں ان کے لات و عزّیٰ کے مندر بھی نہ گرا دیے جائیں۔ نیز

---

[1] تفسیر ابن کثیر ص $\frac{549}{4}$

[2] معالم التنزیل ص $\frac{252}{4}$، تفسیر عزیزی ص $\frac{254}{30}$۔

ابرہہ نے انہیں رشوت بھی پیش کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طائف والے ابرہہ کے ساتھ مل گئے۔ [1]

اب ابرہہ بلا خوف و خطر مکہ معظمہ کے قریب وادی محسر میں مغمس کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہ جگہ مزدلفہ کے قریب ہے جہاں آج کل سڑک پر وادی محسر کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ یہاں پہنچ کر اُس نے ڈیرہ ڈال دیا۔ مکہ معظمہ سے چار پانچ میل کا فاصلہ ہے اُس نے مکہ کے سردار کے پاس اپنا قاصد بھیجا۔ کہ ہم بیت اللہ کو گرانا چاہتے ہیں۔ اگر تم کوئی تعرض نہ کرو، تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اُس کا خیال تھا۔ کہ یہ لوگ بیت اللہ کے متولی ہیں۔ یہ اس کی توہین کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔ بلکہ مزاحمت کریں گے۔ لہذا انہیں بھی کچلنے کا بہانہ ہاتھ آجائے گا۔ اس وقت سردار مکہ (CHEIF OF MAKKAH) حضور علیہ السلام کا جد امجد عبدالمطلب تھا۔ ابرہہ کا ایلچی اُس سے ملا اور اپنا مدعا ظاہر کیا۔ ساتھ یہ پیش کش بھی کی کہ اگر وہ چاہے تو اس کی ملاقات ابرہہ سے بھی کرائی جا سکتی ہے۔ عبدالمطلب نے اس پیش کش کو قبول کر لیا۔

اسی دوران ابرہہ کے لشکریوں نے عبدالمطلب کے دو سو اونٹ پکڑ لیے تھے۔ بہرحال عبدالمطلب ابرہہ کے دربار میں پہنچا۔ آپ بڑے قد آور، بڑے وجیہ اور بارعب تھے۔ ابرہہ نے دیکھا تو اپنی جگہ سے اتر کر نیچے آگیا اور انہیں اپنے پاس بٹھایا۔ ترجمان (INTERPRETER) کے ذریعے گفتگو کا آغاز ہوا۔ ابرہہ نے پوچھا آپ کیا چاہتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ آپکے لشکر والوں نے میرے اونٹ قبضہ میں لے لیے ہیں۔ میں ان اونٹوں کی واپسی کی سفارش کرتا ہوں۔ ابرہہ کہنے لگا۔ میں نے آپ کو بڑا عقلمند اور دانا سمجھا تھا مگر آپ نے بات عقلمندی کی نہیں کی۔ میں تو آپ کے بیت اللہ کو گرانے آیا ہوں۔ اس کا تمہیں کوئی فکر نہیں مگر اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہو۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ اونٹوں کا مالک میں ہوں۔ اس لیے میں نے ان کا مطالبہ کیا ہے۔ اور بیت اللہ کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ خود اسکی حفاظت کرے گا۔ مجھے اس کی فکر نہیں۔ ابرہہ یہ جواب سن کر خوب ہنسا اور کہنے لگا۔

---

[1] تفسیر عزیزی صہ ۲۵۴ پارہ ۳۰، تفسیر مظہری صہ ۳۴۲ ج ۱

اب تمہارا خدا اُس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ بہر حال اُس نے اونٹوں کی واپسی کا حکم دیدیا۔
اس دوران میں عبدالمطلب کے بعض ساتھیوں نے ابرہہ سے کہا[1] کہ وہ بیت اللہ کو نہ گرائے۔ اس کے عوض وہ اُسے تہامہ کی ایک تہائی آمدنی ہر سال بطور خراج ادا کرتے رہیں گے۔ اور اُس کی ماتحتی قبول کر لیں گے۔ مگر ابرہہ نے یہ پیشکش قبول نہ کی۔ عبدالمطلب اور ان کے ساتھی واپس آ گئے۔ انہوں نے بیت اللہ شریف کی دیواروں سے لپٹ کر دعا کی۔ کہ اے مولا کریم! ہم میں ابرہہ کے لشکر کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں۔ لہٰذا تو ہی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ دعا کے بعد عام اعلان کر دیا کہ لوگ شہر مکہ خالی کر دیں ورنہ ابرہہ کا لشکر آ کر انہیں تباہ و برباد کر دے گا۔ چنانچہ تمام لوگ اپنا اپنا سامان لے کر اِدھر اُدھر پہاڑوں پر چلے گئے۔

ابرہہ نے لشکر کو مکے کی طرف چڑھائی کا حکم دیا۔ خدا کی قدرت جب وہ بڑے ہاتھی کو مکے کی طرف ہانکتے تھے۔ تو وہ گھٹنے ٹیک دیتا تھا۔ باقی ہر سمت پہ چلنے کو تیار تھا۔ مگر مہاوتوں کی ہزار کوششوں کے باوجود وہ شہر مکہ کی طرف چلنے پر تیار نہ ہوا۔ ابرہہ کے دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ شاید کسی نے جادو کر دیا ہے۔ یا کوئی اور شرارت کی ہے کہ ہاتھی اس طرف جانے کا نام نہیں لیتا۔ عین اُسی وقت جدہ یا بحر شعیب، کی طرف سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے غول آنے لگے۔ یہ عجیب و غریب سُرخ چونچ والے پرندے تھے۔ جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے۔ ان کے دو پنجوں اور منہ میں تین تین کنکر تھے۔ جو انہوں نے ابرہہ کے لشکر پہ پھینکنے شروع کئے۔ ان کنکروں میں اللہ تعالےٰ نے ایٹم سے زیادہ طاقت ڈال دی تھی۔ جس سپاہی یا ہاتھی کو کنکر لگتا۔ اس کے جسم سے پار ہو جاتا۔ بہت سے لشکری ہلاک ہو گئے۔ کچھ زخمی ہوئے۔ خود ابرہہ زخمی ہو گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ کو اس کی اور زیادہ ذلت منظور تھی۔ وہ اس وقت ہلاک نہ ہوا۔ عکرمہؓ کی روایت کے مطابق[2] جسم کے جس حصّے پہ کنکر لگتا تھا۔ وہاں چیچک جیسے دانے پیدا ہو جاتے تھے۔ جن میں زہریلا

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۵۵۰ جلد ۴
[2] تفسیر عزیزی صفحہ ۲۵۲ جلد ۳۰، ابن کثیر صفحہ ۵۵۱ جلد ۴، درمنثور صفحہ ۲۹۵ جلد ۶، روح المعانی صفحہ ۲۳۶ جلد ۳۰

مادہ بھر جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی ہلاکت واقع ہو جاتی تھی۔ ہاتھی کو چلانے والے دونوں مہاوت اندھے ہو گئے اور وہیں مکہ میں ہی رہ گئے۔ ام المؤمنینؓ کی روایت کے مطابق[1] ان لوگوں نے نہایت ذلت کی زندگی بسر کی۔ وہ مکے کی گلیوں میں بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ الغرض سارا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ ابرہہ واپس اپنے دار الخلافہ پہنچا تو اسے ایسی بیماری لاحق ہوئی کہ اس کے اعضاء گرنے شروع ہو گئے۔ جذام کی بیماری کی طرح آہستہ آہستہ اس کا سارا جسم گل گیا اور اس طرح وہ بھی ہلاک ہو گیا۔[2]

اصحاب فیل کے اس تاریخی واقعہ میں عبرت تھی۔ کہ شعائر اللہ کی توہین کرنے والوں کو خدا تعالیٰ کس طرح ذلیل و خوار کرتا ہے۔ یہ بیت اللہ شریف کو گرانے کے ارادے سے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہوئے۔ حضور علیہ السلام جب حدیبیہ کے موقع پر آئے تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی تھی۔ آگے نہیں چلتی تھی۔ صحیح حدیث[3] میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيلِ جس ذات نے ابرہہ کے ہاتھی والے لشکر کو یہاں روک دیا تھا۔ اس نے ہماری اونٹنی کو بھی روک دیا۔ اب یہ آگے نہیں جائے گی۔ چنانچہ آپ بغیر عمرہ ادا کیے وہیں سے واپس تشریف لے آئے یہ ۶ھ کا واقعہ ہے۔

حضور علیہ السلام کی ولادت عام الفیل میں

الغرض! اس سورۃ میں اصحاب فیل کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ کیا آپ نے نہیں دیکھا۔ یہ دیکھنا رویت بصری نہیں بلکہ رویت قلبی ہے۔ کیا آپ کے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيلِ۔ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ وہ لوگ کس ارادے سے آئے تھے مگر ان کا حشر کیا ہوا۔ وہ کس طرح تباہ و برباد ہوئے۔ تفسیری روایات[4] میں آتا ہے کہ اصحاب فیل کے واقعہ کے پچاس یا پچپن دن بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد قریش کی عزت و احترام میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اور بیت اللہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۵۵۲ جلد ۴، روح المعانی صفحہ ۲۳۶ جلد ۳۰، [2] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۵۵۱ جلد ۴

[3] بخاری صفحہ ۳۷۸ جلد ۱ [4] روح المعانی صفحہ ۲۳۲ جلد ۳۰، تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۵۵ پارہ ۳۰

شریف کا احترام بھی دنیا میں دوبالا ہو گیا۔ قریش کی تجارت کو اللہ تعالیٰ نے تحفظ عطا کیا۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ کہ یہاں پر جو بھی بُری نیت سے آئے گا۔ ذلیل و خوار ہو گا۔

حضور علیہ السلام کی ولادت کے متعلق بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اس واقعہ سے چھ ماہ بعد ہوئی، تاہم زیادہ صحیح روایت پچاس یا پچپن دن والی ہے۔ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ اصحاب فیل والے سال میں ہی حضور علیہ السلام اس دنیا میں تشریف لائے۔ چونکہ اس واقعہ کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، اس لیے یہ واقعہ عربوں میں بڑا مشہور تھا۔ جب سورۃ فیل نازل ہوئی اس وقت تک یہ واقعہ بچے بچے کی زبان پہ تھا حضور علیہ السلام پہ وحی کا نزول چالیس ۴۰ سالہ زندگی کے بعد شروع ہوا۔ درمیان میں تین سال فترت کے بھی ہیں۔ جب وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ تو گویا یہ سورۃ واقعہ اصحاب فیل کے تقریباً پینتالیس ۴۵ یا چھیالیس ۴۶ سال بعد نازل ہوئی۔

اصحاب فیل کی ناکامی

سورۃ کی ابتداء اَلَمْ تَرَ سے اس واسطے شروع ہوئی۔ کہ اس وقت یہ واقعہ زبان زد عام تھا۔ اس کی زیادہ تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ ہر کوئی اس سے واقف تھا۔ لہٰذا صرف اشارۃً بتا دیا کہ کیا آپ نے نہیں دیکھا۔ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ کہ اصحاب فیل کا کیا حشر ہوا۔ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ کیا خدا تعالیٰ نے اُن کی تدبیر کو غلط نہیں کر دیا۔ وہ کس مقصد سے آئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ملیامیٹ کر دیا۔ تدبیر کو غلط اس لیے فرمایا کہ ابرہہ تو اپنی قوت کے گھمنڈ پہ عربوں کو کچلنا چاہتا تھا۔ اور شعائر اللہ کی توہین کرنا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اُسے ناکام کر دیا۔ یہاں پہ سمجھنے کا نکتہ یہ ہے کہ مسلمان ملوکیت اور شہنشاہیت کا ظالمانہ نظام کبھی قبول نہ کریں نہ کبھی اس کی حمایت کریں۔

اگر کسی بیوقوف نے گرجے کی توہین کی تھی یا کسی نے قصداً آگ بھی لگائی تھی تو ابرہہ کا فرض تھا۔ کہ وہ عربوں سے ملزم کا مطالبہ کرتا۔ ظاہر ہے کہ عربوں کے سارے قبائل مل کر ایسے شخص کو تلاش کر سکتے تھے۔ اور اس بات کا فیصلہ ہو سکتا تھا کہ کیا واقعی کسی نے قصداً گرجے کی توہین کی ہے۔ اگر عرب ابرہہ کا مطالبہ پورا نہ کر سکتے تو اُسے مزید کاروائی کا حق پہنچتا تھا۔ مگر اُس نے تو پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ کہ ایک شخص کے نام نہاد جرم کی سزا پورے

ملک کو دے گا۔ لہٰذا اُس نے بیت اللہ شریف کو گرانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ محض ملوکیت کے گھمنڈ کی وجہ سے تھا۔ جو کہ درست فیصلہ نہیں تھا۔

ابابیل کا کارنامہ

ادھر ابرہہ نے لشکر کو چڑھائی کا حکم دیا، اور ادھر حکمت الٰہی جوش میں آئی وَّاَرْسَلَ عَلَیْھِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ اللہ تعالیٰ نے اُس فوج پر چھوٹے چھوٹے پرندوں کے گروہ در گروہ بھیج دیے۔ یہاں یہ بات قابل وضاحت ہے۔ کہ ہمارے تصور کے برخلاف ابابیل کسی خاص پرندے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ابابیل گروہ در گروہ یا جھنڈ در جھنڈ کو کہتے ہیں مطلب یہ کہ لاتعداد پرندے بھیج دیے۔ تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَةٍ جو لشکریوں کو پتھروں کے ساتھ مارتے تھے۔ مِّنْ سِجِّیْلٍ یہ چھوٹے چھوٹے سنگریزے کھنگر کے قبیل سے تھے سجیل فارسی کے لفظ سنگ گل کا مترادف ہے۔ یعنی وہ چھوٹے چھوٹے روڑے جن میں مٹی کی امیزش ہو، غرضیکہ ان پرندوں نے ابرہہ کی فوج پر چھوٹے چھوٹے پتھروں کی بارش کر دی۔ وہ جسے لگتا تھا۔ ہلاک ہو جاتا تھا یا خوفناک بیماری میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ ان پتھروں سے نہ فوجی بچتے تھے اور نہ ان کے ہاتھی۔

واقعہ اصحاب فیل تمہید نبوت تھی

اگرچہ ابرہہ کا حملہ ایک ظالمانہ کاروائی تھی۔ مگر اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص حکمت پوشیدہ تھی۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ مظلوم کی مدد بڑے عجیب و غریب طریقے سے فرماتے ہیں۔ حتیٰ کہ ظالم کا ظلم ہی مظلوم کے لیے وجہ افتخار بن جاتا ہے۔ رب العزت نے اصحاب فیل کو تباہ کر کے قریش کی ایسی مدد فرمائی۔ کہ ان کا کوئی نقصان بھی نہ ہوا، بلکہ ان کی عزت و احترام میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے گھر کی عزت و حرمت منظور تھی۔ اور مشرکوں سے پاک کر کے اسے دوبارہ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ بنانا تھا۔ لہٰذا اسے بالکل محفوظ رکھا، مفسرین کرام فرماتے ہیں[1]۔ کہ یہ سارا کام اس طرح معجزانہ طور پر انجام پایا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ساری کاروائی حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والسلام کی نبوت کا ارہاص یا تمہید تھی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا۔ کہ اس خانہ خدا کو کفر و شرک سے پاک کرنے کے لیے جس نبی آخر الزمان کی آمد آمد

---

[1] روح المعانی ص ۲۳۳/۳۰، معالم التنزیل ص ۲۵۴/۴، تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۵۵/۳۰

کا چرچا ہے۔ اُس کا ظہور عنقریب ہونے والا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کی ولادت باسعادت اسی عام الفیل یعنی ہاتھیوں والے سال ہوئی۔ اور اس کے چالیس سال بعد حضور علیہ السلام نے نبوت کا دعوےٰ کر دیا۔ اور پھر ۸ھ میں اللہ تعالےٰ نے آپ ہی کے ہاتھوں اس بیت اللہ شریف کو بتوں کی آلائش سے پاک کر دیا۔ تو گویا اصحاب فیل کا واقعہ حضور علیہ السلام کی نبوت کی تمہید تھی۔

اللہ تعالیٰ کی کمال حکمت

اصحاب فیل کے واقعہ کے علاوہ اور بھی بے شمار واقعات دنیا میں پیش آئے جو اللہ تعالیٰ کی کمال حکمت کا شاہکار ہیں۔ کسی جنگل میں کوئی عورت سفر کر رہی تھی۔ کوئی ظالم اس کی عصمت دری کرنا چاہتا تھا۔ وہ بیچاری بڑی پریشان تھی۔ بچ نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اچانک ایک سانپ آتا ہے۔ اور اس ظالم کو کاٹ کر ہلاک کر دیتا ہے۔ اس قسم کے کئی واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ یہاں ہندوستان میں بھی بعض واقعات پیش آئے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات میں ہے۔ کہ میں ایک جنگل میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑا بچھو ایک طرف کو تیزی سے دوڑے جا رہا ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ میں سمجھا ضرور اس میں کوئی حکمت ہے۔ چنانچہ اس بچھو کا تعاقب کیا۔ آگے ندی تھی، بچھو نے اُسے بھی عبور کیا۔ میں نے بھی تعاقب جاری رکھا۔ ندی سے پار کوئی شخص درخت کے نیچے شراب کے نشے میں بیہوش پڑا تھا۔ اور درخت کے اوپر سے ایک خوفناک کالا ناگ اس شخص کو کاٹنے کے لیے آرہا تھا، جونہی سانپ اس آدمی کے قریب پہنچا، بچھو نے سانپ کو کاٹ کھایا اور سانپ وہیں ہلاک ہو گیا۔ اور اس کے بعد بچھو غائب ہو گیا۔ خواجہ صاحبؒ خدا کی حکمت دیکھ کر حیران ہوئے۔ اتنے میں وہ شخص بھی ہوش میں آگیا۔ اپنے قریب مردہ سانپ کو دیکھا اور سارا معاملہ سمجھ گیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کس تدبیر کے ساتھ اس کی جان بچائی۔ خواجہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔ کہ وہ شخص اس قدر تائب ہوا۔ کہ اُس نے اپنی زندگی میں چھتیس حج پیدل چل کر کیے۔

الغرض! اسی طرح اللہ تعالےٰ نے اپنی کمال حکمت و تدبیر سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کو بھیج کر چھوٹے چھوٹے کنکروں کے ذریعے ہاتھی والوں کو ہلاک کیا۔ مولانا محمد علی جوہرؒ جب انگریزوں کے مقابلے میں تکالیف اٹھاتے تھے تو کہا کرتے تھے۔

تو طیر ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور   بیچارگی پہ اپنی نہ جا، شانِ خدا دیکھ

اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کی تباہی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ۔

اصحاب فیل کی تباہی

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ کھائی ہوئی گھاس کی طرح پامال کر دیا۔ جب جانور، مویشی گھاس، چارا وغیرہ کھاتے ہیں۔ تو بچ جانے والا چارہ ان کے پاؤں کے نیچے آکر روندا جاتا ہے بری طرح پامال ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے غضب کے بعد اصحاب فیل کے لشکر کی یہی حالت ہوئی۔ ان کی تمام قوت ختم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہوئے ۔ اور اس طرح خداوند کریم نے اپنے گھر کی حفاظت فرمائی ۔

حاصل کلام

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورۃ ہمزہ میں کیپٹلزم (CAPITALISM) کا رد فرمایا ہے۔ کہ سرمایہ پرستی ایک لعنت ہے ۔ اس کی وجہ سے عیب جوئی، طعن زنی اور تحقیر پیدا ہوتی ہے۔ مال سے اس قدر محبت کی اجازت نہیں جس کی وجہ سے دین اور اخلاق تباہ ہو جائے اسی طرح اس واقعہ سے ملوکیت کے نظام کی بھی نفی کی گئی ہے ۔ اہل ایمان اس قسم کے باطل نظام کی کبھی حمایت نہیں کر سکتے۔ اس سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ ظلم کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کرنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ بھی ظالم سے انتقام لیتا ہے جو لوگ شعائر اللہ مثلاً بیت اللہ، نماز، اذان وغیرہ کی توہین کے مرتکب ہوں، وہ خدا کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ واقعہ اصحاب فیل اللہ تعالیٰ نے مثال کے طور پہ بیان فرمایا ہے ۔

سُورَۃُ قُرَیْشٍ

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعُ اٰيَاتٍ

سورۃ قریش مکی ہے اور یہ چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ⓪

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ① اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ② فَلْيَعْبُدُوْا
ع ۲۱ رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ③ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ④

ترجمہ: واسطے مانوس کرنے کے قریش کے ① ان کا مانوس کرنا سفر میں موسم سرما میں اور موسم گرما میں ② پس چاہیئے کہ یہ (قریش) اس گھر کے رب کی عبادت کریں ③ وہ جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا اور انہیں خوف سے امن دیا ④

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ القریش ہے۔ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی چار آیتیں ہیں۔ یہ سورۃ سترہ الفاظ اور چوہتر حروف پر مشتمل ہے۔ پہلی ہی آیت میں لفظ قریش آیا ہے، جس سے سورۃ کا نام لیا گیا ہے۔

پچھلی سورۃ کے ساتھ ربط

یہ سورۃ پہلی سورۃ کے ساتھ مربوط ہے۔ سورۃ فیل میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جو بیت اللہ شریف کو گرا کر اس کی بے حرمتی کرنا چاہتے تھے، وہ لوگ ہاتھیوں سمیت بہت بڑا لشکر لے کر آئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیر کو بالکل ناکام بنا دیا۔ اور نہ صرف وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے حملہ آوروں کو سزا دی۔ اس دور میں قریش کو بیت اللہ کے متولی ہونے کی وجہ سے باعزت مقام حاصل تھا۔ اصحاب فیل کا مقصد یہ بھی تھا کہ قریش کو ذلیل کر دیا جائے تاکہ اس ملک پر قبضے کی راہ ہموار ہو سکے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قریش کا خاندان ہی ان کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ انہیں مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت

یہ ہوئی کہ حملہ آور خود کعصفٍ مّاکُولٍ ہو گئے اور قریش کی عزت و احترام میں کوئی فرق نہ آیا۔

قریش کے لیے الفت

اسی موضوع کو اس سورۃ قریش میں آگے چلایا گیا ہے۔ فرمایا اصحاب فیل کی ذلت کی حکمت یہ تھی۔ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ تاکہ لوگوں کے دلوں میں قریش کے لیے الفت پیدا ہو جائے اندرون اور بیرون ملک جہاں بھی قریش تجارت کے لیے جاتے تھے۔ لوگ ان سے مانوس تھے۔ اور ان کا ادب و احترام کرتے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اصحاب فیل سے محفوظ رکھا۔ بلکہ اُن[1] کو نیست و نابود کر دیا تو مشرق و مغرب میں قریش کو مزید عزت حاصل ہو گئی۔ تو یہاں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ کہ ہاتھی والوں کو شکست فاش قریش کے لیے الفت پیدا کرنے کی غرض سے ہوئی تھی۔

بعض فرماتے ہیں[2] کہ لِاِیْلٰفِ میں "لام" جارہ ہے اور اس کا تعلق فعل یا شبہ فعل سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلا لفظ ماکول شبہ فعل یعنی مفعول ہے۔ لہٰذا "لام" کا تعلق ماکول سے قائم ہو گیا۔ تو مطلب یہ ہوا کہ اصحاب فیل کی پامالی قریش کی الفت کی خاطر ہوئی۔

بعض فرماتے ہیں[3] کہ "لام" سے مراد ہے اِعْجَبُوْا یا تَعَجَّبُوْا یعنی اے لوگو! تعجب کرو کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کو کیسا مانوس بنا دیا۔ بعض[4] کا خیال ہے۔ کہ "لام" کا تعلق بعد میں آنے والے فعل فَلْیَعْبُدُوْا کے ساتھ ہے۔ اگر یہ سمجھا جائے تو مطلب ہو گا۔ کہ قریش کو چاہیئے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی گھر کی بدولت لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے الفت ڈال دی تھی۔ انہیں کفر اور شرک والی عبادت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہیئے۔ جس نے ان کو خانہ کعبہ کی بدولت عزت عطا کی۔

قریش کا شجرہ نسب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ نسب میں بارہویں نمبر پر ایک بزرگ نضر بن کنانہ آتے ہیں[5]۔ ان کی اولاد قریش کہلاتی ہے۔ یہ اصل لفظ قرشی ہے۔ مگر تصغیر کے طور پر

---

[1] تفسیر کشاف صفحہ ۸۰۱ جلد ۴ بیضاوی صفحہ ۴۴۰ جلد ۲ [2] تفسیر کشاف صفحہ ۸۰۱ جلد ۴ بیضاوی صفحہ ۴۴۰ جلد ۲ وغیرہ [3] تفسیر کشاف صفحہ ۸۰۱ جلد ۴ بیضاوی صفحہ ۴۴۰ جلد ۲
[4] روح المعانی صفحہ ۲۳۸ جلد ۳۰، تفسیر بیضاوی صفحہ ۴۴۰ جلد ۲ [5] تفسیر حقانی صفحہ ۲۵۱ جلد ۸

قریش آتا ہے۔ کسی چیز کی تصغیر یا تو تحقیر کے لیے ہوتی ہے یا تقلیل کے لیے اور یا تعظیم کے لیے یہاں پر لفظ قریش کی تصغیر تعظیم کے لیے وارد ہوئی ہے۔ جس سے خاندان قریش کی عظمت کا اظہار مقصود ہے۔ اس خاندان کے آگے بہت سے قبائل اور شاخیں ہیں۔ حضور علیہ السلام کے جد امجد ہاشم قریش ہی کی شاخ میں سے ہیں۔

قریش کا پیشہ تجارت

ہاشم کے زمانے میں وادی مکہ ایک بے آب وگیاہ سرزمین تھی۔ خشک پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی اس وادی میں نہ پانی تھا اور نہ زراعت کا کوئی سامان مکی زندگی بڑی تلخ تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسی وادی غیر ذی زرع میں اللہ کے محترم گھر کے پاس اپنی اولاد کو آباد کرنے کا حکم ہوا تھا جبھی تو انہوں نے کہا تھا "رَبَّنَآ اِنِّیۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ" تو یہ وادی غیر ذی زرع آج تک ویسی کی ویسی بے آب وگیاہ ہے۔

چونکہ قریش کی اقتصادی حالت ان دنوں سخت خراب تھی۔ ہاشم نے انہیں مشورہ دیا کہ انہیں تجارت کا پیشہ اختیار کرنا چاہیئے۔ تجارت کے لیے ایک طرف یمن تھا اور دوسری طرف شام۔ یہ دونوں قدیم زمانے سے تجارتی مرکز چلے آرہے تھے۔ یمن کا علاقہ گرم تھا۔ اس لیے موسم سرما میں قریش کا تجارتی رُخ اس طرف ہوتا تھا۔ شام کا علاقہ ٹھنڈا اور سرسبز تھا اس لیے گرمی کے زمانے میں وہ شام کا سفر اختیار کرتے تھے۔ غرض ہاشم کا مشورہ قبول کرکے قریش نے تجارت میں بڑا نام پیدا کیا۔ انہیں بڑا منافع ہونے لگا۔ اس زمانے میں ان کے ہاں یہ بڑی اچھی ریت (عادت) تھی۔ کہ قریش کا کل منافع ہر امیر وغریب خاندان پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ منافع کی مساوی تقسیم کی وجہ سے قریش میں خوشحالی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ سب سے زیادہ ضرورت اناج کی ہوتی ہے۔ جو کہ انہیں جدہ کی قریبی منڈی سے دستیاب ہونے لگا۔ کیونکہ تبالہ یا جرش جیسے زرخیز علاقوں کی گندم کی پیداوار جدے کی منڈی میں آتی تھی۔ اس طرح قریش غلے جیسی بنیادی ضرورت سے بھی بے فکر ہو گئے۔ الغرض یمن وشام کے سفر میں قریش کی پذیرائی کو الفھم رِحۡلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قریش کا احترام

عرب میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ عرب قبائل بدوی زندگی بسر کرتے تھے تاہم قریش کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بیت اللہ کے مجاور تھے عبدالمطلب کے زمانے میں اصحاب فیل کا واقعہ پیش آیا جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی حفاظت چھوٹے چھوٹے پرندوں کے ذریعے معجزانہ طور پر کرائی۔ اس واقعہ کی وجہ سے قریش کی عزت میں اور اضافہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ یمن کے عیسائی بھی ان کے معتقد ہو گئے۔ شام کا علاقہ بھی عیسائیوں کے قبضے میں تھا۔ اصحاب فیل کے واقعہ سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ بھی قریش کی عزت اور احترام کرنے لگے۔ قریش کا قافلہ یا کوئی آدمی کہیں بھی جاتا تھا۔ کوئی ان سے تعرض نہ کرتا تھا۔ چور ڈاکو تک انہیں پیرا پیرزادے اور خدام کعبہ سمجھ کر نہایت عزت سے پیش آتے تھے۔

قریش کو اللہ تعالیٰ نے خاندانی طور پر شرافت بخشی تھی۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[1]

اِنَّ اللّٰہَ عزوجل اصْطَفٰی کنانۃَ مِنْ وُلْدِ اِسْمٰعِیْلَ علیہ الصلوٰۃ والسلام

اللہ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا۔ کنانہ کی اولاد میں سے قریش کو۔ قریش کی اولاد میں سے خاص طور پر بنی ہاشم کو منتخب فرمایا۔ اور پھر ہاشم کے خاندان میں سے اللہ تعالیٰ نے مجھے منتخب فرمایا۔ اسی طرح درجہ بدرجہ خاندانی طور پر فضیلت حاصل تھی۔

قریش کی قومیت پرستی

قریش کی قدر و منزلت بڑھ جانے کا ایک معکوس اثر یہ ہوا کہ قریش میں خود پسندی پیدا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے الفت پیدا کی تھی۔ مگر وہ اسے اپنی خاندانی برتری پر محمول کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں قومیت پرستی (NATIONALISM) پیدا ہو گئی۔ وہ سمجھنے لگے کہ واقعی انہیں دنیا بھر کی قوموں پر برتری حاصل ہے۔ اگرچہ انہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ مگر ان میں قومیت پرستی کی فاسدانہ ذہنیت پیدا ہو گئی۔ قریب قریب یہ وہی ذہنیت تھی جس کا ذکر گذشتہ سورۃ میں آچکا ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ملوکیت کی تردید فرمائی ہے۔ اور سرمایہ پرستی کو مفسدانہ ذہنیت قرار دیا ہے۔ جس طرح سرمایہ دار محض سرمایہ

---

[1] مسلم صـ ۲۴۵/۲۴، ترمذی صـ ۵۱۹

کو ہی اوّل و آخر سمجھتا ہے۔ اور اسے گن گن کر رکھتا ہے۔ لوگوں کے حقوق ضائع کرتا ہے۔
اسی طرح قوم پرست بھی قومی برتری کے احساس میں مبتلا ہو کر دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں کا ردّ فرمایا ہے۔ اصل چیز نہ سرمایہ ہے۔ نہ قوم اور نہ خاندان، بلکہ فلاح کا دارومدار دین اور اخلاق پر ہے۔

قریش کو عبادت کی تلقین

اللہ تعالیٰ نے قریش کی قومیت پرستی کا علاج یہ تجویز فرمایا فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ اس گھر کے رب کی عبادت کرو۔ یعنی قومیت پرستی کی بجائے خدا پرستی اختیار کرو۔ اور اچھے خاندان میں پیدائش پر فخر نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ یہ تو انعام الٰہی ہے۔ قابل فخر چیز تو اللہ تعالیٰ کی عبودیت ہے۔ اُسے اختیار کرنا چاہیئے۔ حضور علیہ السلام نے خود اپنے متعلق فرمایا[1] اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا فَخْرَ میں نوعِ انسانی کا سردار ہوں مگر میں اس پر فخر نہیں کرتا۔ اُسے انعام خداوندی سمجھتا ہوں۔ لہٰذا قریش کو ترغیب دی جا رہی ہے۔ کہ وہ اپنے پروردگار کی عبادت کریں۔ یہاں پر ربوبیت کی صفت بیان کی گئی ہے جس سے قریش کو یاد دلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری قوموں کے مقابلے میں ان کی کس طرح پرورش کی اور درجہ کمال تک پہنچایا۔ اگر وہ اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت پر فخر کرنے لگیں اور قومیت پرستی کا شکار ہو جائیں، تو یہ مفسدانہ اور تباہ کن ذہنیت ہو گی قریش کو چاہیئے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ اسی طرح اگر کوئی پیر ہے یا مشائخ میں سے ہے۔ تو اس کو تکبر نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ اللہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ اللہ نے اس کے لیے ایسے ذرائع پیدا کر دیے اور اسے اعلیٰ منصب پر فائز کیا۔

بیٹ کا مسئلہ

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کرنے کی قریش کو تلقین کی تو ان کو ساتھ یہ بھی یاد کرا دیا۔ کہ اسی رب کی عبادت کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ۔ جس نے تمہیں بھوک میں کھانا بہم پہنچایا محض حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا اثر تھا۔ کہ قریش کو خوشحالی نصیب ہوئی۔ ورنہ مکہ جیسی غیر ذی زرع وادی میں روزی کے اسباب

---

[1] ترمذی صنا۲۰

کہاں تھے۔ اللہ کریم نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے جن کی وجہ سے انہیں ہر چیز میسر تھی۔ اور آج بھی ہے اور وہاں کے باشندوں کو فاقہ سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔

یہ پیٹ کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ خواجہ فرید الدین شکر گنج ؒ سے ایک شخص نے دریافت کیا ؎ کہ حضرت! اسلام کے رکن کتنے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ پانچ ارکان تو عام ہیں۔ یعنی کلمہ توحید، نماز، روزہ، زکواۃ اور حج اور چھٹا رکن پیٹ کا مسئلہ ہے۔ اس شخص نے خواجہ صاحبؒ کی بات کو تسلیم نہ کیا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا۔ کہ وہ سفر حج پر گیا۔ اور کسی حادثہ کا شکار ہو گیا۔ وہ بالکل مفلوک الحال ہو کر خواجہ صاحبؒ کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا، میں تمہارے لیے خوراک کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ تم اپنی آدھی نیکیاں مجھے دیدو۔ جب وہ اس پر تیار ہو گیا۔ تو پھر اُسے سمجھ آئی کہ پیٹ کا مسئلہ واقعی بڑا اہم ہے۔ اور اسلام کا چھٹا رکن ہے۔

یہ تو خیر تفریح طبع کے لیے تھا مگر حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ جب بھوک لگی ہو، پیٹ خالی ہو، تو کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ سعدی صاحبؒ نے بھی اس کی تائید کی ہے، پیٹ خالی ہو تو نہ عبادت ہو سکتی ہے اور نہ جنگ ہو سکتی ہے۔ لہذا یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ جہاں عوام بھوکے ہوں گے وہاں فتنے سر اٹھائیں گے، چوریاں اور ڈکیتیاں ہوں گی۔ اکثر قباحتیں پیٹ ہی سے پھوٹتی ہیں۔ خرابی یہیں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کا ذکر کیا۔ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے قریش کو بھوک میں کھانا فراہم کیا۔

قریش کی تکریم

اللہ تعالیٰ نے قریش پر دوسرا انعام جو فرمایا، وہ تھا وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ انہیں خوف کی حالت میں امن دیدیا۔ ایسا امن قائم کیا۔ کہ حملہ آوروں کو نیست و نابود کر دیا۔ اور ان کی تباہی ضرب المثل بن گئی "کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ" ایسا امن مہیا کیا۔ کہ قریش جہاں کہیں بھی جائیں ان سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا۔ جدھر جاتے لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ عزت و تکریم کرتے، نذرانے پیش کرتے، کہ یہ بیت اللہ شریف کے مجاور اور خادم ہیں۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کے معزز ترین لوگ ہیں۔ انہیں

؎ا تنبیہات رومی ص ۱۸۳

انعامات کا ذکر فرمایا اور کہا کہ جس گھر کی بدولت تمہیں یہ امن و چین نصیب ہوا ہے ۔ اور تمہیں عزت حاصل ہوئی ہے اس گھر کے رب کی عبادت کرو۔ تمام انبیاء علیہم السلام عبادت الٰہی کی طرف ہی دعوت دیتے رہے ہیں۔

حضور خاتم النبیین علیہ السلام کی بعثت کے وقت تک قریش میں بہت خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، وہ کفر و شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اگرچہ ان میں کچھ خوبیاں بھی تھیں مگر بحیثیت مجموعی وہ کفر و شرک کے علاوہ قومیت پرستی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ان میں فخر و تکبر آچکا تھا۔ جنگ بدر میں جب ابو جہل کی گردن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کاٹنے والے تھے تو وہ کہنے لگا۔[1] افسوس! ہم قریش کے معزز لوگ کاشتکاروں کے ہاتھوں سے قتل ہو رہے ہیں۔ کوئی عزت والے آدمی ہم کو مارتے، تو کیا اچھا ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو کہنے لگا۔ اے چرواہے! آج تمہارے حوصلے اتنے بلند ہو گئے ہیں کہ سردار کے سینے پر چڑھے بیٹھے ہو۔ یہی نیشنلزم کی اکڑ تھی۔ کہ وہ دوسرے کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اپنی قومیت کو سب سے بالا خیال کرتے تھے۔ یہی وہ ذہنیت ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے تردید فرمائی۔

امن و امان کے فوائد

پیٹ کا مسئلہ اور امن و امان کا مسئلہ ساری دنیا کے لیے اہم مسائل ہیں۔ جہاں امن و امان ہو گا، وہاں صنعت و تجارت بھی ہو گی۔ ورنہ نہ کوئی کارخانہ چلے گا، نہ تجارت ہو گی، نہ کسی کی جان محفوظ ہو گی نہ مال۔ امن کے بغیر نہ عبادت دلجمعی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ نہ حج کا سفر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لہذا امن کو دنیا میں بڑی اہم حیثیت حاصل ہے جو حکومت امن و امان میں غفلت برتے گی، لوگوں کی اقتصادی حالت کی طرف توجہ نہیں دے گی اور اپنے تعیش میں لگی رہے گی، اس کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ ہمارے ملک میں امن و امان کا مسئلہ ہمیشہ توجہ طلب رہا ہے۔ روزمرہ کے واقعات سامنے ہیں۔ نہ کسی کی جان محفوظ ہے۔ نہ آبرو۔ الغرض پوری دنیا کے لیے امن و امان اور معیشت کے مسائل بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

---

[1] مسلم ص ۱۱۰ ج ۲، بخاری ص ۵۷۳ ج ۲

حاصل کلام

بہر حال اللہ تعالیٰ نے قریش کی قومیت پرستی کو ختم کرنے کے لیے اس کا علاج بتایا اور فرمایا قریش پہ اللہ نے احسان کیا۔ ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا اِلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ سردی کے موسم میں یمن کا سفر کرتے تھے۔ اور گرمی میں شام جاتے تھے۔ راستے میں انہیں امن حاصل ہوتا تھا۔ اور لوگ ان سے مانوس ہوتے تھے۔ کسی قسم کا خوف اور تعرض لاحق نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے فرمایا کہ قریش کا فرض ہے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں، کفر اور شرک سے باز رہیں۔ قومیت پہ فخر نہ کریں۔ قابل فخر بات ایمان اور خدا پرستی ہے۔ قومیت پرستی اور ملوکیت پرستی کا نتیجہ ہمیشہ تباہ کن ہوگا۔ لہذا انہیں چاہیے کہ اس رب کی عبادت کریں الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ اور خوف سے امن وامان میں رکھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے انعام ہیں لہذا انہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اور قومیت پرستی جیسی لعنت سے دور رہنا چاہیے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سورة الماعون

عمّ ۳۰ — الماعون ۱۰۷

درس — (مکمل سورۃ)

سُوۡرَةُ الْمَاعُوۡنِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبْعُ اٰيَاتٍ

سورۃ ماعون مکی ہے اور یہ سات آیتیں ہیں ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يُكَذِّبُ بِالدِّيۡنِ ۞ ۱ فَذٰلِكَ الَّذِىۡ يَدُعُّ الۡيَتِيۡمَ ۞ ۲
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ۞ ۳ فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۞ ۴ الَّذِيۡنَ
هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ۞ ۵ الَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَآءُوۡنَ ۞ ۶
وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ۞ ۷ ع ۷ / ۳۲

ترجمہ :- کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے (۱) پس یہ ایسا شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے (۲) اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا (۳) پس ہلاکت ہے نمازیوں کے لیے (۴) وہ جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں (۵) وہ جو ریاکاری کرتے ہیں (۶) اور کسی کو برتنے کی چیز بھی نہیں دیتے (۷)

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الماعون ہے ۔ اس کی آخری آیت میں ماعون کا لفظ ذکر کیا گیا ہے ۔ اسی لفظ سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے ۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی اکثر مفسرین[1] کی یہی رائے ہے ۔ تاہم بعض مفسرین[2] فرماتے ہیں کہ اس کا نصف حصہ مکی زندگی میں اور نصف حصہ مدنی زندگی میں نازل ہوا ۔ اس سورۃ کے مدنی ہونے کا تصور اسی وجہ سے ہے ۔ کہ اس میں منافقین کا ذکر ہے ۔ اور وہ مدنی زندگی میں پیدا ہوئے تھے ۔ مکی دور میں منافقین کا وجود نہیں تھا ۔ اس وقت یا کافر تھے ۔ یا مخلص مسلمان ۔

اس سورۃ کی سات آیتیں ہیں ۔ یہ پچیس ۲۵ الفاظ اور ایک سو پچیس ۱۲۵ حروف پر مشتمل ہے ۔

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی ص۳۶ پارہ ۳۰ ، تفسیر اتقان ص۲۵ ج۱ ، درمنثور ص۳۹۹ ج۶

[2] روح المعانی ص۲۴۱ ج۳۰ ، مظہری ص۳۴۹ ج۱۰ ۔

قومیت پرستی کی مذمت

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ قریش میں قومیت پرستی کی بیماری پیدا ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے قریش کو خصوصی مرتبہ عطا فرمایا تھا۔ بیت اللہ شریف کے متولی ہونے کی وجہ سے انہیں عزت بخشی تھی۔ لہٰذا انہیں چاہیے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے مگر ان میں قومیت پرستی پیدا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہلک بیماری کا علاج یہ تجویز کیا۔ کہ اُس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے انہیں بھوک اور خوف سے نجات دلائی۔

جس قوم میں قومیت پرستی پیدا ہو جائے۔ اُس میں غرور، تکبر اور رعونت آجاتی ہے پھر وہ ظلم و ستم پر اُتر آتی ہے۔ ہٹلر نے بھی یہی کہا تھا۔ کہ جرمن قوم قوموں پہ فوقیت رکھتی ہے اس نے اسی لعنت میں مبتلا ہو کر پوری دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا تھا۔ مگر انگریز روس اور امریکہ نے مل کر اُسے شکست دی۔ مسولینی بھی کہتا تھا۔ کہ اٹالین قوم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی قوم معزز نہیں۔ اس میں ڈکٹیٹر شپ کا مادہ پایا جاتا تھا۔ مگر بنیاد اس کی بھی نیشنلزم ہی تھی۔ یہ سب لعنتیں ہیں۔ اشتراکی نظام خدا پرستی کے انکار پر مبنی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ قابلِ قبول نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام جس میں امریکہ، برطانیہ، فرانس وغیرہ شامل ہیں۔ یہ بھی لعنت ہے۔ ہمارے ممالک بھی اسی ظالمانہ نظام کا شکار ہیں۔ حالانکہ اسلام کا عطا کردہ نظام صاف ستھرا اور بلند پایہ نظام ہے۔ جو ان تمام نظاموں سے مختلف ہے۔

قوم پرستی کی مذمت میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے[1] "اِنَّ اللّٰہَ قَدْ اَذْھَبَ عَنْکُمْ عُبِّیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ" اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے زمانے کی نخوت کو مٹا دیا ہے۔ "فَالنَّاسُ رَجُلَانِ رَجُلٌ مُّتَّقِیٌّ کَرِیْمٌ عَلَی اللّٰہِ وَ فَاجِرٌ شَقِیٌّ" اب انسان یا تو مومن اور متقی ہوگا یا فاجر اور بدبخت ہوگا۔ اب کسی کی عزت قومیت پرستی کی بنا پر نہیں ہوگی۔ بلکہ دینداری کی بنا پر ہوگی۔ حضور علیہ السلام کا یہ بھی فرمان ہے[2]۔ کہ "لَیَنْتَھِیَنَّ قَوْمٌ یَفْتَخِرُوْنَ بِاٰبَآئِھِمْ اَوْ لَیَکُوْنُنَّ اَھْوَنَ عَلَی اللّٰہِ مِنَ الْجُعْلَانِ" یعنی لوگ اپنے

---

[1] ترمذی صنـ۴۷۲، [2] کنز العمال صنـ۳ ج ۳ بحوالہ بزار

اباؤ اجداد پر فخر کرنے سے باز آجائیں۔ ورنہ اللہ کے نزدیک وہ اس طرح ذلیل ہوجائیں گے جس طرح غلاظت کا کیڑا غلاظت کی گولیاں بنا کر ناک کے ساتھ لڑھکاتا پھرتا ہے۔

عزت کا مدار تقویٰ پر ہے

سورۃ حجرات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے اجتماعی نظام اور اس کے اصول بیان فرمائے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قومیں، قبائل، خاندان اور گوتیں ایک دوسرے کی پہچان کے لیے پیدا کی ہیں۔ مگر "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعزت وہ ہے جو متقی ہے۔ قومیتوں کا فلسفہ محض جان پہچان تک محدود ہے۔ حضور علیہ السلام کا بھی ارشاد ہے[1] وَالنَّاسُ بَنُوْا اٰدَمَ تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو۔ وَاٰدَمُ مِنَ التُّرَابِ اور آدم (علیہ السلام) کی تخلیق اللہ نے مٹی سے فرمائی۔ تمام انسانوں کا شجرہ نسب مٹی سے ملتا ہے۔ مٹی میں عاجزی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ہم سب کو عاجزی اختیار کرنی چاہیے۔ غرور اور تکبر سے بچنا چاہیے۔ جو کہ شیطان کا شیوہ ہے۔

اسی لیے فرمایا "فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ" اس گھر کے مالک کی عبادت کرو۔ دوسرے الفاظ میں اسے اس طرح تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کو قومیت پرستی سے ہٹا کر ایک دیندار اور مذہبی جماعت بنانے کی تلقین کی ہے۔ تاہم یہ علیحدہ مسئلہ ہے۔ کہ دینی جماعتیں کیوں ناکام ہوتی ہیں۔ ان میں کون سی بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتیں۔

یوم الدین کا انکار

الغرض! اللہ تعالیٰ نے جھوٹی مذہبیت کی تردید کرتے ہوئے فرمایا "اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ" کیا تو نے اُس شخص کو دیکھا ہے۔ جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ دین سے مراد ملت بھی ہوسکتی ہے۔ اور ملت کو جھٹلانے والا کافر ہوتا ہے۔ تاہم زیادہ تر مفسرین[2] بیان کرتے ہیں کہ یہاں پر دین سے مراد یَوْمُ الدِّیْنِ یعنی جزاء کا دن ہے۔ جب قیامت کے روز ہر عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔ سورۃ فاتحہ میں بھی ہم کہتے ہیں "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" یعنی جزاء کا مالک۔ تو یہاں پہ دین کا معنیٰ یوم حساب ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اُس شخص کا

---

[1] ترمذی ص ۴۷ کنز العمال ص ۳/۱۰۰ [2] تفسیر ابن کثیر ص ۴/۵۵۴، روح المعانی ص ۳۰/۲۴۳، معالم التنزیل ص ۴/۲۵۵

قیامت پر یقین نہیں اور جزائے عمل پر اُس کا اعتماد نہیں ہے۔

پوری نوعِ انسانی میں اللہ کا نام لینے والوں کی ہر دور میں غالب اکثریت رہی ہے ایک قلیل تعداد دہریوں کی ایسی ہے۔ جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں۔ آج دنیا بھر کی پانچ ارب آبادی میں سے پونے پانچ ارب اللہ کا نام لینے والے ہیں۔ تاہم ایک دنیا دار اور دیندار میں فرق یہ ہے۔ کہ دیندار آدمی قیامت پر یقین رکھتے ہوئے نیکی کے کام کرتا ہے۔ اور بنی نوعِ انسان کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے۔ برخلاف اس کے دنیا دار سنگ دل ہوتا ہے جو انسانی ہمدردی سے محروم ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے دوزخ میں جانے کی وجہ اللہ تعالےٰ نے یہی بیان فرمائی ”اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ“ وہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتا تھا ”وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ“ اور مسکین کو کھانا کھلانے کے لیے تیار نہیں تھا اور نہ مسکین کے کھانا کھلانے پر کسی کو ترغیب دلاتا تھا۔ گویا کھانے کا تعلق ایمان کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے یومِ جزاء کو جھٹلانے والے کی مذمت بیان کی ہے۔

یتیم سے بدسلوکی

انسانی ہمدردی سے محروم انسان کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ یہ ایسا بدبخت شخص ہے۔ جو ایک قیامت کی تکذیب کرتا ہے دوسرے یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے[1]۔ کوئی آدمی قریب المرگ ہوتا تو ابوجہل اس کے سرہانے جا بیٹھتا۔ کہتا مجھے اپنی اولاد کا متولی بنا دو۔ میں اس کی پوری حفاظت کروں گا۔ بسا اوقات لوگ اسے سردار سمجھتے ہوئے۔ اس پر اعتماد کرتے کہ یہ یتیموں کے مال کی حفاظت کرے گا۔ مگر جب وہ مال پر قبضہ کر لیتا، تو پھر یتیموں کو دھکے مار کر نکال دیتا۔ وہ بیچارے گلیوں میں مارے مارے پھرتے مگر اُس سے کوئی باز پرس نہ کر سکتا۔ کیونکہ وہ طاقتور تھا۔

حدیث شریف میں آتا ہے[2]۔ کہ ایک یتیم حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔

---

[1] تفسیر عزیزی صہ ۲۶۰ پارہ ۳۰ ، [2] تفسیر عزیزی صہ ۲۶۰ پارہ ۳۰

اور عرض کیا کہ حضور! ابوجہل نے میرے ساتھ ایسا ویسا سلوک کیا ہے۔ مجھ پر ظلم کیا ہے۔ حضور علیہ السلام اسی وقت اس کو ساتھ لے کر ابوجہل کے پاس گئے اور اُسے نصیحت فرمائی۔ کہ دیکھو! یتیموں کے ساتھ بدسلوکی مت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل پر ایسا رعب ڈال دیا۔ کہ اُس نے بغیر کسی تعرض کے حضور علیہ السلام کی نصیحت پر عمل کیا۔ اور یتیم کا حق اُسے ادا کر دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت تھی۔ کہ وہ فوراً مان گیا، ورنہ وہ بڑا ظالم آدمی تھا۔ آسانی سے راہِ راست پر آنے والا نہیں تھا۔

ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا[1] حضور! میں اپنے اندر سنگدلی پاتا ہوں۔ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے کہ میرے دل کی سختی دور ہو جائے۔ آپ نے فرمایا یتیم کے سر پر ہاتھ رکھو۔ خدا تمہاری سنگدلی دور فرما دے گا۔

مسکین کو کھانا کھلانا

یوم جزاء کی تکذیب کرنے والے اور انسانوں سے بدسلوکی کرنے والے کی ایک اور صفت یہ بیان فرمائی وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ اتنا کنجوس ہے کہ خود یتیم کی پرورش کرنا تو درکنار دوسروں کو بھی ترغیب نہیں دیتا کہ یہ مسکین ہے۔ اِس کو کھانا ہی کھلا دو۔ یا اس کے ساتھ کوئی اور اچھا سلوک کرو۔ فرمایا یہ بھی بیماری ہے۔ یتیم، مسکین یا عام انسان کا حق ضائع کرنا، ان کی طرف توجہ نہ کرنا۔ مذہبی آدمی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسانی ہمدردی سے محروم ہو جائے۔ تو فرمایا جب ایسا شخص انسانوں کا حق ضائع کرتا ہے تو خدا تعالیٰ کا حق ضائع کرنا تو اُس سے بھی بڑی بات ہے۔

نماز سے غفلت

فرمایا فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ پس ہلاکت اور تباہی ہے نمازیوں کے لیے الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ سہو کا معنی بھول جانا ہے اور بھول دو قسم کی ہے۔ ایک نماز کے اندر بھول جانا یعنی پڑھنے کے دوران بھول ہو جائے اس کا علاج بھی حضور علیہ السلام نے بتا دیا کہ اگر نماز میں بھول جاؤ تو سجدہ سہو ادا کر لو، نماز درست ہو جائے گی۔ حدیث میں آتا ہے۔ کہ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پانچ یا چھ

---

[1] مسند احمد صفحہ ۳۸۷ ج ۲

دفعہ نماز میں بھولے، نماز کے اندر بھول جانے پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ مگر یہاں پر سہو سے مراد نماز سے غفلت ہے۔ کیونکہ الفاظ فِی صَلٰوتِہِمْ نہیں بلکہ عَنْ صَلٰوتِہِمْ ہیں۔ یعنی ایسا شخص سرے سے نماز پڑھتا ہی نہیں، غفلت میں پڑا ہوا ہے اور اگر چار و ناچار پڑھتا بھی ہے۔ تو منافقین کی نماز پڑھتا ہے۔ یعنی بیٹھا رہتا ہے۔ وقت ہو گیا۔ وہ کسی شغل میں مصروف ہے۔ جب وقت بالکل تنگ ہو جاتا ہے۔ تو اٹھ کر مرغ کی طرح دو چار ٹھونگے مار لیتا ہے۔ ایسا شخص اللہ کو بہت تھوڑا یاد کرتا ہے۔ جماعت کا خیال نہیں کرتا، نماز کے فرائض، واجبات، مستحبات کی پرواہ نہیں کرتا۔ یہی منافق کی نماز ہے۔ اسی لیے فرمایا، ہلاکت اور تباہی ہے ان کے لیے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں۔

ریا کاری شرک کے مترادف ہے

اس قسم کی نماز کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا[1]۔ کہ یہ اللہ سے اور دوری کا سبب بنتی ہے اِلَّا بُعْدًا کے الفاظ آتے ہیں۔ کیونکہ یہ نماز عقیدت، شرائط اور پابندی کے ساتھ ادا نہیں کی گئی۔ فرمایا اس قسم کی نماز پڑھنے والے وہ لوگ ہیں اَلَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ جو ریا کاری کرتے ہیں۔ محض لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں کہ لوگ کہیں کہ یہ بڑا نمازی ہے۔ حالانکہ نماز تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے پڑھنی چاہیئے اس کے سامنے عاجزی اور مناجات کرنی چاہیئے۔ تاکہ انسان میں بلند درجے کی روحانیت پیدا ہو۔ اور وہ بارگاہِ الٰہی میں پیش ہونے کے قابل ہو سکے۔ نماز تو بارگاہ ایزدی میں حاضری ہے۔ اسے بڑی احتیاط اور توجہ سے ادا کرنا چاہیئے۔ ریا کاری اس کے منافی ہے۔ ریاکار آدمی خدا کی مخلوق کو خدا تعالیٰ سے بڑا سمجھتا ہے۔ جبھی تو لوگوں کے دکھاوے کے لیے نیکی کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی کوئی عظمت نہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان[2] ہے۔ جس نے ریا کاری کی اس نے شرک کیا۔ ریا کاری گویا شرک کی ایک قسم ہے۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ریاکار سے فرمائے گا[3]۔ میرے پاس تمہارے لیے کوئی جزا نہیں ریاکاری کے عمل کا بدلہ ان سے جا کر حاصل کرو۔ جن کے لیے ایسا

---

[1] ... [2] مستدرک حاکم ص ۳۲۹ ج ۴، ابن ماجہ ص ۳۱۰، مسلم ص ۴۱۱ ج ۲ [3] کنز العمال ص ۲۶۹ ج ۳، ابن ماجہ ص ۳۱۰

عمل کرتے تھے۔ میرے ہاں تو تمہاری گرفت ہے۔ تو گویا ریاکار خدا کی بجائے مخلوق کو قابل وقعت سمجھتا ہے۔ اور یہ نہایت بُری بات ہے۔

مذہبی جماعتوں کی کوتاہیاں

اس سورۃ مبارکہ میں جن بیماریوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان سے مذہبی جماعتیں بھی مبرا نہیں۔ مذہبی لوگوں میں بھی زر پرستی کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ مسکین طبقات پر احسان کرنے کی بجائے ان کا حق غصب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاکاری کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان میں بُخل کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ جماعتیں بھی ناکام ہو جاتی ہیں۔ نیشنلزم والے اس لیے ناکام ہوتے ہیں کہ ان میں اکڑ پیدا ہو جاتی ہے شہنشاہیت والے اس لیے ناکامی کا منہ دیکھتے ہیں۔ کہ وہ ظالم بن جاتے ہیں۔ سرمایہ دار اس لیے تباہ ہوتے ہیں۔ کہ وہ دین کی دولت سے محروم ہوتے ہیں۔ اور دیندار لوگ اس لیے ناکام ہوتے ہیں۔ کہ وہ انسانی ہمدردی کے کاموں سے محروم ہوتے ہیں۔ ریاکاری کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ غریبوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ یتیموں، مسکینوں، اور کمزوروں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش نہیں آتے۔ ان میں بھی دنیاداروں جیسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا جب دینداروں میں بھی یہ بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خواہ پیر ہوں، مولوی ہوں یا خانقاہ والے ہوں، تو وہ بھی یہاں آ کر ناکام ہو جاتے ہیں۔

انسانی ہمدردی

انسانی ہمدردی سے محروم لوگوں کی خباثت کی ایک مثال یہ بیان فرمائی۔ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ کہ کسی کو برتنے کی چیز بھی نہیں دیتے۔ دولت کو سمیٹنا اور پھر اس کے خرچ میں بُخل کرنا ایسے ہی لوگوں کا شیوہ ہے۔ سورۃ توبہ میں بیان ہوا " اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" بہت سے پیر اور عالم ایسے ہیں۔ جو لوگوں کی دولت باطل طریقے سے سمیٹتے ہیں۔ مگر انسانی ہمدردی کا یہ عالم ہے۔ کہ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ کسی کو مانگے کی چیز بھی دینے کیلیے تیار نہیں ہوتے۔ کوئی برتن مانگ لے کہ استعمال کر کے واپس کر دوں گا۔ یا کوئی اور چیز۔

حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ضحاکؒ اور حضرت

قتادہؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ ماعون میں زکوٰۃ بھی شامل ہے۔ گویا یہ لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں کرتے اکثر دوسرے مفسرین[2] اس سے برتنے کی دوسری چیزیں مراد لیتے ہیں۔ کسی پڑوسی کو کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے، تو وہ بھی دینے سے گریز کرتے ہیں۔

بخل کی بیماری

بخل کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی[3] ہے۔ اَیُّ دَآءٍ اَدْوَأُ مِنَ الْبُخْلِ بخل سے بڑھ کر اور کون سی بیماری ہے۔ یہود اسی بیماری سے تباہ ہوئے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ بخل سے بڑھ کر کوئی روحانی اور اخلاقی بیماری نہیں ہے۔ بخل، ریاکاری، غرباء و مساکین سے عدم توجہی، یہی تکذیب دین ہے۔ مذہبی لوگ بھی اسی طریقے سے کام ہیں ظاہری طور پہ چاہیے۔ کچھ عنوان رکھیں۔ مگر انسانیت کا اظہار قیامت کے روز ہی ہوگا۔ جو لوگ انسانیت کے کام سے محروم ہوں گے وہ اس دن ناکام ہو جائیں گے۔ لہٰذا مذہبی لوگوں کو چاہیے۔ کہ وہ ان باتوں سے بچیں۔ جس طرح قریش کو فرمایا کہ قوم پرستی سے بچو، توحید پرستی اختیار کرو۔ جھوٹی مذہبیت خدا کے ہاں کچھ مفید نہ ہوگی۔ انصاف والے دن ہر چیز واضح ہو جائے گی۔

---

[1] مستدرک حاکم ص ۵۳۶ ج ۲، درمنثور ص ۴۰۱ ج ۶، تفسیر خازن ص ۳۰۰ ج ۷۔

[2] درمنثور ص ۴۰۲ و ص ۴۰۱ ج ۶، معالم التنزیل ص ۲۵۶ ج ۴، خازن ص ۳۰۰ ج ۷

[3] مسند احمد ص ۳۰۸ ج ۳، کنز العمال ص ۲۵۷ ج ۳

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سُورَةُ الكَوثَر

عَمَّ ۳۰ — الکوثر ۱۰۸

درس — (مکمل سورۃ)

سُوْرَۃُ الْکَوْثَرِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ ثَلٰثُ اٰیَاتٍ

سورۃ کوثر مکی ہے اور یہ تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ② اِنَّ شَانِئَکَ
ع ۳۳ هُوَ الْاَبْتَرُ ③

ترجمہ: تحقیق ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا ① پس آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیں اور قربانی کریں ② بے شک آپ کا دشمن ہی ابتر ہے ③

نام اور کوائف — اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الکوثر ہے۔ یہ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی تین آیتیں ہیں اور یہ بارہ[۱۲] الفاظ اور بیالیس[۴۲] حروف پر مشتمل ہے۔

زمانہ نزول کے متعلق مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ مکی سورۃ ہے یا مدنی مسند احمد[۱] اور حدیث[۲] کی دوسری کتابوں میں مذکور ہے۔ کہ ایک موقع پر مدنی زندگی میں حضور علیہ السلام اور صحابہؓ کی جماعت موجود تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے آپ پر غنودگی کی حالت طاری ہوئی۔ جب وہ حالت رفع ہوئی۔ تو آپ مسکرائے۔ لوگوں نے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی ایک سورۃ نازل فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ نے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور پھر پوری سورۃ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ پڑھ کر سنادی۔

اسی حدیث میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے کوثر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

۱؎ مسند احمد ص ۱۰۲ ج ۳، مسلم ص ۱۷۲ ج ۱

۲؎ روح المعانی ص ۲۴۴ ج ۳۰، درمنثور ص ۴۰۱ ج ۶، تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۳۰ ص ۳۶۲، روح المعانی ص ۲۴۸ ج ۳۰

کہ کوثر ایک نہر ہے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کیا ہے، کہ وہ مجھے عطا فرمائے گا۔ اس کا پانی بڑا ٹھنڈا اور میٹھا ہوگا۔ اور اس کے کنارے جو گلاس اور آبخورے ہوں گے۔ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر ہوگی۔ اس پانی کی تاثیر یہ ہوگی، کہ جو شخص اس میں سے پی لے گا۔ اُسے حشر کے تمام عرصہ میں پیاس نہیں لگے گی۔

شانِ نزول — مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سورۃ مدنی زندگی میں نازل ہوئی۔ مگر عام مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں[۱]۔ کہ یہ مکی سورۃ ہے۔ اس کا شانِ نزول اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے دو صاحبزادے قاسمؓ اور عبداللہؓ جن کے لقب طیب اور طاہر تھے۔ مکیّ دور میں ہی فوت ہو گئے چنانچہ مکے کے بعض مشرک جن میں عاص بن وائل اور عقبہ بن ابی معیط پیش پیش تھے۔ حضور علیہ السلام کو طعن دیتے تھے۔ کہ آپ ابتر یعنی بے نسل ہیں۔ چونکہ بیٹے بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔ اس لیے آپ کی نسل آگے نہیں چلے گی اور نہ ہی آپ کا دین باقی رہے گا۔ یہ آپ کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ یہودیوں میں سے کعب بن اشرف بھی اسی قسم کی بات کہا کرتا تھا۔ چنانچہ اس طعن کے جواب میں آپکی تسلی کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

موضوع — اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات پر کیے گئے بہت بڑے احسان کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ اللہ نے آپ کو کوثر عطا کیا۔ نیز یہ کہ کفار کے طعن کی کوئی حیثیت نہیں نہ آپ کی نسل ختم ہوگی اور نہ آپ کا دین ختم ہوگا۔ اللہ نے آپ کو خیر کثیر عطا کیا ہے اُس نے آپ کو صوری اور معنوی دونوں قسم کی اولاد عطا کی ہے۔ اور آپ کا مقام بہت بلند فرما دیا ہے۔ یہ تو کہتے ہیں کہ آپ کا نام لیوا کوئی نہیں ہوگا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ ہر مقام پر آپ کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ ہوگا۔ ان طعن بازوں کا کوئی نام لینے والا نہیں ہوگا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی تسلی کے لیے یہ سورۃ نازل فرمائی اور اس میں پہلے انعامات کا ذکر کیا، پھر ان انعامات کے شکریہ کا مطالبہ کیا۔ اور آخری حصہ میں بشارت بھی سنا دی۔

---

[۱] روح المعانی صفحہ ۲۴۸ جلد ۳۰، درمنثور صفحہ ۴۰۱ جلد ۶، تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۳۶۲ پارہ ۳۰

کوثر۔ خیر کثیر

ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ تحقیق ہم نے آپ کو کوثر عطا کیا۔ اس کی تفصیل پہلے آچکی ہے۔ کہ کوثر سے مراد حوض کوثر ہے۔ جو اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کو قیامت کے دن عطا فرمائیں گے۔ آپ کی امت کا جو مومن اس حوض پر پہنچ جائے گا۔ اُسے اس سے پینا نصیب ہوگا۔ جس کی وجہ سے اُسے ہمیشہ کے لیے راحت اور سرور حاصل ہو جائے گا۔ لغوی طور پر کوثر، کثیر کے مادے سے ہے۔ جس کا معنی خیر کثیر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں[1]۔ کہ کوثر کا معنی ہے اَلۡخَیۡرُ الۡکَثِیۡرُ یعنی بہت زیادہ بھلائی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جسمانی اولاد بھی عطا فرمائی۔ اگرچہ آپ کے بیٹے نہیں ہیں، مگر بیٹیاں تو ہیں۔ اور یہ اولاد پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ آپ نے حضرت امام حسینؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا[2] کہ حسین سِبۡطٌ مِّنَ الۡاَسۡبَاطِ ہیں۔ یعنی آپ قبیلوں میں سے ایک بڑا قبیلہ ہیں اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کی اولاد کو اس قدر کثرت سے پھیلائیگا۔ اور معنوی اولاد یعنی آپ پر ایمان رکھنے والے لوگوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ کہ ان کی تعداد دنیا میں کتنی ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہی ہے۔ خود حضور علیہ السلام نے فرمایا[3] کہ قیامت والے دن سب سے زیادہ پیروکار میرے ہوں گے جنت میں داخل ہونے والے لوگوں میں بھی تمام نبیوں سے حضور علیہ السلام کے امتیوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ یہ آپ کی معنوی اولاد ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا[4] اٰلُ مُحَمَّدٍ کُلُّ تَقِیٍّ ہر مومن متقی میری آل میں شامل ہے گویا آپ کی معنوی اولاد شمار سے باہر ہے۔ اتنی کسی دوسرے نبی کو نصیب نہیں ہوگی۔

قرآن کریم بھی خیر کثیر ہے

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ قرآن کریم بھی کوثر یعنی خیر کثیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرآن کریم جیسی دولت عطا کی۔ اس میں حکمت کا مکمل کورس بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے مقام پر قرآن پاک میں موجود ہے " وَمَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا " جس کو حکمت دی گئی اس کو خیر کثیر دیا گیا۔ یعنی بہت زیادہ بھلائی دی گئی۔

---

[1] درمنثور ص ۴۰۲ ج ۶، ابن کثیر ص ۵۵۸ ج ۴، [2] ترمذی ص ۵۴۰، ابن ماجہ ص ۱۴
[3] مسلم ص ۸۶ ج ۱۶ [4] کنز العمال ص ۵۴ ج ۱۲

قرآن پاک ایسا خیر کثیر ہے۔ کہ اس قرآن پاک کا فیض نسلاً بعد نسل اور طبقاً بعد طبق دنیا میں پھیلتا رہے گا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1]۔ جو آدمی دنیا میں جس قدر قرآن کریم سے فیضیاب ہوگا۔ اسی نسبت سے اُس کو حوض کوثر پہ پانی نصیب ہوگا۔ لہٰذا تمام اہل ایمان کو قرآن کریم کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔

اس کے علاوہ علوم وفنون، سلطنت، خزانے اور نماز کو بھی خیر کثیر میں شامل کیا گیا ہے یہ تمام چیزیں خیر کثیر کے تحت آتی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر قرآن پاک ہے۔ جو شخص اس پہ ایمان رکھے گا۔ اسے خدا کا کلام تسلیم کرے گا۔ اس کا فرض ہے۔ کہ وہ اس کی اشاعت میں حصہ لے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ باقی چیزیں قرآن پاک کے مقابلے میں وقیع نہیں ہیں۔ ان سب چیزوں پہ قرآن پاک کو ہی فوقیت حاصل ہے۔

نعمت کی قدر دانی

اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کی قدر دانی کرنی چاہیئے۔ ترمذی شریف کی روایت میں[2] آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یُعَظِّمُ النِّعْمَۃَ وَاِنْ دَقَّتْ یعنی نعمت کی قدر دانی کرتے تھے۔ اگرچہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہوتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر نعمت منجانب اللہ ہے لہٰذا کسی نعمت کی تحقیر نہیں کرنی چاہیئے۔ انسان اکثر ناشکر گزاری کرتا ہے۔ جو کہ مناسب نہیں، سلطنت، خلافت، اولاد، حوض کوثر اور قرآن پاک سب انعامات الٰہی ہیں۔ قرآن کریم دنیا میں ہدایت اور راہنمائی کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا اس سے فیض یابی قیامت کو حوض کوثر سے فیضیابی کا ذریعہ بنے گی۔

اشاعت قرآن کے مختلف طریقے

اشاعتِ قرآن پاک مختلف طریقوں سے ہوتی ہے۔ نماز میں قرآن پاک کا پڑھنا فرض ہے۔ "فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ" اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ لہٰذا نماز بھی اشاعتِ قرآن کا ایک طریقہ ہے۔ مشرکین نماز سے روکتے تھے۔ تاکہ نہ قرآن پاک پڑھا جائے اور نہ اس کی اشاعت ہو۔ وہ کہتے تھے "لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْہِ"

---

[1] تفہیمات ص ۲۴/ج ۱، المقام المحمود پارہ عم حضرت مولانا سندھیؒ ص ۱۸۷ تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۶۳/پارہ ۳۰

[2] ترمذی ص ۵۸۴

قرآن پاک کو مت سنو بلکہ جہاں پڑھا جائے وہاں شور وغیرہ ڈالو تاکہ کوئی بھی اسے نہ سن سکے اور اس طرح اس کی اشاعت رُک جائے۔ سورۃ علق میں گذر چکا ہے "اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی" آپ نے اس بدبخت کو دیکھا ہے جو اللہ کے بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ اس کے پس منظر میں بھی یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ کسی طرح قرآن کی اشاعت نہ ہونے پائے۔ اور درجے مرتبے اور ثواب کے لحاظ سے تلاوت قرآن کی زیادہ فضیلت نماز کی حالت میں ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ نماز سے باہر قرآن کا پڑھنا تسبیح اور تکبیر سے افضل ہے اور تسبیح صدقہ سے افضل ہے اور صدقہ روزہ سے افضل ہے اور روزہ دوزخ کے آگے ڈھال ہے۔ اس کی تعلیم درس وتدریس، اس کے مطابق عمل کرنا، اس کے قانون کو جاری کرنا۔ یہ سب چیزیں اشاعت قرآن کا حصہ ہیں۔ یہ اللہ تعالےٰ کا عظیم احسان ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا کیا ہے۔ منجملہ ان کے قرآن پاک بھی ہے۔ لہٰذا نعمت جس قدر بڑی ہو، اسی قدر اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیئے۔

فلاح کے دو اصول

اس شکر کے مقام پہ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں بیان فرمائی ہیں۔ جو درحقیقت فلاح کے دو بڑے اصول ہیں۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ یعنی نماز پڑھو، اور قربانی کرو۔ یہ دو عظیم اصول بیان فرمائے۔ اس سے پہلے سورۃ عصر میں چار اصول بیان فرمائے تھے۔ جو کبھی غلط نہیں ہو سکتے اور تمام اقوام عالم کے لیے یکساں مفید ہیں۔ جس طرح دو اور دو کبھی پانچ نہیں ہو سکتے، چار ہی رہتے ہیں۔ اسی طرح یہ اصول بھی اٹل ہیں۔ تو گویا اس سورۃ میں اللہ تعالےٰ نے فلاح کے دو اصول بیان فرمائے ہیں۔ جن پہ عمل کرنے سے ساری خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔ سرمایہ داری، ملوکیت اور نیشنلزم کی تمام قباحتیں ان پاکیزہ اصولوں پر عمل درآمد سے رفع ہو سکتی ہیں۔

نماز تعلق باللہ کا ذریعہ ہے

پہلا اصول یہ بیان فرمایا فَصَلِّ لِرَبِّكَ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیں۔ نماز اللہ تعالیٰ کی رضا کا سب سے اہم ذریعہ اور عبادات میں سب سے اہم عبادت ہے۔ اس کے ذریعے انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ استوار ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح ص۱۸۸ بحوالہ بیہقی شعب الایمان۔

بارگاہ میں حاضری ہے۔ تعلق باللہ کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ اگر تعلق باللہ درست ہوگا۔ تو باقی نظام بھی درست ہوں گے اور اگر یہی بگڑا ہوگا۔ تو پھر کوئی نظام صحیح نہیں ہوگا۔ نہ نظام حکومت درست ہوگا۔ نہ تجارت نہ کاروبار۔ اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق نماز کے ذریعے ہی صحیح ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انعامات کا ذکر فرمانے کے بعد کہا فَصَلِّ لِرَبِّكَ اپنے پروردگار کے لیے نماز پڑھیں۔ تاکہ خدا کی نعمتوں کا شکر بھی ادا ہو۔ اور اشاعتِ قرآن کا فریضہ بھی ادا ہوتا ہے۔ جو کہ اس کے برکات کو عوام تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

قربانی تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے

فلاح کا دوسرا اصول فرمایا وَانْحَرْ یعنی قربانی کریں۔ نحر اونٹ کی قربانی کو کہتے ہیں حدیث شریف میں آتا ہے[1]۔ کہ حضور علیہ السلام نے عید الاضحیٰ کے خطبے میں فرمایا۔ آج کے دن ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے۔ کہ نماز پڑھیں ثُمَّ نَرْجِعُ فَنَنْحَرُ پھر پلٹ کر قربانی کریں گے۔ قربانی محض گوشت کھانے کا نام نہیں بلکہ یہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے "لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۗؤُهَا اللہ تعالیٰ کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ" بلکہ تمہارا تقویٰ بارگاہِ رب العزت میں پہنچتا ہے۔ قربانی انسان کے عقیدہ توحید کی علامت ہے ــــ

مشرکین اپنے معبودانِ باطلہ کے نام پر قربانی کیا کرتے تھے۔ جو کہ شرک اور بہت بڑا جرم ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک مومن اللہ کے نام پہ قربانی دیتا ہے۔ جس سے اس کے ایمان اور عقیدہ توحید کا اظہار ہوتا ہے۔

وَانْحَرْ کا معنی بعض[2] نے نماز میں سینے کے نیچے ہاتھ باندھنا بھی کیا ہے۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ بعض[3] نے اس کا معنی سینہ قبلہ کی طرف پھیرنا کیا ہے۔ مگر یہ بھی ضعیف روایت ہے۔ اس مقام پہ وَانْحَرْ کا صحیح معنی قربانی کرنا ہی ہے۔

---

[1] بخاری صفحہ ۱۳۰ جلد ۱، مسلم صفحہ ۱۵۴ جلد ۲ [2] مظہری صفحہ ۳۵۲ جلد ۱۰، روح المعانی صفحہ ۲۴۷ جلد ۳۰، درمنثور صفحہ ۴۰۲ جلد ۶
[3] درمنثور صفحہ ۴۰۳ جلد ۶، ابن کثیر صفحہ ۵۵۸ جلد ۴

قربانی کو اکثر آئمہ سنت مؤکدہ قرار دیتے ہیں، صرف ہمارے امام ابوحنیفہؒ اس کو واجب کہتے ہیں[1]۔ قربانی، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی طرح فرائض میں تو داخل نہیں ہے۔ محض سنت مؤکدہ یا واجب ہے۔ مگر اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[2]۔ کہ اس کی وجہ یہی ہے۔ کہ قربانی کا اس کے وقت پہ ادا کرنا تعلق باللہ درست کرنیکا اہم ترین ذریعہ ہے۔ انسان کے عقیدہ توحید کا اظہار اسی عمل سے ہوتا ہے۔

قربانی صرف پالتو جانور کی روا ہے

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ قربانی بھیمۃ الانعام یعنی پالتو جانور کی ہی ہوسکتی ہے۔ یہ چار قسم کے جانور ہیں۔ جن میں اونٹ، بھیڑ، بکری، گائے بھینس شامل ہیں یہ جان کا بدل ہے۔ اور قربانی کے لیے جانور بھی وہی ٹھہرائے گئے ہیں۔ جن سے انسان عام طور پر مناسبت رکھتے ہیں۔ اور ان سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ ان کا گوشت، دودھ، چمڑا، چربی وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ اور ان پر سواری بھی کرتے ہیں۔ زمین کی خدمت بھی انہیں جانوروں سے لی جاتی ہے۔ جو انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور ان کی خدمت کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ لہٰذا قربانی بھی انہیں جانوروں کی مقرر کی گئی ہے۔ یہ انسانی جان کا بدل ہے۔ کوئی شخص قربانی کے طور پر اپنی اولاد یا اپنے غلام کی قربانی نہیں کرسکتا یہ حرام ہے۔ جان اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پر کسی کو اختیار نہیں دیا۔

اگر کوئی شخص انسانی جان کی نذر مان لے، جیسے یوں کہے کہ میں بیٹے کی قربانی دوں گا۔ تو اس کے لیے بھی یہی حکم ہے ________ کہ جانور کی قربانی کرے انسانی جان کی قربانی نہیں ہوسکتی۔ ابھی آپ نے اخبارات میں پڑھا۔ کہ راولپنڈی کے کسی شخص نے اپنے بیٹے کی قربانی کی نذر مانی اور پھر اسے ذبح کر دیا۔ اس کی ٹانگیں تو دبا دیں، مگر دوسرا گوشت دیگ میں پکا کر حضرت امام حسینؓ کی نیاز کے طور پہ لوگوں کو کھلایا دیکھو! یہ کتنا بڑا جرم اور حماقت ہے۔ نیاز دینے والے لوگ کہاں سے کہاں تک جا پہنچے

---

[1] ہدایہ ص ۴۴۳/۴۴ ، [2] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۶/۲۴ پارہ ۳۰

اوّل تو نماز لغیر اللہ ویسے ہی حرام ہے اور پھر بیٹے کو ذبح کر دیا۔ بدبخت نے دوسرے لوگوں کو بھی اس جرم میں شریک کیا۔ ایسے لوگوں کو عبرتناک سزا ملنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل علیہ السلام کی جان کا بدلہ بھی جانور ہی بھیجا تھا۔ اور اسے ذبح عظیم کے لقب سے یاد کیا۔ گویا قربانی کے لیے یہ عظیم دستور مقرر فرما دیا کہ انسان کی قربانی قطعاً روا نہیں۔ ہندوؤں کے ہاں انسانی قربانی کا تصور پایا جاتا ہے۔ وہ اسے بلیدان کا نام دیتے ہیں۔ کبھی وہ انسان کو کالی دیوی کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ کبھی کسی دیوتا کے نام پر بچوں کو ذبح کر دیتے ہیں۔ یہ سب ناجائز اور حرام ہے۔ قربانی صرف اللہ کے نام پر ہی ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی پالتو جانور کی۔ کسی جنگلی وحشی جانور کی قربانی نہیں ہو سکتی۔

دشمن کی ناکامی

اس سورۃ کی ابتداء میں انعامات کا ذکر کیا۔ پھر نماز اور قربانی کا حکم دیا۔ تاکہ انعامات کا شکریہ ادا ہو سکے۔ اب تیسری آیت میں اس پس منظر کا جواب ہے۔ جس میں یہ سورۃ نازل ہوئی۔ حضور علیہ السلام کے دو صاحبزادگان کی وفات کی وجہ سے کفار طعنہ زنی کرتے تھے۔ کہ نعوذ باللہ حضور علیہ السلام ابتر یعنی بے نسل ہیں[1]۔ اسی کے جواب میں ارشاد ہے۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ بے شک آپ کا دشمن، آپ کے ساتھ بغض و عناد رکھنے والا ہی ابتر ہے۔ یعنی اے نبی کریم! آپ ابتر نہیں ہیں۔ آپ کی صوری اولاد بھی خوب پھیلے گی۔ اور آپ کا دین بھی قیامت تک قائم رہے گا۔ البتہ آپ کے دشمن کی نہ اولاد باقی رہے گی اور نہ اس کا دین باقی رہے گا۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں۔ کہ قرآن پاک کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہو رہی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں آپ کی صوری اولاد کا کوئی فرد نہ ہو۔ اور آپ کی معنوی اولاد یعنی آپ کے پیروکاروں کا تو شمار ہی نہیں کہ دنیا میں ان کی تعداد کس قدر ہے۔ اور ادھر طعن کرنے والے مشرکین مکہ کی نہ صوری اولاد موجود ہے اور نہ معنوی۔ آج ان کا نام و نشان تک دنیا میں باقی نہیں۔ مفسرین ان کا ذکر قرآن پاک

---

[1] درمنثور ج۶ ص۴۰۱ تفسیر عزیزی ج۳۰ ص۳۶۲ روح المعانی ج۳۰ ص۲۴۸

کے سیاق و سباق میں کر دیتے ہیں۔ ورنہ ان کے کسی کام یا اخلاق یا دین کی بنا پر وہ دنیا سے بالکل مٹ چکے ہیں۔ جو لوگ حضور علیہ السلام کو ابتر کہتے تھے، وہ خود ہر لحاظ سے ابتر ثابت ہو چکے ہیں۔

حضور علیہ السلام کے لیے مقام محمود

برخلاف اس کے اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کے متعلق فرمایا "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" ہم نے دنیا میں آپ کا ذکر بلند کر دیا۔ ایسا بلند کیا کہ پانچ وقت نماز میں جہاں اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے۔ وہاں آپ کی ذات اقدس پر درود پاک پڑھا جاتا ہے۔ دشمن بھی آپ کا نام لیتے ہیں تو نہایت احترام کے ساتھ تاریخ میں بھی آپ کے کارہائے نمایاں کا ذکر عزت و احترام سے کیا جاتا ہے۔ یہ تو دنیا کا حال ہے۔ اور پھر جب آخرت کی منزل آئے گی۔ تو پتہ چلے گا۔ کہ بلند پایہ مقام محمود پر اللہ تعالیٰ آپ کو مبعوث فرمائے گا "عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا" اسی لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ میرے لیے وسیلہ کی دعا کیا کرو۔ تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اجر دے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے امید ہے۔ کہ مقام محمود پر اللہ تعالیٰ مجھے ہی فائز کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے وہ مقام میرے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا[۱] اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا فَخْرَ میں تمام بنی نوع انسانی کا سردار ہوں۔ مگر یہ بات میں فخر سے نہیں کہتا۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کا انعام ہے۔

کامیابی کا راز

مفسرین کرام[۲] اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کی تفسیر میں بتاتے ہیں۔ کہ دشمن کی ناکامی کا مطلب یہ ہے۔ کہ آپ ان پاکیزہ اصولوں پر عمل پیرا ہو جائیں گے۔ تو دشمن ناکام ہوگا یعنی آپ تعلق باللہ کی درستگی، اقامت صلوٰۃ، قربانی، اور اشاعت قرآن میں سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ تو آپ کے دشمن کو ناکامی ہوگی اور شیطان کو بھی ناکامی ہوگی۔

تاریخ شاہد ہے۔ کہ ابتدائے اسلام سے لے کر نصف صدی کے اندر اندر اللہ تعالیٰ نے نصف دنیا پر اسلام کا پرچم بلند کر دیا۔ اور ساری دنیا سے کفر کا غلبہ ختم ہو گیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان جنگ صفین تک دنیا میں ایسی

۱؎ مسلم صفحہ ۲۴۵ ج ۱، ترمذی صفحہ ۵۱۹ ۲؎ ترمذی صفحہ ۵۲۰ ۳؎

کوئی دوسری طاقت نہیں تھی، جو مسلمانوں سے ٹکرا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اس قدر غلبہ عطا کیا۔ آج بھی اگر لوگ قرآن پاک کے پروگرام پہ عمل پیرا ہو جائیں۔ تو دشمن بھی مغلوب ہو گا۔ اور شیطان بھی دفع ہو جائے گا۔ اگر ان اصولوں پہ عمل نہیں کیا جائے گا۔ تو نہ دشمن مغلوب ہو گا اور نہ شیطان پیچھا چھوڑے گا۔ گویا ہمیں بھی یہ اصول بتلا دیا گیا اور پروگرام دے دیا گیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرو۔ نماز کا خیال رکھو، قربانی کا جذبہ پیدا کرو۔ قرآن پاک کی اشاعت میں حصہ لو، تاکہ اسی تناسب سے قیامت کے دن حوضِ کوثر کا پانی نصیب ہو۔ یہ حضور علیہ السلام کے فیضان کا ایک نمونہ ہو گا۔ جو کوثر کی صورت میں ظاہر ہو گا۔

[illegible]

سورة الكافرون

عَمَّ ۳۰ — الکفرون ۱۰۹

درس — (مکمل سورۃ)

سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ سِتُّ اٰیٰتٍ

سورۃ الکفرون مکی ہے اور یہ چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنیوالا ہے

قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ ① لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ② وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَآ اَعْبُدُ ③ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ④ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَآ اَعْبُدُ ⑤ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ⑥ ع ۱ / ۲۴

ترجمہ :- (اے پیغمبر) آپ فرما دیں کہ اے کفر کرنے والو ① میں نہیں عبادت کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو ② اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں ③ اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کر چکے ہو ④ اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں ⑤ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے ⑥

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الکفرون ہے۔ اس کی پہلی آیت میں کافروں کا لفظ آیا ہے۔ اسی سے سورۃ کا نام اخذ کیا گیا ہے۔ بعض مفسرینؒ نے اسکا نام سُوْرَۃُ الْمُقَشْقِشَۃ[1] یعنی شفا بخشنے والی سورۃ بھی بتلایا ہے کہ یہ کفر و شرک کی بیماری سے شفا بخشنے والی سورۃ ہے۔ تفسیر روح المعانی[2] میں اس کا ذکر آتا ہے۔ تاہم زیادہ مشہور سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ ہی ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی چھ ۶ آیتیں چھبیس ۲۶ الفاظ اور ننانوے ۹۹ حروف ہیں۔

گذشتہ سورۃ کا خلاصہ

پچھلی سورۃ مبارک میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی فلاح اور کامیابی کے پاکیزہ اصول

---

[1] روح المعانی صـ ۲۴۹ / ۳۰ ، درمنثور صـ ۴۰۴ / ۶ ، [2] روح المعانی صـ ۲۴۹ / ۳۰

بیان فرمائے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اللہ کا سب سے بڑا انعام قرآن کریم ہے، جو انسانوں کو نصیب ہوا۔ اس کی اشاعت میں حصہ لینا چاہیئے تاکہ حوضِ کوثر سے پانی پینا نصیب ہو۔ شکریہ ادا کرنے کے لیے سب سے اہم نماز ہے "فَصَلِّ لِرَبِّكَ" پھر مالی عبادتوں میں قربانی کا ذکر فرمایا۔ کہ یہ خاص جذبہ کے تحت پیش کی جاتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا عقیدہ کارفرما ہوتا ہے۔ کیونکہ کفار و مشرکین اپنے معبودانِ باطلہ کے نام کی قربانیاں کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قربانی کا حکم دیا۔ کہ اللہ کی رضا اور تقرب کے لیے قربانی پیش کرو۔ اور یہ جذبہ اپنے اندر پیدا کرو۔ اور اسے اپنے اندر زندہ رکھو۔ یہ کفر و شرک کو مٹانے والا جذبہ ہے۔ اپنے صحیح پروگرام پر مسلسل عمل کرتے رہو۔ اگر اس میں کوتاہی کرتے رہوگے، تو دشمن مغلوب نہیں ہوگا۔ اور نہ ہی شیطان زیر ہوگا۔ لہٰذا اس پر مستعدی کے ساتھ عمل پیرا رہو۔

موضوع اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے زیادہ تر کفر و شرک کی تردید فرمائی ہے۔ جو کہ نوعِ انسانی کی ایک عظیم بیماری ہے۔ حقیقت میں یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی، اور ایک لحاظ سے اس میں کفار و مشرکین کو آگاہ کیا گیا ہے۔ کہ ان کے ساتھ مومن کی مصالحت نہیں ہو سکتی یہ ایک قسم کا اعلانِ جنگ ہے۔ اور کفر کرنے والوں کے ساتھ مقاطعہ کا ذکر ہے۔ اور مقاطعہ جنگ کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ گویا یہ سورۃ مکی زندگی میں کافروں کے لیے الٹی میٹم تھا۔ کہ تمہارے اور ہمارے درمیان ضرور جنگ ہوگی۔ عرب لوگ اس سے خائف تھے وہ عربی زبان سے واقف اور کلام کے نشیب و فراز کو سمجھتے تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ حضور علیہ السلام کی یہ تحریک کہیں انہیں ملیامیٹ کر کے نہ رکھ دے۔ اسی لیے وہ اسلامی پروگرام کی مخالفت کرتے تھے۔ اور اسے سُننے کے لیے تیار نہ تھے۔

قرآن کی برکات حقیقت یہ ہے۔ کہ اسلام قرآن کو پھیلاتا ہے۔ اور اگر قرآن پاک کی اشاعت کما حقہٗ ہو جائے۔ اور اس کا مفہوم لوگوں کی سمجھ میں آجائے۔ تو پھر کایا ہی پلٹ جائیگی۔ تمام برائیاں صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گی، کفر و شرک کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اللہ کی توحید اور اس کی عبادت کا چرچا ہوگا۔ قرآن پاک کو مان لینے کے بعد کسی کی ذاتی چودھراہٹ باقی

نہیں رہے گی۔ اگر ابوجہل قرآن پاک کے پروگرام کو تسلیم کر لیتا ہے۔ تو اس کی ذاتی چودھراہٹ ختم ہو جاتی اس پروگرام کی وجہ سے ملوکیت، سرمایہ پرستی اور قومیت پرستی وغیرہ تمام فتنے مٹ جاتے بنی نوع انسان پر ہونے والے تمام مظالم بند ہو جاتے۔ اور تمام انسان بہترین سلوک کے مستحق ٹھہرتے۔

رجعت پسند کون ہیں

الغرض! مخالفین کو الٹی میٹم دیا گیا ہے کہ تمہارے تمام حیلے ختم ہو چکے ہیں۔ اب تمہارا پروگرام نہیں چل سکتا۔ اس لیے انہیں براہِ راست خطاب کیا گیا ہے قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ اے پیغمبر آپ واضح طور پر اعلان فرما دیں کہ اے کفر کرنے والو! اور کفر کرنے والے وہی لوگ ہیں۔ جو اسلام کے پروگرام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اور درحقیقت یہی لوگ رجعت پسند ہیں۔ آجکل تو ایمان والوں کو رجعت پسند کہا جاتا ہے۔ یا یہ خطاب علماء کرام کو دیا جاتا ہے۔ حالانکہ رجعت پسند وہ تاریک ذہن کفار ہیں۔ جن کا اللہ کے ہاں کوئی مقام نہیں اور جو شخص خدا تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کی صفات کو سمجھتا ہے۔ خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے۔ اس سے بلند ذہنیت والا کوئی شخص نہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ اے کفر کرنے والو! خوب اچھی طرح سن لو لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ میں نہیں عبادت کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ یہ بالکل ناممکن ہے۔

معبود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے

مفسرین[1] کرام فرماتے ہیں۔ کہ مکے کے بعض مشرکین نے حضور علیہ السلام سے کہا تھا۔ کہ آپ ہمارے معبودوں کی توہین نہ کریں۔ ان کی مذمت نہ کریں۔ بلکہ آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کر لیا کریں۔ ہم آپ کے معبود کی تعظیم کریں گے۔ گویا ہل جل کر طے کر لیں کہ ایک دوسرے کے معبود کی توہین نہیں کریں گے۔ بلکہ ایک دوسرے کے معبود کو مان لیں گے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آپ صاف صاف کہہ دیں لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو۔ تم تو انسانوں، جنوں، فرشتوں اور لات وعزیٰ کی پرستش کرتے ہو۔ مگر میں اس کے لیے قطعاً تیار نہیں

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۵۶۱ ج ۴، تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۳۶۵ پارہ ۳۰، روح المعانی صفحہ ۲۵۰ ج ۳۰، معالم التنزیل صفحہ ۲۵۷ ج ۴

ان میں سے کوئی بھی مستحق عبادت نہیں۔ عبادت کا مستحق صرف وہی ہو سکتا ہے۔ جو واجب الوجود ہو۔ اور واجب الوجود ہستی صرف خدا تعالیٰ کی ہے۔ اس کے علاوہ کسی کا وجود واجب نہیں سب عارضی اور فانی ہیں۔ یہ سب مخلوق ہیں اور مخلوق کا وجود اپنا نہیں ہوتا بلکہ کسی کا دیا ہوا ہوتا ہے لہٰذا یہ عارضی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کا وجود ہی اپنا نہ ہو۔ وہ عبادت کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے۔ گویا قرآن پاک نے الوہیت اور خالقیت کو ایک جگہ پر بیان کر دیا۔ کہ معبود بھی وہی ہو سکتا ہے۔ جو خالق ہو۔ دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔

اسی لیے فرمایا کہ جن چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو ان میں عبادت کا کوئی استحقاق نہیں پایا۔ عبادت کی مستحق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ کیونکہ "اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ" شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1]۔ کہ ملاءِ اعلیٰ یا ملاءِ سافل کے جتنے بھی فرشتے ہیں۔ جبرائیل میکائیل وغیرہ انہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش سے کروڑہا سال پہلے انسان کی مصلحت کے لیے پیدا کیا۔ یہ تمام فرشتے عابد ہیں۔ جیسے ان کے متعلق فرمایا "عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ" یہ اللہ کے معزز عبادت گذار ہیں۔ لہٰذا خود ان کی یا کسی اور چیز کی عبادت کرنا بیوقوفی بلکہ بغاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ مالک الملک کی سرکشی ہے۔ جو علیم کل اور قادر مطلق ہے۔ فرمایا جس طرح میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اسی طرح تم سے بھی یہ توقع نہیں رکھتا کہ تم اس ذات کی عبادت کرو گے۔ جس کی میں کرتا ہوں۔ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ اور یہ بات تاکیداً دوبارہ فرمائی کہ نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرنے والا ہوں۔ اور نہ تم میرے معبود حقیقی کی پرستش کرنے والے ہو۔ تم اپنے کفر کے پروگرام پر پکے ہو۔ یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے۔

معبودانِ باطلہ کی کبھی پرستش نہیں ہوگی۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم عبادت کر چکے ہو گذشتہ زمانے میں اور آج بھی کر رہے ہو وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں پہلے بھی تم شرک میں

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۲۳ ج ۱ مطبوعہ لاہور

مبتلا تھے۔ آج بھی تمہاری وہی حالت ہے۔ یہاں پر فاعل کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں[1]۔ کہ یہ زمانے کے اعتبار سے ہے۔ کہ نہ پہلے یہ بات ہو سکی تھی۔ اور نہ آج ہو سکتی ہے اور نہ آئندہ ہو گی۔ بعض فرماتے ہیں[2]۔ کہ یہ محض تاکید کے لیے ہے۔ کسی وقت اس بات کی توقع ہی نہ رکھیں کہ ہم تمہارے معبودان باطلہ کی پرستش کرنے لگیں گے۔ اور تم سے بھی بظاہر توقع نہیں کہ تم اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنے کے لیے آمادہ ہو جاؤ گے اس لیے ہمارا اور تمہارا پروگرام کبھی اکٹھا نہیں ہو سکتا۔ تمہارا کفر کا پروگرام ہے، اور ہمارا توحید اور ایمان کا پروگرام ہے، توحید اور کفر آپس میں مل نہیں سکتے۔ اس لیے تمہارے ساتھ مصالحت کا کوئی امکان نہیں۔ بلکہ یہ قطع تعلقی اور الٹی میٹم ہے کہ جنگ ضرور ہو کر رہے گی۔

سورۃ مزمل مکی سورۃ ہے جو کہ نبوت کے دوسرے سال نازل ہوئی۔ اس کے دوسرے رکوع میں بھی جہاد کا حکم ہے "یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ" کہ آگے چل کر تم میں جہاد کرنے والے بھی ہوں گے۔ مکی زندگی میں دشمن کے ساتھ جنگ کی اجازت نہ تھی۔ تاہم وہاں پر اشارہ کر دیا۔ کہ آئندہ زندگی میں کفار کے ساتھ جنگ ضرور لڑنی پڑے گی۔ مکی زندگی کے دوران حکم یہ تھا کہ "کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" یعنی اپنے ہاتھ روکے رکھو، دشمن کے ساتھ ابھی نبرد آزما نہ ہو۔ بلکہ نماز پڑھو، اور تنظیم قائم کرو۔ جب وقت آئے گا، تو جنگ کی اجازت دی جائے گی۔ پھر مدنی زندگی میں جب سورہ حج نازل ہوئی تو فرمایا۔ "اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ط" اب اجازت دی گئی ہے ان مظلوموں کو جن کے خلاف کافر لڑتے ہیں کہ وہ بھی ان کے مقابلے میں آسکتے ہیں اور جنگ کر سکتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

بہر حال یہاں فرمایا کہ تمہارے اور ہمارے درمیان صلح کا کوئی امکان نہیں صلح تو اس وقت ہو سکتی ہے جب کوئی مشترکہ نکتہ سامنے آ جائے مگر ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ مصلحت کے لیے کم از کم یہ تو ہو کہ معبود ایک ہو، مگر وہ بھی جدا جدا ہیں۔ ہمارا

---

[1] معالم التنزیل ص ۲۵۷ ج ۴، کشاف ص ۸۰۸ ج ۴ [2] روح المعانی ص ۲۵۱ ج ۳۰

معبود صرف ایک وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ ہے۔ اور تمہارے سینکڑوں خود ساختہ معبود ہیں۔ اس لیے مصالحت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ جنگ ہو کر رہے گی۔ چنانچہ آخر کار یہی ہوا کہ جنگ لڑنا پڑی۔ اس لیے فرمایا لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ یعنی تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے تم اپنے دین پر قائم رہو۔ ہم اپنے دین پر قائم ہیں اس کا فیصلہ جنگ کی صورت میں ہی ہو گا کہ کس کا دین سچا ہے اور کس کا باطل ہے۔

فضائل سورۃ

حدیث شریف میں اس سورۃ مبارکہ کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[۱] کہ سورۃ قُلْ یٰاَیُّہَا الْکٰفِرُوْنَ ربع قرآن ہے۔ یعنی اس ایک سورۃ کی تلاوت کل قرآن پاک کے چوتھائی حصہ کے برابر ہے۔ مضمون کے لحاظ سے بھی یہ قرآن کا چوتھائی حصہ بنتا ہے قرآن میں دو بنیادی چیزیں ہیں۔ یعنی مامورات اور منہیات۔ پھر ان کے آگے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ دل یا عقیدے کے اعتبار سے ہے۔ اور دوسرا اعضاء اور جوارح کے اعتبار سے۔ اس سورۃ مبارکہ میں غیر اللہ کی عبادت کی نفی کی گئی ہے۔ تو گویا یہ عقیدے کے اعتبار سے منہیات میں سے ہے۔ لہذا مضمون کے لحاظ سے بھی یہ قرآن پاک کا چوتھا حصہ ہے۔

بعض فرماتے ہیں[۲] کہ قرآن پاک چار قسم کے مضامین پر مشتمل ہے۔ یعنی عبادات، معاملات، نکاح وغیرہ اور جنایات یہ سورۃ ان میں سے عبادات کے مضمون پر مشتمل ہے۔ لہذا یہ چوتھائی قرآن ہوا۔

حضور علیہ السلام سورۃ اخلاص اور اس سورۃ کو نماز میں کثرت سے پڑھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت[۳] ہے۔ کہ میں نے پچیس مرتبہ نوٹ کیا کہ حضور علیہ السلام نے یہ دونوں سورتیں نماز فجر کی سنتوں میں تلاوت فرمائیں۔ بعض روایات میں آتا ہے[۴] کہ آپ ایک ماہ تک یہ سورتیں تلاوت فرماتے رہے۔ اس کے علاوہ مغرب کی سنتوں میں بھی

---

۱ ترمذی ص۱۱۷ ۔ ۲ روح المعانی ص۲۴۹ ج۳۰ بحوالہ طبرانی۔
۳ مسند احمد ص۳۵ ج۲ ، روح المعانی ص۲۴۹ ج۳۰ ، در منثور ص۴۰۵ ج۶ ، ۴ ترمذی ص۸۷

ان سورتوں کے پڑھنے کا ذکر آیا ہے[1]۔ گویا حضور علیہ السلام یہ سورتیں کثرت سے تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ عبداللہؓ بن جراد کی روایت ہے جسے محدث دیلمیؒ نے بھی نقل کیا ہے[2]۔ اس میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ کہ منافق لوگ ایک تو چاشت کی نماز نہیں پڑھتے دوسرا سورۃ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ نہیں پڑھتے۔ کیونکہ اس میں کفر کی مکمل تردید ہے اور براۃ کا اظہار ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے[3] کہ ایک شخص نے نبی علیہ السلام سے عرض کیا۔ کہ حضور! مجھے قرآن پاک کا کوئی حصہ بتلائیں، جسے میں وظیفے کے طور پہ پڑھا کروں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جب تم لیٹنے کے لیے بستر پہ جاؤ تو سورۃ قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھ لیا کرو۔ کیونکہ فَاِنَّهَا بَرَآءَةٌ مِّنَ الشِّرْكِ یہ شرک سے براۃ کا اظہار ہوگا۔ اور تمہارے لیے لکھ دیا جائے گا کہ یہ شخص شرک سے بیزار ہے۔ لہٰذا سوتے وقت یہ سورۃ اور سورۃ اخلاص وغیرہ پڑھنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ نماز میں اور طواف کعبہ کے بعد دو رکعت واجب الطواف میں ان سورتوں کے پڑھنے کا ذکر آتا ہے[4] وجہ ظاہر ہے۔ کہ اس سے کفر و شرک سے بیزاری کا اظہار ہوتا ہے۔ جو شخص اس سورۃ مبارکہ کی کثرت سے تلاوت کرے گا۔ اس کا اعتقاد راسخ ہوگا۔ اور کفر و شرک سے اس کی بیزاری واضح ہوگی۔ لہٰذا اس سورۃ کی بہت زیادہ فضیلت آئی ہے۔

۱؎ ترمذی ص۸۹، ابن ماجہ ص۸۱ ۲؎ درمنثور ص۴۰۵ ج۶، روح المعانی ص۲۴۹ ج۳۰ بحوالہ دیلمی
۳؎ مستدرک حاکم ص۵۶۵ ج۱، درمنثور ص۴۰۵ ج۶، ترمذی ص۴۹۰ ۴؎ ترمذی ص۱۴۷، نسائی ص۳۹ ج۲

سُورَةُ النَّصرِ

سُوْرَةُ النَّصْرِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُ اٰيَاتٍ

سورۃ نصر مدنی ہے اور یہ تین ۳ آیتیں ہیں ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ① وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ②
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ③

(حاشیہ: ع ۳۵ / ۲۵ — وقف لازم النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ کی مدد آگئی اور فتح (حاصل ہوگئی) ① اور آپ نے دیکھ لیا لوگوں کو کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے ہیں ② پس اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کریں اور اس سے استغفار کریں بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنیوالا ہے ③

نام اور کوائف

اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ النصر ہے۔ اس کا دوسرا نام سورۃ التودیع بھی ہے[1] جس کا معنی رخصت کرنے والی ہے یعنی اس سورۃ میں حضور علیہ السلام کے دنیا سے رخصت ہونے کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ یہ سورۃ مدنی زندگی میں نازل ہوئی۔ بلکہ مکمل سورۃ نازل ہونے والی یہ آخری سورۃ ہے[2]۔ اس کے بعد کوئی پوری کی پوری سورۃ نازل نہیں ہوئی۔ البتہ چند آیات ضرور اس سورۃ کے بعد بھی نازل ہوئی ہیں۔ اس سورۃ کی تین ۳ آیات، انیس ۱۹ الفاظ اور اناسی ۷۹ حروف ہیں۔

الوداعی سورۃ

احادیث سے معلوم ہوتا ہے[3] کہ جس مجلس میں یہ سورۃ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھ کر سنائی۔ اس مجلس میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ، حضرت عمر فاروق رضؓ، حضرت سعدؓ اور آپ کے چچا حضرت عباسؓ موجود تھے۔ چونکہ اس سورۃ میں فتح و نصرت کا ذکر ہے۔ اس لیے تمام حضرات

---

[1] روح المعانی ص ۲۵۵ ج ۳۰، تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۶۷ پارہ ۳۰۔ [2] روح المعانی ص ۲۵۵ ج ۳۰، ابن کثیر ص ۵۶۱ ج ۴
[3] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۶۹ پارہ ۳۰، مجمع البیان ص ۲۱۳ ج ۳۰

بہت خوش ہوئے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فتح کی بشارت دی ہے۔ مگر حضرت عباسؓ یہ سورۃ سُن کر آبدیدہ ہو گئے۔ جب اُن سے رونے کی وجہ دریافت کی گئی، تو کہنے لگے کہ اس سورۃ میں حضور علیہ السلام کی جدائی کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ بات حضور علیہ السلام کے سامنے بیان کی گئی، تو انہوں نے اس کی تصدیق فرمائی، حضرت عمرؓ بھی اس سورۃ سے یہی اخذ کرتے تھے۔ کہ اب حضور علیہ السلام کے دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے یہ سورۃ حضرۃ عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے پیش کی[1] اور پوچھا تم اس سے کیا مطلب لیتے ہو۔ تو انہوں نے کہا کہ میں اس سے حضور علیہ السلام کے دنیا سے رخصت ہونیکا مفہوم سمجھا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہاں یہی بات ہے۔ اس لحاظ سے اس سورۃ کا دوسرا نام سورۃ تودیع ہے۔

زمانہ نزول

اس سورۃ کے نزول کا صحیح وقت تو معلوم نہیں تاہم یہ بات یقینی ہے۔ کہ یہ سورۃ حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ کے آخری دور میں نازل ہوئی۔ لمبی سورتوں میں سورۃ توبہ آخری دور میں نازل ہوئی کہ اس میں غزوہ تبوک کا ذکر ہے جو کہ سنہ ۹ھ میں پیش آیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۰ھ میں حضور علیہ السلام نے حج کیا۔ اس میں حج کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس کے بعد سنہ ۱۱ھ میں ربیع الاول میں حضور علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

جب یہ سورۃ نازل ہوئی۔ حضور علیہ السلام کثرت سے استغفار اور تسبیح کرتے تھے[2]۔ کیونکہ اس سورۃ مبارکہ میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں[3]۔ کہ سورۃ مائدہ کی آیت "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ کے دن نازل ہوئی۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام کی زندگی مبارک کے پچاس دن باقی تھے تو سورۃ توبہ کی آیت "لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ" نازل ہوئی۔ پھر جب پینتیس ۳۵ دن باقی رہ گئے تو

---

[1] بخاری ص ۶۱۵ ج ۲، درمنثور ص ۴۰۷ ج ۶، ترمذی ص ۴۸۵ ، [2] بخاری ص ۷۴۲ ج ۲

[3] تفسیر کبیر ص ۱۶۴ ج ۳۲۔

آخری آیت نازل ہوئی "واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ" یہ سورۃ بقرہ کی آیت ہے اس کے بعد آپ پہ کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ بعض روایات میں آتا ہے[1]۔ کہ اس آیت کے نزول کے سات دن بعد حضور علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ عام طور پہ مفسرین فرماتے ہیں[2]۔ کہ آخری آیت کے نزول کے پینتس ۳۵ دن بعد تک آپ دنیا میں تشریف فرما رہے۔ تاہم یہ سورۃ النصر ان آیات سے قبل مکمل سورۃ کے طور پہ نازل ہوئی۔ اس کے بعد کوئی مکمل سورۃ نازل نہیں ہوئی۔

تکمیل مشن

جیسا کہ پہلے عرض کیا۔ اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد آپ کثرت سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے تھے۔ اور استغفار کرتے تھے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا۔ کہ اس سے پہلے تو آپ اتنی کثرت سے تسبیح و استغفار نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے اندر ایک نشانی رکھی ہے وہ نشانی اس سورۃ مبارکہ میں بیان فرما دی گئی ہے اُسے دیکھ کر میں کثرت سے تسبیح و استغفار کرتا ہوں۔ میری بعثت کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ اور دنیا سے رخصت ہونے کا وقت ہے۔ اس لیے میں کثرت سے یہ وظائف پڑھتا ہوں۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں[3]۔ جس دن حضور علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہوئے آپ نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا نہیں فرمائی۔ کیونکہ آپ کو تکلیف تھی۔ اور آپ حجرہ مبارکہ میں ہی تشریف فرما تھے۔ جب فجر کی نماز کے لیے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی امامت میں جماعت کھڑی ہو گئی۔ تو حضور علیہ السلام کمرے کا پردہ اٹھا کر باہر تشریف لائے آپ نے جھانک کر دیکھا۔ اور مسکرائے۔ پھر واپس اندر چلے گئے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اس وقت حضور علیہ السلام کا چہرہ قرآن کے ورق کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ یعنی چہرہ مبارک مقدس چمکدار اور نورانی تھا۔

اس موقع پہ حضور علیہ السلام کے مسکرانے کے متعلق محدثین کرام فرماتے ہیں۔ کہ جب آپ

---

[1] تفسیر کبیر ص ۱۶۴ ج ۳۲ ، [2] تفسیر کبیر ص ۱۶۴ ج ۳۲ ، [3] بخاری ص ۹۳ ج ۱ مسلم ص ۱۷۹ ج ۱

لے دیکھا کہ آپ کی تیار کردہ جماعت نماز پڑھ رہی ہے۔ تو آپ نے جان لیا کہ آپ کا مشن پورا ہو چکا ہے۔ اور آپ کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ آپ کی خوشی کی یہی وجہ تھی۔ چونکہ آپ کو اس دن زیادہ تکلیف تھی۔ اس لیے لیٹ گئے اور اس دن ضحیٰ کے وقت آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ الغرض آپ کو تعمیل مشن کی خوشی تھی۔ کہ آپ کا نصب العین اب آپ کے صحابہؓ کی جماعت نے سنبھال لیا ہے۔ جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث کیا تھا۔ وہ مکمل ہو چکا تھا۔ اُسے آپ نے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرما لیا۔ لہذا آپ ہنسی خوشی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

مخلاتِ دین

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ دیکھو! حضور علیہ السلام سے پہلے جتنے بھی انبیاء علیہم السلام اللہ نے مبعوث فرمائے ہیں۔ ہر ایک کا مشن انسانی نفس کی اصلاح اور شیطان کا مقابلہ رہا ہے۔ مگر حضور نبی کریم علیہ السلام کی شریعت سب سے کامل اور مکمل تھی اللہ تعالیٰ نے آپ پر دین کو مکمل کر دیا۔ اس لیے آپ کے دین کے مخلّات بھی سابقہ انبیاء علیہم السلام کی نسبت زیادہ ہیں۔ چنانچہ آپ نے صحابہؓ کی جماعت کو چار مخلات دین کے مقابلے کے لیے تیار کیا ان میں پہلے نمبر پر نفس، دوسرے پر شیطان، تیسرے کافر اور چوتھے منافق ہیں۔ آپ کی جماعت نے بیک وقت ان چاروں سے مقابلہ کیا، اور دین کی حفاظت کی۔

سب سے پہلے مخل نفس کا مقابلہ ریاضت سے ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ عبادت میں مشغول رہ کر نفس کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے مخل شیطان کا مقابلہ خدا کی ذات پر اعتماد اور برائیوں سے بچنے سے ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے وہ تمام طریقے سمجھا دیے۔ جن کے ساتھ شیطان سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ تیسرے نمبر پر کافر ہیں، جو دین کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ "جَاهِدِ الْكُفَّارَ" کفار و مشرکین کے ساتھ جہاد کرو اور اس میں جان، مال اور زبان کو کھپا دو۔ آخری گروہ منافقین کا ہے۔ جو کھلے عام مقابلہ نہیں کرتے۔ بلکہ اندرونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں

لے تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۶۱ پارہ ۳۰۔

مصروف رہتے ہیں۔ ان کے خلاف بھی اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا اور اس کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ منافقوں کے ساتھ جہاد سیف و سنان کی بجائے زبان اور برہان کے ساتھ ہوگا۔ گویا ان کے ساتھ زبانی طور پر سختی کی جائے گی اور انہیں دلائل سے قائل کیا جائے گا۔

سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی تمام بُری خصلتوں کو ظاہر کر دیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ منافق کن صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان سے بچنا چاہیئے۔ اسی واسطے سورۃ توبہ کا ایک نام سورۃ فاضحہ یعنی رسوا کرنے والی بھی ہے۔ کہ یہ منافقین کی برائیوں کو کھول کر انہیں رسوا کرتی ہے۔ الغرض یہ چار چیزیں مخالفِ دین ہیں سے ہیں۔ جن کا مقابلہ کرنے کا طریقہ حضور علیہ السلام نے اپنی جماعت کو سکھلا دیا۔ اور وہ جماعت مقابلے کے لیے کمربستہ ہو گئی۔

فتح اسلام

چنانچہ خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ نے سیف و سنان کے ساتھ بھی اور زبان و برہان کے ساتھ بھی جہاد کیا۔ انہوں نے نفس اور شیطان کو بھی زیر کیا۔ اور اس طرح گویا انہوں نے مشن کی تکمیل کی۔ یہ اسلام کے عروج کا زمانہ تھا جب مکہ فتح ہو گیا۔ تو ادھر ادھر کے قبائل دھڑا دھڑ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ مکہ فتح ہوتا ہے یا نہیں جب اس محاذ پر اسلام کو فتح حاصل ہو گئی، تو اشاعتِ اسلام کی راہیں کھل گئیں، چنانچہ یمن سے سات سو آدمیوں کی جماعت مدینے پہنچ کر بیک وقت مشرف بہ اسلام ہوئی۔ واپسی پہ وہ لوگ اذانیں بھی دے رہے تھے۔ اور نمازیں بھی پڑھ رہے تھے۔ اور دین کی مزید تبلیغ ہو رہی تھی۔ اس طرح فتح مکہ کے بعد اللہ کی مزید مدد اور نصرت آ گئی اور لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہونے لگے۔

حضور علیہ السلام کی مکی زندگی کے دوران مکہ دارالکفر بنا ہوا تھا۔ خانہ کعبہ میں مشرکوں نے بت جمع کر رکھے تھے۔ فتح مکہ کے بعد اس گندگی کو دور کیا گیا۔ اور مرکز اسلام کو کفر و شرک کی نجاست سے پاک کیا گیا۔ پھر پورا جزیرہ عرب حضور علیہ السلام کی زندگی میں ہی اسلام کے زیر نگیں آ گیا۔ صرف یہودیوں کو خیبر میں آباد رہنے کی اجازت تھی۔ اس کے متعلق بھی حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ یہ اجازت اس وقت تک کے لیے ہے۔ جب تک ہم چاہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ

---

[1] بخاری ص ۴۴۶ ج ۱، مسلم ص ۱۵ ج ۲

کے زمانہ تک یہ لوگ وہیں آباد رہے۔ اس کے بعد انہیں وہاں سے ہٹایا گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ عرب کے خطے میں صرف ایک ہی دین اسلام رہے گا۔ دوسرا کوئی دین وہاں نہیں رہ سکتا۔[1]

ترکوں کا قبول اسلام

ارشاد ہوتا ہے۔ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آگئی وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا اور آپ نے دیکھ لیا۔ کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج یا گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں۔ پہلے تو کوئی اکا دکا شخص ایمان لاتا تھا۔ مگر اب سینکڑوں کی تعداد میں لوگ رو بہ اسلام ہو رہے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے۔ کہ ترک بڑی مدت تک اسلام کی مخالفت کرتے رہے۔ ان کے متعلق حضور علیہ السلام کا حکم تھا۔[2] اُتْرُکُوا التُّرْکَ مَا تَرَکُوْکُمْ یعنی ——— ترکوں سے تعرض نہ کرنا۔ جب تک وہ خود تمہارے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کریں۔ چنانچہ پانچویں صدی میں آکر اللہ نے ان کی کایا پلٹی اور ایک دن میں چار لاکھ ترک اسلام لائے۔ جب سے سارا ترکی مسلمان ہے زمانے کے بڑے بڑے حوادث آئے مگر ترکوں کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ حضور علیہ السلام نے یہ پیش گوئی بھی فرمائی[3] کہ آگے چل کر ایسا دور بھی آئے گا۔ کہ جس طرح لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے اسی طرح اسلام سے باہر بھی نکلیں گے۔

جانشین جماعت

تو فرمایا جب آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ غول در غول اللہ کے دین اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ تو آپ سمجھ لیں۔ کہ آپ کی بعثت کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ وہ مقصد یہی تھا۔ کہ اسلام کو غلبہ نصیب ہو۔ خدا کا یہ سچا دین دنیا میں قائم ہو جائے اور اس کو آگے چلانے والی ایک منظم جماعت موجود ہو۔ چنانچہ وہ جماعت قائم ہو گئی اور وہ بوجھ "اَلَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ" جس نے آپ کی پشت کو ٹیڑھا کر دیا تھا۔ اور جس کی وجہ سے آپ غمگین تھے۔ وہ دور ہو گیا یہ بوجھ صحابہؓ کی جماعت نے اٹھا لیا۔ جب یہ کام پورا ہو گیا، تو سمجھ لیں کہ اب آپ کو اس مادی جہان میں رہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

---

[1] مسلم ص ۹۴ ج ۲ [2] نسائی ص ۶۴ ج ۲ [3] تفسیر کبیر ص ۱۶۴ ج ۳۲

نبی علیہ السلام کا استغفار

فرمایا جب آپ کے مشن کی تکمیل ہوگئی تو اس کے شکریہ کے طور پر فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کریں۔ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ اور کثرت سے استغفار کریں۔ استغفار دو قسم سے ہے۔ ایک اپنی ذات کے لیے اور دوسرا امت کے لیے ذات سے مراد یہ ہے۔ کہ اگر کوئی بات خلاف اولیٰ سرزد ہو جائے۔ حالانکہ وہ گناہ نہیں۔ تو نبی علیہ السلام اس سے استغفار کرتے ہیں۔ اور امت کے حق میں استغفار عام ہے۔ کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔

حضور نبی کریم علیہ السلام نے استغفار کی بہت تلقین فرمائی ہے۔ صحابہ کرامؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام خود ایک مجلس میں سو مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتے[1]۔ اَللّٰھُمَّ اغۡفِرۡلِیۡ وَتُبۡ عَلَیَّ آپ نے امت کو تعلیم دی کہ انہیں بھی کثرت سے استغفار کرنا چاہیے۔ انسان سے بسا اوقات کوتاہیاں ہو جاتی ہیں۔ ان کی معافی کے لیے استغفار بہت ضروری عمل ہے۔

سعدی صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک سانس کے ذریعے انسان کو خدا تعالیٰ کی دو نعمتیں نصیب ہوتی ہیں۔ چوبیس ۲۴ گھنٹے میں ایک عام آدمی چوبیس ہزار سانس لیتا ہے۔ ہر سانس پہ دو نعمتیں شمار کی جائیں۔ تو ایک دن رات میں انسان پر اللہ تعالیٰ کی کتنی نعمتوں کا شکر واجب ہوتا ہے۔ انسان تو ایک سانس کا شکر ادا نہیں کر سکتا چہ جائیکہ خوراک، لباس اور دیگر انعامات کا شکر ادا کرے۔ یہ تو جسم کے ایک بال کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا، اگرچہ ساری زندگی کرتا ہے۔ تاہم یہ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے۔ کہ کوئی شخص تھوڑا بھی شکریہ ادا کرے، تو وہ راضی ہو جاتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[2]۔ کوئی شخص کھاتا ہے یا پیتا ہے پھر وہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کہتا ہے۔ تو اللہ راضی ہوتا ہے کہ اس نے میری نعمت کی قدردانی کی۔ ورنہ شکریہ تو ایک لقمے کے ہزارویں حصے کا بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ اس ایک لقمے میں ہزاروں نعمتیں شامل ہیں۔

پہلی سورۃ کے ساتھ ربط

پہلی سورۃ میں کفار کو الٹی میٹم تھا۔ لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِيَ دِيۡنِ یعنی تمہارے

---

[1] ابوداؤد ص ۲۱۲ ج ۱، [2] شمائل مع ترمذی ص ۵۸۱

ساتھ مصالحت کی کوئی صورت باقی نہیں۔ اب جنگ ہی ہوگی۔ یہ مکی زندگی کا زمانہ تھا۔ وہاں پر صاف صاف بتلا دیا تھا کہ جب تمہارا اور ہمارا معبود ایک نہیں ہوسکتا۔ تو پھر جنگ کے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی۔ مکہ فتح ہوا۔ بدر میں فتح حاصل ہوئی۔ جنگ احد میں فتح ہوئی۔ جنگِ خندق اور تبوک میں کامیابی حاصل ہوئی۔ حنین کا میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اور پھر سارا عرب فتح ہوگیا۔ اور اسلام کی عظیم الشان حکومت قائم ہوگئی۔ گویا اب اسلام کو سیاسی فتح بھی حاصل ہوگئی۔ اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ اور حضور علیہ السلام کی بعثت کا مقصد پورا ہوگیا۔

رجوع الی اللہ کی ترغیب

فرمایا تکمیل مشن پہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ تسبیح و تحمید کریں۔ کہ اب آپ کو دنیا میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا ہے۔ اور آپ کو اپنے اصل مقام حظیرۃ القدس کی طرف لوٹ جانا ہے۔ نیز یہ کہ آپ استغفار کریں۔ معمولی سے معمولی لغزش بھی نبی کی شان کے لائق نہیں۔ لہٰذا آپ معمولی باتوں پر بھی استغفار کریں۔ یا یہ بھی ہے۔ کہ آپ امت کے بارے میں استغفار کرتے رہیں۔ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا بے شک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ وہ بڑا مہربان ہے۔ جو کوئی سچے دل سے اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔

سُورَةُ اللهب

عَمَّ ۳۰ درس — اللّٰھب ۱۱۱ (مکمل سورۃ)

سُوْرَۃُ اللَّھَبِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ خَمْسُ اٰیَاتٍ

سورۃ لہب مکی ہے اور یہ پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ ۝۱ مَآ اَغْنٰی عَنْہُ مَالُہٗ وَمَا کَسَبَ ۝۲
سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ ۝۳ وَّامْرَاَتُہٗ ؕ حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ ۝۴ فِیْ جِیْدِھَا
حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵ ع ۱ ۵ ۲۶

ترجمہ۔ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور وہ خود بھی ہلاک ہوا ① اسے کچھ کام نہ آیا اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا ② وہ عنقریب شعلہ مارنے والی آگ میں داخل ہوگا ③ اور اس کی بیوی بھی (جہنم میں داخل ہوگی) جو لکڑیاں اٹھانے والی ہے ④ اس کی گردن میں رسی ہے (مونج یا کھجور کے پتوں کی) مضبوط بٹی ہوئی۔ ⑤

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سورۃ اللّٰھب ہے۔ اس کی پہلی اور تیسری آیت میں لہب کا لفظ مذکور ہے۔ اور اسی سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔ اسے سورۃ تَبَّتْ یَدَا بھی کہتے ہیں۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی اس کی پانچ آیتیں تیئس ۲۳ الفاظ اور اکہتر ۷۱ حروف ہیں۔

اقرباء سے خطاب

مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ حضور علیہ السلام پر پہلی وحی کے نزول کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس عرصہ میں آپ خاموشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے۔ اور اندرونی طور پر آہستہ آہستہ ساتھی تیار کرتے رہے۔ پھر جب سورۃ شعراء کی آیت "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ" نازل ہوئی یعنی آپ اپنے عزیز و اقارب کو خدا کے عذاب سے ڈرائیں۔ تو آپ نے خطاب فرمایا مسلم شریف کی حدیث میں اور بعض دیگر صحیح احادیث میں

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۶۹ پارہ ۳۰، درمنثور صفحہ ۴۰۸ ج ۶، بخاری صفحہ ۷۴۳ ج ۲، مسلم صفحہ ۱۱۴ ج ۱

آتا ہے۔ کہ آپ نے لوگوں سے عمومی اور خصوصی خطاب فرمایا۔ عمومی خطاب میں قریش کے وسیع خاندان کو مدعو کیا۔ اس میں خاندانِ قریش، اس کی شاخیں اور گوتیں سب شامل تھیں۔ قریش کے بعد بنی ہاشم کو اور پھر بنی عبدالمطلب کو خطاب فرمایا۔ خصوصی طور پر آپ نے اپنی پھوپھی اور بیٹی فاطمہؓ کو ان کے نام لے کر خطاب فرمایا۔

شانِ نزول ایک موقع پر آپ صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئے اور عربوں کے دستور کے مطابق ایسا نعرہ لگایا، جیسا عرب خوف و ہراس کے وقت لگایا کرتے تھے۔ جب کوئی سخت خطرہ درپیش ہوتا یا دشمن حملہ آور ہوتا تھا۔ یَا صَبَاحَاہُ کا نعرہ لگایا جاتا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا۔ کہ دشمن آگیا ہے۔ اپنی حفاظت کا بندوبست کر لو۔ یا اگر مقابلہ کر سکتے ہو تو مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بعض اوقات ایسا ہوتا۔ کہ جو شخص اس قسم کا اعلان کرتا، وہ کسی اونچی جگہ پر چڑھ جاتا اور اپنا تہہ بند اتار کر اُسے جھنڈے کے طور پر بلند کر دیتا۔ اسے نَذِیْرُ الْعُرْیَان یعنی برہنہ نذیر کہا جاتا تھا۔ اور بہت زیادہ خطرے کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ حضور علیہ السلام نے بھی اس موقع پر یا صباحاہُ کا نعرہ لگایا کم و بیش چالیس[۲] آدمی جمع ہو گئے۔ حضور علیہ السلام نے اُن سے فرمایا[۱] اے لوگو! میں نے تمہیں یہاں اکٹھا کیا ہے۔ اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ پہاڑ کی دوسری طرف دشمن آ رہا ہے۔ تو کیا تم میری بات کا یقین کرو گے۔ بعض لوگوں نے اقرار کیا مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ كَذِبًا ہم نے کبھی آپ پر جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا۔ آپ ہمیشہ سچ کہتے ہیں۔ اس کے بعد حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ فَاِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ پھر سُن لو! کہ خدا کے عذاب کے آنے سے پہلے پہلے میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔ اگر ایمان اور توحید اختیار نہیں کرو گے۔ تو خدا تعالیٰ کے سخت عذاب میں مبتلا ہو گے۔ اس مجمع میں آپ کا حقیقی چچا ابولہب بھی موجود تھا حضور علیہ السلام کی بات سُن کر اُس نے اپنے ہاتھ جھٹکے اور کہا اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا تَبًّا لَّكَ تیرے لیے ہلاکت ہو۔ کیا تو نے اس بات کے لیے ہمیں بلایا تھا۔ پھر وہ گالیاں دیتا ہوا، اور بُرا بھلا کہتا ہوا وہاں

۱ے بخاری صہ ۷۰۲/۲، مسلم صہ ۱۱۴/۱ ، ۲ے بخاری صہ ۷۴۳/۲، مسلم صہ ۱۱۴/۱

سے چلا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابولہب کی اس ناشائستہ حرکت کے جواب میں یہ سورۃ مبارکہ نازل فرمائی[1]

موضوع اس سورۃ میں ابولہب اور اس کی ذہنیت کے لوگوں کی مذمت بیان کی گئی ہے ابولہب کی بیوی بھی اسی ذہنیت کی مالکہ تھی۔ لہٰذا اس کی بھی مذمت بیان کی گئی ہے۔ اس سورۃ میں یہ بات اشارۃً بیان کی گئی ہے۔ کہ جو شخص حق کی مخالفت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے ناکام بنائے گا۔ نیز یہ کہ جو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں، انبیاء علیہم السلام اور ان کے کامل متبعین کو ایذا پہنچائے گا۔ ان کی تحقیر و تذلیل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے ضرور سزا دے گا۔

حضور علیہ السلام کے چچا ابولہب حضور علیہ السلام کا حقیقی چچا تھا۔ اس کا اصل نام عبدالعزّیٰ تھا، عبدالمطلب کا بیٹا تھا آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ بھی عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ مگر ابولہب، حضرت عبداللہ کا علاّتی بھائی تھا۔ یہ دونوں باپ میں شریک تھے۔ البتہ مائیں الگ الگ تھیں۔

حضور علیہ السلام کے ایک اور چچا حمزہؓ تھے۔ انہوں نے کافروں کے ہاتھوں حضور علیہ السلام کی ایذا رسانیاں دیکھ کر ایمان قبول کیا۔ آپ کے چچا عباسؓ خاموش رہتے تھے مگر اندرونی طور پر حضور علیہ السلام کی حمایت کرتے تھے۔ باقی رہے حضرت علیؓ کے والد ابوطالب، انہوں نے ایمان تو قبول نہیں کیا۔ مگر حضور علیہ السلام کی پرورش کی اور ہر موقع پر آپ کا ساتھ دیا۔ وہ نبوّت کے اعلان کے دس سال بعد تک زندہ رہے اور آخر دم تک حضور علیہ السلام کے حامی رہے۔ قریش نے حضور علیہ السلام اور آپ کے خاندان کا جو مقاطعہ کیا تھا۔ ابوطالب اس میں بھی آپ کے ساتھ رہے۔ اسی دوران ان کی وفات ہوئی۔

ابوطالب کی وفات کے بعد مشرکین کی ایذا رسانیاں بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ اسی دوران آپ نے طائف کا تبلیغی سفر اختیار کیا۔

ابولہب اور اس کے بیٹے عبدالعزّیٰ کو ابولہب اس لیے کہتے تھے۔ کہ یہ بڑا خوبصورت اور وجیہ آدمی تھا سُرخ و سفید رنگ والا بڑا قد آور شخص تھا۔ وجاہت کی وجہ سے اس کا چہرہ چمکتا تھا۔ اس لیے اسے ابولہب کہتے تھے۔ ابوجہل کا اصل نام عمرو اور کنیت ابوالحکم تھی۔ کیونکہ وہ

---

[1] بخاری صفحہ ۷۴۳ ج ۲، مسلم صفحہ ۱۱۴ ج ۱

پنچ تھا۔ اور تنازعات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔ اسلام میں اس کا نام ابوجہل ہے۔

ابولہب حضور علیہ السلام کے دوسرے چچاؤں کی نسبت مختلف تھا۔ یہ شروع سے لے کر آخر دم تک حضور علیہ السلام کا مخالف رہا۔ یہ شخص ابوجہل اور امیہ جیسے دشمنانِ دین میں سے تھا۔ ابتداء میں ابوسفیانؓ، ابوجہل کا بیٹا عکرمہؓ اور عمرو بن العاصؓ بھی مخالفین میں سے تھے۔ مگر بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت بخشی۔ ابولہب اور اس کے بیٹے عتبہ اور عتیبہ سخت دشمن تھے۔ حضور علیہ السلام کی دو بیٹیاں رقیہؓ اور ام کلثومؓ ابولہب کے دونوں بیٹوں کے نکاح میں تھیں۔ ابولہب نے انہیں ڈرا دھمکا کر حضور علیہ السلام کی بیٹیوں کو اپنے بیٹوں سے طلاق دلوائی۔ بڑے بیٹے عتبہ نے نہایت ذلیل حرکت کی۔ طلاق بھی دی۔ اور آپ کے منہ پر تھوکا بھی۔ حضور علیہ السلام بہت دل برداشتہ ہوئے اور اس کے حق میں بدعا کی۔ اَللّٰھُمَّ سَلِّطْ عَلَیْہِ کَلْبًا مِّنْ کِلَابِکَ اے اللہ اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو اس پر مسلط کر دے اور پھر اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ یہ شام کے سفر میں بُصریٰ یا کہیں آس پاس تھا۔ رات کو قافلہ ٹھہرا، تو ایک بھیڑیا اس کو پکڑ کر لے گیا اور ہلاک کر دیا۔[1] تو گویا یہ کتا اللہ تعالیٰ نے اس پر مسلط کیا۔ جو اللہ تعالیٰ کے مقبولین کی توہین کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ضرور انتقام لیتا ہے۔[2]

ابولہب کی بیوی

ابولہب اور اُس کی بیوی ام جمیلہ دونوں بدترین مخالف تھے۔ ام جمیلہ ابوسفیانؓ کی بہن تھی۔ اور بڑی گستاخ اور زبان دراز تھی۔ تفسیر کبیر میں لکھا[3] ہے۔ کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی۔ حضور علیہ السلام کعبہ کے پاس تھے۔ ابوبکرؓ بھی وہاں موجود تھے۔ ام جمیلہ کو پتہ چلا کہ قرآن نے اس کی مذمت کی ہے۔ تو ہاتھ میں پتھر لیے گالیاں دیتی ہوئی وہاں پہنچی۔ حضرت صدیقؓ نے عرض کیا۔ حضور! وہ بکواس کرتے ہوئے پتھر مارنے کے لیے آ رہی ہے۔ آپ نے فرمایا اللہ کے حکم سے یہ مجھے نہیں دیکھ سکتی۔ چنانچہ وہ آئی اور ابوبکرؓ سے پوچھا کہ تمہارے صاحب نے میری مذمت کی ہے۔ وہ کہاں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے صاحب نے تمہاری مذمت

۱؎ روح المعانی ص۲۶۲ ج۳۰، تفسیر کبیر ص۱۶۷ ج۳۲، تفسیر عزیزی فارسی ص۲۳۷ پارہ ۳۰، دلائل النبوۃ لابی نعیمؒ ص۱۶۲ ج۲

۲؎ مستدرک حاکم ص۳۲۸ ج۴، ۳؎ تفسیر کبیر ص۱۶۲ ج۳۲، تفسیر ابن کثیر ص۵۶۵ ج۴

نہیں کی بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا ہے۔ خدا تعالیٰ کی قدرت وہ حضور علیہ السلام کو نہ دیکھ سکی اور غصے کی حالت میں آپ کی مذمت بیان کرتی ہوئی چلی گئی۔ یہ بدبخت مشرکین حضور علیہ السلام کو محمد کی بجائے مذمم کہتے تھے۔ یعنی قابل تعریف کی بجائے قابل مذمت کے لقب سے پکارتے تھے۔ چنانچہ ام جمیلہ یہ شعر پڑھتی ہوئی لوٹ گئی مُذَمَّمًا قَلَيْنَا وَدِيْنَهُ اَبَيْنَا وَحُكْمَهُ عَصَيْنَا یعنی ہم نے مذمم کے ساتھ نفرت کر رکھی ہے۔ اس کے دین کو قبول نہیں کیا۔ اور اس کی بات کو نہیں مانا۔ الغرض! یہ حضور علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ کہ آپ کی وہاں موجودگی کے باوجود وہ آپ کو نہ دیکھ سکی۔

حضرت حاجی امداد اللہؒ کی کرامت

یہ تو پیغمبر علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ ایسا ہی جب کوئی عجیب واقعہ اولیاء اللہ کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ تو اُسے کرامت کہتے ہیں۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ انگریزوں کے مقابلے میں ناکام ہوئے، تو انہوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو گرفتار کرنا چاہا۔ آپ روپوش ہو گئے۔ اور سہارنپور سے نکل کر انبالہ کے قریب ایک بستی میں آگئے۔ وہاں آپ کا ایک مرید راؤ رحیم بخش تھا۔ اس کے پاس مقیم ہوئے۔ انگریزوں نے پیچھا کیا۔ اور اس بستی میں پہنچ گئے۔ اس وقت حاجی صاحبؒ باغ میں واقع اصطبل کی ایک کوٹھڑی میں تھے۔ رحیم بخش بڑے پریشان ہوئے کہ یہ خبیث کہیں حضرت کو گرفتار نہ کر لیں۔ فوراً آپ کو اطلاع دی کہ وہ لوگ آرہے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم فکر نہ کرو، اور یہاں سے چلے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ وہ بہتر سبیل پیدا کرے گا۔ چنانچہ وہ تلاش کرتے کرتے آپ کے کمرے میں پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ کمرے میں لوٹا پڑا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی کسی نے وضو کیا ہے۔ مگر آدمی کوئی نہیں۔ انہیں شبہ ضرور ہوا مگر راؤ رحیم بخش نے اسے کسی طرح ٹال دیا۔ کہ ایسے ہی وضو کیا تھا۔ اس طرح انگریز کے وہ سپاہی ناکام لوٹ گئے[۱]۔ اللہ تعالیٰ نے اس حکمت کے ساتھ اپنے بندے کو حفاظت میں رکھا۔ تاہم یہ کرامت بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوتا ہے۔ بندے کو اس پر کچھ اختیار نہیں ہوتا۔

ابولہب کی ہلاکت

ابولہب کا حال اس کی بیوی سے بھی زیادہ دردناک ہوا۔ شیخ ابوبکر جصاصؒ۔ اور

---

[۱] کرامات امدادیہ ص ۶۷ مطبوعہ شاہ کوٹ (شیخوپورہ)

روح المعانی اور بعض دیگر تفاسیر میں موجود ہے۔ طارق فرماتے ہیں کہ میں نے ذوالمجاز کی منڈی میں دیکھا۔ کہ ایک شخص لوگوں کو تلقین کرتا ہوا جا رہا ہے قُولُوا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوا۔ یعنی اے لوگو! لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہو فلاح پا جاؤ گے۔ اس کے پیچھے ایک اور اونچا لمبا قد آور آدمی، سفید چوغہ پہنے ہاتھ میں پتھر لیے جا رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے، لوگو! اس کی بات نہ ماننا، یہ جھوٹا اور کذاب ہے۔ العیاذ باللہ۔ تفسیر روح المعانی میں موجود ہے کہ ابولہب کے پتھر مارنے سے حضور علیہ السلام کا سارا جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ پاؤں تک زخمی ہو چکے تھے۔

پہلی دعوت کے موقع پر اس شخص نے حضور علیہ السلام سے کہا تھا۔ تبًّا لک یعنی تیرے لیے ہلاکت ہو۔ اور جب آپ نے عام تبلیغ شروع کی۔ تو اس نے پتھر مارنے سے بھی گریز نہ کیا اب اسی کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے۔ کہتے ہیں۔ کہ یہ دعا نہیں بلکہ پیش گوئی ہے۔ کہ جن ہاتھوں سے یہ پتھر مارتا ہے اور کمائی کرتا ہے تم عنقریب دیکھ لو گے۔ کہ وہ خود بھی ہلاک ہوگا، اور اس کے یہ دونوں ظالم ہاتھ بھی تباہ ہوں گے۔

مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ اُسے کچھ کام نہ آئے گا۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا۔ کمائی میں اولاد بھی شامل ہے۔ تو گویا نہ اس کا مال اسے کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ ہی اس کی اولاد مددگار ہوگی۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ اِنَّ مِنْ اَطْيَبِ مَا اَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهٖ وَوَلَدُهٗ مِنْ كَسْبِهٖ (اَوْ كَمَا قَالَ) اچھی خوراک وہ ہے جسے انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتا ہے۔ یعنی جو کمائی محنت و مشقت کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے۔ وہ پاکیزہ اور طیب ہوتی ہے۔ اولاد بھی چونکہ انسان کی کمائی میں شامل ہے۔ اس لیے حضور علیہ السلام نے فرمایا[۳] اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔ باپ کو ضرورت ہو تو بیٹے کی مرضی کے خلاف بھی اس کا مال لے سکتا ہے۔ بیٹے کو علم نہ ہو، تب بھی لے سکتا ہے مگر بغیر

---

[۱] روح المعانی ص۲۶۰ ج۳۰، تفسیر کبیر ص۱۶۶ ج۳۲، کنز العمال ص۹۳ ج۱۴

[۲] ابوداؤد ص۱۴۱ ج۲، [۳] ابوداؤد ص۱۴۲ ج۲، تفسیر کبیر ص۱۶۹ ج۳۲

ضرورت کے نہیں۔ مگر ابولہب کو کچھ بھی کام نہ آیا۔ چنانچہ اس کا حشر یہ ہوگا کہ سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ وہ عنقریب شعلہ مارنے والی آگ میں داخل ہوگا۔ یہ شخص جہنم رسید ہونے والا ہے۔ بھڑکنے والی آگ کا ایندھن بنے گا۔

پھر یہ ہے کہ اکیلا جہنم میں نہیں جائے گا۔ بلکہ وَّامْرَاَتُهٗ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جائے گا۔ وہ بیوی جو حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ایندھن کی لکڑیاں اٹھانے والی ہے چونکہ میاں بیوی دونوں حق کے مخالف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جہنمی ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

ابولہب کا انجام یہ ہوا کہ خود تو جنگ بدر میں شریک نہ ہوا۔ بلکہ مکے کے دستور کے مطابق اپنی جگہ عاص بن ہشام کو بھیج دیا۔ اور خود مکے میں رہ کر لڑائی کے نتیجے کا انتظار کرتا رہا۔ بدر میں کفار کو شکست ہوئی۔ بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ بہت سے قیدی ہو کر مدینے پہنچے اس وقت حضرت عباسؓ کے غلام ابورافعؓ مکہ میں تھے۔ وہ اپنے گھر کے قریب بیٹھے تھے۔ حضرت عباسؓ کی بیوی ام فضلؓ بھی وہاں موجود تھی۔ ابورافعؓ کا بیان ہے کہ ابولہب کعبے کے پاس آیا تو کسی نے کہا کہ وہ دیکھو ابوسفیان آگیا ہے۔ جب وہ قریب آیا، تو ابولہب نے پوچھا کہ اے بھتیجے جنگ کا کیا حال ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ حال کیا بتاؤں، بس یوں سمجھو کہ ہمارے آدمیوں نے اپنے کندھے خود مسلمانوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیے کہ تو بھی جس طرح چاہو ہمیں مارو یا قیدی بنالو۔ لوگ کہتے ہیں بخدا کچھ ایسے لوگ بھی لڑائی میں آئے تھے۔ جو گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور سفید لباس پہن رکھے تھے۔ یہ سن کر ابورافعؓ نے خیمہ کا پردہ اٹھایا۔ اور باہر کی طرف دیکھ کر کہنے لگا واللہ وہ تو فرشتے ہیں۔ ابولہب سے برداشت نہ ہو سکا اس نے کہا کہ تم بکواس کرتے ہو۔ اور ابورافعؓ کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اس پر بھی صبر نہ آیا تو سینے پر چڑھ گیا اور بے تحاشا مارا اتنے میں ام فضلؓ بھی آگئی۔ اس نے ایک ڈنڈا اٹھا کر ابولہب کے سر پر دے مارا۔ اور کہنے لگی، تم خواہ مخواہ اس شخص کو مار رہے ہو۔ جب کہ اس کا مالک موجود نہیں ہے۔ تم اس لیے اسے مار رہے ہو کہ یہ غلام ہے۔ جاؤ۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہو۔

---

[1] تفسیر کبیر

اس طرح ابولہب ذلیل و خوار ہو کر رہ گیا۔ ابھی بدر کے لوگ واپس بھی نہیں آئے تھے۔ کہ اس واقعہ کے ساتویں دن ابولہب مرگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسی ذلت کی موت دی۔ کہ اُسے طاعون کی بیماری لاحق ہوئی۔ جسے مکے والے عدسہ کہتے تھے۔ جسم پہ ایک دانہ سا نکلتا تھا چونکہ یہ متعدی بیماری ہے۔ ابولہب کے بیٹوں نے اُسے الگ کر دیا، کوئی اُس کے قریب نہیں جاتا تھا۔ اسی حادثے میں مرگیا۔ تین دن تک کوئی بھی اس کی لاش کے قریب نہ گیا۔ حبشی غلاموں کو کرائے پر حاصل کیا گیا۔ جو اس کی لاش کو اٹھا کر لے گئے اور لکڑی کے ساتھ گڑھے میں لڑھکا کر اوپر پتھر ڈال دیئے[1]

ام جمیل حضور علیہ السلام سے عداوت

ابولہب کی بیوی ام جمیلہ کو حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ جس کا معنیٰ لکڑیاں اٹھانے والی ہے۔ تاہم اس کو مختلف معانی پہ محمول کیا گیا ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی بڑے کنجوس تھے۔ مکے کے امیر ترین آدمیوں میں سے ہونے کے باوجود ابولہب سخت خسیس آدمی تھا۔ غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرنے کی بجائے ان کا حق بھی کھا جاتا تھا۔ خانہ کعبہ کا متولی ہونے کی وجہ سے وہاں پہ پیش کی جانے والی نذر و نیاز کی چیزیں اڑا لیتا تھا۔ کہتے ہیں[2] کہ کسی نے سونے کا ہرن نیاز چڑھایا تھا۔ وہ ابولہب نے ہی چوری کیا تھا۔ ام جمیلہ ایک سردار کی بیٹی ہونے کے باوجود سخت کنجوس تھی جنگل سے خود لکڑیاں کاٹ کر لاتی۔ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کا حقیقی معنیٰ یہی ہے۔

بعض آدمی طبیعت کے خسیس ہوتے ہیں۔ پیسہ خرچ نہیں کرتے۔ اور جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں[3] کہ ام جمیلہ کو حَمَّالَةَ الْحَطَبِ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہ کانٹے وغیرہ کاٹ کر لاتی تھی اور جلانے کی بجائے انہیں حضور علیہ السلام کے راستے میں بچھایا کرتی تھی۔ بعض کہتے ہیں[4] کہ یہاں حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کا حقیقی معنیٰ مراد نہیں ہے۔ بلکہ فارسی میں اسے

---

[1] روح المعانی ص ۲۶۲ ج ۳۰ نظام القرآن تفسیر سورۃ لہب ص ۱۲ [2] نظام القرآن تفسیر سورۃ لہب از فراہیؒ ص ۶

[3] معالم التنزیل ص ۲۶۳ ج ۴، تفسیر خازن ص ۳۱۸ ج ۷، مظہری ص ۳۶۸ ج ۱۰، روح المعانی ص ۲۶۳ ج ۳۰

[4] تفسیر عزیزی فارسی ص ۳۷ پارہ ۳۰، معالم التنزیل ص ۲۶۳ ج ۴، ابن کثیر ص ۵۶۴ ج ۴ وغیرہ۔

ہیزم کش کہا جاتا ہے جسکا مطلب چغل خور ہے یعنی جلتی پر تیل ڈالنے والے کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ چغلی کھاتا ہو اِدھر اُدھر لگائی بجھائی کرتا رہے اور لڑائی فساد کرا دے اس لحاظ سے بھی اُمِّ جمیلہ کو حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ کہا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتی رہتی تھی اسے ہیزم کش یا لکڑیاں کھینچنے والی یا چغلی کھانے والی بھی کہا گیا ہے۔ فِیۡ جِیۡدِهَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ اسکی گردن میں رسّی ہے مونج یا کھجور کے پتوں کی (مضبوط بٹی ہوئی)

خدا کی قدرت جس طرح خاوند ذلت کی موت مرا، بیوی کا حشر بھی ویسا ہی ہوا۔ ام جمیلہ لکڑی کے کانٹوں کا گٹھا سر پہ اٹھا کر لا رہی تھی۔ کہ گٹھا گر گیا اور اس کی رسی اس کے گلے میں اٹک گئی جس کی وجہ سے وہ گلا گھٹ کر مر گئی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حق کی مخالفت کرنے والے لوگ ضرور ناکام ہوں گے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کی مثال سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل و خوار کیا اور بدترین موت مارا۔ اور آخر میں جہنم واصل ہوئے۔

اسلام کا فکری غلبہ

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ سیاسی فتح اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی۔ جب تک اس کے ساتھ سوشل فتح موجود نہ ہو۔ سیاسی فتح کا تذکرہ سابقہ سورۃ نصر میں آچکا ہے اسی طرح سورۃ توبہ اور سورۃ فتح میں سیاسی غلبہ کا بیان اس آیت میں آتا ہے " هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ " خدا کی وہ ذات ہے۔ جس نے اپنے رسُول کو ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا۔ تاکہ اس کو سب دینوں کے مقابلے میں غالب کر دے۔ دلیل اور برہان کے ساتھ دین کو غلبہ تو ہر وقت ہے تاہم مذکورہ سیاسی غلبہ بھی ہو گیا۔ تاکہ کافر مغلوب ہو جائیں۔ مگر سیاسی فتح (POLITICAL VICTORY) کامل فتح نہیں ہوتی۔ جب تک اس کے ساتھ فکری غلبہ نہ ہو۔ اگر سیاسی فتح کے ساتھ فکری محاذ پہ بھی کامیابی ہو جائے، لوگ دین کے مشن کو قبول کر لیں، تو یہ فتح دیرپا ثابت ہوگی۔ ورنہ جونہی سیاسی غلبہ کمزور پڑے گا، لوگ پھر اٹھ کھڑے ہوں گے۔

ہندوستان میں ایسا ہی ہوا مسلمانوں نے یہاں سیاسی فتح کے ذریعے آٹھ سو سال تک حکومت کی مگر وہ سوشل فتح حاصل نہ کر سکے۔ بادشاہ سیاسی طور پہ لوگوں کو دباتے رہے۔

---

[1] المقام المحمود تفسیر حضرت مولانا سندھی صفحہ ۱۹۷ پارہ ۳۰

مگر ان میں فکری انقلاب پیدا نہ کر سکے، جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جب سیاسی غلبہ کمزور ہوا تو ہندوؤں نے پھر سر اٹھایا اور ان کی اکثریت غالب آئی۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا۔ کہ آٹھ سو سالہ غلبہ کے دوران مسلمان ہندوؤں کو جذب کر لیتے مگر اس کی بجائے مسلمانوں نے ہندوؤں کی رسمیں اختیار کر لیں۔ وجہ یہی ہے۔ کہ مسلمانوں کا فکری محاذ کمزور رہا۔ اس کے برخلاف مصر، شام اور عراق وغیرہ کی فکر ہی بدل گئی۔ انہوں نے تمام غیر اقوام کو اپنے اندر جذب کر لیا، اور اس طرح سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ سوشل فتح بھی حاصل کر لی۔

اس سورۃ مبارکہ میں اسی بات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کہ خسیس، بخیل، کنجوس بے ایمان اور دھوکے باز لوگوں کی موجودگی میں فکر پاک نہیں ہو سکتی۔ جب تک فکر پاک نہیں ہو گی مکمل فتح نہیں ہو سکے گی۔ اجتماعی فتح حاصل کرنے کے لیے ابو لہب جیسے لوگوں کی بیخ کنی ضروری ہے۔ یہ اس وقت ہو گا۔ جب باطل کی بجائے حق آ جائے۔ ظلم کی بجائے انصاف کا بول بالا ہو، غرباء کے استحصال کی بجائے ان کی پرورش کا انتظام ہو، دھوکہ کی بجائے خدمت کا جذبہ بیدار ہو۔ اور خساست کی بجائے انفاق فی سبیل اللہ کا مادہ پیدا ہو۔ اجتماعی فتح کے لیے ان تمام چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

سومنات کا مندر

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان محمود غزنوی نے سومنات کا مندر توڑ دیا اور بت شکن بھی کہلایا۔ آدھا مندر مسجد میں تبدیل کیا، اور باقی آدھا اسی طرح قائم رہا۔ مندر کا دروازہ کابل لے گیا۔ مگر نتیجہ کیا نکلا۔ سیاسی فتح حاصل کر لی۔ مگر ان کی فکر پر غلبہ حاصل نہ کر سکا۔ ہزار سال کے بعد ہندوؤں نے وہی دروازہ سوا لاکھ روپے میں خرید کر پھر وہیں لگا دیا اور مسجد کو پھر مندر میں تبدیل کر لیا۔ کسی کے عبادتخانے کو توڑنا اصولی طور پر غلط تھا۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ان کی فکر کو اس طور سے بدلا جائے کہ وہ خود بخود اپنے عبادت خانے ختم کریں۔ طائف والوں نے بت خانے خود توڑے تھے۔ کیونکہ ان کی فکر بدل گئی تھی۔ وہ مسجدوں میں تبدیل ہوئے مگر ہمیشہ کے لیے۔ کیونکہ ان کی بنیاد مضبوط بن چکی تھی۔ یہ فکری اور دائمی فتح تھی۔

سومنات کے دروازے کو سالم حالت میں رکھنا ہی غلط تھا۔ اسے توڑ کیوں نہ دیا نہ وہ موجود ہوتا اور نہ اس کی واپسی کا امکان ہوتا۔ عمر فاروق رضؓ نے کسریٰ کے کروڑوں روپے

مالیت کے قالین کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے غازیوں میں تقسیم کر دیا تاکہ انہیں مصلے کے طور پہ استعمال کریں۔ قالین کو اپنی حالت پہ قائم رہنے نہیں دیا۔ الغرض جب تک سوسائٹی میں ابولہب جیسی ذہنیت کے لوگ موجود ہیں کامل فتح حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہذا سیاسی فتح کے ساتھ فکری فتح کی بھی ضرورت ہے۔

سُورَةُ الإِخْلَاص

درس — (مکمل سورۃ)

سُوْرَۃُ الْاِخْلَاصِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ اَرْبَعُ اٰیَاتٍ

سورۃ اخلاص مکی ہے اور یہ چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝۳
وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝۴ ع

ترجمہ:۔ (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجیے وہ اللہ تعالیٰ ایک ہے ۝۱ اللہ بے نیاز ہے ۝۲
نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ وہ کسی سے جنا گیا ۝۳ اور نہیں ہے کوئی اس کا ہمسر ۝۴

نام اور کوائف

اس سورۃ کا نام سُوْرَۃُ الْاِخْلَاصِ ہے۔ اخلاص کا مطلب دل کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے لیے خاص کرنا ہے گویا یہ انسانوں کے قلوب کو اللہ تعالیٰ کی توحید کے لیے مخلص کرنے والی سورۃ ہے۔ اس میں خدا کی توحید کا ذکر ہے۔ یہ سورۃ مکی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی چار ۴ آیات، پندرہ ۱۵ الفاظ اور اڑتالیس ۴۸ حروف ہیں۔ یہ چھوٹی سورۃ ہے۔

خلاصہ قرآن

سورۃ وَالتِّیْنِ کے بعد والی چھوٹی چھوٹی سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا خلاصہ بیان فرما دیا ہے۔ لمبی سورتوں میں جو باتیں بڑی تفصیل اور دلائل اور مثالوں کے ساتھ واضح کی گئی ہیں وہی باتیں ان چھوٹی چھوٹی سورتوں میں بالکل مختصر طریقے سے دو، دو چار چار جملوں میں بیان کی گئی ہیں۔ تاکہ پورے قرآن حکیم کے مضامین کا خلاصہ ذہن میں آجائے۔ بعض اوقات امتحان میں اگر خلاصہ بھی یاد ہو۔ تو کام دے جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک کے آخر میں یہ خلاصہ قرآن ذہن نشین کرایا گیا ہے۔

گذشتہ سورتوں وَالْعَصْرِ اور وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ میں دین کے بنیادی اصول بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے پہلے سورۃ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا میں دین کا نچوڑ اور خلاصہ

ذکر کیا گیا ہے۔ کہ یہ سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی چیز ہے۔ پھر اس بارے میں رکاوٹ بننے والی چیزوں مثلاً مال کی محبت خاندان یا قبیلے کے ساتھ محبت کا ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد نظریات کے فساد، دہریت اور زر پرستی وغیرہ کا ردّ بھی ہو چکا ہے۔ ملوکیت پرستی اور قومیت پرستی کی مذمت بیان ہو چکی ہے۔ یہ بڑی بڑی بیماریاں ہیں۔ جو انسان کے فکر کو فاسد کرتی ہیں۔ اور پھر وہ پاکیزہ اصول بھی بتلا دیئے۔ جن کو اختیار کرنے سے ان بیماریوں سے آدمی بچ سکتا ہے۔

اس سے پہلے قرآن کریم کی اہمیت بیان ہو چکی ہے۔ جھوٹی مذہبیّت کا ردّ ہو چکا ہے ریاکاروں اور جھوٹے مذہب پرستوں کی ناکامی کا ذکر ہوا ہے۔ اور پھر ان تمام چیزوں کو بیان کرنے کے بعد آخر میں کفار کو چیلنج کیا گیا ہے۔ کہ اگر اتنی باتیں بیان کرنے کے بعد بھی تم راہِ راست پر نہیں آتے، تو تمہارے ساتھ قطع تعلقی ہے۔ اب سوائے جنگ کے کوئی طریق کار باقی نہیں رہا۔ اس سورۃ میں اس بات کی بشارت دی گئی ہے کہ صحیح فکر رکھنے والوں کو فتح حاصل ہو گی۔

یہ دراصل پولیٹیکل کامیابی تھی۔ ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی سمجھا دی کہ صرف سیاسی فتح مکمل کامیابی کی ضمانت نہیں ہوتی۔ جب تک صحت فکر کے ساتھ اجتماعی فتح حاصل نہ ہو۔ صحیح فکر کے حاملین کے بغیر نظامِ سلطنت درست نہیں ہو سکتا۔ سورۃ لہب میں یہی نکتہ سمجھایا گیا ہے۔ کہ جب تک خائن، حریص اور حق کے مخالف لوگ موجود ہیں۔ سوسائٹی پاک نہیں ہو سکتی اور نہ نظامِ حکومت درست ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اب جب کہ سیاسی غلبہ حاصل ہو چکا ہے۔ فکر کو درست کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یہ تمام باتیں بیان کرنیکے بعد اس سورۃ اخلاص میں اس مرکزی بات کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس کے گرد سارے دین اسلام کی عمارت گردش کرتی ہے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔ کہ قرآن پاک کی آخری دو سورتوں کی حیثیت ایسی ہے۔

۱؎ نظام القرآن تفسیر سورہ   از فراہی ص

جیسے تکمیل کے بعد تعویذ دیا جاتا ہے کہ تعویذ کے ذریعے اس چیز کی حفاظت ہو گی۔ یہ آخری دو سورتیں صرف تعویذ ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے۔ جیسے عمارت مکمل کرنے کے بعد گیٹ پر حفاظت کے لیے دو سپاہی بٹھا دیے جائیں۔ یہ آخری دو سورتیں قرآن پاک کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

اسلام کا مرکزی نظریہ حیات

اس سورۃ میں وہ مرکزی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ جس پر دین اسلام کی بنیاد قائم ہے اور جسے موجودہ دور میں نظریہ حیات یا آیڈیالوجی کہا جاتا ہے اسلام یا دین یا جو کچھ آپ نے قرآن پاک میں پڑھا ہے۔ اس کی بنیاد اسی فکر پر ہے اگر یہ بنیادی فکر قائم رہے گی، تو دین کی عمارت قائم رہے گی اور اگر یہ بنیادی فکر ہی متزلزل ہو گی۔ تو نہ نظام سلطنت درست ہو گا۔ نہ عبادت درست ہو گی۔ نہ معاملات ٹھیک ہوں گے اور نہ ہی کوئی دوسرا نظام صحیح کام کرے گا۔ یہ وہی بنیادی نظریہ توحید ہے۔ جس کی تمام انبیاء کرام علیہم السلام دعوت دیتے رہے ہیں۔ تمام مسائل میں سے اہم ترین مسئلہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا مسئلہ ہے۔ دنیا میں ابتداء سے لے کر انتہا تک جتنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ اسی مرکزی نظریہ میں فساد کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ گویا اس سورۃ میں ہر قسم کی باطل فکر رکھنے والوں کا ردّ آ چکا ہے۔

نظریہ دہریت

دہریت کا معنیٰ مادہ پرستی ہے جن لوگوں کا نظریہ یہ ہے۔ کہ ان کا کوئی خالق نہیں کائنات کی تمام چیزیں خود بخود بن گئی ہیں۔ انہیں دہریہ یا مادہ پرست کہا جاتا ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ مادے کے اجزا آپس میں جڑ گئے ہیں۔ تو انہوں نے مختلف شکل (SHAPE) اختیار کر لی ہے، کوئی زمین بن گئی، کوئی آسمان بن گیا۔ کوئی اور چیز بن گئی۔ یہ خود بخود مختلف شکلیں بن گئی ہیں۔ نہ کوئی ان کا جوڑنے والا ہے اور نہ پیدا کرنے والا۔ اگرچہ ایسے لوگوں کی تعداد دنیا میں نہایت قلیل ہے۔ تاہم یہ لوگ بھی موجود ہیں۔ اسی قسم کا نظریہ کفر کی بدترین قسم ہے۔ اس کو تسلیم کرنے والے سخت بیوقوف ہیں۔ کیونکہ ایک عام انسانی فکر بھی اس قسم کے نظریے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مولانا رومیؒ کہتے ہیں ؎

ہیچ چیزے خود بخود چیزے نشد   ہیچ آہن خود بخود تیغے نشد

مطلب یہ کہ جس طرح لوہے سے چھری یا تلوار خود بخود نہیں بن جاتی۔ اسی طرح یہ

کائنات اور اس میں موجود لاکھوں کروڑوں اشیاء خود بخود کیسے بن گئیں۔ عقل و شعور یہ سوچنے پر مجبور ہے۔ کہ ان سب کو بنانے والی اور کائنات کے نظام کو چلانے والی ضرور کوئی ذات موجود ہے اور وہ ذات، ذاتِ خداوندی ہے۔

صفاتِ الٰہی کے منکرین فلاسفر

بعض لوگ فلاسفر کہلاتے ہیں۔ ایسے لوگ یونان اور روم میں بھی تھے۔ اور آجکل یورپ میں بھی ہیں۔ یہ لوگ خالق کو تو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر خالق کی کسی صفت کے قائل نہیں۔ ان لوگوں کی فکر بھی فاسد ہے۔ کیونکہ قرآن پاک کا نظریہ یہ ہے "وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی" اللہ تعالےٰ کے تمام نام پاکیزہ ہیں" وَلِلّٰہِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی" اور اللہ کی صفات بہت عالی ہیں حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے[۱]۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ نام ہیں۔ جو شخص انہیں یاد کرے گا۔ ان پر ایمان رکھے گا۔ ان کو پڑھتا ہے گا جنت میں داخل ہوگا۔ رحمٰن، رحیم، غفار، ستار، قہار وغیرہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ جو لوگ ان صفات کے منکر ہیں۔ ان کی فکر بھی فاسد ہے۔

کفار و مشرکین

بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اس لیے منکر ہیں کہ اکیلا اللہ کائنات کے سارے امور کیسے انجام دے سکتا ہے۔ ان میں مکے کے مشرک بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے خانہ کعبہ کے پاس تین سو ساٹھ ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ وہ کہتے تھے ہماری یہ بے شمار حاجتیں اکیلا خدا کیسے پوری کر سکتا ہے۔ یہ تو ہمارے اتنے سارے معبود پوری کرتے ہیں۔ اللہ کا نبی ہمیں کہتا ہے۔ کہ ان سب کو چھوڑ کر ایک خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے "اَجَعَلَ الْاٰلِھَۃَ اِلٰھًا وَّاحِدًا" یہ سب کفر و شرک کی مختلف قسمیں ہیں جو لوگوں میں راسخ ہو چکی ہیں۔

ثنویت پرستی

ثنویہ فرقہ کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ صانع یعنی کسی چیز کا بنانے والا اکیلا نہیں ہے۔ بلکہ مختلف اشیاء کو پیدا کرنے والی مختلف ہستیاں ہیں۔ مجوسیوں کا بھی قریب قریب یہی عقیدہ ہے وہ کہتے ہیں کہ جو ہستی روشنی کو پیدا کر سکتی ہے۔ وہ تاریکی کو نہیں پیدا کر سکتی گویا روشنی اور اچھائی کا خدا اور ہے اور تاریکی اور برائی کا خدا دوسرا ہے۔ روشنی کا خالق یزداں ہے۔ اور تاریکی کا خالق اہرمن ہے۔ لہٰذا ایسے لوگ اثنینیت کے قائل ہیں حالانکہ عقیدہ تو وہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے

---

[۱] بخاری جلد ۱ صفحہ ۳۸۲، جلد ۲ صفحہ ۹۴۹، صفحہ ۱۰۹۸، مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۴۲

سورۃ انعام کی ابتداء میں بیان فرمادی ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ط" خدا کی ہستی وہ ہے۔ جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ اور روشنی اور تاریکی کو پیدا فرمایا۔ مطلب یہ کہ خالق ہر چیز کا ایک ہی ہے۔ مختلف چیزوں کے خالق مختلف نہیں ہیں۔ ثنویت پرستی قبیح قسم کی مشرکانہ فکر ہے۔ یہ فکر بھی فاسد ہے۔

عقیدہ تشبیہ

بعض لوگوں میں تشبیہ کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفت کو تو مانتے ہیں۔ مگر ایسی صفت مانتے ہیں۔ جو مخلوق میں پائی جاتی ہے۔ اسے عقیدہ ابنیت بھی کہا جاتا ہے۔ جو کہ باطل عقیدہ ہے۔ ان کی فکر اس قسم کی ہے "قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا" یعنی انہوں نے کہا کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ یا ان کا عقیدہ ہے مسیح ابن اللہ یا عزیر ابن اللہ یعنی مسیح یا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ اولاد یا بیوی بچوں کا ہونا تو مخلوق کا خاصہ ہے۔ انہوں نے یہی صفت اللہ میں مان لی، تو عقیدہ تشبیہ میں مبتلا ہو گئے۔

یہاں دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جس کے لیے اولاد ہوگی، وہ حادث ہوگا (العیاذ باللہ) کیا خدا کی ذات بھی حادث ہے؟ حادث کا معنی نئی پیدا ہونے والی چیز ہے۔ جو چیز پیدا ہوگی وہ فنا بھی ہوگی۔ جس کو حیات مستعار ملتی ہے اس پر موت بھی طاری ہوتی ہے۔ مقصد یہ کہ اگر مخلوق والی صفت اللہ تعالیٰ میں مان لی جائے تو خدا تعالیٰ کی ذات بھی حادث بن جائے گی وہ قدیم اور ازلی نہیں رہے گی۔ حالانکہ وہ ازلی اور ابدی ہے۔ لہٰذا عقیدہ تشبیہ بھی باطل ٹھہرا۔

شرک کی مختلف اقسام

اس سورۃ مبارکہ میں مذکورہ تمام قسم کے فاسد اور مشرکانہ افکار کا رد کیا گیا ہے۔ سورہ انعام پڑھ لیں ہر قسم کے شرک کی تردید موجود ہے۔ شرک کی اقسام میں سے قولی بھی فعلی اور عملی شرک ہے۔ نذر و نیاز چڑھانا فعلی شرک ہے۔ اسی طرح اعتقادی شرک یہ ہے کہ مافوق الاسباب غائبانہ طور پر اللہ کے سوا کوئی اور بھی نفع نقصان پہنچا سکتا ہے۔ عالم کے اندر رہتے ہوئے ایک دوسرے ________ کی مدد کرنا فطرت کے عین مطابق ہے۔ جیسے "وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" نیکی اور بھلائی میں ایک دوسرے کا تعاون حاصل کرو۔ گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔ یہ تو عالم اسباب ہے مگر جہاں ظاہری اسباب موجود ہی نہ ہوں۔ وہاں غیر اللہ کی طرف سے نفع نقصان کی امید رکھنا یہی اعتقادی شرک ہے۔

ڈاکٹر مریض کا معائنہ کرتے ہیں۔ اس کے لیے دوائی تجویز کرتے ہیں۔ علاج کے تمام ذرائع بروئے کار لاتے ہیں، پھر بھی افاقہ نہیں ہوتا۔ تو جواب دے دیتے ہیں۔ کہ اس مریض کا علاج ہمارے بس میں نہیں ہے۔ اب مریض کے لواحقین کہتے ہیں۔ کہ ظاہری اسباب ختم ہو چکے ہیں اب دم درود کراؤ۔ اس سٹیج پر اگر کوئی یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس مریض کو کوئی اور بھی شفا دے سکتا ہے۔ تو یہ شرک ہوگا۔ اور ایسا عقیدہ رکھنے والا شخص کافر ہو جائے گا۔ کیونکہ اب ظاہری اسباب ختم ہو چکے ہیں۔ مافوق الاسباب شفا دینا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

اسی طرح بگڑی کو بنانا خدا تعالیٰ کی صفت ہے۔ تمام ذرے ذرے کا علم ہونا بھی خاصہ خداوندی ہے۔ کیونکہ" وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ "مخلوق میں کوئی ہستی ایسی نہیں جسے ذرّے ذرّے کا علم ہو۔ نہ جبرائیل علیہ السلام کو نہ میکائیل علیہ السلام کو اور نہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ موسیٰ علیہ السلام، خضر علیہ السلام کوئی عالم الغیب نہیں اولیاء اللہ تو انبیاء علیہم السلام سے کم تر درجے میں ہیں۔ وہ تو نبیوں کے خدام ہیں انہیں علم غیب کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ مقرب فرشتے تک اس سے محروم ہیں۔ اسی طرح قدرت تامہ سوائے خدا کے کسی کو حاصل نہیں۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" ہر چیز پر قدرت رکھنے والی ذات صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ اگر کسی دوسرے کو علیم کل یا قادر مطلق تسلیم کرے گا، تو مشرک ہو جائے گا۔

خالق اور مخلوق

اسی طرح ہر چیز کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ارض وسما کی پیدائش سے کروڑوں سال پہلے اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو پیدا کیا۔ اس کے بعد اس کائنات کی پیدائش کا وقت آیا۔ اب جو چیز پیدا ہو چکی ہے۔ وہ فنا بھی ہوگی۔ یہ جہاں بھی بدل جائے گا۔ خدا جانے اس سے پہلے کتنے جہان بدل چکے ہیں۔ ہمارے علم میں نہیں ہے۔ ہم تو صرف اسی موجودہ دور کو جانتے ہیں۔ اس کی بھی کوئی انتہا ہے۔ اس کے بعد دوسرا جہان آنے والا ہے۔ الغرض قادر مطلق ذات الٰہی ہے۔ علیم کل اور مختارِ مطلق بھی وہی ہے، جو چاہے کرے؛ اس کے ارادے کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ

نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے۔ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ میں نے اپنے رب کو ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔ جب ہم کوئی ارادہ کرتے ہیں۔ تو وہ ٹوٹ جاتا ہے، بات پوری نہیں ہوتی۔ بار بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہمیں اپنے ارادے میں کوئی اختیار نہیں۔ ہر چیز خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ معلوم ہوا کہ کوئی ایسی ذات ہے، جو قادر مطلق ہے اور مرید ہے وہ جب چاہتا ہے انسانی ارادے کو توڑ دیتا ہے۔ اور جس کے ارادے کو کوئی توڑ نہیں سکتا، وہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے "وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءً فَلَا مَرَدَّ لَهٗ" جب وہ کسی قوم یا فرد کے بارے میں اچھائی یا برائی کا ارادہ کرتا ہے۔ تو اُسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔ وہ جس طرح چاہتا ہے کہ گزرتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔

الغرض قرآن پاک نے یہ مسئلہ سمجھا دیا کہ کائنات کی ہر چیز جو آپ کے فہم و ادراک، یا نگاہ و مشاہدہ میں آتی ہے، وہ مخلوق ہے۔ خالق ان کے علاوہ ہے۔ اور غیب الغیب میں ہے۔ یہ غیب اور شہادت سب مخلوق ہے۔ ہر چیز کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ اس کے علاوہ اور کوئی خالق نہیں ہے۔

مسئلہ الوہیت

حکومت کے متعلق فرمایا "اَلَا لَهُ الْحُكْمُ" حکم اور فیصلہ بھی اُس کا ہے اور پھر آخر میں مسئلہ الوہیت بھی واضح کر دیا کہ الٰہ بھی اس کے سوا کوئی نہیں "مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" سارے انبیاء علیہم السلام نے یہی بات سمجھائی کہ دیکھو! خالق اس کے سوا کوئی نہیں، مالک کوئی نہیں، قادر مطلق کوئی نہیں اور علیم کل بھی وہی ہے جس طرح تم مخلوق ہو، اسی طرح کائنات کی تمام چیزیں مخلوق ہیں۔ نبی علیہ السلام بھی مخلوق ہیں، ملائکہ بھی مخلوق ہیں۔ خالق صرف خدا تعالیٰ ہے۔

ہر نبی نے یہی اعلان کیا "يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ" اے لوگو عبادت صرف خدا تعالیٰ کی کرو۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے الٰہ کا معنی ہے مستحق عبادت اور عبادت کہتے ہیں۔ انتہائی درجے کی تعظیم کو تو گویا ذہن میں عقیدہ رکھتے ہوئے کہ خالق، مالک، مختار مطلق، نافع، ضار اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ انتہائی درجے کی تعظیم کرنا عبادت کہلاتا ہے۔ تعظیم قول سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور جسم سے بھی۔ نماز میں ہم زبان سے مناجات کرتے ہیں۔ یہ قولی عبادت ہے۔ جسمانی طور پہ قیام، رکوع، سجود کرتے

ہیں یہ جسمانی عبادت ہے۔ اسی طرح اس کی راہ میں نذر و نیاز پیش کرتے ہیں یہ مالی عبادت ہے۔ اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّیِّبَاتُ میں توحید کا مسئلہ سمجھایا گیا ہے۔ کہ تمام بدنی قولی اور مالی عبادتیں خاص اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں۔ کوئی اور ان عبادتوں کا مستحق نہیں۔ کیونکہ جو صفات خدا تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آتیں اس لیے معبود صرف وہی ہے۔ معبود وہ ہوگا جو ازلی اور ابدی ہے، جو خالق کل ہے۔ جو قادر مطلق اور علیم کل ہے، جو کسی کا محتاج نہیں۔ بلکہ اس کے سب محتاج ہیں۔ اپنے وجود میں بھی محتاج ہیں اور بقا میں بھی اسی کے محتاج ہیں کام میں بھی محتاج ہیں۔ اس کی توفیق کے بغیر قدم تک نہیں اٹھا سکتے۔

خود انبیاء علیہم السلام بھی یہی کہتے ہے" وَمَا تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ" اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ نیز فرمایا، وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰہِ" آپ صبر کریں مگر صبر بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے خدا سے توفیق طلب کرتے رہنا چاہیئے۔ کوئی نیکی کا کام کرکے اس پر اتراؤ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایسا کرنے کی توفیق دی۔

الغرض! مستحق عبادت وہ ہوگا۔ جو خالق ہے، علیم کل ہے اور قادر مطلق ہے۔ جسے ذرے ذرے کا علم ہے، جو نافع اور ضار ہے، جو چاہے کرے۔ جس کے ارادے کو کوئی توڑ نہ سکے۔ مخلوق آخر کسی نہ کسی مادے سے پیدا ہوئی ہے۔ جبرائیل علیہ السلام بھی مادہ سے پیدا ہوئے تاہم ان کا مادہ لطیف ہے۔ انسان اور حیوان کا مادہ ذرا کثیف ہے۔ عبادت کا مستحق وہ خدا ہو سکتا ہے۔ جو مادیت سے منزہ ہو۔ باقی تمام مخلوق کا کوئی نہ کوئی مادہ ہے۔ شیاطین اور جنات غلیظ قسم کے مادہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ تو یہ قرآن کریم کی توحید کا تصور اور مرکزی فکر کہ توحید کا مسئلہ بالکل صاف ہونا چاہیئے۔ اس میں کسی قسم کی شرک کی ملاوٹ نہیں ہونی چاہیئے تب جاکر اسلام کا تقاضا پورا ہوگا۔

شرک کے اجزاء

اب شرک کے مختلف اجزاء ہیں۔ اگر ذات میں کسی کو شریک ٹھہرایا گیا تو مشرک ٹھہرا۔ اگر ذات کو تسلیم ہی نہ کیا تو دہریت کا شکار ہوگیا۔ اگر خدا کی صفت کا انکار کیا تب بھی کفر کیا۔ اگر صفت کو غلط طریقے سے مانا تب بھی مشرک ہوگیا۔ ابنیت والوں کی طرح اگر

اللہ تعالیٰ میں مخلوق کی کوئی صفت مان لی تب بھی شرک کا ارتکاب کیا، کیونکہ تشبیہ کے عقیدے میں مبتلا ہو گیا۔ شرک کبھی ذات میں ہوتا ہے اور کبھی صفات میں۔ اسی طرح تاثیر میں بھی شرک ہوتا ہے۔ ایک شخص خود ایک کام نہیں کر سکتا۔ وہ دوسرے کا تعاون حاصل کرتا ہے۔ جیسے کوئی شخص وزنی چیز اٹھانے سے قاصر ہے۔ مگر دوسرے کی امداد حاصل کر کے وہ چیز اٹھا لیتا ہے اس قسم کا عقیدہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق رکھنا کہ اُسے بھی کسی کی امداد یا تعاون کی ضرورت ہے، یہ تاثیری شرک ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کو کسی تاثیر کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے لیے غیر کی تاثیر ماننا بھی شرک ہوگا۔

شرک عام طور پر عبادت یا صفت میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ علیم کُل ہے۔ اگر یہی صفت دوسروں میں مانی جائے۔ کہ انبیاء علیہم السلام یا اولیاء اللہ بھی غیب جانتے ہیں۔ یا بگڑی بنا سکتے ہیں اور اُن سے حاجتیں طلب کی جائیں۔ ان کو غائبانہ طور پر مافوق الاسباب پکارا جائے تو یہ شرک ہوگا۔ وظیفہ یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ اسی قبیل سے ہے۔

اکثر شرک صفات میں ہوتا ہے۔ حالانکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات میں کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح صفات میں بھی کوئی شریک نہیں۔ مگر یہاں دوسروں کو بھی شریک سمجھا جاتا ہے۔ کہ ان کو بھی قدرت حاصل ہے۔ ان کے پاس بھی علم غیب ہے۔ یہ بھی کچھ کر سکتے ہیں مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی تاویل کرتے ہیں۔ کہ اس سے مراد خدا کے مدمقابل نہیں بلکہ اس کے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ یہ بھی مشرکانہ عقیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو مقرر نہیں کیا۔ کہ لوگوں کی حاجت روائی کیا کرو۔ مشکل کشائی کیا کرو۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ سب کی براہ راست مشکل کشائی کرتا ہے۔ اس نے کسی کو مخلوق کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا۔ کہ کسی کا واسطہ پکڑا جائے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1] کہ اس قسم کا شرک کرنے والے قبر پرست، پیر پرست، امداد طلب کرنے والے اللہ تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرتے ہیں۔ کہ جس طرح دنیوی حاکموں تک عام آدمیوں کی رسائی نہیں ہوتی۔ اسی طرح دربار الٰہی تک

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۵۹ ج ۱

بھی ہر کسی کی رسائی نہیں۔ لہٰذا وسیلہ پکڑنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرنا جہالت، بیوقوفی، نادانی اور مشرکانہ بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی چار صفات

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[1]۔ اللہ تعالیٰ کی چار صفات ہیں۔ اوّل ابداع، دوم پیدا کرنا، سوم تدبیر کرنا اور چہارم تدلی۔ تدلی کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہر شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست ہے۔ ہر آدمی کے اندر خواہ وہ کیسا بھی ہو، خدا تعالیٰ کی تھوڑی بہت تجلی پڑتی ہے۔ جو لوگ پاکیزگی اختیار کرتے ہیں۔ ان کو آخرت میں بڑا فائدہ ہوگا۔ اور جو اس تجلی کو خراب کر لیتے ہیں۔ ان پر بڑا وبال آئے گا۔ تاہم براہ راست تدبیر کا تعلق کسی غیر اللہ کے ساتھ نہیں ہے، مارنا، زندہ کرنا، ترقی، تنزل، صحت قائم رکھنا، بڑھاپا طاری کرنا یہ سب خدا کی تدبیر ہے۔ اور تدلی یعنی مخلوق کے ہر فرد کے ساتھ براہ راست تعلق بھی خدا تعالیٰ کا موجود ہے۔ درمیان میں وسائل بنانا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے۔ بعض مشرک یہ کہتے ہیں۔ کہ ہماری عبادتیں ناقص ہیں۔ لہٰذا ہم انبیاء علیہم السلام یا اولیاء کی اس لیے عبادت کرتے ہیں تاکہ ہماری ناقص عبادتیں ان کی افضل عبادتوں کے ساتھ مل کر مقبول ہو جائیں۔ یہ بھی باطل اور نہایت غلیظ فکر ہے شرائط اور پاکیزگی کے ساتھ جو کوئی بھی عبادت کرے گا، وہ مقبول ہوگی۔

توحید مرکزی عقیدہ ہے

بہرحال توحید اسلام کا مرکزی اور بنیادی عقیدہ ہے۔ جو اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے۔ سارے دین کی بنیاد اسی عقیدہ پر ہے۔ اور آخرت میں نجات کا دارومدار اسی پر ہے ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ آپ کہہ دیجئے وہ اللہ ایک ہے۔ اس کے ساتھ، اس جیسا یا اس کے ساتھ کسی قسم کی شراکت رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ اللہ بے نیاز ہے وہ کسی کا محتاج نہیں صمد اُسے کہتے ہیں جو کسی کا محتاج نہ ہو۔ بلکہ سب اُسی کے محتاج ہوں گویا صمد کا معنیٰ اَلْمَصْمُوْدُ اِلَيْهِ فِي الْحَوَائِجِ ہوا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں[2]۔ کہ صمد وہ ہے جو حاجت برآری کرنے والا ہے مگر اس کی اپنی کوئی حاجت نہیں کہ جسے وہ کسی دوسرے کے پاس لے جائے۔ صمد اُسے بھی کہتے ہیں۔ جس کا جوف نہ ہو یعنی اس کے اندر کسی قسم کا عیب

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص، تفہیمات الٰہیہ ص، ہوامع ص [2]

نہ ہو۔ تو خدا بے نیاز ہے لَمْ یَلِدْ ۥ وَلَمْ یُوْلَدْ نہ اُس نے کسی کو جنا ہے۔ اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔ ابنیت یا ولدیت کا باطل عقیدہ اہلِ کتاب کا ہے۔ ان لوگوں کا بھی رد ہو گیا۔ اور آخر میں فرمایا وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ کوئی اس کا ہمسر، برابر یا معین نہیں۔ اس کے ساتھ کوئی اور تاثیر کرنے والا نہیں ہے اور اس کا کوئی ناصر نہیں۔ اور نہ ہی اس کو کسی کی ضرورت ہے وہ ہر لحاظ سے اپنی ذات اور اپنے افعال میں یگانہ ہے۔ لہذا عبادت بھی صرف اسی کی کرنی چاہیئے۔ اس کی وحدانیت کو اپنانا ہی صحیح فکر ہے، اور یہی اسلام کی بنیاد ہے۔

فضائل سورۃ

اس سورۃ مبارکہ کو ثلثِ قرآن یعنی پورے قرآن پاک کا تیسرا حصہ کہا گیا ہے[1]۔ اسکی تفصیل یہ ہے۔ کہ قرآن پاک تین قسم کے مضامین کا مجموعہ ہے یعنی اللہ تعالٰی کی ذات اور اس کی صفات کا عقیدہ، شریعت کا بیان اور معاد یعنی آخرت کا ذکر۔ چونکہ اس سورۃ میں سے ایک موضوع متعلقہ ذات وصفات خداوندی کا ذکر ہے۔ اس لیے اسے ثلثِ قرآن کہا جاتا ہے۔

ترمذی شریف کی روایت[2] ہے۔ کہ جو شخص رات کو دائیں کروٹ لیٹ کر یہ سورۃ مبارکہ تلاوت کرے گا، اللہ تعالٰی فرمائیں گے جاؤ سیدھے بغیر باز پرس جنت میں داخل ہو جاؤ۔ تاہم شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا مومن ہو منافق نہ ہو اور شرک کرنے والا نہ ہو۔

ایک صحابی قوم کی امامت کراتے تھے اور ہر نماز میں اس سورۃ کی قرأت کرتے تھے۔ صحابہؓ نے حضور علیہ السلام سے شکایت کی۔ کہ یہ ہر رکعت میں دیگر سورۃ کے علاوہ سورۃ قُلْ ھُوَ اللہُ بھی پڑھتے ہیں۔ جب انہیں اس شکایت کا علم ہوا تو اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے۔ کہ اگر تم چاہو تو میں نماز پڑھاتا ہوں، ورنہ نہیں۔ مگر میں اس سورۃ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ صحابیؓ جب حضور علیہ السلام کے پاس آئے۔ تو آپ نے دریافت فرمایا کہ دوسری سورۃ کے ساتھ اس سورۃ کو کیوں پڑھتے ہو۔ تو انہوں نے عرض کیا۔ حضور! اس میں اللہ تعالٰی کی ایسی صفت ہے جو مجھے بہت پسند ہے۔ اس لیے اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ نے فرمایا[3] اِنَّ حُبَّکَ اِیَّاھَا

---

[1] ترمذی ص۴۱۱، بخاری ص۷۵۰ ج۲، مسلم ص۲۷۱ ج۱

[2] ترمذی ص۴۱۱

[3] ترمذی ص۴۱۲

یُدۡخِلُكَ الۡجَنَّةَ۔ تیری اس سورۃ کے ساتھ محبت نے تجھے جنت میں داخل کر دیا ہے۔
یاد رہے کہ عام لوگوں کے لیے ضروری نہیں ہے۔ کہ یہ سورۃ ہر رکعت میں پڑھی جائے
بلکہ ایسا سمجھنے میں کچھ قباحت آتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری سورتیں بھی پڑھنی چاہیئں۔ اس
شخص کو اس سورۃ سے بے پایاں محبت تھی۔ لہٰذا اُسے جنت کی بشارت دی گئی۔ یہ سورۃ اخلاص
کہلاتی ہے۔ اس میں مؤمنوں کو حکم دیا گیا ہے۔ کہ عقیدہ توحید کو اپنے دلوں میں خالص بنا کر رکھیں
کیونکہ نجات کا مدار اسی پر ہے، اور یہی اسلام کا نظریہ حیات یا آئیڈیالوجی ہے یہی مرکزی فکر
ہے جس پر سارا دین قائم ہے۔ اگر یہ نظریہ درست ہے تو سارا دین درست ہے اور اگر یہ ہی
بگڑا ہوا ہے تو سارا دین بگڑا ہوا ہوگا۔ کوئی چیز بھی ٹھیک واقع نہیں ہوگی۔

سُورَةُ الفَلَقِ

درس (مکمل سورۃ)

سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ خَمْسُ اٰيَاتٍ

سورۃ فلق مدنی ہے اور یہ پانچ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿۲﴾ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ
اِذَا وَقَبَ ﴿۳﴾ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِى الْعُقَدِ ﴿۴﴾ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ
ع ۵/۳۸ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے میں پناہ لیتا ہوں صبح کے رب کے ساتھ ﴿۱﴾ تمام ان چیزوں کی برائی سے جن کو اس نے پیدا کیا ہے ﴿۲﴾ اور اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جاتا ہے ﴿۳﴾ اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے ﴿۴﴾ اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب وہ حسد کرتا ہے ﴿۵﴾

نام اور کوائف اس سورۃ کا نام سورۃ الفلق ہے۔ یہ مدنی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی پانچ آیات ہیں۔ یہ سورۃ تیئس ۲۳ الفاظ اور انہتر ۶۹ حروف پر مشتمل ہے۔ اس کی پہلی آیت میں فلق کا لفظ مذکور ہے۔ جس سے سورۃ کا نام لیا گیا ہے۔

فضیلت معوذتین آخری دو سورتیں یعنی سورۃ فلق اور سورۃ والناس معوذتین کہلاتی ہیں۔ احادیث میں ان کی بہت فضیلت آئی ہے۔ صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں سورتیں اکٹھی نازل ہوئیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[۱] کہ مجھ پر ایسی آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ کہ ان کی مثل کوئی آیت نہیں ہے۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ تعوذ کے باب میں یعنی برائیوں سے پناہ مانگنے کے سلسلے میں جتنا اثر یہ دو سورتیں رکھتی ہیں۔ اس کے برابر کوئی کلام نہیں۔ یہاں پر

۱؎ مسلم ص ۲۷۲ ج ۱، ترمذی ص ۱۲۰ ج ۲

فضیلت سے مراد مطلقاً فضیلت نہیں۔ کیونکہ مطلق فضیلت سورۃ فاتحہ سورۃ بقرہ کی آخری آیات، سورۃ حشر کی آخری آیات اور آیۃ الکرسی وغیرہ کی زیادہ ہے۔ تاہم پناہ مانگنے کے سلسلے میں ان سورتوں جیسا کلام نہ توراۃ میں ہے، نہ زبور میں، نہ انجیل میں اور نہ قرآن پاک میں ہے۔ گویا کسی بھی آسمانی صحیفے میں پناہ سے متعلقہ کلام ان دو سورتوں کے برابر نہیں ہے۔

احادیث میں آتا ہے[۱] کہ ان سورتوں کے نزول سے پہلے حضور علیہ السلام استعاذہ کے لیے مختلف کلمات پڑھتے تھے۔ مگر جب یہ سورتیں نازل ہو گئیں تو آپ نے انہیں اختیار کر لیا۔ اور زیادہ تر انہی سے تعوذ کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[۲] کہ فرض نماز کے بعد ان دو سورتوں کی تلاوت کیا کرو تاکہ ہر قسم کے شرور اور فتنوں سے پناہ حاصل ہو سکے۔ ان دو سورتوں کو نماز کے بعد ورد کی حیثیت حاصل ہے۔

روشنی اور تاریکی

یہ سورۃ فلق ہے۔ فلق کا معنی سفیدی اور روشنی ہے۔ محققین فرماتے ہیں[۳] کہ تاریکی میں شر ہے اور تاریکی عدم ہے۔ اس کے مقابلے میں روشنی وجود ہے۔ خوبی کا تعلق وجود سے ہوتا ہے۔ اور شر کا تعلق عدم سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جب روشنی نمودار ہوتی ہے۔ تو اس سے ہر قسم کی خوبی حاصل ہوتی ہے۔ اور تاریکی میں شر و فساد واقع ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے۔ "فَالِقُ الْإِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا" اللہ تعالیٰ تاریکی میں سے صبح کو پھاڑ کر نکالتا ہے۔ اور اس نے رات کو سکون کے لیے بنایا۔ تاکہ تمام انسان اور جانور آرام و سکون حاصل کر سکیں۔ نیز "وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا" دن کو معاش کا ذریعہ بنایا۔ تاکہ لوگ کاروبار میں اشتغال اختیار کریں۔ یہ چیز روشنی میں ہی انجام دی جا سکتی ہے تاریکی میں نہیں ہو سکتی۔

دینی اور دنیوی فتنے

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ذکر کر کے چار چیزوں کے شر سے پناہ مانگی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ اگلی سورۃ والناس میں

۱؎ نسائی ص ۳۱۷ ج ۲، در منثور ص ۴۱۶ ج ۶ ۲؎ ترمذی ص ۴۱۲، در منثور ص ۴۱۶ ج ۶

۳؎ تفسیر عزیزی فارسی ص ۲۷۵ پ ۳۰

اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا بیان ہے۔ اور ایک چیز سے پناہ مانگی گئی ہے۔ تو مفسرین محققین فرماتے ہیں[1] کہ ان دونوں سورتوں کا موضوع الگ الگ ہے۔ سورۃ فلق میں چار دنیوی آفات و بلیات کے شر سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ اور سورۃ والنّاس میں دینی شرور اور فتنوں سے پناہ مانگی گئی ہے۔ وسوسہ شیطانی دینی فتنہ ہے اور دینی فتنہ کی دنیوی فتنوں کی نسبت زیادہ اہمیت ہے۔ اس لیے وہاں پر اللہ تعالیٰ کی تین صفات بیان کر کے صرف ایک دینی فتنہ یعنی وسوسہ شیطانی سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ جب کہ اس سورۃ فلق میں اللہ کی ایک صفت بیان کر کے دنیا کے چار شرور سے پناہ مانگی گئی ہے۔ چونکہ دینی فتنے کا اثر آخرت پر ہوگا۔ اس لیے حضور علیہ السلام دعا فرمایا کرتے تھے[2] (اَللّٰھُمَّ) وَلَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا۔ اے اللہ! دین کے معاملے میں ہمیں مصیبت میں گرفتار نہ کرنا، کیونکہ یہ مصیبت آخرت تک ساتھ جائے گی۔ مثلاً اگر کوئی کفر و شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ تو یہ مصیبت اُسے جہنم تک لے جائے گی۔ اس کے برخلاف دنیوی فتنہ تو زیادہ سے زیادہ کسی کو اس کی زندگی تک ہی مصیبت میں مبتلا رکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد یہ تکلیف خود بخود رفع ہو جائے گی۔ گویا دنیوی شرور کے اثرات عارضی ہیں۔ جب کہ دینی فتنوں کے اثرات دائمی ہیں۔ اسی لیے یہ زیادہ اہم ہیں۔

مخلوق کے شر سے پناہ

ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ آپ کہہ دیجئے اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ میں پناہ لیتا ہوں صبح کے رب کے ساتھ۔ یعنی جو صبح کی روشنی کو رات کی تاریکی سے پھاڑ کر نکالتا ہے۔ میں اس کی پناہ لیتا ہوں۔ کن چیزوں سے پناہ لیتا ہوں مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ تمام ان چیزوں کی بُرائی سے جن کو اُس نے پیدا کیا یعنی اللہ تعالیٰ مجھے اپنی مخلوق کے شر سے پناہ میں رکھے۔

گزشتہ سورۃ اخلاص میں توحید کا مضمون بیان ہوا ہے۔ اور اس سورۃ میں پناہ پکڑنے کا بیان ہے۔ ان دونوں سورتوں کا باہمی ربط اس طرح ہے۔ کہ پناہ وہی ذات دے سکتی ہے جو قادرِ مطلق، علیمِ کل، مختارِ کُل اور صفاتِ کمال کی مالک ہو۔ یہاں پر اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ میں اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی صفت کے نتیجے میں ہر چیز

---

[1] تفسیر عزیزی فارسی صـ ۲۷۵ پارہ ۳۰ — [2] ترمذی صـ ۵۰۴

کو اس کے کمال تک پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔ ربوبیت کا معنیٰ ہی یہ ہے۔ اِنْشَاءُ شَیْءٍ حَالًا فَحَالًا اِلٰی حَدِّ الْکَمَالِ یعنی کسی چیز کو آہستہ آہستہ اس کے حد کمال تک پہنچانے کے ذرائع مہیا کرنا۔ چنانچہ انسان کو حد کمال تک پہنچنے کے لیے جس جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ نے مہیا فرمائی۔ خوراک، لباس، مکان، سایہ، گرمی ہوا، وغیرہ اللہ تعالیٰ اپنی صفت ربوبیت کے مطابق مہیا کرتا ہے۔ تاکہ ہر چیز اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔

اس مقام پہ دوسری بات یہ معلوم ہوئی ہے۔ کہ شر سے بچنا انسان کا فطری حق ہے اگر وہ شر سے بچ جائے گا۔ تو اس کے لیے کامیابی کے ہزاروں دروازے کھل جائیں گے اور اگر انسان شر سے نہ بچ سکا، تو پھر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تمام مخلوق کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے اور ان میں سے تین چیزوں کا بطورِ خاص ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کا شر اور فتنہ زیادہ نمایاں ہے۔

ظاہری اور باطنی شر

شر دو قسم کے ہیں۔ یعنی حسی اور معنوی یا ظاہری اور باطنی۔ اور پھر یہ ہے کہ شر ہر ایک چیز کے ساتھ منسلک ہے۔ مثلاً عبادت کا شر یہ ہے۔ کہ اس میں ریاکاری آجائے۔ اگر ایسا ہوا تو عبادت نہ صرف بے معنیٰ ہو جائے گی۔ بلکہ وبال جان بن جائے گی۔ گویا عبادت جیسی اچھی چیز میں بھی اگر ریاکاری پیدا ہو گئی تو وہ شر میں داخل ہو جائے گی۔

انبیاء علیہم السلام کے ساتھ شر یہ ہے۔ کہ انسان ان پر ایمان نہ لائے۔ ان کی تکذیب کرے اور ان کی اطاعت سے روگردانی کرے۔ ایسا شخص انبیاء علیہم السلام کے اعتبار سے شر میں مبتلا ہو جائے گا۔ اسی طرح ایمان کے ساتھ بھی شر ہے۔ حالانکہ ایمان ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اگر انسان کا ایمان کمزور ہو جائے۔ اس میں نفاق پیدا ہو جائے، شرک کی ملاوٹ آجائے۔ یا کوئی انسان مرتد ہو جائے تو یہ ایمان کے اعتبار سے فتنہ ہوگا۔

شر سے بچنا ضروری ہے

ان تمام قسم کے شرور سے بچنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص شر سے بچ نہیں سکے گا۔ تو کوئی کمال حاصل نہیں کر سکے گا۔ شر سے بچنا انسان کا فطری حق ہے۔ اور یہی مقصد حاصل کرنے کے لیے پناہ مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔

یہ ایک اصولی بات ہے۔ کہ کسی چیز سے کما حقہٗ فائدہ حاصل کرنے کے لیے اس

چیز کو شر سے بچانا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ایک کسان کھیتی بوتا ہے۔ ہل چلاتا ہے۔ بیج ڈالتا ہے، پانی دیتا ہے اور فصل کی امید رکھتا ہے مگر فصل حاصل کرنے کے لیے اُسے شر سے بچانا اولین ضرورت ہے۔ بیج کو کیڑے سے بچانا ہوگا۔ فصل طوفان اور ژالہ باری سے محفوظ رہے گی۔ تب کسان اس سے مکمل فائدہ حاصل کر سکے گا۔ اسی طرح فصل کو پانی، روشنی اور گرمی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ چیزیں میسّر نہیں ہوں گی تو فصل مرجھا جائے گی۔ مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ لہٰذا فصل کو ہر قسم کے شرور سے بچانا ضروری ہے۔ دین کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اگر کمال حاصل کرنا ہے۔ تو دین کو نفاق، شرک اور بدعقیدگی کے شرور سے بچانا ہوگا۔ ورنہ صحیح نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔

اندھیرے کا شر

فرمایا وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں پناہ مانگتا ہوں اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی سے روایت ہے[1] کہ حضور علیہ السلام نے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا تَعَوَّذِیْ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّ ھٰذَا الْغَاسِقِ اِذَا وَقَبَ اس غاسق کے شر سے پناہ مانگو جب یہ چھپ جاتا ہے۔ جب چاند چھپ جاتا ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے اور اندھیرا شر کی بنیاد ہے۔ اس میں طرح طرح کے شرور پیدا ہوتے ہیں۔

سب سے پہلا شر یہ ہے۔ کہ جب اندھیرا شروع ہوتا ہے۔ تو شیاطین اور جنات پھیل جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے[2] جب اندھیرے کی ابتداء ہو تو بچوں اور جانوروں کو باہر نہ نکالو، تاکہ وہ شیاطین اور جنات کے اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔ شام کے وقت شیاطین اور جنات پر افراتفری کا عالم ہوتا ہے وہ اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں۔ اس لیے اس وقت بچوں کو باہر نہیں نکالنا چاہیئے۔ کہیں وہ ان کے اثرات کا شکار نہ ہو جائیں۔ البتہ جب اندھیرا خوب جم جائے اور کچھ وقت گذر جائے تو پھر باہر نکلنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس وقت تک شیاطین کی افراتفری ختم ہو جاتی ہے

رات کے وقت موذی قسم کے جانور بھی نکلتے ہیں۔ اسی لیے حضور علیہ السلام

---

[1] ترمذی ص ۴۸۵ مسند احمد ص ۶۱ ج ۶ مستدرک حاکم ص ۵۴۱ ج ۲ [2] بخاری ص ۴۶۷ ج ۱، مسلم ص ۱۷۱ ج ۲

کا فرمان[1] ہے کہ سفر کے دوران اگر رات ہو جائے تو آرام کرنے کے لیے سڑک سے ہٹ کر سونا چاہیے تاکہ کیڑے مکوڑے سانپ بچھو وغیرہ کے شر میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ وہ بھی اپنا شکار تلاش کرنے کے لیے رات کو نکلتے ہیں۔ اسی طرح چوری بھی عام طور پر رات کو ہی ہوتی ہے۔ بسا اوقات جانیں بھی تلف ہو جاتی ہیں۔ مال چلا جاتا ہے۔ آبرو کو خطرہ ہوتا ہے۔ یہ سب تاریکی کے فتنے ہیں۔

جادو سحر اور باطل عملیات کرنے والے لوگ بھی زیادہ تر رات کو مصروفِ عمل ہوتے ہیں۔ دن کی روشنی میں ان کی کامیابی کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ اسی واسطے فرمایا۔ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ میں پناہ مانگتا ہوں اندھیرے کے شر سے جب وہ چھا جائے۔ اس رب کی پناہ مانگتا ہوں جو تاریکی کو دور کرنے والا اور روشنی کو لانے والا ہے۔

جادو کا شر

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ اور میں پناہ مانگتا ہوں گرہوں میں پھونکنے والی عورتوں کے شر سے۔ نَفّٰثٰتِ مؤنث کا صیغہ ہے۔ جس کا معنی جادوگر عورتیں ہیں۔ جس طرح مرد کرتے ہیں اسی طرح بعض عورتیں بھی اس کام کی ماہر ہوتی ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے[2] کہ لبید بن الاعصم اور اس کی بیٹیوں نے حضور علیہ السلام پر سحر کیا تھا تو نَفّٰثٰت سے مراد جادوگر عورتیں ہوا۔ اور اگر نفّٰثٰت سے مراد نفس لیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ ان نفوس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو گرہوں میں کالا علم پھونک کر شر پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہر حال جادو کرنے والی عورتیں ہوں یا عام نفوس ان کے شر سے پناہ حاصل کرنے کا سبق دیا گیا ہے۔

باطل پراپیگنڈے کا شر

محققین مفسرین فرماتے ہیں[3]۔ کہ نفّٰثٰت سے مراد پارٹیاں اور گروہ ہیں اور نفث سے سے مراد باطل پراپیگنڈا ہے۔ اس بنا پر معنی یہ ہوگا کہ میں غلط پراپیگنڈا کرنے والی جماعتوں کے شر سے رب الفلق کی پناہ مانگتا ہوں جس طرح جادو کرنے کے لیے گرہوں میں پھونکا جاتا ہے اسی طرح اذہان کو متاثر کرنے کے لیے غلط پراپیگنڈا کرنے والے پراپیگنڈا پھونکتے رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ لوگوں کے صحیح اعتقادات آہستہ آہستہ متاثر ہونے لگتے ہیں۔ یہ جتنی بدعات پھیلی ہیں۔ شرک کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ یہ سب باطل پراپیگنڈے کا اثر ہے

---

[1] مسلم ص۱۴۲ ج۲، [2] بخاری ص۸۵۷ ج۲ مسلم ص۲۲۱ ج۲ روح المعانی ص۲۸۳ ج۳۰ [3] المقام المحمود یعنی تفسیر حضرت مولانا سندھیؒ پارہ ۳۰ ص۲۱۷

ادیانِ باطلہ والے اس قدر پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ کہ لوگوں کے ایمان مضمحل ہو جاتے ہیں۔ ہٹلر کہا کرتا تھا۔ کہ اس قدر جھوٹ بولو کہ سو فیصدی جھوٹ بھی سچ نظر آنے لگے۔

یہ پراپیگنڈے کے اثرات ہوتے ہیں۔ کہ لوگوں کے اعتقاد ضعیف ہوتے ہیں۔ پھر بالکل باطل ہو جاتے ہیں۔ اور یقین ختم ہو جاتا ہے۔ عیسائی مشنریاں اسی پراپیگنڈے کے زور پر کامیاب ہو رہی ہیں۔ بڑے بڑے عیسائی پادریوں کا قول ہے کہ کوشش کے باوجود اگر کوئی مسلمان عیسائی نہ بنے تو مسلمان بھی نہ رہے۔ اس کا اعتقاد اس قدر تو فاسد ہو جانا چاہیئے۔ ہنٹر نے اپنی کتاب (OUR INDIAN MUSLIMS) (ہمارے ہندوستانی مسلمان) میں لکھا ہے کہ ہماری سلطنت کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔ کہ مسلمانوں کی تحقیر کی جائے۔ یہ چیز انگریز کے مشن میں داخل ہے۔ ہنٹر ابتدائی دور کا انگریز تھا جس کی تحریر سے تعصب کا پتہ چلتا ہے۔ عیسائی مشنریاں اربوں روپے پراپیگنڈے کے مختلف ذرائع پر خرچ کرتی ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو بھی پراپیگنڈے کی زد میں آ گیا۔ اگر وہ عیسائی نہ ہوا تو کم از کم اس کا اعتقاد متزلزل ضرور ہو جائے گا۔

نیکوکاروں کی مجلس سے محرومی

نیکوکاروں کی مجلس سے محروم رہنا بھی افسوسناک ہے۔ اولیاء اللہ کے ساتھ نشر کی نسبت یہ ہے کہ انسان ان کی مجلس سے محروم رہے۔ یہ انسان کے لیے باعث وبال ہے اگر کوئی ساری عمر کسی ولی اللہ یا راسخ العقیدہ نیک آدمی کی مجلس میں نہیں پہنچ سکا ؏ زادی بہ حجاب اندمیری بہ حجاب اندر ——— کے مصداق تاریکی میں ہی پیدا ہوئے اور تاریکی میں ہی زندگی گنوا دی ساری عمر کسی نیکوکار کی صحبت ہی نصیب نہ ہوئی، تو یہ بھی بدنصیبی کی بات ہے۔ اچھی مجلس باجماعت کو سنت مؤکدہ قریب الوجوب کہا گیا ہے۔ کہ یہ بہترین سوسائٹی ملنے کا ذریعہ ہے۔ ہماری اجتماعیت اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتی۔ جب تک جماعت کے ساتھ نماز ادا نہ کریں۔ جماعت کی بڑی برکات ہیں۔ انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔ عقیدے میں رسوخ پیدا ہوتا ہے۔ لہذا اجتماعیت ضروری ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا[1] کہ جو شخص بلا عذر تین جمعہ تک جمعہ کی نماز میں شامل نہ ہو تو اس کا نام منافقوں کے رجسٹر میں لکھ دیا جائے گا۔ (اور دوسری روایت میں ہے کہ) اور اس

---

[1] کنز العمال صفحہ ۵۱۶ ج ۷ و صفحہ ۵۱۸، زجاجۃ المصابیح صفحہ ۳۸۳ ج ۱۔

دِل پر ٹھپا مار دیا جائے گا[1] کہ یہ منافق ہے۔ الغرض قرآن و حدیث کے درس کی مجلس ہو یا عام وعظ و نصیحت کی مجلس ہو، یا کسی بزرگ کی مجلس ہو۔ اس میں شریک ہونا چاہیئے۔ اگر کسی کو ایسی مجلس نصیب نہیں ہوئی تو یہ اس کے حق میں شر ہے۔

ادیان باطلہ کا پراپیگنڈا

نفثٰت سے مراد اگر غلط پراپیگنڈا ہے تو یہ بھی اپنے عروج کو پہنچا ہوا ہے۔ ہندو مت جیسے تاریک مذہب کے پیروکاروں نے اپنے پراپیگنڈے کا دائرہ کار امریکہ تک وسیع کر رکھا ہے۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کو ہندو بنا لیا ہے۔ مرزائیوں نے زبردست پراپیگنڈا کی بدولت اپنی شاخیں ساری دنیا میں پھیلا رکھی ہیں۔ اس پراپیگنڈے کی وجہ سے لوگوں کے ایمان مضمحل ہوتے ہیں۔ شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ سیاسی طور پر بھی پراپیگنڈے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ باطل پارٹیاں محض پراپیگنڈے کے زور پر غلبہ حاصل کر لیتی ہیں۔ اور صحیح لوگ پراپیگنڈا نہ ہونے کی بنا پر ناکام ہو تے ہیں۔ غلط کار لوگوں کا پراپیگنڈا زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔

حسد اولین کبیرہ گناہ ہے

فرمایا وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ میں پناہ مانگتا ہوں حسد کرنے والے کی برائی سے جب وہ حسد کرتا ہے۔ حسد بہت بری بیماری ہے۔ کائنات میں سب سے پہلا کبیرہ گناہ حسد کی وجہ سے سرزد ہوا، جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو حسد کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ یہودی اور نصرانی محض حسد کی بنا پر نبی آخر الزمان پر ایمان نہیں لائے۔ "حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ" وہ چاہتے تھے کہ آخری نبی ہماری قوم بنی اسحٰق سے آتا۔ یہ دوسری قوم سے کیوں آیا۔ اس لیے ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ انہوں نے بنی اسمٰعیل سے حسد کیا۔ یہودی اور نصاریٰ حسد میں مبتلا ہو کر ایمان سے محروم ہو گئے۔ حسد حرام ہے۔ حسد کا معنی یہ ہے کہ کسی شخص میں کوئی کمال دیکھ کر دوسرا کہے کہ اس کے پاس یہ خوبی کیوں ہے۔ یہ میرے پاس ہونی چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ حاسد اللہ تعالیٰ کی حکمت اور نظام قدرت پر معترض ہوتا ہے۔ اگر کسی میں خوبی دیکھو تو اس کی برائی طلب کرنے کی بجائے اس جیسی خوبی خود بھی طلب کرو۔

---

[1] مسلم ص ۲۸۴/ ۱، ترمذی ص ۹۸

امیہ بن الصلت ساری عمر سچے مذہب کی تلاش میں پھرتا رہا۔ کبھی عیسائی بنا۔ کبھی یہودیت اختیار کی مگر جب حضور علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو بدبخت حسد میں مبتلا ہو گیا۔ کہنے لگا کہ وحی مجھ پر کیوں نہیں آئی۔ اسی حسد کی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ حالانکہ وہ بڑا قابل آدمی تھا۔ بڑے پایہ کا شاعر تھا۔ اس کا دیوان پڑھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ کہ وہ کس قدر حق کا طالب تھا مگر حسد کی وجہ سے کفر کی موت مرا۔ ——— حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے[۱]۔ کہ حسد ایسی بیماری ہے جو یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔ نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے۔ جس طرح آگ خشک لکڑیوں کو جلا دیتی ہے۔

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہوا۔ کہ شر سے بچنا انسان کا فطری حق ہے۔ اگر انسان اس سے بچ جائے گا۔ تو اُس کے لیے کامیابی کے ہزاروں دروازے کھلیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام کائنات کا ربط خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ اب صرف وہی ہے۔ لہذا شرور اور فتنوں سے بچانے والا بھی وہی ہے۔ اس لیے انسان کو دعا کرنی چاہیئے۔ کہ رب العزت اُسے فتنوں سے محفوظ رکھے کیونکہ فلاح کا مدار اسی پر ہے۔

---

[۱] کنز العمال ص ۲۶۳ ج ۳، بحوالہ ابن مردویہ وبیہقی در منثور ص ۴۱۹ ج ۶ وص ۴۲۰

سُورَةُ النَّاسِ

الناس ۱۱۴ عمّ ۳۰
(مکمل سورۃ) درس

سُوْرَةُ النَّاسِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ سِتُّ اٰيَاتٍ

سورۃ الناس مدنی ہے اور یہ چھ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ① مَلِكِ النَّاسِ ② اِلٰهِ النَّاسِ ③ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ④ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ⑤ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ⑥ ع ۶ / ۳۹

ترجمہ: (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجئے میں پناہ لیتا ہوں لوگوں کے رب کے ساتھ ① لوگوں کے بادشاہ کے ساتھ ② لوگوں کے معبود کے ساتھ ③ وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو پیچھے ہٹ جاتا ہے ④ وہ جو وسوسہ ڈالتا ہے لوگوں کے سینوں میں ⑤ جنات میں سے بھی ہوتا ہے اور انسانوں میں سے بھی ⑥

نام اور کوائف: اس سورۃ مبارکہ کا نام سورۃ الناس ہے۔ یہ قرآن کریم کی آخری سورۃ ہے۔ مدنی زندگی میں نازل ہوئی۔ اس کی چھ آیات ہیں اس سے پہلی سورۃ فلق کی پانچ آیتیں ہیں۔ گیارہ آیات کی یہ دو سورتیں ایک ہی وقت میں اکٹھی نازل ہوئیں۔ اس سورۃ الناس کے بیس[2] الفاظ اور اناسی[9] حروف ہیں۔

موضوع: سورۃ فلق اور سورۃ الناس معوذتین کہلاتی ہیں۔ ان کے ذریعے شرور سے پناہ مانگنے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ پہلی سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بیان کر کے چار دنیوی زندگی سے متعلق چیزوں سے پناہ مانگی ہے۔ اور اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات کا ذکر کر کے ایک دینی زندگی سے متعلق چیز یعنی وسوسہ شیطان سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ اس سورۃ میں چونکہ دینی آفتوں سے پناہ کا ذکر ہے۔ اس لیے مفسرین کرام فرماتے ہیں[1] کہ اس سورۃ کا موضوع

---
[1] تفسیر عزیزی فارسی صفحہ ۲۷۵

اَلْاِسْتِعَاذَةُ مِنَ الْاٰفَاتِ الدِّیْنِیَّۃ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ پہلی سورۃ میں تمام کائنات کا ربط اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔ اور اس سورۃ میں انسانیت کا ربط اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی جو تین صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں رَبِّ النَّاس مَلِکِ النَّاس اور اِلٰہِ النَّاسِ کی صفات ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت، مالکیت اور الوہیت کے ساتھ شیطان کے وسوسہ کے شر سے پناہ حاصل کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔ کہ وسوسہ ڈالنے والے شیاطین جنات میں سے بھی ہیں۔ اور انسانوں میں سے بھی ہیں۔ خنّاس دراصل چھپ جانیوالے کو کہتے ہیں۔ گویا وسوسہ اندازی کرنے والے جن و انس حملہ کرتے ہیں مگر نظر نہیں آتے۔ یہ حملہ آور افراد بھی ہوتے ہیں۔ اور گروہ بھی ہوتے ہیں۔ جب یہ اپنا کام کرتے ہیں۔ تو انسان برائی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

فضیلت

احادیث میں ان آخری دو سورتوں کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ جب یہ سورتیں نازل ہوئیں۔ تو حضور علیہ السلام نے ایک صحابیؓ سے فرمایا[1] اَلَا اُعَلِّمُکَ کیا میں تمہیں وہ دو سورتیں نہ سکھاؤں لَمْ یُنْزَلْ عَلٰی مِثْلُھُنَّ جن کی مثل نہ انجیل میں ہے۔ نہ زبور میں اور نہ قرآن میں یعنی آفات سے پناہ حاصل کرنے کے سلسلے میں اُن کے برابر کوئی اور کلام نہیں ہے۔ چنانچہ آپ نے صحابی کو یہی دو سورتیں سکھائیں۔

حضور علیہ السلام کی عادت مبارکہ تھی کہ رات کو سوتے وقت سورۃ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اور یہ دو سورتیں اپنے ہاتھ مبارک پہ پھونک کر جسم مبارک پہ ملتے تھے۔ آپ تین دفعہ ایسا کرتے[2]۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ وسوسوں کو رفع کرنے کے لیے یہ مجرب نسخہ ہے۔ جو کوئی ایسا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے وساوس سے محفوظ رکھے گا۔

سورۃ فاتحہ اور سورۃ الناس میں ربط

اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی جو تین صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان کا ربط بالترتیب سورۃ فاتحہ

---

[1] مسلم ص ۲۷۲ ج ۱، تفسیر ابن کثیر ص ۵۷۱ ج ۴، درمنثور ص ۴۱۶ ج ۶

[2] ترمذی ص ۴۹۰، بخاری ص ۹۳۵ ج ۲

میں مذکورہ صفات کے ساتھ ہے۔ اس سورۃ میں پہلی صفت ہے ربّ النّاس اسکے مقابل سورۃ فاتحہ میں آیا ہے۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" یہاں پر صفت ربوبیت میں مناسبت ہے اسی طرح اس سورۃ میں دوسری صفت ہے۔ مَلِکِ النَّاس اور وہاں سورۃ فاتحہ میں ہے مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ یہاں صفت، مالکیت میں مناسبت ہے۔ پھر یہاں تیسری صفت اِلٰہِ النَّاسِ ہے اور ادھر ہے "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" گویا دونوں مقامات پر صفت الوہیت مشترکہ ہے اسیطرح سورۃ والنّاس کو سورۃ فاتحہ کے ساتھ واضح مناسبت ہے۔

صفت ربوبیت کا اطلاق

یہاں پر سب سے پہلی صفت ربوبیت کی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے۔ جو ہر چیز کی پرورش کر کے اُسے حد کمال تک پہنچاتی ہے۔ دنیا میں انسان کی پرورش اور تربیت اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے۔ جو انسان کے مشاہدے میں آتا ہے۔
جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے۔ تو اس کا تعلق ماں باپ کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو اس کی حتی المقدور پرورش کرتے ہیں۔ گویا اس وقت بچے کی ساری کائنات اس کے والدین ہی ہوتے ہیں۔ لہذا یہاں پر صفت ربوبیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ

صفت مالکیت کا اطلاق

بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ اس کے ماں باپ اس کی بہت سی ضروریات پوری کر رہے ہیں۔ مگر بعض ضروریات ایسی ہیں۔ جنہیں والدین بھی پورا کرنے سے عاجز ہیں۔ اور ایسی ضرورتوں کے لیے حاکم وقت امیر یا بادشاہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ تو اب اس کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ماں باپ کے بعد کسی دوسری ہستی کے تعاون کی بھی ضرورت ہے۔ اور وہ ہستی بادشاہ ہے۔ گویا اس موقع پر اُسے اللہ تعالیٰ کی صفت مالکیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو دوسرے منبر پر آگیا مَلِکِ النَّاسِ

صفت الوہیت کا اطلاق

جب انسان اس مرحلہ پر پہنچتا ہے۔ تو وہ دیکھتا ہے۔ کہ اسکے لوازمات زندگی کچھ ایسے بھی ہیں۔ جنہیں نہ والدین پورا کر سکتے ہیں اور نہ ہی بادشاہ یا امیر اس قدر استطاعت رکھتے ہیں۔ کہ لوگوں کی تمام ضروریات پوری کریں۔ مثلاً جب لوگوں کو دھوپ، گرمی یا سردی کی ضرورت ہوتی ہے۔ فصل بونے کے وقت جس قسم کے موسم کی ضرورت ہوتی ہے۔ پکنے

کے وقت کتنی گرمی کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر فصل کاٹتے وقت کس قسم کی آب و ہوا درکار ہوتی ہے۔ انسان دیکھتا ہے۔ کہ یہ تمام چیزیں نہ ماں باپ کے بس میں ہیں اور نہ بادشاہ کے بس میں۔ لامحالہ اس کی نگاہ بلند ہوتی ہے۔ کہ وہ کون سی ہستی ہے۔ جو تمام کی تمام ضروریات پوری کرنے پر قادر ہے۔ ہر چیز کی تربیت کرتی ہے۔ اور تمام چیزوں کی مالک ہے۔ تو اُسے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ وہ صرف اور صرف اللہ ہے۔ تو یہاں پر الوہیت کی صفت کارفرما ہوئی اِلٰہِ النَّاسِ

اللہ تعالیٰ محبوب ترین ہستی ہے

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اِلٰہ یعنی معبود کے سوا کوئی تمام ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا۔ نہ کوئی تربیت کر سکتا ہے۔ اور نہ کوئی حقیقی مالک ہے۔ تو پھر حقیقت یہ ہے کہ اُس سے بڑھ کر محبوب بھی کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ تمام محبوبوں کا محبوب ہے اور یہ اُس کو اللہ کہتے ہیں بات تربیت سے شروع ہو کر آہستہ آہستہ معبودیت کے درجے تک پہنچ گئی گویا انسان خدا تعالےٰ کی معبودیت اور الوہیت کے مقام کی پہچان تک پہنچ گیا۔ خدا تعالےٰ کی ہستی بے چون وبے چگون ہے۔ اس میں انسان حیران ہو جاتا ہے۔ مگر اُس کے ساتھ محبت بھی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے محبوب کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ تو اُسے سکون میسر آتا ہے۔ اور جب اُس سے جدا ہوتا ہے۔ تو بے چینی ہوتی ہے۔ چونکہ سب محبوبوں سے بڑھکر خدا کی ذات ہے۔ اس لیے اس کے پاس حاضری میں بندے کو سکون ملتا ہے۔ اور جونہی اس سے جدا ہوتا ہے بے چین ہو جاتا ہے

اب بندے کو اپنے اللہ سے جدا کرنے والی دو طاقتیں ہیں۔ اولاً حاسد کا حسد ہے۔ جس کے متعلق پہلی سورۃ فلق میں استعاذ کیا گیا ہے۔ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ "بندے اور اس کے محبوب کے درمیان دوسری رکاوٹ شیطان کی مکاری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیطان انسان کا حقیقی دشمن ہے۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ انسان کو مخاطب کر کے فرمائے گا۔ "اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ" یعنی اے بنی آدم کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے "اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ" اس سے بچنے کی کوشش کرنا۔ چنانچہ اس دشمن سے بچاؤ کا بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ انسان اپنی محبوب ترین ہستی کی پناہ تلاش کر لے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ تو دشمن کی کید اور

اس کے مکر سے بچ جائے گا۔ اور یہی وہ چیز ہے۔ جس کی تعلیم اس سورۃ مبارکہ میں دی گئی ہے کہ شیطان کے وسوسے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کی جائے۔

مخلات دین اور ان کا علاج

سورۃ نصر کی تفسیر میں عرض کیا گیا تھا۔ کہ مخلاتِ دین یعنی دین میں خلل ڈالنے والی چار چیزیں ہیں۔ یعنی کافر، منافق، شیطان اور نفس ان میں دو چیزیں یعنی کافر اور منافق ظاہری مخلات ہیں۔ اور دوسرے دو یعنی شیطان اور نفس باطنی مخلات ہیں۔ ان چاروں مخلات کا علاج قرآن پاک نے بتا دیا ہے۔ کافر کے شر سے بچنے کے لیے فرمایا "جَاهِدُوا" ان کے ساتھ تلوار سے جہاد کرو۔ مادی وسائل بروئے کار لاؤ۔ منافق کی چالوں کو ناکام بنانے کے لیے فرمایا "وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ" دلیل و برہان سے ان کو ذلیل کرو۔ گویا ان کے ساتھ زبان سے جہاد کرو اسی طرح نفس کے متعلق فرمایا اَعْدٰی عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ تمہارا دشمن نفس ہے جو تمہارے پہلو میں بیٹھا ہوا ہے۔ یہی نفس خواہشات اور برائی کی طرف لے جاتا ہے۔ "اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ" فرمایا نفس کو مغلوب کرنے کے لیے بھاری عبادت اور ریاضت کرو جو نفس پر گراں گزرے۔ نفس کی بہیمیت اس ریاضت سے ٹوٹتی ہے۔ اس کا علاج یہی ہے۔ دین میں چوتھا مخل شیطان ہے جو اول سے آخر تک انسان کے ساتھ مکاری کرتا ہے۔ اس کے شر سے بچنے کیلئے اس سورۃ مبارکہ میں یہ علاج بتایا گیا ہے۔ کہ محبوب ترین ہستی کی پناہ حاصل کی جائے۔

معرفت الٰہی

حضرت مالک بن دینار فرماتے ہیں[1]۔ افسوس! انسان سب سے اچھی چیز کا مزہ چکھے بغیر ہی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا حضرت! وہ کون سی ایسی چیز ہے۔ جس سے لوگ محروم رہتے ہیں۔ فرمایا معرفت الٰہی یعنی اللہ تعالیٰ کی پہچان ہے۔ جسے حاصل کیے بغیر ہی لوگ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ گویا سب سے اچھی اور پسندیدہ چیز اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر یقین اور خدا کی محبت اور پہچان ہے۔ شیطان اسی چیز میں رخنہ ڈالتا ہے۔ تاکہ انسان یہ بہترین چیز حاصل نہ کر سکے۔ کیونکہ شیطان نے اللہ تعالیٰ کے روبرو کہا تھا۔ کہ میں انسان

---

[1] حلیۃ الاولیاء ص ۳۵۸ ج ۲

کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے آکر اُسے بہکانے کی کوشش کروں گا۔ لہٰذا اُس کے شر سے بچنے کا علاج یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی پناہ میں آجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرے تاکہ شیطان کی کید سے محفوظ رہ سکے۔ حدیث شریف میں آتا ہے[۱]۔ کہ شیطان انسان کے دل کے خانے پر جونک کی طرح لگا رہتا ہے۔ جونہی وہ انسان کو غافل پاتا ہے۔ فوراً وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ مگر جب انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے۔ تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے یا چھپ جاتا ہے۔ تو اس کا علاج خدا تعالیٰ کا ذکر ہے۔ اور اس کی پناہ میں آنا ہے۔

تو فرمایا آپ کہہ دیجیے کہ میں پناہ مانگتا ہوں رَبِّ النَّاسِ لوگوں کے پروردگار کی مَلِكِ النَّاسِ لوگوں کے بادشاہ کی، اِلٰهِ النَّاسِ لوگوں کے معبود کی۔ وہ معبود ہے اور محبوب ہے اُس کے سوا کسی کی عبادت روا نہیں۔ اس کے بغیر تمام ضروریات پوری کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ لہٰذا عبادت بھی اسی کی کرنی چاہیے۔ اگر اس کے سوا کسی کی عبادت کرے گا۔ تو کفر، شرک اور بغاوت میں مبتلا ہو جائے گا۔

وسوسہ شیطانی سے پناہ

الغرض! اللہ تعالیٰ کی تین صفات ربوبیت، مالکیت اور الوہیت کا ذکر کرکے فرمایا مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵ الْخَنَّاسِ میں پناہ لیتا ہوں وسوسہ انداز کے شر سے۔ اور وسوسہ ڈالنے والا کون ہے اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ جو وسوسہ ڈالتا ہے۔ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ لوگوں کے سینوں میں اور وہ ہے کس نوع سے مِنَ الْجِنَّةِ شیطان کی طرح جنات میں سے ہوتا ہے شیطان کے متعلق فرمایا[۲] کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ وہ جنات میں سے ہے۔ اُس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ اور مردود ہوا۔ اور یا پھر وَالنَّاسِ وسوسہ ڈالنے والا انسانوں میں سے بھی ہوتا ہے۔ جس طرح نَفّٰثٰتِ میں بیان کیا گیا کہ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں اور گروہ بھی ہوتے ہیں۔ جو وسوسہ اندازی کرتے ہیں۔ اور عقیدے جیسے قیمتی جوہر کو خراب کر دیتے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے دل پر خیالات یا خطرات اس طرح وارد ہوتے ہیں۔ جس طرح بارش کے قطرے برستے ہیں۔ مگر انسان یہ جاننے سے قاصر ہے کہ خیالات کے

۱؎ تفسیر ابن کثیر ص ۵۷۵ ج ۴ و درمنثور ص ۴۲۰ ج ۶ تفسیر طبری ص ۳۵۵ ج ۳۰ ۲؎ حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۷ ج ۱

وارد ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ یہ خیالات جم جائیں یعنی پختہ ہو جائیں تو انسان کا عقیدہ بن جاتا ہے۔ جب عقیدے میں پختگی آتی ہے تو ارادہ بنتا ہے اس کے بعد انسان عزم کرتا ہے اور پھر فعل کرتا ہے۔ اس چیز سے ہٹانے کے لیے شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ جس کا علاج یہ بتایا گیا ہے۔ کہ انسان اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی کوشش کرے اور اس کا ذکر کرے تو وہ اس وسوسہ سے بچ سکتا ہے۔ انسان کا عقیدہ اس کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ اس کو خراب کرنے کے لیے شیطان ہر وقت اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ تاکہ کسی نہ کسی طرح اُسے ایمان کی دولت سے محروم کر دے مگر اس کے شر سے وہ بچ سکتا ہے جو خدا تعالیٰ کی پناہ میں آجائے گا اور وہ علاج کرے گا جو شریعت مطہرہ نے تجویز کیا ہے۔

قرآن پاک منتہائے مقصود ہے

اَللّٰھُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ وَاجْعَلْہُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنِیْ مِنْہُ مَا نَسِیْتُ وَعَلِّمْنِیْ مِنْہُ مَا جَھِلْتُ وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَہٗ اٰنَاءَ اللَّیْلِ وَاٰنَاءَ النَّھَارِ وَاجْعَلْہُ لِیْ حُجَّۃً یَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے ہم سب کا ایمان ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ کی "ب" سے لے کر "والنّاس" کی "س" تک جو کچھ اس میں ہے یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ بعض شاعروں نے کہا ہے کہ "ب" اور "س" کے درمیان جو کچھ آیا ہے اس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ دنیا و آخرت میں انسان کی فلاح کے لیے یہی بس ہے۔ "ب" اور "س" کو جوڑیں تو لفظ بس بنتا ہے اور فارسی میں اس کا معنیٰ کافی ہے۔ گویا دنیا اور دین کی سعادت کے لیے قرآن پاک کافی ہے۔[۱]

قرآن پاک کی درس و تدریس

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد شیخ عبدالرحیمؒ بہت بڑے اولیاء اللہ میں سے تھے اپنے زمانے کے صوفی اور بزرگ تھے اورنگ زیب عالمگیرؒ نے "فتاویٰ عالمگیری" کی تدوین کے لیے جو پانچسو علماء کی کمیٹی بنائی تھی، شیخ عبدالرحیمؒ اس کے ممبر تھے۔ بعد میں خود اس کمیٹی سے علیحدہ ہو گئے۔ آپ کا طریقہ یہ تھا۔ کہ خاص اہلِ علم کو اکٹھا کر کے درس قرآن پاک دیا کرتے تھے۔ یہ درس عام لوگوں کے لیے نہیں بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہوتا تھا۔

---

[۱] تفسیر عزیزی فارسی پارہ ۳۰ صہ ۲۸۲ بحوالہ حکیم ثنائیؒ

شاہ ولی اللہؒ آپ کی مجلس میں ایک یا دو رکوع پڑھتے اور شیخ عبدالرحیمؒ اس کی تشریح بیان فرماتے۔

شاہ ولی اللہؒ کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے بھی اپنے زمانے میں عوام کے لیے قرآن کریم کا درس جاری کیا۔ انہوں نے کہا۔ کہ قرآن پاک کا فیض عوام تک پہنچنا چاہیئے۔ وہ بھی قرآن پاک کھول کر بیٹھیں اور فیضیاب ہوں۔

مشکوٰۃ شریف میں حضور علیہ السلام کی حدیث موجود ہے[1]۔ کہ قرآن پاک کی زبانی تلاوت کرنے والے کو ہر حرف کے بدلے دس دس نیکیاں ملتی ہیں اور اگر کھول کر پڑھے تو دو ہزار نیکیاں ملتی ہیں۔ قرآن پاک کو دیکھ کر پڑھنے سے اس کا فیض اس قدر بڑھ جاتا ہے۔ اسی لیے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے برصغیر میں قرآن پاک کا درس جاری کیا۔ اور یہ آج تک جاری ہے اللہ تعالیٰ کا کلام عمل کے لیے آسان ہے، مگر علم کے اعتبار سے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ کیونکہ اس کی تفسیر کی کچھ شرائط ہیں، اُن کو پورا کئے بغیر کلام پر مکمل عبور حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم عوام بھی اس طریقے سے کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں امید ہے کہ وہ بھی قرآن پاک کے فیض سے محروم نہیں رہیں گے۔

علوم قرآن کی امانت

قرآن کریم کی تفسیر اور اس کے مطالب و معانی کا بیان بڑے علم والوں کا کام ہے۔ میری حیثیت بالکل معمولی ہے۔ اور میرا علم نہایت ناقص اور کمزور ہے۔ جو امانت بزرگوں نے ہمارے سپرد کی ہے۔ اس کو نبھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہماری بساط ہی کیا ہے۔ یہ تو مولانا احمد علی لاہوریؒ جیسی بزرگ ہستیوں کا کام ہے۔ جو اسلامی مدارس سے فارغ ہونے والوں کو تین ماہ میں قرآن پاک کی تفسیر پڑھاتے تھے۔ پانچ ہزار علماء کرام نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ ہم تو علماء کے خاک پا کے برابر بھی نہیں ہیں معمولی درجے کے لوگ ہیں۔ تھوڑی بہت شُد بُد ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔

آیئے دعا کریں۔ کہ قرآن پاک کے بیان میں جو کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے

---

[1] مشکوٰۃ شریف ص۱۸۶، ص۱۸۹ طبع سنگاپور، ترمذی ص۱۳۴ [2] مشکوٰۃ شریف ص۱۸۶

معاف کرے۔ ہمارے بیان ناقص ہیں۔ ہماری زبانیں ناقص ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہم سے کئی غلطیاں سرزد ہوئی ہوں تاہم جو کچھ اللہ تعالیٰ کی مراد ہے اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کو بیان کیا ہے۔ اس پہ ہمارا ایمان ہے۔

دعا ہے کہ جو لوگ درسِ قرآن میں شریک ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں قرآن پاک کی سعادت سے محروم نہ رکھے۔ اور اس کے فیض سے سب کو مستفید فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ قرآن کریم کی نشر و اشاعت اس کے سننے سنانے اور مسائل کی تشریح میں طاقت کے مطابق حصہ لیتے رہیں۔ اور قرآن پاک کی درس و تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ قرآن پاک کا بیان یہاں پانچویں دفعہ ختم ہوا ہے۔ میں سب حضرات کے لیے دعا کرتا ہوں۔ آپ بھی اس میں شریک ہوں۔

دعا ختم قرآن

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

اے اللہ تعالیٰ! ہم نے اپنے ناقص فہم کے مطابق جو کچھ قرآن پاک کا ترجمہ کیا ہے۔ جن حضرات نے سنا ہے اور سمجھا ہے، جو مسائل علم میں آئے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو قبول فرمائے۔ اور مزید فہم اور توفیق عطا فرمائے۔ اے اللہ مرتے دم تک ہمارا تعلق قرآن کریم کے ساتھ قائم رکھنا۔ اے اللہ! قرآن کریم کو ہمارے دلوں میں محبوب بنا دے۔ قرآن پاک، اسلام، پیغمبر اور اپنی ذات کے ساتھ ہماری محبت کو قائم رکھ۔ جو لوگ قرآن پاک سنتے ہیں، اس کی نشر و اشاعت میں کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہر قسم کے فیض سے فیضیاب کرے جن لوگوں نے قرآن پاک کی صحیح تفسیریں لکھی ہیں، بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی خدمات کو قبول فرمائے اور ہم کو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک تمام امتوں کے مسلمانوں کی بخشش اور مغفرت فرمائے۔ خصوصاً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے تمام مرد اور عورتوں کی بخشش فرمائے ہماری، ہمارے والدین اور اساتذہ سب کی مغفرت فرمائے۔ جو لوگ مقروض ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قرضے ادا کرنے کی سبیل پیدا فرمائے۔ جو بیروزگار ہیں

اللہ تعالیٰ ان کے لیے روزگار کی سبیل پیدا کرے۔ جو لوگ جاہل ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جہالت سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جو لوگ کفر و شرک اور بدعت میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس مصیبت سے نکالے اور ایمان، توحید اور سنت کا اتباع نصیب فرمائے۔ جو لوگ کسی دنیوی یا اخروی پریشانی میں مبتلا ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی پریشانی کو دور فرمائے اور ان کے لیے بہتر سبیل پیدا کرے۔ جو لوگ بھی طرح طرح کے مصائب میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مصیبتوں کو آسان فرمائے۔ فلسطین، افغانستان، قبرص، ہندوستان، کشمیر اور چین کے جو مسلمان تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تکالیف کو رفع کرے۔ اللہ تعالےٰ ان کی کافروں، مشرکوں، دہریوں اور عیسائیوں سے حفاظت فرمائے۔ ان کے ایمان، دین اور اہل و مال کو بے دینوں کے شر سے محفوظ فرمائے۔ جو لوگ اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اور قرآن پاک کے پروگرام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ذلیل و ناکام بنائے۔ تمام بنی نوع انسان میں جو لوگ حق پرست ہیں اور سلیم فطرت پر ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ایمان کی دولت نصیب فرمائے اور ان کی ہدایت کا ذریعہ پیدا فرمائے۔ معاندین اور مخالفین کو مغلوب کر دے۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ہر مقام پر غلبہ اور برتری عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے ذمہ دار لوگوں کو قرآن و سنت کا قانون جاری کرنے کی توفیق دے۔ جو تمام بنی نوعِ انسان کے لیے فلاح کا ذریعہ بنے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے نوجوانوں کو بُرائی سے بچا کر نیکی کی طرف راغب کرے۔ اور مستورات کو ہر قسم کی برائیوں سے بچائے۔ اللہ تعالیٰ انگریز کی منحوس تہذیب کو ختم کر دے، اور اسلام کی صحیح اور سچی تہذیب کو ہمارے ملک میں جاری کر دے۔ ہر قسم کی ــــ برائیوں سے ہماری حفاظت فرمائے۔

اللہ تعالیٰ ان مساجد کو آباد رکھے اور اسلام کی صحیح خدمت کرنے والے دینی مدارس کی ترقی کے اسباب پیدا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کا اتباع نصیب فرمائے۔ اور تمام اولیائے امت، مفسرین، محدثین کرام کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ حاجت مندوں اور پریشان حال لوگوں کی پریشانیاں دور کر دے۔ بیماروں کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ دنیا اور آخرت میں ہر قسم کی

بہتری عطا فرمائے۔ تجارت میں ترقی عطا کرے۔ طالب علموں کو حصول تعلیم میں کامیابی عطا کرے قرآن و سنت کی تعلیم حاصل کرنے والے جو طلبا سفر کی تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اُن کو کامیاب بنائے۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو اخلاص کی دولت عطا فرمائے۔ اور دینِ حق کی خدمت کرنے کی توفیق دے۔ ہر قسم کی پریشانیوں اور تکلیفوں سے ہماری حفاظت فرمائے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

(وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ)

خوش خبری

دور جدید سائنسی دور ہے، سائنس اور جدید انکشافات اپنے عروج پر ہیں۔ لوگ بھی نئی چیز کے شائق ہوتے ہیں۔ اگر آپ "دروس القرآن" کتابی شکل کے ساتھ ساتھ صاحب درس کی اصلی آواز میں سننا چاہیں تو بغیر کسی منافع کے اصلی لاگت پر کیسٹ بھی مہیا کی جا سکتی ہیں۔ صاحب ذوق حضرات اپنے گھروں میں، دوکانوں پر سُن سکتے ہیں۔ بالخصوص غیر تعلیم یافتہ اور ناخواندہ حضرات کے لیے یہ نعمت غیر مترقبہ ہوگی۔ دوسروں کو بھی سُنا سکتے ہیں۔ دوست واحباب کو تحفہ اور ہدیہ کے طور پر بھیج سکتے ہیں۔ ملک اور بیرون ملک بھی اس پروگرام کو وسیع کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم کی تبلیغ کے سلسلہ کو پھیلایا جا سکتا ہے۔ اس لیے قارئین کرام اور شائقین مضامین قرآن کی خدمت میں عرض ہے کہ اگر وہ استفادہ کرنا چاہتے ہوں تو اطلاع کرنے پر کیسٹ بھی مہیا کیے جا سکتے ہیں۔ کل کیسٹیں ۴۷۴ ہیں۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ دروس القرآن محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ

معالم العرفان فی دروس القرآن مکمل ۲۰ جلدوں میں

افادات

مفسر قرآن مولانا صوفی عبدالحمید سواتی صاحب

ریکارڈنگ

بلال احمد ناگی صاحب

مرتب

الحاج لعل دین ایم۔اے علوم اسلامیہ لاہور

زیرانتظام انجمن محبان اشاعت القرآن

صدر انجمن شیخ محمد یعقوب عاجز صاحب

جنرل سیکرٹری بابو غلام حیدر صاحب

الحاج محمود انور بٹ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ خزانچی مکتبہ دروس القرآن

ناظم مکتبہ دروس القرآن محمد منیر صاحب فون: 4221943